اسلامی ریاست اور غیر مسلم شہری

غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا تحقیقی مطالعہ

مصنّف

ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ

عکس

AKSPUBLICATIONS

اسلامی ریاست اور غیر مسلم شہری

غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا تحقیقی مطالعہ

مصنف
ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ

عکس
AKSPUBLICATIONS

کتاب	اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری
مصنف	ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ
سن طباعت	2018ء
تعداد	600
قیمت	1200

عکس

AKSPUBLICATIONS
Book Street, Data Darbar Market, Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publications.aks@gmail.com

فہرست ابواب وفصول

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ رحمۃ للعالمین اما بعد

ایک اسلامی ریاست جس آئین و قانون اور نظام حکومت کی پابند ہوتی ہے، وہ دیگر قومی و جمہوری یا لادین ریاستوں کے آئین کی طرح کسی حکمران یا پارلیمنٹ کا وضع کردہ نہیں جس میں عام طور پر عوام اور رعایا کے مفاد اور ان کی فلاح و بہبود کی بجائے حکمران پارٹی، کسی مخصوص طبقہ یا خاص فرد کے مفاد کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ قرآن و سنت دوسرے لفظوں میں اسلام کی شکل میں اسلامی ریاست کا آئین اور نظام حکومت اللہ اور اس کے آخری و آفاقی رسول حضرت محمد ﷺ عطا کردہ ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر سے اللہ کی پہچان اور شان یہ ہے کہ وہ "رب المسلمین" نہیں بلکہ "رب العالمین" ہے جس کی ربوبیت اور رحمت کا دائرہ رنگ، نسل، علاقہ، زبان اور عقیدہ و مذہب کی تمیز کے بغیر سارے انسانوں کو محیط ہے۔ اسی طرح اس کا آخری رسول ﷺ بھی "رحمۃ للمسلمین" نہیں بلکہ "رحمۃ للعالمین" ہے۔ جس کی رحمت تمام جہانوں سمیت ہر قسم کی مذکورہ تمیز کے بغیر سارے بنی نوع انسان کو شامل ہے۔ اس لیے اسلام کے اسم باسمی نام سے نظام رحمت کی نقد برکات و فوائد بلا امتیاز ٹھیک اسی طرح سارے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے عام ہیں جس طرح سورج چاند ہوا پانی اور زمین جیسی خدائی نعمتیں کسی قسم کی تفریق و امتیاز کے بغیر سارے انسانوں کے لیے عام ہیں۔

خالق کائنات نے اپنی وحی (قرآن مجید) اور اپنے نمائندہ رسول محتشم ﷺ کے عملی اسوہ و زبانی فرمودات کے ذریعے حق و باطل، ہدایت و ضلالت اور سچ و جھوٹ کے درمیان واضح لکیر کھینچ دی ہے اور انسان کو عقل و فہم اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عنایت فرمانے کے بعد اختیار دیا ہے کہ وہ روز روشن کی طرح واضح ان حق و باطل یا ایمان و کفر کے راستوں میں سے جس کو چاہے اختیار کر لے۔ اسی اختیار پر اس کی اخروی جزا و سزا کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ دین و ایمان کا تعلق بنیادی طور پر چونکہ انسان کے دل سے ہے اور دل

پر کسی کا زور نہیں چل سکتا، اس لیے اگر کوئی بات یا نظریہ وعقیدہ ایک آدمی دل سے تسلیم نہیں کرتا اور جبر واکراہ کے ذریعے اس سے زبانی اقرار و اعتراف کرایا جائے تو ظاہر ہے یہ منافقت ہو گی جس کی قرآن مجید نے کفر سے بھی زیادہ مذمت کی ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے اعلان فرمایا:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (سورۃ البقرہ، ۲:۲۵۶)

دین (کے معاملے) میں کوئی زبردستی نہیں (کیونکہ) ہدایت (راہ اسلام) گمراہی (طریق کفر) سے بالکل ممتاز ہو چکی ہے۔

تاہم اللہ کریم نے دنیا میں بندگان خدا پر ہر قسم کے ظلم وناانصافی کے خاتمہ اور عدل وانصاف کے لیے اسلامی نظام حکومت (خلافت) کا قیام لازمی قرار دیا اور اصولی طور پر ضروری طے پایا کہ اس نظام حکومت کی باگ ڈور اور زمام اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو دل و دماغ سے اس نظام کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اس خدائی نظام اور اسلامی عقائد و نظریات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے اسلام کے مقابلے میں دوسرے عقائد و نظریات یا کسی دوسرے مذہب کو اپنائے رکھنے پر مصر ہیں تو ازروئے قرآن وسنت کسی اسلامی حکومت یا حکمران کو اس بات کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ اقتدار اور حکومتی اختیارات و وسائل کے بل بوتے پر انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرے۔ بلکہ وہ اس امر کا پابند ہے کہ بحیثیت انسان اللہ نے ان کو جو عزت و عظمت عنایت فرمائی ہے اور بحیثیت ایک شہری کے اسلام نے انہیں جتنے حقوق دیے ہیں، ان کو پورا کرے اور انہیں اس شکایت کا ہرگز موقع نہ دے کہ محض غیر مسلم ہونے کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی یا امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔

چنانچہ نبی رحمت ﷺ نے اپنے زمانے میں ریاست مدینہ کی حدود میں بسنے والے تمام غیر مسلموں / اہل الذمہ کو (سوائے شر پسندوں، فتنہ پردازوں، بدعہدوں اور ریاست کے خلاف سازشیوں کے) صرف قانونی اور آئینی حقوق دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ حقوق سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ حد درجہ حسن سلوک، رواداری، برداشت، انسانی ہمدردی وخیر خواہی کا وہ کمال عادلانہ بلکہ فیاضانہ مظاہرہ فرمایا

جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے پہلے دیکھی تھی نہ قیامت تک دیکھ سکے گی۔ پھر اپنے رسول ﷺ کے اسوہ حسنہ اور اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرتے ہوئے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور بعد کی تمام اسلامی حکومتوں نے دیگر کئی کمزوریوں اور باہمی خانہ جنگیوں کے باوجود اپنی مملکت کی حدود میں رہنے والے غیر مسلموں کو مذہب و عقیدہ کے اختلاف بلکہ تضاد کے باوجود جس طرح برداشت کرنے کا مظاہرہ کیا اور جس عادلانہ انداز میں آج کئے گزرے دور میں بھی مسلمان حکومتیں ان کے انسانی حقوق کی پاسداری کر رہی ہیں، اور انہیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے، انسانی حقوق کے علمبردار بلکہ چیمپئین مغربی اور دیگر غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کو عملی طور پر اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں۔ اس کے باوجود بعض مستشرقین اور مغربی مفکرین دانستہ یا نادانستہ طور پر اس معاملے میں اہل اسلام کو موردالزام ٹھہراتے رہتے ہیں۔

اس لیے زیر تحقیق عنوان میں پورے دلائل تاریخی شہادتوں اور تقابلی مطالعہ سے اس تاثر کو زائل کیا گیا اور غیر مسلم رعایا کے تمام بنیادی حقوق کے بارے میں اسلام کی فراخدلانہ اور منفرد تعلیمات کو یکجا کر کے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ دوسرے سیاسی و اقتصادی اعتبار سے اسلام کے عالمی غلبہ کے زمانے میں بعض اوقات اسلامی حکومتوں کی طرف سے غیر مسلم رعایا پر لباس ہیئت اور سواری وغیرہ کے معاملے میں جو پابندیاں لگائی جاتی رہیں، ان کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے مستشرقین کی طرف سے عاید کیے گئے اہم اعتراضات کا مفصل اور مدلل جواب دیا گیا اور ان کا تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب دراصل راقم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے "اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق۔ عصری افکار و رجحانات۔ ایک تجزیاتی جائزہ" جسے "اسلامی ریاست اور غیر مسلم شہری" کے عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے۔ کئی اہل علم خصوصاً راقم سے غائبانہ خلوص و محبت، شفقت اور حسن ظن رکھنے والے حضرت علامہ مفتی جمیل احمد نعیمی (جامعہ نعیمیہ کراچی) کا مدت سے تقاضا بلکہ اصرار تھا کہ اس مقالہ کو ضرور شائع ہونا چاہیے۔

بہر کیف اس کی اشاعت میں راقم کی طرف سے ہی باوجوہ سستی اور تاخیر ہوئی۔ اب اس طرف توجہ کیگئی تو نوجوان کتاب دوست عزیز محترم محمد فہد ناظم (عکس پبلیکیشن و کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور)

نے ازراہ محبت و علم دوستی فوراً اسکی اشاعت کی حامی بھرلی جس پر میں تہہ دل سے انکا شکر گزار ہوں۔ جزاہ اللہ خیر۔ اللہ کریم راقم کی اس چھوٹی سی علمی خدمت کو قبول اور نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ربیع الثانی 1439ھ ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ

جنوری 2018ء ایڈیٹر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

باب اول

اسلامی ریاست ... مد اور رعایا کے ساتھ تعلقات کے بنیادی اصول

پہلی فصل

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد

زیر تحقیق موضوع کا تعلق چونکہ ایک اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے حقوق سے ہے۔ اس لیے حقوق کی بحث اور تفصیلات وجزئیات میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہاں دو چیزوں کا جائزہ لے لیں: اولاً ایک اسلامی ریاست کے قیام کا اولین مقصد کیا ہوتا ہے؟ ثانیاً ایک اسلامی ریاست اور اس کی رعایا کے درمیان تعلقات کے بنیادی اور لازمی اصول کیا ہیں؟ ان دو چیزوں کی وضاحت کے بعد کافی حد تک واضح ہو جائے گا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کی کیا حیثیت ہے نیز اس کا معاشرتی مرتبہ و مقام کیا ہوتا ہے اور اسلامی ریاست ان کے حقوق کی پاسداری کی کس طرح پابند ہوتی ہے۔ اگر کوئی اسلامی ریاست غیر مسلم رعایا کے حقوق کا پاس کرتی ہے تو از روئے اسلام یہ اس کی ذمہ داری ہے نہ کہ کوئی احسان۔ اور اگر اس معاملے میں کوئی کوتاہی کرے گی تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں جوابدہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے خلیفہ راشد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی مجوسی کے ہاتھوں زخمی اور پھر شہید ہونے کے باوجود اپنی شہادت سے قبل اپنے بعد آنے والے خلیفۃ المسلمین کو جو وصیتیں فرمائیں، ان میں ایک نمایاں اور تاکیدی وصیت یہ بھی تھی کہ

واوصیه بذمة الله وذمة رسوله ﷺ ان یوفی لهم بعهدهم وان یقاتل من وراءهم ولا یکلفوا فوق طاقتهم۔[1]

---

[1]- ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمان الخ) ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی ۱/۵۲۳، رقم الحدیث ۳۷۰۰؛ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم (م۱۸۲ھ) کتاب الخراج (مشمولہ در موسوعۃ الخراج) دار المعرفۃ بیروت، لبنان، ۱۳۹۹ھ، ۱۹۷۹ء، ص:۱۴؛ یحیی ابن آدم القرشی (م۲۰۳ھ)، کتاب الخراج، دار المعرفۃ بیروت، لبنان، ۱۳۹۹ھ، ۱۹۷۹ء، ص:۷۴-۷۵؛ ابو عبید قاسم بن سلام (م۲۲۵ھ) کتاب الاموال، مؤسسۃ ناصر للثقافۃ بیروت، ۱۹۸۱ء، ص:۶۲ (پیرو ۳۳۴)

اور میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ وہ اہل الذمہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرے جس کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ذمہ داری ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے تحفظ کی خاطر جنگ کی ضرورت پیش آئے تو جنگ سے بھی دریغ نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ انہیں کسی ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو ان کی طاقت سے باہر ہو۔

ہم جب انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دنیا میں سلطنتوں، ریاستوں اور حکومتوں کے قیام کا مقصد زیادہ تر ملک گیری، حدود سلطنت کی توسیع، ہوس اقتدار کی تکمیل، وسائل پر قبضہ، قومی، نسلی اور وطنی تعصبات یا انتقام کی تسکین، مجبور و مقہور اور مفتوح اقوام کا استیصال، خاندانی عظمت کا اظہار، ذاتی بادشاہت کا استحکام جیسے گھٹیا عارضی اور وقتی مفادات کا حصول رہا ہے۔ جبکہ اسلامی ریاست جیسا کہ آگے آئے گا، بڑے بلند مقاصد، محض انسانی فلاح و بہبود کے حصول، عدل اجتماعی، ظلم و ناانصافی کے خاتمہ اور خدائی سلطنت کے قیام کی خاطر معرض وجود میں آتی ہے۔ اس حوالے سے معروف سیرت نگار سید سلیمان ندوی کا تجزیہ قابل ملاحظہ ہے، فرماتے ہیں:

> دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے۔ مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمح نظر نہ تھی۔ نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری نہ خاندان قریش کی بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ صرف ایک شہنشاہ ارض و سماء کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمان الٰہی کے آگے سارے بندگان الٰہی کی سرافگندگی۔ دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا

گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی وسماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو۔[1]

اسلامی ریاست کے قیام اور اسلامی جہاد کی بنیادی غرض وغایت کی صحیح معنوں میں وضاحت اس جرأت مندانہ مکالمہ سے ہوتی ہے جو عہد فاروقی میں جنگ قادسیہ کے وقت سفیر اسلام حضرت ربعی بن عامرؓ اور مشہور ایرانی سپہ سالار رستم کے درمیان پیش آیا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ رستم کے خلاف صف آراء تھے تو رستم کی خواہش پر مذاکرات کے لیے ایک سفیر اس کے دربار میں بھیجا گیا۔ یہ اسلامی سفیر حضرت ربعیؓ بن عامرؓ تھے۔ یہ سفیر کس کمال بے نیازی، بے دھڑک انداز اور حد درجہ دلیری کے ساتھ رستم کے مرصع تخت شاہی تک پہنچے۔ وہ ایک الگ ایمان افروز داستان ہے جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔ بہرکیف رستم نے اسلامی سفیر حضرت ربعی بن عامرؓ سے پوچھا: "تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟" حضرت ربعیؓ نے جواب دیا:

> الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله وحده ومن ضيق الدنيا الى سعتها ومن جور الاديان الى عدل الاسلام الخ۔[2]
>
> اللہ نے ہمیں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم بندگان خدا کو جنہیں وہ چاہے بندوں کی بندگی سے نکال کر اکیلے اللہ کی بندگی کی طرف لے آئیں اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف اور دیگر ادیان (نظامہائے حکومت) کے ظلم سے نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔

---

[1] - سیرۃ النبیؐ، الفیصل، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۷/۴۳

[2] - دیکھیے: ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل (م ۷۷۴ھ)، البدایہ والنہایہ، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۷/۳۹؛ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ)، تاریخ الطبری، دار المعارف، مصر، ۱۹۶۲ء، ۳/۵۲۰

اسلامی ریاست کے اہداف ومقاصد

ایک اسلامی ریاست کے قیام کے اہداف و مقاصد کیا ہوتے ہیں؟ قرآن مجید نے اپنے معجزانہ ایجاز و اختصار اور فصیح و بلیغ انداز میں دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے ان کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ[1]

وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہے سارے کاموں کا انجام۔

اس آیت نے بڑی جامعیت کے ساتھ اسلامی ریاست و حکومت کے اہداف ومقاصد کی نشاندہی کر دی ہے۔ نماز تمام حقوق اللہ اور زکوٰۃ سے تمام حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح معروف میں دین و دنیا اور معاشرتی اعتبار سے ہر نیکی و بھلائی کا حکم جبکہ منکر میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی برائی اور شر کے انسداد کا حکم آگیا ہے۔

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول نہ مال غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب مقصود، نہ عیش و عشرت مطلوب اور نہ شان و شوکت اور شاہانہ کر و فر کا اظہار بلکہ سراسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجاآوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت ذمہ داری کا نام ہے۔ چنانچہ مولانا حامد الانصاری نے اسلامی حکومت کا تعارف یوں کرایا ہے۔

دنیا میں سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو خداوند عرش کے قوانین کی تعمیل کرے جو سب سے زیادہ انسانوں کی بہتری کا کام انجام دے جس کا مدار اللہ کے پسندیدہ اصولوں پر ہو جو انسانی فطرت اور قدرت کے ابدی قوانین سے مکمل مطابقت پیدا کر سکیں۔

---

[1] - الحج، ۲۲:۴۱

جس کے اصولوں اور سیاسی عمال میں عدل و اعتدال اور یکسانیت پائی جائے۔ اس قسم کی حکومت کے قیام کے متعلق اسلام کے علاوہ آج تک کسی مذہب، کسی سوسائٹی اور کسی قوم نے دعویٰ نہیں کیا۔ اسلام اس قسم کا دعوی کرتا ہے اور دنیا کے انسانوں کو اپنے دعوی کی صداقت پر جمع کر سکتا ہے۔ جو مثالی، معیاری اور اچھی حکومت کے طالب ہوں۔ عالمگیر امن اور عالمگیر بہتری کے لیے تڑپ رکھتے ہوں اور ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی تعصبات سے پاک وصاف ہو کر اس کے دعویٰ کی تنقیح کے لیے آگے آئیں۔[1]

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی محمد بن یوسف (م ۷۴۵ھ) نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

وفی الآیة اخذ العهد علیٰ من مکنه الله ان یفعل مارتب علی التمکین فی الآیة۔[2]

اس آیت کریمہ میں اس امر کا عہد وپیمان لیا گیا ہے کہ اللہ کریم جس آدمی کو حکومت عطا فرمائے گا۔ وہ ان چار احکام و فرائض پر عمل پیرا ہو گا جن کا آیت میں اقتدار کی صورت میں بجالانا بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب (م ۱۳۹۶ھ) نے آیت ہذا کا شان نزول بیان کرتے اور اس آیت کو خلفائے راشدینؓ کے حق میں پیشگوئی کا مصداق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

یہ تو اس آیت کے شان نزول کا واقعاتی پہلو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ الفاظ قرآن جب عام ہوں تو وہ کسی خاص واقعہ میں منحصر نہیں ہوتے۔ ان کا حکم عام ہوتا ہے۔ اسی لیے ائمہ تفسیر میں سے ضحاک نے فرمایا کہ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے ہدایت بھی ہے جن کو اللہ تعالیٰ ملک وسلطنت عطا فرمادیں کہ وہ اپنے اقتدار میں یہ کام انجام دیں

---

[1] - اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ الحسن، لاہور، ص: ۵-۶

[2] - البحر المحیط فی التفسیر، دار الفکر، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء، ۵۱۸/۷

جو خلفائے راشدینؓ نے اپنے وقت میں انجام دیے تھے۔[1]

اردو مفسر مولانا عبد الماجد دریابادی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اسلامی حکومت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

یہ ہے اصلی اور سچی تصویر اسلامی طرز حکومت کی۔ گورنمنٹ اگر مسلمانوں، سچے مسلمانوں کی قائم ہو جائے تو مسجدیں آباد و پُر رونق ہو جائیں۔ ہر طرف سے صدائیں تکبیر و تہلیل کی گونجا کریں۔ بیت المال کے بعد کوئی ننگا بھوکا نہ رہ جانے پائے۔ عدالتوں میں انصاف بکنے کی بجائے ملنے لگے۔ رشوت، جعلسازی، دروغ حلفی کا بازار سرد پڑ جائے۔ امیر کو کوئی حق، کوئی موقع غریب کی تحقیر کا، ایذا کا نہ باقی رہ جائے۔ غیبتیں، بدکاری، چوریاں، ڈاکے خواب و خیال ہو جائیں۔ آبکاری کے محکمہ کو کوئی پانی دینے والا بھی نہ رہے۔ مہاجنی کوٹھیوں، سود خوار ساہوکاروں، بینکوں کے ٹاٹ الٹ جائیں۔ گوتے نچنیئے اگر تائب نہ ہوں، شہر بدر کر دیے جائیں۔ سینما، تھیٹر، تمام شہوانی تماشہ گاہوں کے پردوں کو آگ لگا دی جائے۔ گندہ فحش افسانہ و شاعری کی جگہ صالح و پاکیزہ ادبیات، غرض یہ کہ دنیا، دنیا رہ کر بھی نمونہ جنت بن جائے۔[2]

اس آیت کریمہ کی وضاحت میں سید مودودیؒ (م ۱۳۹۹ھ) نے لکھا ہے:

اس آیت میں اسلامی حکومت کے مقصد وجود اور اس کے بنیادی فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔ کافر حکومتوں کی طرح اس کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے اندرونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کرے اور ملک کی مادی خوشحالی کے لیے ساعی ہو بلکہ ایک اسلامی حکومت ہونے کی حیثیت سے اس کا اولین فریضہ یہ ہے کہ نماز اور زکوۃ کا نظام قائم کرے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول ﷺ بھلائی قرار دیتے ہیں۔ اور ان برائیوں کو روکے جسے خدا اور رسول ﷺ برائی کہتے ہیں۔ کوئی ایسی حکومت اسلامی

---

[1] - معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی طبع جدید ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء، ۶/ ۲۷۱

[2] - تفسیر القرآن، تاج کمپنی لاہور، ت۔ن، ص: ۶۸۶ (تحت آیت)

حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جو اس بات سے بے پرواہو کہ نماز قائم ہو رہی ہے یا نہیں، زکوۃ دی جا رہی یا نہیں، بھلائیاں پھیل رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں اور برائیاں دب رہی ہیں یا ابھر رہی ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس کے حدود میں زنا، شراب، قمار بازی، فحش لٹریچر، فحش تماشوں، فحش گانوں، مخلوط تعلیم، تبرج جاہلیت اور اختلاط مرد و زن کا عام رواج ہو اور ان صریح منکرات پر کوئی قدغن نہ ہو پس ایک اسلامی دستور میں لازماً ریاست کو ان فرائض کا پابند ہونا چاہیے جنہیں قرآن اس کے بنیادی فرائض میں شمار کرتا ہے۔[1]

[1] - اسلامی ریاست، ص:۳۸۰-۳۸۱؛ اسلامی ریاست کے مقصد وجود پر مولانا مودودیؒ نے "خلافت وملوکیت" میں مدلل اور تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دیکھیے: خلافت وملوکیت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۷۵-۷۶

دوسری فصل

حکومت اور رعایا کے تعلق کی نوعیت

ایک اسلامی حکومت جو دنیا کی دیگر حکومتوں کے برعکس اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے خلافت (نیابت الٰہی) کہلاتی ہے، اس کے درمیان اور اس کی رعایا کے درمیان تعلق و رشتہ کس نوعیت اور کن جذبات واحساسات پر مبنی ہوتا ہے، اس کا اندازہ "خلیفہ" اور "رعایا" کے الفاظ کے مفہوم و معنی پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں علم سیاست کے کسی ماہر یا سیاسی مصطلحات کے کسی عالم کی بجائے معروف صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کی زبانی خلیفہ اسلام کی پہچان بتائے دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

ان الخلیفة ھوالذی یقضی بکتاب اللہ ویشفق علی الرعیة شفقة الرجل علیٰ اھلہ فقال کعب الاحبار صدق۔[1]

بے شک خلیفہ (اسلامی ریاست کا حکمران) وہ ہوتا ہے جو کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق فیصلہ کرے اور اپنی رعایا/عوام پر اسی طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سن کر کعب احبار نے کہا انھوں نے واقعی سچ کہا۔

اسلامی حکومت یا حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان کمال ہمدردی اور خیر خواہی کے تعلق اور خلیفہ کی ذمہ داری کے حوالے سے مشہور تابعی حضرت ابو مسلم خولانیؒ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان درج ذیل مکالمہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ ابن تیمیہؒ (م۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:

حضرت ابو مسلم خولانیؒ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس آئے تو سلام کے طور پر کہا: السلام علیک ایھا الاجیر (اے مزدور تمہارے اوپر سلامتی ہو) لوگوں

[1] ۔ ابو عبید قاسم بن سلام (م۲۲۴ھ)، کتاب الاموال، مؤسسۃ ناصر الثقافۃ، بیروت۔ لبنان، ۱۹۸۱ء، ص۱۹۰

(درباریوں) نے کہا حضرت! "السلام علیک ایھا الامیر" کے الفاظ سے سلام کہیں۔ آپ نے پھر کہا "السلام علیک ایھا الاجیر" تو لوگوں نے کہا: ایھا الامیر کے الفاظ سے سلام کریں۔ آپ نے تیسری بار بھی "السلام علیک ایھا الاجیر" ہی کے الفاظ سے سلام کیا۔ لوگوں نے کہا کم از کم امیر ہی کہہ دیں۔ اس پر امیر معاویہؓ نے کہا لوگو! ابو مسلم کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے بخوبی جانتے ہیں۔ حضرت ابو مسلمؒ نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ آپ اجیر (مزدور) ہیں جن بھیڑ بکریوں (رعایا) کی حفاظت و نگرانی کے لیے ان کے مالک (باری تعالیٰ) نے تمہیں اجرت پر رکھا ہے۔ اگر تم نے ان میں خارش زدہ بکریوں کے زخموں پر مرہم رکھا اور بیماریوں کا علاج کیا اور تم نے اول سے لے کر آخری تک کو اپنی جگہ پر روک رکھا یعنی ان کی پوری طرح نگرانی کی اور انہیں بھیڑیے وغیرہ سے بچا کر رکھا) تو ان کا مالک تمہیں پورا پورا اجر دے گا اور اگر تم نے ان کی خارش زدوں کے زخموں پر مرہم نہ رکھا اور بیمار بکریوں کا علاج نہ کیا اور تمام بکریوں کی حفاظت و نگرانی نہ کی تو ان کا مالک (باری تعالیٰ) تمہیں سزا دے گا۔

لفظ راعی اور رعایا کی تشریح

اسی طرح لفظ رعیت اور رعایا کی تشریح و تحقیق بھی بڑی حد تک اسلامی حکومت اور رعایا کے درمیان تعلق کی نوعیت واضح کر دیتی ہے۔ سید سلیمان ندویؒ نے بڑی عمدہ تحقیق لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں۔ یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی

- دیکھیے: السیاسیۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، ص:۳؛ الاصبہانی، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ، حلیۃ الاولیاء، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۳۵۱ھ، ۱۹۳۳ء، ۱۲۵/۲

تربیت، پرورش، نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو۔تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے۔ درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور ﷺ کی زبان مبارک پر لفظ رعیت کس قدر شفقت آمیز اور پر محبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے۔[1]

شریعت اسلامیہ میں رعیت کا مفہوم اس سے قطعاً جداگانہ ہے جو آج کل سیاسیات اور قانون میں سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ سیاسیات و قانون میں رعیت انگریزی لفظ "Sujbect" کا ترجمہ ہے جو انسانی حکومت اور خدا دونوں کے مقابلہ میں مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ اور ایک حد تک عربی لفظ "عبد" یا اردو لفظ "بندے" کے مترادف ہے۔ اس معنٰی کے لحاظ سے اسلام کسی انسان کو کسی انسان کی رعیت قرار نہیں دیتا۔ ان معنوں میں انسان صرف اور صرف اللہ کی رعیت ہے نہ کہ کسی انسان یا حکمران کی۔ رعایا کو غلام یا عبد سمجھنا "فرعونی سیاست" کا اصول ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے فرعون کے درباریوں کی زبانی اس چیز کا اظہار کرایا:

فَقَالُوٓا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ۔[2]

تو وہ بولے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں درانحالیکہ ان کی قوم ہماری محکوم و غلام ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس فرعونی ذہنیت کو فرعون کے ساتھ مکالمہ میں یوں بیان کیا ہے: وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِيۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ۔[3]

یہی وہ احسان ہے جس کا بار تو مجھ پر رکھ رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

---

[1] ۔ سیرۃ النبی، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۷/ ۷۹-۸۰

[2] ۔ المؤمنون، ۲۳: ۴۷

[3] ۔ الشعراء، ۲۶: ۲۲

ایک اسلامی حکمران کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالامیر الذی علی الناس راع وھو مسؤول عن رعیته الخ۔[1]

آگاہ رہو تم میں سے ہر ایک آدمی (اپنی جگہ) نگران / حاکم ہے اور (قیامت کے دن) اس سے اس کی رعیت (ماتحت لوگوں) کے بارے میں باز پرس ہو گی تو (اس قاعدے کے تحت) لوگوں پر امیر / حکمران بھی ایک نگران / چرواہا ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے پوچھا جائے گا۔

شرعی نقطہ نظر سے اگر کوئی آدمی خلیفہ یا امیر کے منصب پر فائز ہوتا ہے اور گزشتہ تفصیل کی رو سے اپنے فرض منصبی کے مطابق رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کرتا ہے نہ ان کی خیر خواہی کرتا ہے تو پیغمبر اکرم ﷺ نے ایسے حکمران کے لئے بڑی وعیدیں سنائی ہیں، مثلاً فرمایا:

مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم وینصح الا لم یدخل معھم الجنة۔[2]

جو آدمی مسلمانوں کے معاملے (حکومت) کا والی / حکمران بنے پھر ان کی بہتری کے

---

1 دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الاحکام باب قول اللہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ) ۲/۱۰۵۷، رقم ۱۳۸، علاوہ یہ روایت صحیح بخاری کے کئی اور مقامات پر بھی موجود ہے مثلاً رقم الحدیث، ۸۹۳، ۲۰۹، ۲۵۵۴، ۲۷۵۱، ۵۱۸۸، ۵۲۰۰)؛ مسلم، الجامع الصحیح (مع شرح نووی)، (کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل الخ)، ۲/۱۲۲، رقم ۴۷۲۴؛ ہیثمی، مجمع الزوائد منبع الفوائد، (کتاب الخلافۃ باب کلکم راع ومسئول)، دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۹۶۷ء، ۵/۲۰۷؛ ابوداؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب ما یلزم الامام من حق الرعیۃ)، ۲/۵۸، رقم ۲۹۲۸؛ ابوعوانہ، مسند (کتاب الامراء)، ۴/۳۸۴-۳۸۵ (الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ متعدد طرق سے مروی)؛ ابوعبید، کتاب الاموال (معرب)، ص۹ (پیرہ نمبر ۳)

2 دیکھیے: مسلم، الجامع الصحیح (مع شرح نووی) (کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامیر العادل وعقوبۃ الجائر والحث علی الرفق بالرعیۃ والنہی عن ادخال المشقۃ علیھم)، ۲/۱۲۲ رقم الحدیث ۴۷۳۱؛ ابوعوانہ، مسند (کتاب الامراء)، دارالمعرفۃ بیروت، ۴/۳۸۶، رقم: ۷۰۴۳

اس کے ذریعے (دشمن و دیگر مصائب سے) بچا جاتا ہے۔ پس اگر وہ خوف خدا کا حکم دے اور عدل وانصاف سے کام لے تو اس کے لیے اس پر بہت اجر ہے اور اگر اس کے برعکس کرے تو اس پر اس خلاف ورزی کا گناہ ہو گا۔

المختصر اسلام میں حاکم اور عوام کے تعلق کی نوعیت عام معنوں میں حاکم اور محکوم کی نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کی ہے۔ جس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں آجائے گی۔

روایت امام حاکم اور امام ترمذی بھی لائے ہیں۔[1]

کسی بھی ریاست کا داخلی و خارجی استحکام، معاشرتی امن و امان، معاشی و اقتصادی ترقی، صنعت و حرفت کا فروغ، علوم و فنون کی ترویج، رسل و رسائل کی سہولتیں اور ملکی ترقی کے لیے دیگر زیادہ تر منصوبوں کا دارومدار چونکہ حکمرانوں اور رعایا کے درمیان باہمی مخلصانہ ہمدردانہ اور خواہانہ تعلق پر ہے اس لیے پیغمبر اسلام ﷺ نے ترغیب و ترہیب کا انداز اپناتے ہوئے مذکور دونوں طبقوں خصوصاً حکمران کو رعایا کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی اور عدل و انصاف کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان من احب الناس الی واقربهم منی مجلسا یوم القیامة امام عادل وان ابغض الی یوم القیامة واشدهم عذابا امام جائر۔[2]

بے شک قیامت کے دن سارے لوگوں میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور قریب تر امام عادل اور سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ عذاب پانے والا آدمی (رعایا پر) ظلم کرنے والا امام ہو گا۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به فان امر بتقوی الله وعدل فان له بذالک اجراً وان اتی بغیرہ فعلیه اثمه۔[3]

بے شک امام (حکمران رعایا کے لیے) ایک ڈھال ہے جس کے پیچھے جنگ کی جاتی اور

---

[1] دیکھیے: ترمذی، جامع (ابواب الاحکام باب ماجاء فی امام الرعیة) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱/ ۳۸۰ رقم: ۱۳۳۲؛ حاکم نیشاپوری، ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، (کتاب الاحکام)، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۰ء، ۴/ ۱۰۵

[2] امام ابو یوسف، کتاب الخراج، دار المعرفة، بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص:۸

[3] حوالہ مذکور، ص:۹

اس کے ذریعے (دشمن و دیگر مصائب سے) بچا جاتا ہے۔ پس اگر وہ خوف خدا کا حکم دے اور عدل و انصاف سے کام لے تو اس کے لیے اس پر بہت اجر ہے اور اگر اس کے برعکس کرے تو اس پر اس خلاف ورزی کا گناہ ہو گا۔

المختصر اسلام میں حاکم اور عوام کے تعلق کی نوعیت عام معنوں میں حاکم اور محکوم کی نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کی ہے۔ جس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں آجائے گی۔

تیسری فصل

اسلامی ریاست اور رعایا کے تعلقات کے بنیادی اصول

قرآن و حدیث، تعلیمات نبوی، اسوۂ رسول، خلفاء راشدین کے طرز عمل اور علماء و فقہاء کے اقوال سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کسی متعین اور لگے بندھے مصطلع سیاسی نظام کا پابند نہیں بنایا۔ حالات اور زمانے کے تقاضے کے مطابق نظام خلافت کے علاوہ کسی دوسرے نظام حکومت کو بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ تاہم ضروری ہے کہ وہ نظام حکومت چند اساسی اصولوں کا پابند ہو ورنہ وہ ریاست ایک اسلامی ریاست نہیں کہلا سکے گی۔ چنانچہ مولانا حنیف ندوی نے خلفاء راشدین کے طرز حکومت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> اس لیے حکومت کے آئین، اسلوب اور شکل و صورت کا مسئلہ زیادہ اہم نہیں۔ اصل اہمیت اس شے کو حاصل تھی کہ معاشرہ میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ تقوی اور پرہیزگاری کا چرچا ہو۔۔۔۔ ان میں کوئی شخص حسب نسب کی خوبی اور مال و دولت کے امتیازات کی وجہ سے معاشرہ میں اونچا اور سربلند نہ ہو۔ سب کو ایک ہی ترازو اور معیار سے جانچا پرکھا جائے کہ ان میں کون شخص خدا سے زیادہ ڈرتا ہے۔ کون زیادہ بنی انسان کے کام آتا ہے۔ اور کون وہ ہے جو کتاب و سنت کی روح کو زیادہ سمجھتا، بوجھتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ سیاسیات کے نقطۂ نظر سے اسلامی معاشرہ کو کیا اسلوب و انداز اختیار کرنا چاہیے تو اس کا تعلق حالات کے ارتقاء سے ہے۔[1]

بہرکیف اسلام نے نظام حکومت اور رعایا کے ساتھ تعلقات اور برتاؤ کے حوالے سے اسلامی

---

[1] - اساسیات اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۱۷۵ (باب نمبر ۷: اسلام اور اس کی سیاسی قدریں)

ریاست کو بعض اصولوں کا پابند بنایا ہے، وہ کسی صورت ان اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتی۔ حکومت اور رعایا کے درمیان کسی قسم کا سیاسی اور نظریاتی اختلاف ان بنیادی اصولوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ کوئی حکمران اپنے حکومتی اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان اصولوں کو پامال نہیں کر سکتا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اس پر لازم ہے کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان اصولوں پر کاربند رہے۔ بصورت دیگر وہ حکمران اسلامی حکمران اور وہ ریاست اسلامی ریاست کہلانے کی مستحق نہیں۔

چونکہ انہی اصولوں پر ہمارے زیر تحقیق موضوع کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس لیے آئندہ سطور میں ہم ان اساسی اصولوں میں سے صرف چند ایک ان بنیادی اور لازمی اصولوں کی نشاندہی کریں گے جن کا تعلق مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کے بغیر تمام رعایا بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ ہے۔

پہلا اصول: تصور حاکمیت الہیہ

اقوام عالم کی تاریخ اور عام مشاہدہ اور حالات حاضرہ اس بات کی بین دلیل ہیں کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ لوگوں کے بنیادی حقوق کی پامالی اور غصب اور ان پر ظلم و زیادتی اور استحصال میں سب سے بڑا ہاتھ دوسرے لفظوں میں تمام فسادات اور خرابیوں کی جڑ حکومت، ریاست، پارلیمنٹ یا حکمران وقت کا اپنے آپ کو معبود و الہ یعنی حاکم اعلیٰ اور مقتدر اعلیٰ تصور کرنا اور اس تصور کے مطابق شہریوں / رعایا سے معاملہ کرنا ہے۔ اس لیے اسلام نے انسانی الوہیت کی تمام شکلوں کی نفی کی ہے۔ کسی شخص یا ادارے کا اپنے آپ کو الہ یعنی حاکم اعلیٰ یا حقیقی حاکم و مقتدر اعلیٰ سمجھنے کا مطلب مولانا مودودی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> اس کا حکم قانون ہے، اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں، افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں خواہ بطوع و رغبت یا بکراہت، اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے، افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں۔ جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں، اسی کے دیے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو بھی سلب کرے وہ آپ سے آپ

معدوم ہو جاتا ہے۔[1]

اسلام نے سب سے پہلے اسی تصور حاکمیت اور فساد کی جڑ پر کاری ضرب لگائی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں حاکمیت اعلیٰ یا حکم کے اختیار کو اللہ کی ذات میں "محصور" کرتے ہوئے حصر کے انداز بیان میں فرمایا گیا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔[2]

حکم (حاکمیت) نہیں ہے مگر رب اللہ کے لیے۔ اسی نے حکم دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی ہے مستقیم (صحیح طریقہ) ہے لیکن لوگوں کی اکثریت (اس بات کا) علم نہیں رکھتی۔

اس مضمون کی قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں جن میں واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی حکمران یا پارلیمنٹ تشریعی اختیار رکھتا ہے نہ تکوینی۔ زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ آخری ہے۔[3]

اسلام میں حکمران کی حیثیت کسی ڈکٹیٹر اور مطلق العنان (بے لگام) بادشاہ کی نہیں ہے کہ اس کی مرضی اور حکم کو قانون کا درجہ حاصل ہو۔ اسی طرح جمہور / رعایا کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت آقا و غلام کے درمیان تعلق کی مانند نہیں کہ کسی آدمی کو اس کے سامنے غلام کی طرح دم مارنے کی مجال نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت ایک "امین" کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۔[4]

---

[1] ۔اسلامی ریاست، ص:۳۱۳

[2] ۔سورہ یوسف، ۱۲:۴۰

[3] ۔دیکھیے: سورۃ الاعراف، ۷:۵۴، سورۃ آل عمران، ۳:۲۶، المائدہ، ۵:۴۴

[4] ۔النساء، ۴:۵۸

بے شک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو۔

آیت میں "امانت" سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی کے سپرد ہوں اور تمام حقوق واجبہ ہیں خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے۔ علامہ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وھذا یعم جمیع الامانات الواجبة علی الانسان من حقوق اللہ علی عبادہ ۔۔۔۔ ومن حقوق العباد بعضھم علی بعض۔[1]

یہ حکم انسان پر واجب تمام امانات کو شامل ہے۔ ان کا تعلق بندوں پر اللہ کے حقوق سے ہو یا بندوں کے ایک دوسرے پر واجب باہمی حقوق سے ہو۔

اس آیت کے ضمن میں حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں:

ان ھذا الخطاب لولاۃ الامر ان یقوموا برعایة الرعیة وحملھم علی موجب الدین والشریعة وعدوا من ذالک تولیة المناصب مستحقیھا۔[2]

یہ خطاب الٰہی (بطور خاص) حاکموں کے لیے ہے کہ وہ جملہ امور میں رعایا کے مفاد کی حفاظت کریں اور انہیں دین و شریعت کے مقتضیات کا پابند بنائیں۔ مزید برآں لفظ امانت میں عہدے بھی شامل ہیں کہ وہ صرف (اہلیت و صلاحیت کی بنا پر) مستحقین کو دیے جائیں۔

ازروئے قرآن انسان کی تخلیق حاکمیت و فرمانروائی کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی عبادت کے لیے ہے۔[3] یہاں بندگی یا عبادت کا مطلب فقہ کی کتاب العبادات والی عبادات پنجگانہ اور تسبیح و تہلیل ہی مراد نہیں بلکہ

---

[1] ۔ تفسیر القرآن العظیم، میر محمد کتب خانہ، کراچی، ۱/ ۵۶۴

[2] ۔ آلوسی، روح المعانی، مکتبہ امدادیہ ملتان، ۵/ ۶۴

[3] ۔ سورۃ الذریٰت ۵۱: ۵۶ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ)

علامہ رازیؒ (م ۶۰۶ھ) کے مطابق اس سے مقصود "التعظيم لامر الله والشفقة على خلق الله"[1] (اللہ کی تعظیم بجالانا اور خلق خدا پر شفقت کرنا) ہے۔ گویا زندگی کے تمام معاملات میں صرف ایک خدا کی کامل اطاعت سے فرمانبرداری اور اسی کے احکام کی بجا آوری کا نام عبادت / بندگی ہے۔ جناب صلاح الدین کے الفاظ میں:

> اس حقیقت بندگی کو نظر انداز کرنے کا مطلب انسان کا خود اپنی ذات اور اپنی فطرت سے باغی ہو جانا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود اپنی خدائی کا مدعی بن بیٹھے یا اپنا سر کسی جھوٹے خدا کے سامنے جھکا دے۔ انسان جونہی بغاوت کی اس راہ پر قدم بڑھاتا ہے اس کی ذات کے عالم میں فساد کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ نے چونکہ تمام انسانوں کو ایک فطرت پر پیدا کیا ہے اس لیے کسی کا حاکم بن جانا اور کسی کا محکوم ہو جانا دونوں ہی صورتیں خلاف فطرت ہیں۔ حاکمیت خواہ بادشاہ اور آمر کی صورت میں کسی ایک فرد کی ہو، پارلیمنٹ کی صورت میں بہت سے منتخب افراد کی۔ کسی ایک ریاست کے شہریوں کی ہو یا بحیثیت مجموعی پوری دنیا کے عوام کی۔ ظلم ہر صورت میں سر ابھار کر رہے گا کیونکہ انسان کی حاکمیت ہر انفرادی و اجتماعی شکل میں ایک ایسے مقتدر اعلیٰ کو وجود میں لے آتی ہے جو حقیقی مقتدر اعلیٰ کی جگہ نہیں لے سکتا اور یہی فساد فی الارض کی اصل جڑ ہے۔[2]

قرآن مجید نے "ان الحكم الا لله" (حکم نہیں ہے مگر اللہ کے لیے) کا اعلان کر کے اسلامی ریاست میں انسانی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ اور مقتدر اعلیٰ تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں حاکم و محکوم کی تقسیم اور درجہ بندی ختم ہوئی۔ ادنی شہری سے لے کر خلیفة المسلمین تک سب مساوی الحیثیت قرار پائے۔ اسلام میں یہ تصور حاکمیت انسانی حقوق کے بارے میں

---

[1] ۔ تفسیر کبیر، مکتبہ علوم اسلامیہ، لاہور، (الطبعة الرابعة)، ۱۰/ ۱۹۳ (سورۃ الذاریات)

[2] ۔ بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۲۰

حکومت کا رویہ یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اسی تصور حاکمیت کا نتیجہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نے کہا تھا:

لو مات جمل ضیاعًا علیٰ شط الفرات لخشیت ان یسألنی اللہ۔[1]

اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے باز پرس فرمائے گا۔

جبکہ ایک دوسری روایت میں اخروی باز پرس کا یہ احساس آپ نے ایک بکری کے بے سہارا مرنے پر ظاہر فرمایا۔[2]

اس روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو خلیفہ جانوروں کے معاملے میں اتنا متفکر تھا اپنی انسانی رعایا کے حقوق کے بارے میں اس کے احساس و فکر کا کیا عالم ہو گا۔ اسی طرح امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارے ان کی اہلیہ محترمہ کی چشم دید گواہی ہے کہ:

> اللہ کی قسم میں نے کسی بندہ خدا کو عمر بن عبد العزیزؒ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے جسم اور ذات کو لوگوں اور عوام کے لیے فارغ (وقف) کر رکھا تھا۔ وہ دن بھر لوگوں کی حاجات کے لیے بیٹھے رہتے۔ اگر دن گزر جاتا اور ابھی لوگوں کے کام باقی رہ جاتے تو وہ رات میں بھی لگے رہتے۔ ایک دن یوں ہوا کہ لوگوں کی حاجات سے دن ہی دن میں فارغ ہو گئے تو شام کو ایک چراغ منگوایا جسے وہ اپنے ذاتی تیل سے جلایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے دو رکعت نماز نفل ادا کی اور اپنا ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسی حال میں سیدھے بیٹھے رہے کہ آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہتی رہیں اور ساری رات یوں ہی بیٹھے روتے رہے حتیٰ کہ سپیدہ سحر نمودار ہوا تو انہوں نے روزے کی نیت کر لی۔ میں (بیوی فاطمہ) نے ان سے پوچھا: امیر المؤمنین رات کس وجہ سے آپ یوں بیٹھے روتے رہے؟ انہوں نے بتایا: ہاں میرا حال یہ ہے کہ

---

[1] - دیکھیے: ابن سعد، الطبقات الکبری، ۳/۳۰۵؛ طبری، تاریخ (ذکر بعض سیرہ۔ السنۃ الثالثۃ والعشرون)، ۳/۵۷۹

[2] - ابن جوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۶۴ھ، ص: ۱۶۱

میں اسود و احمر تمام امت مسلمہ کا والی بنایا گیا ہوں، مجھے ملک کے دور دراز علاقوں میں پڑے ہوئے غرباء و مساکین، فقراء، محتاج، قیدیوں اور ان جیسے مقہور و مظلوم لوگوں کی یاد آئی تو مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے بارے مجھ سے ضرور سوال کرے گا اور نبی اکرم ﷺ ان کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا فرمانے والے ہوں گے تو میں اس بات سے ڈر گیا کہ اس وقت اللہ کے سامنے کوئی عذر نہیں چل سکے گا اور نہ حضور ﷺ کے سامنے کوئی حجت پیش کر سکوں گا۔ یہ سوچ کر میں ڈر گیا اور رونے لگ گیا۔[1]

انسانی حقوق کی ادائیگی کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی فکر مندی اور احساس پر مشتمل ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

جب لوگوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بیعت کی اور ان کی خلافت قائم ہو گئی تو وہ اس حال میں گھر لوٹے کہ بڑے غمزدہ اور فکر مند تھے۔ ان کے غلام نے ان سے کہا۔ کیا وجہ ہے کہ آپ اس طرح غمزدہ اور فکر مند ہیں حالانکہ یہ وقت غم و الم اور رنج و فکر کا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا: اللہ تجھ پر رحم فرمائے، میں کیوں غمزدہ اور فکر مند نہ ہوں جبکہ مشرق و مغرب میں رہنے والا امت مسلمہ کا ہر شخص مجھ سے مطالبہ کر رہا ہے کہ میرا حق ادا کرو۔ خواہ اس نے اپنے حق کے بارے میں مجھے لکھا ہے یا نہیں۔[2]

دوسرا اصول: تکریم انسانیت

تمام انسانی حقوق کی بنیاد چونکہ انسان کی تعظیم و تکریم کے نظریے پر منحصر ہے۔ جب تک دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کے شرف و اکرام کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک انسانی حقوق کا احترام اور ان کی ادائیگی کماحقہ روبہ عمل نہیں لائی جا سکتی۔ اس لیے اسلامی ریاست اور رعایا کے تعلقات

---

[1] -ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۶-۱۷

[2] -البدایہ والنہایہ، (ترجمہ عمر بن عبدالعزیز)، المکتبہ الحقانیہ، پشاور، ۹/ ۲۳۳

کے اساسی، بنیادی اور لازمی اصولوں میں ایک اہم اصول یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں ہر انسان چاہے وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، گورا ہے یا کالا، عربی ہے یا عجمی، انسان ہونے کی حیثیت سے انتہائی تعظیم وتکریم کا مستحق ہے۔ تعظیم وتکریم کا یہ تاج خود خالق کائنات نے اس کی تخلیق کے وقت سے اس کے سر پر سجایا اور بیشتر مخلوقات سے اسے افضل قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔[1]

اور ہم نے بنی آدم کو (عقل و علم دے کر) عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور سمندر (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔

امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی موت سے نجس نہیں ہو جاتا۔

ولذا استدل الامام الشافعی بالآیة علیٰ عدم نجاسة الآدمی بالموت۔[2]

جبکہ علامہ شامیؒ (م ۱۲۵۲ھ) کا کہنا ہے: "والآدمی مکرم شرعاً ولو کافراً"[3] (آدمی شرعی اعتبار سے قابل احترام وتکریم ہے چاہے وہ کافر ہی ہو)۔ غیر مسلم عقیدے کے اعتبار سے ناپاک ہے مگر آدمیت وانسانیت کے لحاظ سے قابل احترام ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی تعظیم وتکریم کا حکم نہیں دیا بلکہ اس مہتم بالشان کام کو اپنی طرف منسوب کر کے احترام وتکریم آدمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ اب جس

---

1 ۔ بنی اسرائیل، ۱۷: ۷۰

2 ۔ آلوسی بغدادی، روح المعانی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۵/ ۱۱۸

3 ۔ ردالمحتار، (کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب الآدمی مکرم شرعاولو کافرا)، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۵/ ۵۸

اولادِ آدم کو خود اللہ تعالیٰ تکریم سے نواز چکا تو شیطان ملعون کے سوا اور کون ہو گا جو اس کی عزت نہیں کرے گا۔ یہ حتمی عظمت ہر انسان کو احترام اور رعایت کا مستحق بناتی ہے۔

آیت ہذا میں بیان کردہ یہ شرف اور عزت و تکریم بحیثیت انسان کے، ہر انسان کو حاصل ہے چاہے مؤمن ہوں یا کافر۔ کیونکہ یہ شرف دوسری مخلوقات، حیوانات، جمادات و نباتات وغیرہ کے مقابلے میں ہے اور یہ شرف متعدد اعتبار سے ہے مثلاً جس طرح کی شکل و صورت، قد و قامت اور ہیئت اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے، وہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں، جو عقل انسان کو دی گئی ہے، جس کے ذریعے سے اس نے اپنے آرام و راحت کے لیے بے شمار چیزیں ایجاد کیں، حیوانات وغیرہ اس سے محروم ہیں۔ علاوہ ازیں اسی عقل سے وہ اللہ و رسول کو پہچان کر اور حسن و قبح کے درمیان تمیز کرنے پر قادر ہے۔ اسی عقل کے ذریعے سے وہ اللہ کی دیگر مخلوقات سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے تابع رکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ[1]

عصر حاضر کے مشہور فقیہ ابو زہرہ نے اسی آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ "قرآن مجید نے تمام بنی نوع انسان کو عزت و تکریم کا مستحق قرار دیا ہے، نسلی و خاندانی اعتبار سے ان کا تعلق چاہے جس نسل سے ہو۔"[2]

اسلام میں احترام آدمیت کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ایک جنازہ دیکھتے ہیں تو اسکے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ تو ایک ذمی / یہودی کا جنازہ ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہ انسان نہیں ہے؟ (الیست نفساً؟)[3] اس کے برعکس آج انسانی حقوق اور

---

[1] ۔ تمام مخلوق میں انسان کی عظمت و فضیلت کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الدمیری، حیاۃ الحیوان الکبری، عبدالحمید احمد حنفی قم، ایران، س۔ن

[2] ۔اصول الفقہ، درالفکر العربی، قاہرہ، ص:۹۳

[3] ۔نسائی، احمد بن شعیب، السنن (کتاب الجنائز باب الامر بالقیام للجنازۃ، القیام للجنازۃ اھل الشرک)، ۱/۲۷۲: ولی الدین ابو عبداللہ الخطیب، مشکوٰۃ المصابیح (باب المشی بالجنازہ) ص:۱۴۷، رقم الحدیث: ۱۶۸۰: صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ یھودی، رقم الحدیث: ۱۳۱۲

انسانیت و تہذیب کے علمبردار انسانی لاشوں پر پیشاب کرتے اور "حسن اخلاق" کے اس مظاہرہ پر مسکراتے بھی ہیں۔[1]

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ایک حدیث میں حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ "کسر عظم المیت ککسرہ حیا" "میت کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ حالت میں اسے توڑنا۔[2] تو یہ بھی احترام آدمیت کے لیے ہے۔ کیونکہ بالعموم مردہ انسان کے بارے یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ کون سا دیکھتا سنتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے اس تصور کی نفی فرمائی۔ فقہاء اسلام نے احترام آدمیت کو یہاں تک ملحوظ رکھا ہے کہ "اگر کوئی آدمی موتی نگل لے پھر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کا بطن چیر کر موتی نہیں نکالا جائے گا" "لان حرمة الآدمی اعظم من حرمة المال" کیونکہ آدمی کی حرمت مال کی حرمت سے کہیں زیادہ ہے۔[3] اسی طرح اگر کوئی آدمی بلا کفن و غسل دفنا دیا جائے تو اس کی قبر کھود کر اسے غسل کفن نہیں دیا جائے گا بلکہ بغیر نکالے اس کی قبر پر ہی جنازہ پڑھ لیا جائے گا تا کہ اس کی پردہ دری نہ ہو۔[4] عین میدان جنگ میں کسی دشمن قوم کے مقتول آدمی کے مثلہ (اعضاء بدن کاٹ دینا اور چہرہ مسخ کر دینا) سے ممانعت نبوی بھی اسی احترام آدمیت کے باعث ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن حصینؓ سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ ينهانا عن المثلة۔[5]

(رسول اللہ ﷺ ہمیں مثلہ سے منع فرمایا کرتے تھے)

اسی طرح انسان کے چہرے جو انسانی بدن میں سب سے زیادہ محترم عضو ہے، پر مارنے سے

---

[1] - دیکھیے: روزنامہ اساس لاہور، مؤرخہ ۱۴ جنوری ۲۰۱۲ (کالم سوچ بچار)

[2] - خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح، باب دفن المیت، الفصل الثانی ص: ۱۴۹، رقم الحدیث: ۱۶۱۶؛ اخرجہ ابوداؤد فی السنن، رقم ۳۲۰۷ وابن ماجہ: ۱۶۱۶

[3] - ابن نجیم، الاشباہ والنظائر (مع شرح حموی)، ۱/ ۲۶۰ (پیرہ نمبر ۵۹۵)

[4] - حوالہ مذکور، ۱/ ۲۵۲ (پیرہ نمبر ۵۷۰)

[5] - ابوداؤد، السنن، کتاب الجہاد، باب فی النہی عن المثلۃ)، ۲/ ۱۴، رقم: ۲۶۶۷

حضور ﷺ نے جو منع فرمایا تو وہ بھی اسی تکریم آدمیت کے نقطہ نظر سے ہے۔[1]

انسانی نفسیات اور فطرت کے لحاظ سے ہر انسان عرفی، معاشرتی، خاندانی اور نسلی اعتبار سے چاہے جتنا چھوٹا اور مالی اعتبار سے جتنا کمزور ہو، انسان ہونے کے ناطے جہاں وہ جیسا کہ ابھی گزرا، ازروئے قرآن انتہائی تعظیم و تکریم کا مستحق ہے وہاں وہ کچھ باطنی جذبات و احساسات کا حامل ہونے کے باعث ایک عزت نفس بھی رکھتا ہے۔ پھر یہ عزت نفس ہر باغیرت آدمی کے نزدیک خواہ وہ امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا، افسر ہو یا ماتحت، مسلم ہو یا غیر مسلم طبعی و فطری طور پر بڑی محبوب اور سب سے قیمتی چیز ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی عزت نفس کو بچانے کی خاطر اپنے مفادات اور کل پونجی ہی نہیں اپنی جان بھی دینے کو تیار ہو جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم اپنے معاشرے اور گردوپیش میں آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ انسان کی اسی نفسیات اور معاشرے میں امن و امان اور باہمی اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم رکھنے کے لیے اسلام نے دوسروں کی عزت نفس کا احترام لازم ٹھہرایا اور کسی بھی انداز میں اسے مجروح کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر اسلام اور محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبےٰ علیہ التحیۃ والثناء نے صحابہ کرام کے جم غفیر کو ایک حیرت انگیز اور سوالیہ انداز میں ماہ ذی الحجہ، بلدۃ الحرام (مکہ مکرمہ) اور قربانی کے دن کی مسلمہ عزت و حرمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

فان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا۔[2]

بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام

---

[1] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العتق، باب اذا ضرب العبد فلیجتنب الوجہ، ۱/۳۴۷، رقم الحدیث: ۲۰۰۹؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب اللباس باب النہی عن ضرب الوجہ نیز کتاب البر والصلۃ باب النہی عن ضرب الوجہ) ۲/۳۲۷

[2] - ولی الدین، ابو عبداللہ الخطیب، مشکوۃ المصابیح، (کتاب المناسک باب خطبۃ یوم النحر) المکتب الاسلامی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، ۲/۸۱۶، حدیث نمبر: ۲۶۵۹؛ بخاری، الصحیح (کتاب العلم باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من سامع)، باب نمبر ۹

(لائق حرمت) ہیں جس طرح تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارے اس دن کی حرمت ہے۔

تیسرا اصول: انسانی مساوات

اہل علم سے مخفی نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے جب دین اسلام کی طرف اہل مکہ کو دعوت دینا شروع کی تو اس وقت دنیا "انسانی مساوات" کے لفظ سے ہی ناآشنا تھی۔ عرب میں طبقاتی تقسیم اور خاندانی کبر و نخوت کا یہ عالم تھا کہ قریش مکہ موسم حج میں دوسرے اہل عرب اور عام حاجیوں کے ساتھ میدان عرفات میں "وقوف" کرنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔[1] قریش کے رؤساء و امراء تو اس حد تک طبقاتی کبر و نخوت میں مبتلا تھے کہ غرباء و مساکین، غلاموں اور عام لوگوں کے ساتھ مل کر ایک مجلس میں بیٹھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ انہی رئیسوں اور سرداران مکہ نے جب ایک مرتبہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ حضرت صہیب رومی سالم مولیٰ ابی حذیفہ، بلال اور عمار بن یاسرؓ جیسے ان چھوٹے اور کم مرتبہ لوگوں کو اپنی مجلس سے ہٹایئے تاکہ ہم لوگ آپ کے پاس آکر آپ کی بات سن سکیں۔ ایک روایت کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کے ایمان و ہدایت کے طمع میں ایسا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔[2] مگر اسلام تو اس قسم کے طبقاتی تفوق اور برتری کی سوچ پر کاری ضرب لگانے آیا تھا۔ اس لیے حضور ﷺ کے جواب دینے سے پہلے ہی اللہ کریم نے آپ کو ایسا کرنے سے منع کر دیا اور واضح کر دیا کہ اگر آپ ان دولتمندوں اور رؤساء مکہ کی خاطر ایسا کریں گے تو آپ کا شمار ظالمین (بے انصافوں) میں سے ہو گا۔[3]

انسانوں میں امتیاز اور طبقاتی تقسیم چونکہ حقوق انسانی کی پامالی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لیے اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے انسانی مساوات کا اعلان کیا۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے

---

1 - دیکھیے: البقرۃ، ۲:۱۹۹ مع آیت ہذا کی عربی اور اردو تفاسیر

2 - دیکھیے: نووی، یحییٰ بن شرف، ریاض الصالحین، باب ملاطفۃ الیتیم والبنات الخ، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ ص:۱۳۴؛ آلوسی، محمود بغدادی (م ۱۲۷۰ھ)، روح المعانی، (سورۃ الانعام: ۵۲) مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۷/۱۵۸-۵۹

3 - دیکھیے: الانعام ۶:۵۲ والکہف ۱۸:۲۸ مع آیت ہذا کی عربی اور اردو تفاسیر

عظمت کا معیار کردار کو مقرر کیا۔ ذات پات، برادری، حسب و نسب، مال و دولت اور قوت و اقتدار کے امتیازات کو صرف ایک جملہ کہہ کر رد کر دیا: "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "[1] (بے شک تم میں سب سے زیادہ معزز آدمی وہ ہے جو سب سے بڑھ کر صاحب تقویٰ ہے) یہ ایک نیا معیار تکریم تھا جو اسلام نے انسانیت کو عطا کیا۔ یہ ایسی مساوات تھی جس نے رنگ و نسل کے مسائل پر نہایت کامیابی سے قابو پایا۔ عربوں میں طبقاتی تقسیم اور طبقاتی اونچ نیچ کا تصور اس حد تک رچا بسا ہوا تھا کہ مقتول اگر اپنی قوم کا کوئی بڑا اور ان کے الفاظ میں "شریف" ہوتا اور اس کا قاتل کوئی چھوٹا آدمی ہوتا تو مقتول کے ورثاء اصل قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کرتے تھے بلکہ قاتل کے خاندان میں مقتول کے پایے کے آدمی کو جب تک قتل نہ کر لیتے چین سے نہ بیٹھتے تھے۔ ایسے حالات میں اسلام آیا اور اس نے انسانوں میں مذکورہ بالا طبقاتی تقسیم اور بڑائی کے خود ساختہ معیاروں کی نفی کرتے ہوئے "انسانی مساوات" کا اعلان کیا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔[2]

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز (برتر) وہی آدمی ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقوی شعار (اللہ سے ڈرنے والا) ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔

قوموں اور قبیلوں کا یہ اختلاف اس لیے نہیں تھا کہ لوگ محض اپنی قوم اور قبیلہ کے بل بوتے پر دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں۔ اس اختلاف کی غرض و غایت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ باہمی تعارف میں آسانی ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ ساری قومیں اور قبائل برابر ہیں کسی کو کسی سے برتر قرار دیا جاسکتا ہے تو

---

[1] ۱- الحجرات، ۴۹: ۱۳

[2] ۱- الحجرات، ۴۹: ۱۳

صرف تقویٰ کی بنا پر۔ اور یہ ایک ایسی صفت ہے جسے نسب وخاندان سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام قبیلہ، نسب اور مذہب ومسلک کے تعصبات سے بری ہے اور اس سلسلے میں اتنے بلند مقام تک پہنچ گیا ہے کہ جہاں پہنچنا مغربی تہذیب کو آج تک نصیب نہیں ہو سکا۔ اس تہذیب کا پروردہ امریکی ضمیر اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ علی الاعلان ریڈ انڈین نسل کو مٹا دینے کی منظم کوشش کرے اور گوروں اور کالوں کے درمیان مذموم تفریق کو روا رکھے۔ یہ تہذیب جنوبی افریقہ کی حکومت کے لیے رنگین نسل والوں کے خلاف علی الاعلان امتیازی قوانین بنانا جائز قرار دیتی ہے اور روس، چین، ہندوستان، برطانیہ، فرانس، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے مسلمانوں کا قتل عام مباح کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے مغربی تہذیب کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے سب سے پہلی خرابی یہ لکھی ہے کہ:

> تمیز رنگ ونسب، جو اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج سے ایک سال پہلے ایک سرخ حبشی کو امریکہ کی ایک درسگاہ میں داخل کرانے کے لیے فوج بلانی پڑی۔ امریکہ کے صدر کینیڈی کو دسمبر ۱۹۶۳ء میں ٹیکساز کے اُوز ویلڈ نے محض اس لیے گولی مار دی کہ وہ مساوات انسانی کا قائل تھا۔ لنڈن میں آئے دن اسی بنا پر پاکستانیوں اور افریقیوں پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ یہی حال فرانس اور سپین کا ہے۔ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں گوروں کی حکومت ہے اور یہ لوگ اہل افریقہ کے لیے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی افریقہ کو برطانیہ نے کامن ویلتھ سے نکالا۔ اقوام متحدہ نے متفقہ قرارداد ملامت پاس کی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بھارت کی طرح نسل کشی کی راہ پر بدستور رواں ہے۔ بھارت مسلمانوں کو ذبح کر رہا ہے اور وہ افریقیوں کو۔[1]

جبکہ قرآن مجید نے اس بات کو مختلف پیرایوں میں بار بار دہرایا ہے کہ پوری جنس انسانی مٹی سے

---

[1] ۔یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۰۳

نوٹ: مغربی دنیا میں آج بھی جس طرح نسلی امتیاز اور نسلی برتری کے گھمنڈ میں گورے کالوں کا استیصال کر رہے ہیں، اور انہیں حیوانات سے بھی کم درجے کی مخلوق سمجھ رکھا ہے، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید مجتبیٰ موسوی، تمدن عرب از دیدگاہ اسلام (اردو ترجمہ مغربی تمدن کی ایک جھلک)، ص: ۸۳ تا ۸۸

بنی ہے اور بلا استثناء ہر فرد ایک حقیر پانی سے وجود میں آیا ہے۔ اور اس تکرار سے مقصود یہی لگتا ہے کہ سارے انسانوں کے ایک ہی اصل سے ہونے، ایک طرح سے پیدا ہونے اور ایک ہی طرح نشوونما پانے کی حقیقت دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے یادگار خطبہ حجۃ الوداع میں انسانی مساوات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

یاایھا الناس الا ان ربکم واحد وابا کم واحد لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود علیٰ احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی ان اکرمکم عند اللہ اتقا کم۔[1]

اے لوگو! سن لو تمہارا رب ایک ہے نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر مگر تقویٰ کے ساتھ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں معزز و برتر وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی و پرہیز گار ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن جب تمام عرب اسلامی ریاست کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے خاندان والوں سمیت، جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے، لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یاایھا الناس ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاہلیۃ وتعاظمھا بآ بائھا فالناس رجلان برتقی کریم علی اللہ وفاجر شقی ھین علی اللہ الناس کلھم بنو آدم وخلق اللہ آدم من تراب۔[2]

اے لوگو: بے شک اللہ نے جاہلیت کا غرور و تکبر اور اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا تم سے دور کر دیا۔ لوگو! انسان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نیک اور پرہیز گار ہو وہ اللہ کے نزدیک معزز ہے دوسرا وہ جو بد اعمال شقی ہو وہ اللہ کے نزدیک ذلیل و حقیر ہے۔

---

1 - بیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۰ھ، ۴/۲۸۹، رقم ۵۱۳۷

2 - ترمذی، جامع، (ابواب التفسیر — سورۃ الحجرات)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/۶۳۴، رقم: ۳۲۷۰

اصل کے اعتبار سے سب انسان اولاد آدم ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔

(پھر استدلال میں سورۃ الحجرات کی درج بالا آیت نمبر ۱۳ درج بالا تلاوت فرمائی)۔

نبی کریم ﷺ نے انسانی مساوات کو ایک بہترین مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ فرمایا:

الناس سواسیة کاسنان المشط لافضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علیٰ اسود الا بالتقوی۔[1]

تمام انسان آپس میں کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں نہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی طرح کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔

پھر غور کیجیے انسانی مساوات کے اس تصور نے اس عہد اور سوسائٹی میں کتنا انقلاب پیدا کیا۔ اسی تصور نے بلال حبشیؓ کو حضرت عمر جیسے قریشی اور امیر المومنین کی زبان سے سیدنا بلال کہلوایا۔[2] اسی نے صہیب رومی، عمار بن یاسر اور زید بن حارثہؓ جیسے غلاموں کو وہ رتبہ دیا جو کسی بڑے بڑے قریشی کا تھا اور اسی نے سلمان فارسیؓ کے بارے میں زبان نبوت سے **"سلمان منا اھل البیت"** کہلوایا۔[3]

یہ واقعہ تو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ آستانہ فاروقی پر حضرت ابوسفیان، سہیل بن عمرو اور حارث بن ھشام سرداران قریش حاضر ہیں، اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں مگر امیر المؤمنین حضرت بلال، حضرت صہیب، عمارؓ اور دیگر اہل بدر کو پہلے اجازت دے دیتے ہیں۔ اس پر ابوسفیان نے برا منایا تو سہیل بن عمروؓ نے ان سے کہا: ان پر ناراض ہونے کی بجائے اپنے آپ پر ناراض ہو۔ اسلام کی جب پوری قوم کو دعوت دی گئی تھی تو تمہیں بھی دی گئی۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی اور تم لوگ

---

[1] - قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ)، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر، ۱/ ۷۸

[2] - ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ الحقانیہ، پشاور، ۷/ ۱۱۰؛ ابن شبہ، تاریخ المدینۃ المنورۃ، ۳/ ۸۳۸

[3] - دیکھیے: الجزری، عزالدین ابن اثیر (م ۶۳۰ھ)، اسد الغابہ، دارالمعرفہ، بیروت، ۲/ ۳۵۰؛ ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۱/ ۲۹۳

پیچھے رہ گئے۔[1]

اس سلسلے میں خود حضور اکرم ﷺ کا اپنا ذاتی عمل اور نمونہ حالانکہ ہر جہت، ہر پہلو اور ہر زاویے سے آپ سے بڑھ کر کوئی بڑا آدمی نہ تھا، یہ تھا کہ اپنے بلند ترین روحانی و معاشرتی مرتبہ و مقام پر فائز ہونے کے باوجود کبھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر نہ سمجھا، اپنے لیے کسی امتیازی چیز کو پسند نہ فرمایا، کہیں بھی دوسروں سے نمایاں ہونے کا انداز اختیار نہ فرمایا نہ لباس میں نہ خورد و نوش میں نہ رہن سہن میں نہ کام کاج میں نہ کسی اور بات میں۔ حتیٰ کہ اجنبی آدمی کو صحابہ کرامؓ سے پوچھنا پڑتا کہ تم میں پیغمبر کون ہے؟ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ہر امتیازی کردار طبقہ آفرینی (Creation of Classes) کی بنیاد بن جاتا ہے اور پھر ہر طبقے کے حقوق دوسروں سے ممتاز ہونے لگتے ہیں اور یوں باہمی آویزش اور فساد شروع ہو جاتا ہے اور آپ کی بعثت ان چیزوں کو مٹانے کے لیے ہوئی تھی۔

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ نے انسانی مساوات کے حوالے سے درج بالا قسم کی جو تعلیمات و ہدایات دیں، ان پر اہل اسلام نے کس طرح عمل کیا؟ اس سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔ تفصیل میں جانا یہاں ہمارے لیے ممکن نہیں تاہم انسانی مساوات کے ایک دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہو گا۔

واقدی اور بلاذری وغیرہ نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ انسانی مساوات کا شاہکار یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ غسان کا فرمانروا جبلہ بن ایہم اسلام قبول کرنے کے بعد عمرہ کے لیے گیا تو طواف کعبہ کے وقت اس کی چادر کا ایک گوشہ کسی بدو کے پاؤں کے نیچے آ گیا۔ جبلہ نے اپنی خاندانی وجاہت اور معاشرتی مرتبہ و مقام کے خود ساختہ زعم میں اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ بدو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جبلہ نے امیر المؤمنین عمرؓ سے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا: تم نے جیسا کیا ویسا پا لیا۔ جبلہ نے کہا: ہم وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم سے کوئی گستاخی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ فرمایا: ہاں عہد جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام

---

[1] -ابن الاثیر، عزالدین علی بن محمد الجزری (م ۶۳۰ھ)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء، ۲/ ۳۹۶-۳۹۷ (تذکرہ سہیل بن عمرو۔ نمبر شمار ۲۳۲۶)

نے پست و بالا کو ایک کر دیا ہے۔(ان الاسلام جمعک و ایاہ فلست تفضله الا بالتقوی)[1]

اسی طرح عہد فاروقی میں ایک گھوڑ دوڑ مقابلے میں ایک مصری غیر مسلم ذمی کے گھوڑے کے محض سبقت لے جانے پر "انا ابن الاکرمین" (میں شریف زادوں کی اولاد ہوں) کے زعم میں گورنر مصر عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے اس غیر مسلم کو مارا اور اس غیر مسلم کی بارگاہ خلافت میں شکایت پر جرم ثابت ہو گیا تو فاروق اعظمؓ نے اس مصری کے ہاتھ میں درہ پکڑاتے ہوئے فرمایا "اس شریف زادے کو پیٹو"۔ جب وہ تسلی کر چکا تو فرمایا: اس کے باپ کے سر پر بھی مارو کیونکہ خدا کی قسم اس نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے بل بوتے پر تمہیں مارا تھا۔ مگر مصری نے بے گناہ باپ کو مارنے سے انکار کر دیا۔ اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے عمرو بن العاص (گورنر مصر) کو مخاطب کرتے ہوئے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو اسلام میں بلا امتیاز انسانی حریت کا شاہکار اور ہر قسم کی نسلی برتری کی نفی پر روشن دلیل ہے، فرمایا:

یا عمرو! متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احراراً۔[2]

اے عمرو! کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنا لیا جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا۔

اس مثالی واقعہ پر عصر حاضر کے معروف فقیہہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا تبصرہ لائق ملاحظہ ہے، لکھتے ہیں:

اس واقعے میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کے سائے میں لوگوں کو اپنی عزت اور شرف انسانی کا بھرپور احساس تھا حتی کہ اگر کسی کے ایک طمانچہ بھی ناحق رسید کیا جاتا تو

---

[1] - دیکھیے:: واقدی، فتوح الشام، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱/۱۰۸؛ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، ص: ۲۰۴؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ الحقانیہ، پشاور، ۸/۴۵۶؛ ابو الفرج الاصبہانی، کتاب الاغانی، دار صعب بیروت، ۱۴/۴؛ گستاؤلی بان نے بھی اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کی انصاف پسندی میں شمار کیا ہے۔ دیکھیے: تمدن عرب، ص: ۱۸۳

[2] - دیکھیے: ہندی حسام الدین، علی متقی (م۹۷۵ھ) کنز العمال، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ۲/۴۵۵؛ ہیکل، محمد حسین، الفاروق عمر (مترجم محمد مسعود عبدہ)، الفیصل لاہور، ت۔ن، ص: ۷۵۸؛ یوسف القرضاوی، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، مکتبہ وھبۃ القاہرہ، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء (الطبعۃ الثالثۃ)، ص: ۳۰؛ جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام (مترجم مولوی محمد حلیم انصاری)، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۶۴ء، ۱/۹۹

اسے برداشت نہ کرتا جبکہ اس جیسے ہزاروں واقعات رومیوں وغیرہ کے عہد میں پیش آتے اور کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اسلامی ریاست کے زیر سایہ ہر فرد کو اپنی عزت اور حقوق کا شعور اس قدر تھا کہ ایک مظلوم مصر سے مدینہ تک کے طویل سفر کی سختیاں اس اعتماد پر جھیل لیتا کہ اس کا حق ہرگز ضائع نہ جائے گا اور اس کی فریاد توجہ سے سنی جائے گی۔[1]

قرآن وحدیث کی رو سے مساوات کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ نیک اور بد، شریف اور رذیل، باکردار اور بدکردار، متقی و پرہیزگار اور عصیاں کار سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں۔[2] اس لیے مساوات کا مفہوم یہ اور صرف یہ ہے کہ سماجی قانون اور اخلاقی طور پر ہر فرد کو بغیر امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق دین و مذہب یکساں اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔ کوئی فرد اس لیے ممتاز نہ مانا جائے کہ وہ کسی حکومتی منصب پر فائز ہے اور معاشرتی و معاشی جاہ و مرتبہ کا مالک ہے، اکثریت کا فرد ہے، سرکاری پارٹی کا رکن ہے، اس لیے وی آئی پی کا درجہ رکھتا ہے اور کسی کو محض اس لیے حقیر اور کم مایہ نہ قرار دیا جائے کہ اقلیت، اپوزیشن یا محکوم طبقے کا فرد ہے۔ قاتل کو ہر حالت میں پھانسی پر لٹکنا چاہیے خواہ وہ کسی مذہب، قوم اور

1- غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی (طبع مذکور)، ص: ۳۰-۳۱

2- چنانچہ قرآن مجید میں اس مضمون کی متعدد آیات ہیں مثلاً ایک جگہ ارشاد الٰہی ہے: أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ (السجدہ، ۱۸:۳۲) (تو کیا جو مومن ہے وہ (عند اللہ) اس جیسا ہو سکتا ہے جو نافرمان ہے۔ وہ (دونوں) برابر نہیں ہو سکتے)۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ" (ص، ۲۸:۳۸) کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے ان کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فساد پھیلانے والے ہیں یا ہم متقی لوگوں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے؟ (ہرگز نہیں)۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے: "وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ" (المومن، ۵۸:۴۰) اور اندھا (جاہل) اور آنکھ والا (عالم) برابر نہیں اور (اسی طرح) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور جو برائی کرنے والا ہے برابر نہیں ہو سکتے (مگر لوگو!) تم بہت کم ہی نصیحت پکڑتے ہو۔

پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے چاہے بڑے سے بڑے جاہ و مرتبہ کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ مجرم کو ہر حالت میں سزا ملنی چاہیے خواہ اس کا دین مذہب اور جاہ و مرتبہ کچھ بھی ہو۔ اور اسے دفاع اور صفائی کا بھی پورا پورا حق ملنا چاہیے۔ ذہانت، قابلیت اور اہلیت و صلاحیت کو مقدم سمجھا جانا اور ہر حالت میں قدر ہونی چاہیے خواہ اس کا تعلق کسی فرقے کسی قوم اور کسی مذہب سے کیوں نہ ہو۔ ترقی کے مواقع سب کو یکساں طور ملنے چاہئیں اور اس راستے میں دین و مذہب پارٹی اور قوم و ملت کا سوال ہرگز نہیں پیدا ہونا چاہیے۔[1]

چوتھا اصول: اقامت عدل

انسانی تاریخ اور مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ کوئی دستور حکومت نظام عدل و انصاف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شریعت اسلامیہ نے اسے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اسے حکومت کے درجہ اول کے فرائض میں شمار کیا ہے۔

اسلامی ریاست کے ہر شہری کو چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی، حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا، انصاف مہیا کرنا اور اس کے حقوق کا تحفظ کرنا اسلامی حکومت کا کوئی احسان نہیں بلکہ بنیادی اور اساسی فرض ہے۔ عدل و انصاف کے معاملے میں قرآن و سنت نے اپنے ماننے والوں کو کتنی تاکید کی، کتنی باریک بینی سے ہدایات دیں، قاضی کے لیے کتنی احتیاط کرنے کا حکم ہے اور عدالت کے سلسلے میں کتنے سنہری اصول و ضوابط مقرر کیے ہیں۔ ان کا مطالعہ آج بھی حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود "کتاب القضاء" اور "کتاب الشہادۃ" وغیرہ میں کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تاہم زیر بحث موضوع کے لیے اتنی وضاحت ضروری ہے کہ عدل کا معنی صرف مساوات اور برابری نہیں بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ بغیر کسی افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ مستحق ہے۔ جبکہ ظلم کے معنی ہیں "وضع الشئی فی غیر موضعہ"[2] (کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے علاوہ دوسرے مقام پر رکھنا) یعنی حقدار

---

[1] ۔رئیس احمد جعفری، اسلامی جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص: ۱۵۴

[2] المنجد [تحت مادہ ظلم] دار المشرق بیروت، 1967ء، ص674

ں حق تلفی کرنا، اس کا حق دبالینا، کسی دوسرے کو دے دینا یا اس کی ادائیگی میں کمی اور تاخیر کرنا وغیرہ سب ظلم میں داخل ہے۔

اسلامی قانون عدل و انصاف کے معاملے میں سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کسی کے حسب و نسب اور جاہ و مرتبہ کو نہیں دیکھتا۔ عام چھوٹے بڑے لوگ تو ایک طرف رہے۔ سربراہ مملکت اور خلیفہ وقت کو بھی کوئی امتیاز اور استثناء حاصل نہیں۔ اس کے خلاف کوئی دعویٰ دائر ہوتا ہے تو اسے بھی عدالت کے کٹہرے میں مدعی کے برابر کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر مدعاعلیہ غیر مسلم اور قاضی کا دشمن بھی ہے تو محض اس وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاسکتی کہ وہ غیر مسلم یا دشمن ہے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۤءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔[1]

اے ایمان والو! اللہ کے (حکم کی تعمیل کے) لیے خوب قائم ہونے والے انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر ہرگز نہ اکسائے کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ ان کاموں سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

جس قوم یا جماعت سے مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کے دشمنی ہوگی ظاہر ہے وہ دشمن اسلام قوم کفار اور غیر مسلموں ہی کی ہوگی۔ تو گویا آیت میں اس امر کی تاکید آگئی کہ دشمنان اسلام کے ساتھ بھی ناانصافی اہل ایمان کے شایان شان نہیں۔ دنیا کا کون سا قانون ایسا ملے گا جس نے اپنے باغیوں مخالفوں بلکہ معاندین تک کے حقوق کی یہ رعایت رکھی ہو۔ فقہاء و مفسرین نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: دلت الآية علىٰ ان كفر الكافر لا يمنع من العدل عليه۔[2]

---

[1] ۔ المائدہ، ۵:۸

[2] ۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۶/ ۴۳

یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ کافر کا کفر اس کے ساتھ عدل کرنے سے مانع نہیں۔

انسانی نفسیات کے مطابق شدت غضب میں اپنے آپ پر قابو رکھنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تاکید فرمادی گئی کہ جو غصہ تمہارے دلوں میں کفار اور دشمنان اسلام کے خلاف ہے وہ کہیں تمہیں ان کے مقابلے میں زیادتی پر نہ آمادہ کردے۔ علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں:

والمعنى لا يحملنكم شدة بغضكم للمشركين على ترك العدل فيهم فتعتدوا عليهم بارتكاب ما لا يحل كمثلة وقذف وقتل نساء وصبية ونقض عهد تشفيا مما في قلوبكم۔[1]

معنی یہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ تمہارے بغض کی شدت ان کے معاملے میں تمہیں عدل کا راستہ چھوڑ دینے پر آمادہ نہ کرے جس کے باعث تم شرعی طور پر ایک ناجائز چیز (بے انصافی) کا ارتکاب کر کے ان پر زیادتی کرو۔ مثلاً اپنی دلی عداوت و بغض کی تسکین کے لیے ان کا مثلہ کرو۔ تہمت لگاؤ، ان کی خواتین اور بچوں کو قتل کر دیا ان سے نقض عہد کرو۔

عمومی مشاہدہ یہی ہے کہ معاملات و مقدمات میں ناانصافی کا بڑا سبب عموماً دو ہی چیزیں بنتی ہیں۔ ایک تو اپنا ذاتی، شخصی مفاد اور قرابت داروں کی رو رعایت، دوسرے کسی فریق کی عداوت و مخالفت۔ سورۃ النساء آیت نمبر ۱۳۵ میں اقامت عدل کا حکم ناانصافی کے سبب اول کی مناسبت سے اور یہاں سبب دوم کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت اور دوست دشمن سارے انسانی طبقوں بلکہ پوری کائنات کے لیے سراسر عدل و رحمت ہے۔ اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت (لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ [2] الخ) میں بڑی صراحت سے بتایا گیا ہے کہ نہ صرف شریعت محمدی بلکہ تمام سابقہ شرائع اور آسمانی کتب کے نزول کا ایک ہی ہدف اور مقصود تھا اور وہ یہ کہ "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" سارے لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں۔ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے مولانا مودودی نے

---

[1] - انوار التنزیل واسرار التاویل، دار فراس للنشر والتوزیع (الجزء السادس)، ص:۱۴۲

[2] - الحدید، ۵۷:۲۵

لکھا ہے:

جو شخص "اسلام میں عدل ہے" کہتا ہے وہ حقیقت سے کم تر بات کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدل ہی اسلام کا مقصود ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ عدل قائم کرے۔[1]

تمام اسلامی تعلیمات کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کا سب سے بڑا مقصد ہی دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد جیسا کہ اوپر گزرا، قیام سلطنت، ملک گیری اور ہوس زر و اقتدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی بلکہ اس کے ذریعہ دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے حکومت کو ختم کر کے جن میں چند سر اقتدار بندوں کو دوسرے عام بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ فرمان الٰہی کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا کسی کی پوجا نہ ہو، کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ دوست دشمن سب کے ساتھ کسی بھی قسم کی رنگ نسل مذہب و مسلک کی تمیز کے بغیر عدل و انصاف ہو۔[2]

عدل و انصاف کا یہی اسلامی تصور کالے گورے، عربی، عجمی، ملکی، غیر ملکی، حاکم محکوم، دوست دشمن سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یورپ و امریکہ اور روس وغیرہ جو اس وقت بین الاقوامی ادارے اقوام متحدہ کے کرتا دھرتا ہیں اور انسانی حقوق اور مساوات انسانی کے علمبردار بلکہ ٹھیکیدار ہیں ان کی بنائی ہوئی بین الاقوامیت اسی عدل و انصاف نہ ہونے اور دوہرے معیار کی وجہ سے بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسری طرف آپ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کا تو کیا ذکر اس کے بعد کے زمانوں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ملے جس میں کسی غیر مسلم یا دشمن قوم کے فرد کو اسلامی عدالت نے کسی حق سے محض اس لیے محروم کر دیا ہو اور صرف اس وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی کی ہو کہ یہ غیر مسلم ہے۔ اس کی ایک دو نہیں سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ مسلمان عدالتوں نے عدل و انصاف کے

---

1 - معاشیات اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۳۷۹

2 - ملاحظہ ہو: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷/ ۳۹؛ طبری، تاریخ الطبری، ۳/ ۵۲۰

معاملے میں ہمیشہ حق و ناحق ہی کو مد نظر رکھا ہے۔ یہ محض دعوی نہیں بلکہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود دشمن اقوام کو بھی تھا۔ چنانچہ ایک گواہی ملاحظہ ہو۔

فتح خیبر کے بعد حسب معاہدہ وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو مقرر فرمایا۔ وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی تو اس پر یہودیوں نے کہا یہ تو زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا اچھا لیں دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں تم لوگ جونسا حصہ لینا چاہو لے لو۔ اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے۔

هذا الحق وبه تقوم السماء والارض قد رضينا ان نأخذه بالذی قلت۔[1]

عدل وانصاف اور حق اسی کا نام ہے اور اسی انصاف سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ جو کچھ آپ نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

ایک روایت کے مطابق محصل مذکور نے کہا کہ اگرچہ تم میرے نزدیک ساری مخلوق سے زیادہ مبغوض ہو۔ اس کے باوجود میں تم پر ظلم نہیں کروں گا۔ تو انہوں نے کہا: "لهذا قامت السموات والارض" (اسی انصاف سے آسمان اور زمین قائم ہیں)[2]

ہر انسان کے ساتھ بغیر کسی مذہبی و نسلی امتیاز و تخصیص کے نیکی، بھلائی اور ہر معاملے میں ہر آدمی کے ساتھ عدل وانصاف اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ

---

1 - ابوداؤد، السنن، کتاب البیوع، باب فی المساقات، ۲/۱۲۹، رقم: ۳۴۰۹

2 - شیبانی، محمد بن حسن، الموطا، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ت۔ن، ص: ۳۵۷؛ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۱۹۵ (پیرہ نمبر ۱۴۳۷)

مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ۔[1]

اللہ کریم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنے کا جرم کیا ہے۔ اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور ان سے انصاف کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے سیاق وسباق میں کفار کی دوستی اور موالات سے اہل ایمان کو سختی سے منع کیا گیا ہے جس کے متعلق یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ یہ ممانعت ان کے کفر کے باعث ہے۔ اس لیے ان آیات میں اس امر کی وضاحت فرمادی گئی کہ کفار سے عدم موالات کا حکم ان کے کفر کے باعث نہیں بلکہ اہل اسلام سے ان کی عداوت، بغض اور ظالمانہ روش کے سبب ہے۔ جو کفار اہل اسلام کے ساتھ اس قسم کا معاندانہ رویہ نہیں رکھتے ان کے ساتھ احسان و انصاف کرنے کے معاملے میں کوئی ممانعت نہیں۔ مشہور اردو مفسر مولانا امین احسن اصلاحی نے یہاں "ان اللہ یحب المقسطین" کے الفاظ میں ایک عمدہ نکتہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جب "بر" اور "قسط" دو چیزوں کا ذکر آیا ہے تو مناسب تھا کہ یہاں دونوں نیکیوں کے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ صرف عدل کرنے والوں ہی کی محبوبیت کا ذکر کیوں آیا؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ صلہ رحمی وغیرہ کے قسم کی نیکیاں نفس پر اتنی بھاری نہیں ہیں جتنی عدل و انصاف کے قسم کی نیکیاں ہیں۔ بالخصوص جب کہ ان کا تعلق کفار سے ہو۔ کمزوروں کو سہارا دے دینا۔ محتاجوں کی مدد کر دینا اور اپنے کافر ماں باپ کے ساتھ صلہ رحم کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہیں۔ انسانی فطرت کے اندر ان کے لیے نہایت قوی محرکات موجود ہیں۔ لیکن عدل و انصاف کا حق ادا کرنا اور وہ بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملہ

1- الممتحنہ ۶۰: ۸

کرنے میں، کوئی سہل بازی نہیں ہے۔[1]

علماء اسلام کے نزدیک عدل و انصاف کتنا ضروری ہے اور اسلام میں اس کا کیا مرتبہ و مقام ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل فتویٰ سے لگایا جاسکتا ہے جسے ابن الطقطقی نے ایک اسلامی حکمران کے اندر درکار ضروری خصال خیر اور اوصاف حمیدہ کی وضاحت کے ضمن میں بیان کیا ہے:

> جب سلطان ہلاکو نے بغداد کو ۶۵۶ھ میں فتح کر لیا تو اس نے حکم دیا کہ علماء دین سے یہ فتویٰ پوچھا جائے کہ عدل کرنے والا کافر بادشاہ افضل ہے یا ظلم کرنے والا مسلمان بادشاہ؟ پھر اس نے اس مقصد کے لیے مستنصریہ میں علماء کو جمع کیا۔ جب علماء دین کو اس فتویٰ کے بارے میں معلوم ہوا تو جواب دینے سے رُک گئے۔ علماء کی اس مجلس میں اس زمانے کے نامور عالم رضی الدین علی بن طاؤس بھی موجود تھے جنہیں ان کے علمی مرتبہ و مقام کی بنیاد پر انتہائی قابل تعظیم و احترام سمجھا جاتا تھا۔ جب انہوں نے علماء کی اس ہچکچاہٹ کو دیکھا تو فتویٰ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ظلم کرنے والے مسلمان بادشاہ پر عدل کرنے والے کافر بادشاہ کی فضیلت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ ان کے بعد دیگر علماء دین نے بھی اس فتویٰ پر اپنے اپنے دستخط کر دیے۔[2]

دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی فاتح قوم نہیں گزری جو بزور شمشیر فتح شدہ کوئی علاقہ محض اس لیے خالی کر دینے پر تیار ہو کہ جنگ کے دوران فاتح قوم سے کوئی عدل و انصاف کے منافی حرکت سرزد ہو گئی ہو۔ اس قسم کی مثالیں اسلامی حکومتوں نے پیش کی ہیں اور اس عروج اور عالمی سیاسی غلبہ کے وقت پیش کی ہیں جبکہ دنیا کی ہر طاقت ان کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی ہے اور دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا حکمران ان کا راستہ روکنے کی جراءت نہیں کر سکتا ہے۔ ذیل میں اس کمال عدل و انصاف کی ایک منفرد مثال ملاحظہ ہو:

اموی دور کے مشہور سپہ سالار اسلام قتیبہ بن مسلم نے وسطی ایشیاء کے علاقہ سمرقند پر حملہ کیا تو

---

[1] ۔ تدبر قرآن، (تفسیر سورۃ الممتحنہ:۸) فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۸/ ۳۳۴

[2] ۔ الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ (الفصل الاول)، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء، ص:۱۱

اہل سمرقند نے جزیہ کی ایک مخصوص مقدار پر ان سے صلح کر لی۔ اس جنگ میں مفتوح قوم میں سے کسی آدمی کی عزت و آبرو پر آنچ آتی ہے نہ کسی کی جائیداد اور مال و دولت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور نہ اخلاق و کردار سے ہٹ کر کوئی غیر اخلاقی حرکت کسی فوجی سے سرزد ہوتی ہے۔ لیکن اس فاتحانہ داخلے کے موقع پر بعض شرائط جنگ کی پاسداری کرنے میں کوتاہی ہو گئی جو محض رسمی نوعیت کی تھیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اہل سمرقند کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرضداشت پیش کی کہ قتیبہ بن مسلم کا ان کے شہر میں داخلہ اور وہاں مسلمانوں کو ٹھہرانا دھوکے کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ یہ چیز معاہدہ میں داخل نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی شکایت سن کر وہاں کے اپنے عامل کو لکھا اور حکم دیا کہ وہ ان کے لیے ایک قاضی / جج مقرر کرے جو ان کی شکایت کا جائزہ لے۔ اگر قاضی وہاں سے مسلمانوں کے نکالنے کا فیصلہ دے تو وہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ عامل نے اس کیس میں جمیع بن حاضر الباجی نامی کو قاضی مقرر کیا۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ مسلمان شہر سے نکل جائیں اور دوبارہ اہل سمرقند سے اعلان جنگ کریں۔ مگر اہل سمرقند نے دوبارہ جنگ کو پسند نہ کیا اور اپنے درمیان مسلمانوں کے قیام پر رضامندی ظاہر کر دی۔[1]

اسلام کے قانون عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ سربراہ حکومت، گورنروں، وزراء، اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا قانون کی گرفت سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ قریش کے معزز گھرانے کی فاطمہ نامی ایک خاتون پر چوری کا جرم ثابت ہو گیا اور اس گھرانے نے اپنی خاندانی وجاہت و مرتبہ کے پیش نظر اس معاملے میں محبوب رسول حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارشی بنا کر بھیجا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا! تو اللہ کی حدود کے معاملے میں سفارش کرتا ہے تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دی جاتی اور اگر کوئی بااثر آدمی

---

[1] دیکھیے: بلاذری، ابوالحسن احمد بن یحیٰ (م ۲۷۹ھ)، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء، ص: ۴۱۱؛ محمود احمد غازی، خطبات بہاولپور (اسلام کا قانون بین الممالک — دوسرا خطبہ)، ص: ۷۵

چوری کرتا تو اس سے درگزر کر جاتے لیکن میرے ہاں ایسا نہیں ہو گا۔ پھر زوردار الفاظ میں فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔[1]

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے۔ اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ دیتا۔

علامہ ابن قیم نے "الشریعة مبنیة علی مصالح العباد" (شریعت کی بنیاد ہی بندگان خدا کی مصلحت پر رکھی گئی ہے) کی ذیلی سرخی کے تحت شریعت اسلامیہ کی مادی و معنوی برکات کا شمار کرتے ہوئے اس کے "سراپا عدل" ہونے کے بارے میں کہا ہے:

فان الشریعة مبناھا واساسھا علی الحکم ومصالح العباد فی المعاش والمعاد، وھی عدل کلھا، ورحمة کلھا ومصالح کلھا، وحکمة کلھا فکل مسألة خرجت عن العدل الی الجور وعن الرحمة الی ضدھا وعن المصلحة الی المفسدة وعن الحکمة الی العبث فلیست من الشریعة وان ادخلت فیھا بالتاویل. فالشریعة عدل الله بین عبادہ ورحمته بین خلقه وظله فی ارضه وحکمته الدالة علیه وعلی صدق رسوله ﷺ اتم دلالة واصدقھا۔[2]

بے شک شریعت کی بنیاد اور اس کی اساس دنیا و آخرت میں حکمتوں اور بندگان خدا کی مصلحتوں پر رکھی گئی ہے۔ وہ سراپا عدل اور رحمت کلی ہے۔ وہ کل کی کل مصلحتوں اور حکمت پر مبنی ہے۔ پس ہر وہ مسئلہ جو عدل کی بجائے ظلم، رحمت کی بجائے زحمت، مصلحت کی جگہ فساد اور حکمت کی بجائے فضول چیز کی طرف جاتا ہو وہ شریعت نہیں اگرچہ تاویل کے ذریعے اسے شریعت میں داخل کر لیا گیا ہو۔ شریعت اللہ کا عدل ہے

---

1 ۔ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف الخ)، ۲/۶۳، رقم الحدیث ۴۴۱۱

2 ۔ اعلام الموقعین عن رب العالمین، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء، ۳/۱۱

اس کے بندوں کے درمیان اور ان کی رحمت ہے اس کی مخلوق کے درمیان اور اس کا سایہ رحمت ہے اس کی زمین پر اور اس کی حکمت ہے جو اس کی ذات پر اور اس کے رسول ﷺ کی سچائی پر مکمل ترین اور سچی دلالت کرنے والی ہے۔

عدل و انصاف کے معاملے میں اسلامی ریاست کے خلفاء اور قاضیوں نے جو مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کی نظیر دنیا کے کسی مذہب، قانون اور آئین میں نہیں پائی جاتی۔ جس کی تفصیل ایک الگ مستقل کتاب کی متقاضی ہے۔ تاہم یہاں ایک دو واقعات و نظائر کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔

1) ایک بار حضرت عمرؓ بیٹھے حضرت علیؓ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آیا اور بولا کہ وہ (حضرت) علیؓ پر دعویٰ کرنے آیا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے یہ سن کر حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ابوالحسن ! سامنے کھڑے ہو کر جواب دو۔ حضرت علیؓ اٹھے تو ان کے چہرہ پر بل تھا۔ دعویٰ سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا، وہ چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا: جب ان کو کھڑے ہو کر جواب دینے کو کہا گیا تو وہ چیں بہ جبیں تھے۔ کیا وہ یہودی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا: یہودی کے برابر کھڑے ہونے میں چیں بہ جبیں ہونے کا سوال نہ تھا مگر جب انہیں ابوالحسن کہہ کر کھڑے ہونے کو کہا گیا تو کنیت سے پکارنا نشان عزت ہے، خیال ہوا کہ یہودی یہ نہ سمجھے کہ عدالت کو مدعا علیہ کا خاص لحاظ ہے۔ اسی لیے مدعی کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اگر وہ ایسا سمجھ لیتا تو ہماری عدالت پر دھبہ لگتا۔[1]

2) امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰؓ نے اپنی ایک گمشدہ زرہ ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھ لی جو اسے کوفہ کے بازار میں بیچ رہا تھا۔ آپ نے امیر المؤمنین اور صاحب اقتدار و امتیاز ہونے کے بل بوتے پر اپنی زرہ اس سے چھین نہیں لی۔ بلکہ قاضی کے پاس مقدمہ دائر کیا اور چونکہ وہ مطلوبہ شہادت

1۔ قاضی سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، اسلامی کتب خانہ لاہور، س۔ن، ۳/۳۶۹

پیش نہ کر سکے اس لیے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔[1]

3) اسی طرح ابن خلکان کی روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں حضرت علیؓ اور ایک ذمی فریقین کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی نے اٹھ کر حضرت علی المرتضیٰؓ کا استقبال کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے۔[2]

الغرض اسلام میں عدلیہ کو دی جانے والی طاقت اختیارات اور آزادی اسلامی نظام کے محاسن ومفاخر میں سے ایک ہے۔ لہذا اسلام کے منصفانہ عادلانہ اور مبنی برحق نظام عدالت میں تمام مظلوموں اور زیادتی کے شکار لوگوں کو خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں، اس بات کی ضمانت حاصل تھی کہ ظالم سے انصاف اور غاصب سے ان کا حق دلایا جائے گا۔ اگرچہ ظالم اپنی تمام تر ہیبت و قوت سمیت خود خلیفہ ہی کیوں نہ ہو۔ عدل کے حوالے سے اسلام کے مذکورہ نقطہء نظر اور تعلیمات و تصریحات کے باوجود اسلامی دنیا میں کسی ذمی کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہوئی ہے جیسا کہ مغربی مصنفہ Bat ye'or نے اپنی کتاب The Dhimmi کے صفحہ نمبر ۵۷ پر بعض واقعات کی نشاندہی کی ہے تو اس کے بارے یہی کہا جائے گا کہ یہ اس آدمی یا حکومت کا ذاتی اور جذباتی فیصلہ تھا نہ کہ اسلام کی تعلیم۔

پانچواں اصول: کفالت عامہ

اسلامی ریاست اور رعایا کے درمیان تعلقات کے بنیادی اصولوں اور لوازم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ بلا کسی مذہبی ولسانی تفریق و تمیز کے اپنی قلمرو میں بسنے والی رعایا کے ہر غریب، مسکین، نادار، بے سہارا، اپاہج، مفلوک الحال، محروم المعیشت، بیوہ، یتیم، محتاج اور ضرورتمند کی کفالت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ

---

[1] - دیکھیے: بیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین (م۴۵۸ھ)، السنن الکبری، (کتاب آداب القاضی باب انصاف الخصمین)، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، دکن، ۱۳۵۵ھ، ۱۰/۱۳۶؛ ابن عماد الحنبلی ابو الفلاح عبدالحی (م۱۰۸۹ھ)، شذرات الذہب فی اخبار من ذھب، مکتبۃ القدسی ازھر، مصر ۱۳۵۰ھ، ۱/۸۵

[2] - ملاحظہ ہو: وفیات الاعیان، مکتبہ النہضہ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۴۸ء، ۲/۱۶۸

ہے کہ انسانی جان (نفس) کی حفاظت شریعت اسلامیہ کے "مقاصد خمسہ" میں شامل ہے۔[1] دوسرے ریاست پر کفالت عامہ کی یہ ذمہ داری ایک اجتماعی حق کے بدلے میں ڈالی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے ریاست ہر اس شہری کی وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اس وجہ سے وہ لازمی طور پر اس کی کفیل اور ذمہ دار بھی بنائی گئی ہے اگر اس کا کوئی کفیل نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

من ترک کلا فالی وربما قال الی اللہ والی رسولہ ومن ترک مالا فلورثتہ وانا وارث من لا وارث لہ، اعقل لہ وارثہ، الخ۔[2]

جس آدمی نے کوئی یتیم اولاد چھوڑی تو وہ میرے ذمہ ہے اور بسا اوقات فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہے اور جس آدمی نے ترکہ میں کوئی مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور میں ہر اس آدمی کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا (اگر اس کے ذمہ واجب ہوئی) اور اس کا وارث بنوں گا (اگر اس نے کوئی اور وارث نہ چھوڑا ہوگا۔)

اسی طرح سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۶ (اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ الخ) کے تحت علامہ آلوسی وغیرہ نے صحیح بخاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فتوحات ہونے لگیں اور بیت المال میں مال غنیمت آنے لگا تو آپ ﷺ نے مذکورہ آیت کا حوالہ دیتے ہوئے اعلان فرمایا:

من مات و ترک مالا فلیرثہ عصبتہٗ من کانوا فان ترک دینا او ضیاعاً فلیأتنی فانا مولاہ۔[3]

---

[1] ۔ الشاطبی، ابواسحاق (م ۷۹۰ھ)، الموافقات فی اصول الشریعہ، ۲/۴

[2] ۔ ابوداؤد، السنن، (کتاب الفرائض، باب فی میراث ذوی الارحام)، اصح المطابع کراچی، ۲/۴۰۱، رقم: ۲۸۹۹

[3] ۔ دیکھیے: آلوسی بغدادی، روح المعانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲/۱۵۱؛ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب فی الاستقراض باب الصلوٰۃ علی من ترک دینا، ۲/۸۴۵، حدیث نمبر ۲۲۶۹؛ ترمذی، جامع، ابواب الفرائض، باب ماجاء فمن ترک مالا فلورثتہ، ص: ۳۰۴

جو آدمی بھی مرے اور مال چھوڑ جائے تو اس کے وارث اس کے عصبہ (قریبی رشتہ دار) ہوں گے جو کوئی بھی ہوں اور اگر وہ اپنے ذمہ دین (قرض) چھوڑ کر مرا یا بچے چھوڑ کر مرا تو وہ دین اور یتیم بچے میرے ذمہ ہیں۔ میں ان کا مولیٰ (کفیل) ہوں۔

جبکہ صحیفہ ھمام بن منبہ کے الفاظ ہیں:

فایکم ترک دینا او ضیعة فادعونی فانی ولیه وایکم ما ترک مالا فلیؤثر بماله عصبته من کان۔[1]

تم میں سے جو آدمی دین (قرض) یا چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جائے تو مجھے بلاؤ (اطلاع کرو) بے شک دین اور بچوں کے معاملے میں میں اس کا ولی ہوں اور اگر مال چھوڑ کر مرا ہے تو جو کوئی اس کا قرابت دار ہے اسے اس مال پر ترجیح حاصل ہو گی۔

حضور اکرم ﷺ نے اسلامی ریاست کی اس ذمہ داری کو متعدد ارشادات میں واضح کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

اللہ ورسوله مولیٰ من لا مولی له۔[2]

اللہ اور اس کا رسول اس آدمی کا مددگار / سرپرست ہے جس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔

عورت کے بغیر اجازت ولی نکاح کے معاملے میں ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر فرمایا:

فالسلطان ولی من لا ولی له۔[3]

بادشاہ / حکومت ہر اس آدمی کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔

اسی طرح فقیہہ مفسر امام جصاص (م ۳۷۰ھ) نے سورہ یوسف کی تفسیر میں لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ سنایا ہے اور ان کے بارے میں

---

1 - الصحیفۃ الصحیحہ، تحقیق: ڈاکٹر حمید اللہ، رشید اللہ یعقوب کراچی، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵۳، حدیث: ۱۲۱

2 - ترمذی، جامع، ابواب الفرائض باب ماجاء فی میراث الخال، ص: ۳۰۶، حدیث: ۲۱۰۳

3 - ابو داؤد، السنن، کتاب النکاح باب فی الولی، ۱/ ۲۸۴ رقم: ۲۰۸۳؛ ترمذی، جامع، ابواب النکاح ماجاء لا نکاح الا بولی، ص: ۱۷۶، رقم: ۱۱۰۲

قحط کے زمانے میں غذائی اشیاء کو محفوظ کر کے انسانوں میں بقدر ضرورت تقسیم کرنے کا جو واقعہ نقل کیا ہے، وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہر زمانہ میں حکمرانوں پر یہ واجب ہے کہ جب انھیں اندیشہ ہو کہ قحط کے سبب عوام ہلاک ہو جائیں گے تو ایسا ہی طریقہ اختیار کریں۔[1]

علیٰ ھذا القیاس ایک اور پہلو سے بھی اسلامی ریاست و حکومت پر اپنی رعایا کے حاجتمند اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلام میں خلافت (حکومت) فرمانروائے اعلیٰ (اللہ کریم) کی نمائندگی اور نیابت کا نام ہے۔

الخلافة نيابة في حفظ الدين وسياسة الدنيا۔[2]

خلافت دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست (دنیوی امور چلانے) میں (اللہ کریم کی) نیابت کا نام ہے۔

ظاہر ہے نائب یا قائم مقام / خلیفہ کے فرائض اور ذمہ داریوں میں وہ تمام ذمہ داریاں شامل ہوں گی جو اس کا اصل یعنی خلیفہ بنانے والا سرانجام دیتا ہے۔ تو رب العالمین جس نے حکومت یا حکمران کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، اس نے ازراہ شفقت و کرم یہ امر اپنے ذمہ لے رکھا ہے کہ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔[3]

اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو۔

اسی چیز کو رسول خدا ﷺ نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا:

الخلق عيال الله فاحب الخلق الى الله من احسن الى عياله۔[1]

---

[1] ۔احکام القرآن، ۳/۱۷۶

[2] ۔دیکھیے: ماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص: ۵؛ ابن خلدون مقدمہ، ص:۱۶۶؛ مولانا حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ الحسن لاہور، ص:۱۷۰ (دفعہ نمبر۹)

[3] ۔سورہ ہود، ۱۱:۶

ساری مخلوق (مذہب و نسل کی تمیز کے بغیر) اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب آدمی وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

تو جب ساری مخلوق اللہ کا کنبہ (عیال) قرار پائی اور ان کے نان نفقہ کا پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہوئی تو اللہ کے خلیفہ (حکومت) کی بھی ذمہ داری ہوگی کہ اس کی قلمرو میں کوئی متنفس بھوکا پیاسا نہ رہے۔ مولانا سیوہاروی نے مشہور حنفی فقیہہ سید علی زادہ کے حوالہ سے امیر حکومت کے فرائض بتاتے ہوئے لکھا ہے:

ولا یدع فقیرا فی ولایته الا اعطاه ولا مدیوناً الاقضی عنه دینه ولا ضعیفا الا اعانه ولا مظلوماً الانصره ولا ظالما الا منعه عن الظلم ولا عاریا الا کساه کسوة۔[2]

اور وہ اپنی مملکت کے اندر کوئی ایسا فقیر نہ چھوڑے جس کو عطا نہ کرے اور کوئی ایسا مقروض نہ چھوڑے جس کی طرف سے قرض ادا نہ کر دے اور کوئی کمزور نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی اعانت کرے اور کوئی مظلوم نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی مدد کرے اور نہ کسی ظالم کو ظلم کرنے دے اور کوئی ایسا ننگا آدمی نہ چھوڑے جس کو لباس پہنا نہ دے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو جیسا کہ پیچھے بھی گزرا، اس ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ فرمایا:

لو مات جمل ضیاعاً علیٰ شط الفرات لخشیت ان یسألنی الله عنه۔[3]

---

[1] ۔ خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق)، ص:۴۲۵، رقم: ۴۹۹۸ - ۴۹۹۹؛ واخرجه البیہقی فی شعب الایمان، ۶/ ۱۲۰، رقم: ۷۶۷۰

[2] ۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۹ء، ص:۱۲۹-۱۳۰

[3] ۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳/ ۳۰۵

اگر ساحل فرات پر (انسان تو در کنار) کوئی اونٹ بھی بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ (روز قیامت) اس کے بارے میں مجھ سے باز پرس فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں:

لوماتت شاة على الفرات ضائعة لظننت ان الله سائلي عنها يوم القيامة۔[1]

اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو میرا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے بارے میں مجھ سے جواب طلبی فرمائے گا۔

حضرت عمرؓ نے ریاست کی اسی ذمہ داری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا:

اما و الله لئن بقيت لارامل اهل العراق لادعهن لا يفتقرن الى امير بعدى۔[2]

قسم بخدا اگر میں زندہ رہا تو اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو اتنا خوشحال کر دوں گا کہ میرے بعد کسی امیر کی محتاج نہیں رہیں گی۔

صحیح بخاری میں یہ روایت تھوڑے مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔[3]

اسلامی ریاست کس طرح حاجتمندوں کی کفالت کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کی صرف ایک جھلک ملاحظہ ہو:

حضرت زید بن اسلم اپنے والد (حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام اسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے ساتھ بازار کی طرف نکلا تو

---

[1] - ابن جوزی، سیرۃ عمر بن الخطابؓ، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۶۴ھ، ص:۱۶۱

[2] - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۳۷

[3] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمان بن عفان الخ)، ۱/۵۲۳، حدیث نمبر: ۳۷۰۰

ایک نوجوان عورت حضرت عمرؓ سے ملی اور اس نے کہا امیر المؤمنین! میرا خاوند ہلاک ہو گیا اور اس نے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے چھوڑے ہیں۔ جو قسم بخدا نہ پاوے پکا کر کھا سکتے ہیں (یعنی ان کے پاس کوئی کھانے کا سامان نہیں) نہ ان کے لیے کوئی کھیتی ہے اور نہ بھیڑ بکریاں (جن کا دودھ دوہ کر گزارہ کر سکیں) اس صورت حال میں مجھے ڈر ہے کہ قحط سالی ان کو ختم کر دے گی۔ اور میں خفاف بن ایماء الغفاری کی بیٹی ہوں اور میرے باپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ صلح حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے۔ حضرت عمرؓ وہیں کھڑے ہو گئے اور وہاں سے حرکت نہیں کی۔ پھر اس قریبی تعلق کی بنا پر مرحبا کہا۔ اس کے بعد ایک طاقتور اونٹ کیطرف تشریف لے گئے جو گھر میں بندھا ہوا تھا اس پر دو بورے لدوائے جنہیں کھانے سے بھر دیا۔ نیز اس پر نان و نفقہ کا دیگر سامان اور کپڑے رکھوا دیے۔ پھر اس عورت کو اس اونٹ کی باگ پکڑاتے ہوئے فرمایا: اسے لے جاؤ، اللہ تعالیٰ اس سامان کے ختم ہونے سے پہلے پہلے تمہارے لیے مزید خیر کا انتظام فرمادے گا۔[1]

ایک اسلامی ریاست میں کفالت عامہ کی یہ ذمہ داری صرف مسلمان محتاجوں تک محدود نہیں بلکہ اہل الذمہ میں سے بھی ضرورتمند لوگوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

چنانچہ "امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا گزر کسی آدمی کے دروازے پر ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا، ایک بوڑھا آدمی جس کی بینائی زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو ٹھونکا اور پوچھا: تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟ اس نے جواب دیا۔ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب میں کہا: میں بڑھاپے ضرورتمندی اور جزیہ کی وجہ سے

---

[1] -بخاری، الجامع الصحیح، کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیۃ، ۲/۵۹۹، حدیث نمبر: ۴۱۶۰ - ۴۱۶۱؛ ہندی، کنز العمال کتاب الخلافۃ والامارۃ، ۵/۳ ۷۲، رقم الحدیث ۱۴۱۸۶

بھیک مانگ رہا ہوں۔ راوی ابو بکر کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر سے کچھ لا کر اسے دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور اس سے فرمایا: اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔ آپ نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ٦٠ (إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَٰكِينِ الخ) کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: فقراء تو مسلمان ہیں اور مساکین اہل کتاب، اور یہ مساکین اہل کتاب میں سے ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کا اور اس قسم کے تمام ذمیوں کا جزیہ معاف کر دیا۔[1]

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک اہم دفعہ یہ بھی تھی کہ:

ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابته آفة من الآفات اوکان غنیا فافتقر و صارا اہل دینه یتصدقون علیه طرحت جزیته و عیل من بیت مال المسلمین وعیاله ما اقام بدار الهجرة ودار الاسلام۔[2]

جو بوڑھا آدمی کام کرنے سے رہ جائے یا جس آدمی کو کوئی آفت پہنچ جائے یا وہ مالدار تھا مگر فقیر ہو گیا اور اس کے اہل مذہب اس پر صدقہ خیرات کرنے لگیں تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی کفالت کی جائے گی جب تک کہ وہ دار الہجرۃ اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا۔

علیٰ ہذا القیاس ابو عبیدؒ نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو جزیہ کے سلسلے میں ہدایات دیتے ہوئے مستحق اہل الذمہ کے حوالے سے یہ بھی لکھا کہ

اور دیکھو تمہارے علاقہ میں جو عمر رسیدہ کمزور اور کمائی سے لاچار ذمی ہوں ان کا بیت

1- ابو یوسف، کتاب الخراج، (فصل فیمن تجب علیه الجزیة) ص:١٢٦

2- حوالہ مذکور، ص:١٤٤

المال سے مناسب وحسب ضرورت وظیفہ مقرر کردو۔[1]

چھٹا اصول: ظلم وزیادتی کا ازالہ

اسلامی ریاست کے لازمی اصولوں میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اس کی حدود میں مسلم اور غیر مسلم اپنے پرائے حاکم محکوم اور امیر غریب کی تمیز کے بغیر جس آدمی پر بھی کسی قسم کا ظلم ہوگا اس کا ازالہ کیا جائے گا اور مظلوم کو ظلم وزیادتی سے بچایا جائے گا۔[2] ظلم کی حرمت اور ہر قیمت پر اس کے تدارک کے لیے مختلف پیرایوں میں قرآن مجید کی متعدد ہدایات موجود ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔[3]

اسی طرح امام بخاری اور دیگر محدثین نے اپنی کتابوں میں "ابواب المظالم" اور "تحریم الظلم" کے عنوان سے مستقل ابواب قائم کیے ہیں جن میں بیسیوں احادیث کے اندر مختلف پیرایوں میں ظلم کے دنیوی واخروی نقصانات سے امت کو آگاہ کیا گیا اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔[4]

ابن قیم فرماتے ہیں: بیشک سیاست کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ظالمانہ سیاست جسے شریعت اسلامیہ نے حرام ٹھہرایا ہے اور دوسری عادلانہ سیاست جس کے ذریعے ظالم اور فاجر لوگوں سے حق وصول کیا جاتا ہے۔[5]

---

1 ۔کتاب الاموال (عربی)، ص: ۷۶ (پیرہ نمبر ۱۱۹)

2 ۔مشہور فقہی قاعدہ ہے: "الضرر یزال" ہر قسم کے ضرر اور نقصان کو دور کیا جائے گا۔ جس کی اصل حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ "لاضرر ولاضرار" ابن ماجہ، کتاب الاحکام، رقم الحدیث، ۲۳۴۰؛ نقصان برداشت کرنا جائز ہے نہ نقصان پہنچانا۔ دیکھیے: ابن نجیم، الاشباہ والنظائر مع شرح حموی، ۱/۲۵۰؛ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد ہی "دفع المظالم من بین الناس" (لوگوں سے مظالم کا دور کرنا) تھا۔ ملاحظہ ہو: حجۃ اللہ البالغہ (باب المظالم)، دارالکتب الحدیثہ بالقاہرہ، ۲/۴۷

3 ۔ملاحظہ ہو: سورۃ الاعراف، ۷:۳۳؛ النحل، ۱۶:۹۰؛ الشوریٰ، ۴۲:۳۹-۴۳؛ بنی اسرائیل، ۱۷:۳۳؛ النساء، ۴:۱۴۸، حجرات، ۴۹:۹

4 ۔دیکھیے: بخاری، الصحیح ابواب المظالم، ۱/۳۳۱؛ مسلم، الصحیح (کتاب البر والصلۃ والادب باب فی تحریم الظلم)، ۲/۳۱۹-۳۲۰

5 ۔الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، دارالکتب العلمیۃ بیروت، س۔ن، ص: ۵

اسلام میں چوری وغیرہ جیسے جرائم پر سخت ترین سزاؤں اور تعزیرات کا نفاذ بھی یقیناً اسی ظلم و زیادتی کے ازالہ کے لیے ہے۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلام ﷺ نے کسی بھی انسان کے ساتھ ظلم وزیادتی کی شناعت اور اس پر اخروی وعیدات کی وضاحت کے ساتھ ساتھ عملی طور پر مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انصر اخاک ظالماً او مظلوماً قال یا رسول اللہ هذا ننصرہ مظلوماً فکیف ننصرہ ظالماً قال تاخذ فوق یدیہ۔[1]

تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم یا مظلوم۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کریں گے مگر جب وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے؟ فرمایا تم اس کا ہاتھ پکڑ لو (ظلم نہ کرنے دو)۔

اسی طرح براء بن عازب ؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کے کرنے کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع فرمایا۔ جن سات چیزوں کا حکم دیا ان میں ایک "نصر المظلوم" (مظلوم کی مدد) بھی ہے۔[2]

آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ:

من مشی مع ظالم لیقویہ وهو یعلم انہ ظالم فقد خرج من الاسلام۔[3]

جو آدمی کسی ظالم کے ساتھ اس نیت سے چلا کہ اسے تقویت پہنچائے اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ مددگار آدمی دائرہ اسلام سے نکل گیا۔

---

[1] ۔بخاری، الجامع الصحیح (ابواب المظالم والقصاص باب اعن اخاک ظالما او مظلوما)، ۱/۳۳۱، رقم: ۲۴۴۳ - ۲۴۴۴

[2] ۔حوالہ سابق، (باب نصر المظلوم)، رقم: ۲۴۴۵

[3] ۔خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (کتاب الآداب باب الظلم ۔ الفصل الثالث)، المصباح لاہور، ص: ۴۳۶، رقم: ۵۱۳۵؛ نیز اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان، ۶/۱۲۴، رقم: ۷۶۷۵

پیغمبر اسلام ﷺ کو خود طبعی و فطری طور پر مظلوموں سے کتنی ہمدردی تھی اور ان کی داد رسی آپ کس طرح فرماتے تھے؟ اس کی تفصیلات میں جانا یہاں ممکن نہیں۔ تاہم حضرت زبیر بن عبد المطلب کی تحریک پر اہل مکہ کے چند انسان دوست رؤساء کے درمیان قائم ہونے والے "حلف الفضول" نامی معاہدہ کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہ ہو گا جو صرف اور صرف مظلوم لوگوں کی حمایت میں قائم کیا گیا تھا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے بیس سال کی عمر ہونے کے باوجود اور اعلان نبوت سے بھی پہلے اس میں بھرپور بلکہ پر زور شرکت فرمائی تھی۔ اس معاہدہ کا واحد مقصد بلا تفریق ہر مظلوم کی مدد اور ظالم کا ہاتھ روکنا تھا۔ اس کی اہم دفعات یہ تھیں:

1. اہل مکہ یا باہر سے آنے والے کسی بھی آدمی پر ظلم ہو گا تو ہم ہمیشہ اس کی حمایت میں ایک ہاتھ اور طاقت بن جائیں گے۔
2. ظالم کے خلاف یہ ہاتھ اس وقت تک اٹھا رہے گا جب تک کہ وہ مظلوم کا حق واپس نہ کر دے۔
3. ہر اجنبی اور مسافر کے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔[1]

اس موقعہ پر حضور اکرم ﷺ کے تایا حضرت زبیر بن عبد المطلب نے اپنے جذبات و عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

ان الفضول تعاقدوا وتحالفوا الا يقيم ببطن مكة ظالم
امر عليه تعاقدوا وتوافقوا فالجار والمعتر فيهم سالم [2]

بے شک معاہدہ کرنے والوں نے اس بات کا عہد کیا اور قسم اٹھائی ہے کہ سرزمین مکہ میں کوئی ظالم قیام پذیر نہیں ہو گا۔ یہ ایسا امر ہے جس پر ان سب نے متفقہ عہد کیا ہے کہ پڑوسی اور پردیسی فقیر جو ان کے ہاں ہو گا ہر قسم کے جور و ستم سے محفوظ ہو گا۔

---

[1] ۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۱۲۹؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، ۱/۱۴۵؛ سہیلی، الروض الانف، ۱/۱۵۶-۱۵۷؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۲/۲۹۱

[2] ۔دیکھیے: سہیلی، الروض الانف، ۱/۱۵۶

یہ معاہدہ جو حضرت عبداللہ بن جدعان کے مکان پر طے پایا تھا۔ معاشرے میں ظلم و زیادتی کے ازالہ کے لیے "تعاون علی البر" کی عمدہ مثال ہے۔ حضور ﷺ کو خود یہ معاہدہ اتنا عزیز تھا کہ بعد میں ایک مرتبہ جب صحابہ کرام نے حضور اکرم علیہ الصلاۃ والسلام سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے بڑی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: یہ معاہدہ تو مجھے سرخ اونٹوں (زر کثیر) سے بھی بڑھ کر عزیز تھا اور پھر ارشاد فرمایا:

ولو دعیت فی الاسلام لاجبت[1]

اگر اسلام میں بھی مجھے کسی ایسے معاہدے میں شرکت کے لیے بلایا جائے تو میں فوراً لبیک کہوں گا۔

ظلم اور ظالم کے خلاف قرآن و حدیث کی درج بالا وعیدوں کا اطلاق اہل الذمہ پر کیے جانے والے ظلم پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم عموماً عددی لحاظ سے یا بعض دوسرے پہلوؤں سے کمزور ہو سکتے ہیں۔ اس لیے نبی رحمت ﷺ نے ان پر ظلم کرنے والے کے لیے بطور خاص وعیدیں سنائی ہیں۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے یہ مرفوع حدیث بیان کی ہے جسے دوسرے محدثین نے بھی نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ارقم کی اہل الذمہ سے جزیہ وصول کرنے کی ڈیوٹی لگائی۔ جب وہ آپ کے ہاں سے روانہ ہو پڑے تو انہیں آواز دے کر بلایا اور فرمایا:

الا من ظلم معاهدا او كلفه فوق طاقته او انتقصه او اخذ منه شيئا بغير طيب نفسه فانا حجيجه يوم القيامة۔[2]

سن لو جس آدمی نے کسی معاہد (جس غیر مسلم کے جان و مال کے تحفظ کا حکومت نے ذمہ لے رکھا ہے) پر ظلم کیا یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی۔ یا اس کے حق

[1] ۔ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۲/۲۹۱

[2] ۔ دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج، دار المعرفہ، بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء، ص: ۱۲۵؛ ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب فی تعشیر اھل الذمۃ، ۲/۱۷۰، رقم: ۳۰۵۲؛ بیہقی، السنن الکبریٰ، (کتاب الجزیۃ باب لا یأخذ المسلمون من ثمار اھل الذمۃ)، ۱۴/۵۰، رقم: ۱۹۲۴۳

میں کمی کی یا اس کی دلی خوشنودی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو قیامت کے دن میں اس (غیر مسلم معاہد) کی طرف سے مدعی بن کر کھڑا ہوں گا۔

سنن بیہقی کی روایت کے مطابق اس کے بعد مزید تاکید کے لیے آپ نے انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ بھی فرمایا۔

یہاں یہ بات انتہائی قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے خود مسلمان مظلوموں کے بارے یہ نہیں فرمایا کہ انکی طرف سے قیامت کے دن ظالم کے خلاف عدالت الٰہی میں استغاثہ دائر کروں گا، مگر اہل الذمہ کے بارے فرمایا جا رہا ہے کہ ان پر کسی مسلمان یا عامل نے زیادتی کی تو میں ان کا مدعی اور مستغیث بنوں گا۔ اب جس ذمی / غیر مسلم کی وکالت کرنے والے خود نبی اکرم ﷺ ہوں تو کون مسلمان ہو گا جو اس پر زیادتی کا تصور بھی کر سکے۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہوئے آخری بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ میں نے جن لوگوں کے جان ومال اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی ہے، اس کی لاج رکھنا، اس پر آنچ نہ آنے دینا۔ (احفظوا فی ذمتی)[1]

اہل الذمہ کے حقوق کی پاسداری اور حفاظت کے حوالے سے پیغمبر اسلام ﷺ کے انہی فرمودات کے پیش نظر امام زین العابدین نے اھل الذمہ کے حق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

ولیکن بینک وبین ظلمھم من رعایة ذمة الله والوفاء بعهده وعهد رسوله فانه بلغنا انه قال: من ظلم معاهدا کنت خصمه۔[2]

اہل الذمہ کو اللہ کی طرف سے حاصل امان کی پاسداری کر کے نیز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عہد کو توڑ کر ان پر ظلم نہ کرو۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ

---

[1] ملاحظہ ہو: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مکتبہ المعارف، بیروت، ۷/۳۲۸؛ ماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصطفیٰ حلبی مصر، ص: ۱۴۳

[2] رسالۃ الحقوق، البلاغ المبین، اسلام آباد، ص: ۳۹

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی ذمی پر ظلم کرے گا تو میں اس کا مد مقابل اور مخالف ہوں گا۔

اسلام میں جنگ (اسلامی جہاد) کی مشروعیت و اجازت کی بڑی وجہ بھی استعماری اور استیصالی طاقتوں کی طرح توسیع پسندی یا دوسرے ممالک کے وسائل پر قبضہ نہیں بلکہ ظلم کا ازالہ اور ظالم لوگوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ[1]

(اب لڑنے کی) اجازت دی جاتی ہے ان (مسلمانوں) کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر (بڑا) ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے محض اس بات پر کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا تو ضرور گرادی جاتیں خانقاہیں گرجے کلیسے اور مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اور اللہ اس (فرد۔قوم) کی ضرور مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ یقیناً بڑا طاقتور اور غالب ہے۔

ایک اسلامی ریاست کی کمزور لوگوں کو بڑے لوگوں کے مظالم سے بچانے کی کتنی ذمہ داری ہے، اس کا اندازہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پہلے پالیسی ساز خطبہ خلافت کے اس عہد یا عزم صدیقی سے لگایا جاسکتا ہے جس میں فرمایا:

1۔ سورۃ الحج، ۲۲: ۳۹۔۴۰

آپ لوگ یقین رکھیے کہ میری نظر میں معاشرہ کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی وہ کمزور شخص ہو گا جس کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہو گی تا آنکہ میں اسکے جملہ حقوق واپس نہ دلادوں۔ اسی طرح میرے نزدیک معاشرہ کا سب سے کمزور فرد وہ طاقتور شخص ہو گا جو لوگوں کے حقوق غصب کرتا ہے تا آنکہ میں اس سے غصب شدہ حقوق واپس نہ لے لوں۔[1]

ظلم اسی میں منحصر نہیں کہ کسی سے اس کا مال یا اس کی چیز بلا قیمت چھین لی جائے بلکہ ظلم عام ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی سے کسی کی چیز چھین لے یا اس کے دائرہ کار میں ہو اسے چھین لے یا اس سے ناجائز مطالبہ کرے یا کوئی ایسا حق اس پر لازم کر دے جو شریعت نے اس پر فرض نہ کیا ہو، وہ ظالم ہے۔ لوگوں سے ناجائز وصول کرنے والے ظالم ہیں۔ وصولیابی میں زیادتی برتنے والے ظالم ہیں۔ مال لوٹنے والے ظالم ہیں۔ لوگوں کے حقوق نہ دینے والے ظالم ہیں۔ لوگوں کی زمینیں چھیننے والے ظالم ہیں اور کھلم کھلا ظالم ہیں۔ ان تمام ظلموں کا وبال حکومت پر ہی پڑتا ہے جو آبادی کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور ویرانی اس لیے آتی ہے کہ ظلم سے لوگوں کی تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں اور دل ٹوٹ جاتے ہیں۔[2]

شارع علیہ السلام نے جو ظلم حرام فرمایا ہے اس میں یہی حکمت کام کر رہی ہے۔ یعنی اس سے آبادی میں نقصان و بربادی لازم آتی ہے اور ظلم نسل انسانی کے ختم ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہی وہ عام حکمت ہے جس کی رعایت شرع نے اپنے پانچ لازمی مقاصد میں پیش نظر رکھی ہے۔ یعنی دین، نفس عقل، نسل اور مال کی حفاظت کی جائے انہیں ضائع نہ ہونے دیا جائے، جب کہ ظلم انسانی نسل کے خاتمہ ہو جانے کی خبر دیتا ہے کیونکہ اس سے ویرانی لازم آتی ہے تو اس میں خطرہ کا وجود ہے اس لیے ظلم کی حرمت میں سنگینی ہے۔ قرآن و حدیث میں حرمت ظلم کے دلائل ان گنت اور ضبط و حصر سے باہر ہیں۔[3]

اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اگر کسی اسلامی حکمران نے بوجوہ اہل الذمہ پر زیادتی کرنے

---

[1] ۔ابو عبید القاسم، کتاب الاموال، ص:۱۰؛ ابن سعد الطبقات الکبریٰ، ۳/۱۲۹

[2] ۔ابن خلدون، عبدالرحمن، مقدمہ ابن خلدون، (الفصل الثالث والاربعون)، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، قاہرہ، ص:۲۸۹ – ۲۹۰

[3] ۔حوالہ مذکور

کی کوشش بھی کی تو فقہائے اسلام اس کے لیے سدِ راہ بن گئے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

ابو عبید نے لکھا ہے کہ شام کے ایک علاقہ جبل لبنان میں معاہدین (اہل الذمہ) آباد تھے اور انہوں نے کوئی عہد شکنی کی۔ اس وقت شام کے والی صالح بن علی تھے۔ چنانچہ اس نے معاہدین سے جنگ کی اور انہیں جلاوطن کر دیا تو مشہور مجتہد وفقیہ امام اوزاعی نے اسے ایک طویل خط اس موضوع پر لکھا جس میں یہ عبارت بھی تھی کہ جبل لبنان میں رہنے والے ذمیوں کی جلاوطنی کا عمل ایسی صورت میں جب کہ جلاوطن کئے جانے والے بغاوت میں ایک دوسرے کے معاون نہ تھے نہ سب مجموعی طور پر مجرم تھے، یہ صحیح فیصلہ نہیں کہ آپ ان میں سے ایک جماعت کو (جس کا جرم ثابت ہو جائے) قتل کردیں اور باقی ماندہ لوگوں کو ان کی بستیوں میں واپس آنے نہیں دیا گیا کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ خواص کے عمل پر عوام کی گرفت کی جائے؟ اور ان کی پاداش میں انہیں ان کے گھروں اور مال ومتاع سے بے دخل کر دیا جائے؟ جبکہ اللہ عزوجل کا یہ فیصلہ ہم تک پہنچ چکا ہے کہ وہ خواص کے عمل پر عوام کی گرفت نہیں کر سکتا بلکہ عوام کے عمل پر خواص کی گرفت کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے سب سے زیادہ قابل اقتداء فیصلہ جس سے آگے ہمیں قدم نہیں بڑھانا چاہیے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ ہے، اور تمام وصیتوں میں سب سے زیادہ حفاظت کی مستحق رسول اللہ ﷺ کی وصیت ہے اور آپ ﷺ کا فرمان ہے۔ جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس کی قوت برداشت سے زیادہ اس پر بار ڈالا تو میں اس کی طرف سے مدافعت کروں گا۔ اور جس کا خون حرام ہو جائے اس کا مال بھی حرام ہو جاتا ہے اور اس حرمت کے مطابق اس سے عدل بھی کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ معاہدین غلام نہیں کہ تمہیں ان پر اختیار ہو کہ انہیں ایک شہر سے دوسرے شہر میں نکال دو۔ وہ تو آزاد اور ذمی ہیں ان کا شادی شدہ شخص بدکاری کی پاداش میں رجم کیا جائے گا۔ اگر ہم میں سے کوئی ان کی عورتوں سے شادی کرلے تو ان کی عورتیں ہماری عورتوں سے دنوں کی تقسیم میں قاعدہ کے مطابق اپنا حصہ لیں گی۔ نیز طلاق وعدت میں ان پر برابری کے ساتھ ہماری عورتوں کے سے قانون نافذ ہوں گے۔[1]

[1] ۔ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۷۹ (پیرا نمبر ۴۶۷)؛ بلاذری، فتوح البلدان (اُمر الجراجمة)، ص: ۱۶۷ - ۱۶۷

اسی طرح تاریخ گواہ ہے کہ کسی دور حکومت میں اگر کسی مسلمان حکمران کی طرف سے اہل الذمہ کے ساتھ زیادتی ہوئی تو بعد کے خلفاء نے اس کا ازالہ کر دیا۔ مثلاً جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ تمدن اسلام کے حصہ دوم میں بنی امیہ کے بعض عاملوں کی طرف سے غیر مسلم اہل الذمہ کے ساتھ بعض زیادتیوں کا تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ بعد میں جب عمر بن عبدالعزیز کا دور حکومت آیا تو انہوں نے اہل الذمہ پر ہونے والی ہر زیادتی کا ازالہ کیا، انہیں انصاف دلایا اور ان کی غصب شدہ جائدادیں واپس کرائیں۔[1]

اسلامی ریاست میں غیر مسلم / اہل الذمہ افرادی اور آبادی کے اعتبار سے عموماً اقلیت میں ہوتے ہیں۔ اس لیے اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی مسلمان فرد یا کوئی سرکاری افسر اکثریت کے زعم میں یا اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کرے۔ خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ کو اس چیز کا کتنا احساس اور کتنی فکر تھی؟ اس کا اندازہ درج ذیل ایک چشم دید گواہی سے لگایا جاسکتا ہے:

> عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں آپ کو نیزہ مارے جانے (جو آپ کی شہادت کا باعث بنا) سے تین دن پہلے حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ کے پاس حضرت حذیفہ اور حضرت عثمان بن حنیفؓ دونوں موجود تھے۔ حضرت حذیفہؓ ان علاقوں سے خراج وصول کرنے پر مامور تھے جنہیں دریائے دجلہ سیراب کرتا ہے جبکہ عثمان بن حنیفؓ دریائے فرات کے سیرابی علاقے میں خراج وصول کرنے کے ذمہ دار تھے۔ آپ نے ان دونوں عاملین خراج سے فرمایا: کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے وہاں کے اہل علاقہ پر ان کی طاقت سے زیادہ خراج وصول کیا ہو؟ حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا: (ہرگز نہیں) میں نے بہت سی پیداوار چھوڑ دی ہے (جس کا خراج نہیں وصول کیا گیا) اسی طرح حضرت عثمانؓ نے عرض کیا۔ میں نے دوگنا

---

[1] ۔تاریخ تمدن اسلام (مترجم مولوی محمد حلیم انصاری) شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۶۳ء، ۲/ ۳۱-۳۲

پیداوار خراج وصول کیے بغیر چھوڑ دی ہے اگر چاہتا تو (اصولی و قانونی طور پر) اس کا مالیہ وصول کر سکتا تھا۔[1]

علی ہذا القیاس ایک عامل نے ایک نصرانی تاجر سے دریائے فرات عبور کرتے ہوئے ٹیکس (عشور) وصول کر لیا۔ تاجر واپس لوٹا تو عامل نے دوبارہ ٹیکس لینا چاہا۔ اس نے کہا کیا تم ہر دفعہ مجھ سے آتے جاتے ٹیکس وصول کرو گے؟ عامل نے کہا: ہاں۔ اس پر نصرانی تاجر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی شکایت پیش کی تو آپ نے فرمایا: وہ اس بات کا مجاز نہیں۔ تیرے مال تجارت میں سال میں صرف ایک مرتبہ ہی ٹیکس ہے۔ پھر آپ نے عامل کی طرف بھی یہ حکم بھیج دیا۔ سرخسی نے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اس نصرانی تاجر نے حضرت عمرؓ کا یہ انصاف دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔[2]

اسی طرح اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد حکومت میں آپ کے ایک عامل عبد الحمید بن عبد الرحمن نے جب حیرہ (شام) کے ان یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں سے جزیہ وصول کرنا چاہا جو اسلام لے آئے تھے، یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ جزیہ سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر رہے ہیں، تو خلیفۃ المسلمین نے اسے ایسا کرنے سے روکتے ہوئے لکھا:

ان الله جل ثناء ہ بعث محمداً ﷺ داعیاً الی الاسلام ولم یبعثه جابیاً فمن اسلم من اهل تلک الملل فعلیه فی ماله الصدقة ولا جزیة علیه۔[3]

بے شک اللہ جل شانہ نے حضرت محمد ﷺ کو داعی اسلام بنا کر مبعوث فرمایا تھا نہ کہ محصل بنا کر پس ان اہل ملت میں سے جو آدمی اسلام قبول کر لے تو اس پر اس کے مال

---

[1] - یحییٰ ابن آدم قرشی، کتاب الخراج (مشمولہ در موسوعۃ الخراج)، دار المعرفۃ، بیروت-لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص: ۷۶؛ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۲۵ (پیرہ نمبر ۱۰۶)

[2] - دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج (مشمولہ در موسوعۃ الخراج)، طبع مذکور، ص: ۱۳۶

[3] - حوالہ مذکور، ص: ۳۱ (کتاب الخراج)

میں صدقہ (زکوۃ) ہے اور اس پر جزیہ نہیں ہے۔

ایک دوسرے عامل "حبان بن شریح" نے بھی اسلام قبول کرنے والے اہل الذمہ پر جزیہ لگانے کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے اجازت چاہی تو پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے مذکورہ مقصد کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اسے بیس کوڑے بھی لگوائے۔[1]

یہود مدینہ کے ساتھ کیے گئے حضور اکرم ﷺ کے مشہور معاہدہ "میثاق مدینہ" کی مدینہ ایک اہم دفعہ تھی:

وان النصر للمظلوم۔[2]

اور بے شک ہر مظلوم (خواہ مسلمان ہو یا یہودی) کی مدد کی جائے گی۔

الغرض مذکورہ تصریحات اس بات کی دلیل ہیں کہ بغیر کسی مذہبی و نسلی تفریق کے اسلامی ملکوں میں بسنے والے ہر شہری کو ہر ظلم و زیادتی سے بچانا اور ہر مظلوم کی مدد کرنا اسلامی ریاست کا لازمی فرض اور اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ممکن ہے بعض اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم رعایا پر ظلم و زیادتی کے واقعات بھی مل جائیں۔ مثلاً جرجی زیدان نے اپنی کتاب تاریخ تمدن اسلام کی جلد دوم میں بنی امیہ کے چند عاملوں اور حکمرانوں کے اپنی مفتوحہ غیر مسلم اقوام (اہل الذمہ) پر جزیہ و خراج کی وصولی وغیرہ کے حوالے سے بعض مظالم اور زیادتیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح جولائی۔اگست ۲۰۰۹ء میں پاکستان کے شہر گوجرہ کے ایک قریبی گاؤں میں عیسائی آبادی کی طرف سے قرآنی اوراق جلانے کے ایک واقعہ پر وہاں کے مسلمانوں نے اشتعال اور جذبات میں آکر عیسائی آبادی کو نقصان پہنچایا اور ان کے گھروں اور املاک کو جلا دیا۔ مگر ایسے واقعات سے کسی بھی قوم کی تاریخ خالی نہیں۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی یہ اصولی بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسلام کا قانون اور کسی مسلمان حکمران کا عمل الگ الگ چیزیں

---

[1] - جرجی زیدان، تمدن اسلام، ۲/ ۳۳

[2] - دیکھیے: ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دارالمعرفۃ بیروت، ق ۱ ص:۵۰۲؛ ابن کثیر البدایہ والنہایہ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۳/ ۲۹۳؛ ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص:۲۰

ہیں۔ اسلامی قانون کی رو سے اسلامی حکومت (جیسا کہ گزشتہ ابواب میں تفصیل سے گزر چکا ہے) اپنی غیر مسلم رعایا کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جو مسلمان حکمران اس کے خلاف عمل کرتا ہے، اسلام اس کا ذمہ دار نہیں ہے اور اس کی نگاہ میں یہ فعل اتنا ہی ناپسندیدہ ہے جتنا غیر مسلم کے لیے ناپسندیدہ ہے۔

ساتواں اصول: ایفائے عہد

ایک اسلامی ریاست کے بنیادی اور نمایاں اصولوں میں سے ایک انتہائی اہم اصول ایفائے عہد یا معاہدات کی پابندی بھی ہے۔ اسلام میں عقد ذمہ سمیت کسی بھی انفرادی یا اجتماعی معاہدے کی حیثیت چاہے وہ کسی مسلمان سے کیا گیا ہو یا غیر مسلم سے، محض کاغذ کے ایک ٹکڑے کی نہیں ہوتی۔ وہ اسے فریب اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بناتا ہے نہ مخصوص و مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کی آڑ لیتا ہے اور نہ طاقت کے نشے میں کمزور پر مسلط کرنے کو روا سمجھتا ہے۔ اسلامی ریاست جب کسی قوم سے معاہدہ کرتی ہے تو قرآن و سنت کی رو سے اس معاہدہ کی پاسداری اور ایفائے عہد اس پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے۔ جب تک فریق مخالف اس کو توڑنے میں پہل نہ کرے، شرعی اعتبار سے اسے توڑا جا سکتا ہے نہ اس کی شرائط کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔[1] قرآن مجید کی متعدد آیات میں اہل ایمان کو ایفاء عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ جن کا اندراج یہاں طوالت کا باعث ہو گا۔ اسی طرح ان آیات کی تفسیر میں ائمہ مفسرین اور مجتہدین کے اقوال اور تصریحات کی بھی یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔[2]

قرآن و حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ ایمان اور ایفائے عہد لازم و ملزوم ہیں اور عہد کو پورا کرنا ایک ایسا مستحکم اصول و دستور ہے جسے توڑا نہیں جا سکتا۔ عہد توڑنا کسی مسلمان کے شایان شان نہیں بلکہ

---

[1] ۔ دیکھیے " ترمذی، جامع (ابواب السیر باب ماجاء فی الغدر)، ۱/ ۴۲۰؛ ابو داؤد، السنن (کتاب الجہاد، باب فی الامام یکون بینہ وبین العدو عہد فیسیر نحوہ)، ۲/ ۳۱-۳۲، رقم: ۲۷۵۹؛ ابن قیم، زاد المعاد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۵/ ۸۸

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ المائدہ: ۱؛ سورۃ النحل، ۱۶: ۹۱؛ سورہ بنی اسرائیل، ۱۷: ۳۴؛ سورۃ التوبۃ، ۹: ۴، ۷، اور ان آیات قرآنی کی تفسیر

ازروئے حدیث منافق کا شیوہ ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کی یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔[2]

اور جب وہ کوئی عہد کرتے ہیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ اہل ایمان کے اس وصف کو یوں بیان فرمایا گیا کہ

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ۔[3]

وہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں جو کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں دیتے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ایفاء عہد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین لمن لا عهد له۔[4]

اس آدمی کا کوئی ایمان نہیں جو امانت کا پاس نہیں کرتا اور اسی طرح اس آدمی کے دین کا بھی کوئی وزن نہیں جو اپنے عہد کا پاس نہیں کرتا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی ایفائے عہد کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ قریش مکہ کے لشکر نے جب حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے باپ کو راستے میں گرفتار کر لیا اور پھر اس شرط پر رہا کیا کہ وہ دونوں غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ قریش کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ تو جب یہ باپ بیٹا میدان بدر میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ کو سارا ماجرا سنایا تو فرمایا: "انصرفا نفی لهم بعهدهم ونستعین الله علیهم" (تم دونوں حسب عہد واپس لوٹ جاؤ ہم ان کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کریں گے اور ان کے مقابلے میں اللہ سے مدد چاہیں گے)۔[5]

---

[1] ۔ خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (باب الکبائر وعلامات النفاق۔ الفصل الاول)، ص: ۱۷

[2] ۔ البقرہ، ۲:۱۷۷

[3] ۔ الرعد، ۱۳:۲۰

[4] ۔ خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح، (کتاب الایمان۔ الفصل الثانی)، رقم الحدیث: ۳۵؛ مسند احمد، رقم: ۱۲۴۱۰؛ شعب الایمان للبیہقی، رقم: ۴۳۵۴

[5] ۔ مسلم، الصحیح (کتاب الجہاد والسیر، باب الوفاء بالعہد) ۲/ ۱۰۶؛ ابن قیم، زاد المعاد، (فصل فی حکمہ فی الوفاء بالعہد لعدوہ الخ) طبع مذکور، ۵/ ۸۸، رقم الحدیث: ۴۶۳۹

مشہور مؤرخ بلاذری نے فتوح البلدان، طبری نے اپنی معروف تاریخ اور عصر حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ" میں عہد نبوی ﷺ اور عہد خلفاء راشدین ﷺ کے اہل الذمہ کے ساتھ متعدد ایسے معاہدے نقل کیے ہیں جن کے شروع یا آخر میں یہ الفاظ درج ہیں کہ اس معاہدہ میں جو شرائط درج کی گئی ہیں، مسلمانوں کی طرف سے اس کے ایفاء کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ہے۔(لہٗ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ) لہذا جو شخص یا حکومت اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے گی گویا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرے گی۔

اہل الذمہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی مسلمانوں کی طرف سے پاسداری اور کمال ایفاء کی متعدد مثالیں تاریخ اسلام سے پیش کی جا سکتی ہیں جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ تاہم اہل الذمہ کے ساتھ ایفائے عہد کی ایک نادر اور بے نظیر مثال کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہو گا۔ جسے امام ابو یوسفؒ اور بلاذریؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ عہد فاروقی میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے اہل حمص (شام) سے جو معاہدہ کیا اس میں یہ شرط تھی کہ اگر ہم تمہاری حفاظت کریں گے تو ہم جزیہ لینے کے مستحق ہوں گے ورنہ نہیں۔ معاہدہ کے مطابق اہل حمص سے جزیہ کی وصولی شروع ہو گئی مگر جب شام میں خلافت اسلامیہ کی شمالی سرحدوں پر رومیوں نے اپنی افواج جمع کر دیں تو اس صورت حال میں حمص اور دیگر شہروں کی حفاظت چونکہ مشکل ہو گئی اس لیے حضرت ابو عبیدہؓ نے حسب معاہدہ جن علاقوں کے باشندوں سے مذکورہ شرط پر صلح ہو چکی تھی، ان کے والیوں کو حکم دیا کہ اپنے شہروں سے جتنا جزیہ وصول کر چکے ہیں سب کو واپس کر دو۔ اس حکم کے ساتھ انہوں نے ان علاقوں کے شہریوں کے نام ایک خط بھی لکھا، جس میں واضح کیا کہ ہم تمہارے مال اس لیے واپس دے رہے ہیں کہ دشمن نے جس قدر افواج ہم پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع کر دی ہیں، اس کی خبر ہمیں مل گئی ہے۔ معاہدے میں آپ لوگوں سے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے مگر ان معروضی حالات میں ہمارے لیے اس کی پابندی ممکن نہ ہو گی۔ ہم نے جو کچھ (جزیہ-خراج) آپ لوگوں سے لیا تھا وہ واپس کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کی اور دشمن پر ہم نے غلبہ پالیا تو تمہارے ساتھ کیے گئے معاہدے پر اور جو کچھ اس میں طے پایا ہے ہم اس پر

قائم رہیں گے۔[1]

حسب ہدایت تمام والیوں نے جب اہل علاقہ کو ان سے وصول شدہ جزیہ کی رقم واپس کر دی اور حضرت ابو عبیدہؓ کا خط انہیں پڑھ کر سنایا تو اس کمال انصاف کو دیکھ کر ان کی زبانوں پر بے ساختہ یہ دعاء جاری ہو گئی کہ

ردکم الله علینا ونصرکم علیهم فلو کانوهم لم یردوا علینا شیئاً

واخذوا کل شئی بقی لنا حتی لا یدعوا لنا شیئا[2]

اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ ہمارے پاس لوٹا کر لائے اور ان (رومیوں) کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے۔ اگر وہ لوگ (رومی حکمران) ہوتے تو ہمیں (یقین ہے کہ) کوئی ایک چیز بھی واپس نہ کرتے بلکہ جو کچھ ہمارے پاس باقی بچ جاتا وہ بھی لے لیتے اور ہمارے لیے کوئی چیز نہ چھوڑتے۔

اسی طرح تاریخ اسلام سے غیر مسلم معاہدین کے ساتھ کمال ایفاء عہد کی ایک اور مستند گواہی ملاحظہ ہو، ایک چشم دید گواہ (سلیمان بن عامر حمیری) کہتے ہیں:

حضرت امیر معاویہؓ اور روم کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ تھا۔ ان معاہدہ کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ حضرت امیر معاویہؓ اس ارادہ سے فوج لے کر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہو پڑے کہ جوں ہی معاہدہ کی مدت پوری ہو گی، ہم ان کے ساتھ جنگ شروع کر دیں گے۔ دوران سفر لشکر نے دیکھا کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار آرہا ہے اور یہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

"الله اکبر، الله اکبر وفاء لا غدر" (اللہ اکبر، اللہ اکبر، معاہدے کی پاسداری کرو، نہ کہ بدعہدی۔) لوگوں نے دیکھا تو وہ صحابی رسول حضرت عمرو بن عبسہؓ تھے۔ امیر لشکر امیر معاویہؓ نے انہیں بلایا اور اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ آدمی جس کے درمیان اور کسی قوم کے درمیان کوئی معاہدہ ہو تو وہ اس عہد کی پابندی کرتے ہوئے اسے ہرگز نہ توڑے یہاں تک کہ اس معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے یا وہ اسے ان کی طرف واپس کر دے یعنی اسے توڑ دینے کا

---

[1] - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۳۸

[2] - حوالہ مذکور، ص:۱۳۹؛ نیز بلاذری، فتوح البلدان (یوم الیرموک)، ص:۱۴۳

اعلان کر دے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے یہ حدیث نبوی ﷺ سنی تو واپس لوٹ آئے۔[1]

غیر مسلم معاہدین یا اہل الذمہ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی پابندی شرعی اعتبار سے کتنی لازم ہے اس کا اندازہ عہد فاروقی میں مشہور عیسائی قبیلے بنو تغلب کے ساتھ کیے گئے معاہدہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد حکومت میں بنو تغلب نے قبول اسلام سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ لگانا چاہا تو انہوں نے اپنی عربی نخوت کی وجہ سے اس کو ناپسند کیا اور ملک چھوڑ کر باہر نکل جانے پر آمادہ ہو گئے۔ عبادہ بن نعمان تغلبی (اور ایک روایت کے مطابق زرعہ بن نعمان بن زرعہ) بیچ میں پڑے اور انہوں نے اس معاملے میں حضرت عمرؓ سے بات کی اور آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ یہ جنگجو لوگ اگر آپ کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے تو دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ جس پر حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کی بجائے صدقہ عائد کر دیا البتہ اس کی مقدار دوگنی کر دی۔ ان کے ساتھ معاہدہ میں یہ شرط بھی رکھی گئی کہ اگر ان کا کوئی بچہ مسلمان ہونا چاہے گا تو وہ اسے مسلمان ہونے سے نہیں روکیں گے۔ یہ معاہدہ کوئی اڑھائی تین سو سال تک قائم رہا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں، بنی امیہ کے عہد میں، منصور عباسی کے عہد میں حتی کہ معتصم عباسی کے زمانے میں ایسے حالات پیدا ہوتے رہے کہ حکمرانوں نے اس معاہدہ کو کالعدم قرار دینا چاہا لیکن مسلمان فقہاء اور ائمہ مجتہدین ہمیشہ بنو تغلب کے تحفظ اور وفا کے لیے کھڑے ہو گئے اور اس معاہدہ فاروقی کی بنیاد پر حکمرانوں سے ٹکر لی اور ان پر واضح کیا کہ شرعی اعتبار سے اس معاہدہ کو نہیں توڑا جا سکتا۔[2]

اہل الذمہ کے ساتھ ایفائے عہد کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے وصال کے وقت اپنے مابعد خلیفہ کے لیے جو وصیتیں فرمائیں۔ ان میں ایسے اہل الذمہ کے ساتھ نرمی کے

---

[1] - ابو داود، السنن (کتاب الجهاد باب فی الامام یکون بینه وبین العدو عهد فیسیر نحوه)، ۲/ ۳۲-۳۱، رقم ۲۷۵۹، جامع ترمذی، ابواب السیر باب ماجاء فی الغدر، ۱/ ۴۲۰

[2] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابو عبید، کتاب الاموال (پیرہ نمبر ۷۱ اور ۱۶۹۹)، ص: ۲۰، ۲۱۷؛ نیز دیکھیے: محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک (خطبہ: اسلامی ریاست کے غیر مسلموں سے تعلقات)، ص: ۲۸۸-۲۸۷

ساتھ اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کے ساتھ ساتھ یہ وصیت بھی فرمائی: ان یوفی لھم بعھدھم۔[1] ان کے ساتھ کیے گئے عہد (عقد ذمہ) کو ہر قیمت پر پورا کیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کو اہل الذمہ کے ساتھ معاہدوں کی پابندی اور ذمیوں کے حقوق کے تحفظ کا اتنا اہتمام تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً فوجی افسروں اور صوبوں کے گورنروں کو اس کے بارے میں تاکیدی احکام بھیجتے رہتے تھے۔ فاتح شام حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا:

وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکل اموالھم الا بحلھا ووف لھم بشرطھم الذی شرطت لھم فی جمیع ما اعطیتھم۔[2]

مسلمانوں کو اہل الذمہ پر ظلم کرنے، انہیں نقصان پہنچانے اور ناجائز طور پر ان کے اموال کھانے سے منع کرو۔ علاوہ ازیں ان کے ساتھ کیے گئے تمام معاہدات میں تم نے جو ان سے شرائط طے کی ہیں انہیں پورا کرو۔ ایفائے عہد کے معاملے میں قرآن و سنت اور اسلام کی درج بالا تعلیمات کے پیش نظر ہی فقہاء اسلام نے جہاد کے آداب و احکام بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

وینبغی للمسلمین ان لا یغدروا۔[3] (اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دشمن سے کبھی بدعہدی نہ کریں۔

---

1 ۔ دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۴؛ بخاری، الصحیح (کتاب الجہاد باب الوصاۃ باھل ذمۃ رسول اللہ ﷺ)، ۱/۴۴۸؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب الوصاۃ باھل الذمۃ)، ۱۴/۵۳، رقم ۱۹۲۵۲

2 ۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۸۲

3 ۔ مرغینانی، ہدایہ (کتاب السیر باب کیفیۃ القتال)، ۲/۵۴۶؛ القدوری، مختصر القدوری (کتاب السیر)، ص:۴۹۷؛ نسفی، کنز الدقائق (کتاب السیر والجہاد)، ص: ۱۷۸

باب دوم

حقوق انسانی اور اسلام

پہلی فصل

حقوق کا معنی اور اقسام

لغوی معنی:

حقوق عربی لفظ ہے جس کا واحد حق ہے، جبکہ حق کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔[1] زیر تحقیق موضوع میں حق کا وہ معنی مد نظر اور ملحوظ رکھا گیا ہے جو فرض کے مقابلے میں آتا ہے۔ حق کا لغوی معنی متعدد اہل لغت نے (مادہ حق کے تحت) الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ

حَقَّ حقاً الامر ثبت ووجب وحقاً الامر اثبته واوجبهٗ والحق (جمع حقوق) الموجود الثابت الامر المقضی۔[2]

حق (باب نصر) کا لفظ جب لازمی معنی میں آئے تو اس کا مطلب ہے کسی معاملے کا ثابت اور واجب ہونا۔ اور یہی لفظ جب متعدی معنوں میں مستعمل ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کسی معاملے کو ثابت اور واجب کرنا۔ جبکہ لفظ حق (جسکی جمع حقوق ہے) کا معنی ہے: موجود چیز، ثابت چیز، ایسا معاملہ جس کا فیصلہ ہو چکا ہو۔

معجم لغۃ الفقہاء میں لفظ حق کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الحق جمع حقوق : الصواب، ضد الباطل، الثابت الذی لا یجوز

1۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن منظور جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، داراحیاء التراث العربی، بیروت (طبع جدید و محققہ)، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء، ص:۲۵۵ تا ۲۵۸ ؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، طبع اول ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء، ۸ / ۴۳۵-۴۳۹؛ دیگر عربی لغات تحت لفظ "حق"

2۔ لویس معلوف الیسوعی، المنجد فی اللغۃ، الکاثولیکیہ بیروت الطبعۃ الجدیدۃ، ت۔ن، ص:۱۴۴؛ دیگر عربی لغات لسان العرب، الصحاح اور محیط المحیط وغیرہ

انکارہٗ۔ Right[1]

حق (جمع حقوق) سے مراد ہے صحیح، باطل کی ضد، ایسی ثابت چیز جس کا انکار جائز نہ ہو۔ انگریزی زبان میں حق کے لئے Right کا لفظ بولا جاتا ہے۔

عربی زبان میں حق کے ذمہ دار کی تعیین کے لیے حق کے ساتھ "علیٰ" کا صلہ آتا ہے جبکہ حقدار کی تعیین کے لیے حق کے ساتھ لام کا صلہ لایا جاتا ہے۔[2] پہلے کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۔[3]

اور تم انہیں (مطلقہ عورتوں کو جوڑا دے کر) نفع پہنچاؤ۔ مالدار پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی طاقت کے مطابق (کپڑوں کا جوڑ دینا) لازم ہے۔ دستور کے مطابق انہیں فائدہ پہنچاؤ۔ یہ بھلائی کا کام کرنے والوں پر واجب ہے۔

جبکہ صلہ لام کی مثال درج ذیل آیت کریمہ ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔[4]

ان کے مالوں میں حق ہے مانگنے والے اور (شرم وحیا کی وجہ سے مانگنے سے) محروم (رہنے والے) کے لیے۔

اصطلاحی مفہوم

دیوانی قانون کے سیاق وسباق میں حق سے مراد وہ استحقاق یا Entitlement ہے جس کا مطالبہ

---

[1] ۔ محمد رواس قلعہ جی وحامد صادق قنیبی، معجم لغۃ الفقہاء (عربی انگلیزی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، س۔ن، ص:۱۸۳

[2] ۔ لسان العرب، حوالہ مذکور

[3] ۔ البقرہ، ۲۳۶:۲

[4] ۔ الذاریات، ۱۹:۵۱

عدالت کے ذریعے یا کسی قانونی اورامر یا حکومت کے ذریعے کیا جا سکے۔[1] علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نزدیک حق کا مفہوم یہ ہے کہ:

> ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔[2]

پھر سید صاحب مذکور حقوق کی مزید تشریح میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۹ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے، ایک گونہ لگاؤ ہے پس اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی وحفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے۔ اسی ذمہ داری کا نام "حق" ہے جس کو اس کو خود ادا کرنا ضروری ہے۔[3]

محمد صلاح الدین صاحب (المنصف حیدری) مزید وضاحت کرتے ہوئے حقوق کا اصطلاحی مفہوم یوں بیان کیا ہے:

> انسان طبعاً معاشرت پسند ہے۔ اس کی گروہی جبلت اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ اپنی پیدائش سے لے کر تادم زیست بے شمار افراد کی خدمات، توجہ، امداد اور سہاروں کا محتاج ہے۔ اپنی پرورش، خوراک، لباس، رہائش اور

---

[1] - غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، الفیصل لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۵۸

[2] - سیرۃ النبی، الفیصل لاہور، ۱۹۹۱ء، ۶/ ۱۰۷

[3] - حوالہ سابق

تعلیم و تربیت کی ضروریات ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء اوران کے عملی اظہار کے لئے بھی وہ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اس کے گرد تعلقات کا ایک وسیع تانا بانا تیار کرتی ہے۔ خاندان، برادری، محلے، شہر، ملک اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی تک پھیلے ہوئے تعلقات کے لیے چھوٹے بڑے دائرے اس کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ ماں، باپ، بیٹے، شاگرد، استاد، مالک، ملازم، تاجر، خریدار، شہری اور حکمران کی بے شمار مختلف حیثیتوں میں اس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں وہ کچھ متعین حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔[1]

انگریزی زبان میں جیسا کہ اوپر گزرا، حق کے لیے Right کا لفظ مستعمل ہے۔ جس کی تعریف ماہر قانون Henry Campbell کے مطابق یوں ہے:

A power, privilege or immunity guaranteed under a constitution, statutes or decisional laws or claimed as a result of long usage.[2]

ایک اختیار، استحقاق یا تحفظ جس کو دستور، تحریری قانون یا (عدالتی) فیصلوں سے وجود میں آنے والے قوانین کے تحت ضمانت دی گئی ہو یا جسے طویل رواج و استعمال کے نتیجے میں حاصل کیا گیا ہو۔

انگریزی میں لفظ Right کی یہ تعریف قانونی اعتبار سے ہے۔ ورنہ انگلش ڈکشنریز کے مطابق Right کا لفظ بیسیوں بلکہ سینکڑوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں انتہائی باریک

---

1 - بنیادی حقوق، ترجمان القرآن، لاہور ص: ۳۱

2 - Black's Law Dictionary, 6th ed. West Publishihgn Co. USA, 1990, P:1324

فونٹ میں بڑے سائز کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں ان مختلف معانی کی تفصیل موجود ہے۔[1]

حقوق کی قسمیں

انسانی حقوق کی مختلف حیثیتوں، نفاذ، حکومتی اختیار اور قانونی اعتبار سے ان کے مرتبہ و مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقوق میں بعض کی حیثیت اخلاقی ہوتی ہے جن کا نفاذ یا ادائیگی انسان کے ضمیر اور وجدان پر چھوڑ دی گئی ہے مثلاً مریض کی عیادت، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، حاجت مندوں کی اعانت، پڑوسیوں سے حسن سلوک وغیرہ[2] اور بعض کو قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ وہ انتظامیہ کے ذریعے قابل نفاذ اور عدلیہ کے ذریعے قابل حصول ہوتے ہیں۔ مثلاً جان ومال کے تحفظ کا حق، کاروباری آزادی کا حق اور ملکیت و اجرت کا حق وغیرہ۔ یہ حقوق اصطلاح میں قانونی حقوق (Legal Rights) یا مثبت حقوق (Positive Rights) کہلاتے ہیں۔

فرد کے عمومی حقوق کا ایک دائرہ حکومت وریاست سے تعلقات کا ہے۔ اس دائرہ میں ایک وسیع الاختیار اور کثیر الوسائل ریاست کے مقابلے میں ایک فرد / شہری کو جو حقوق دیے جاتے ہیں انہیں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کہا جاتا ہے۔ ان حقوق کے لئے بنیادی انسانی حقوق (Basic Human Rights) اور انسان کے پیدائشی حقوق (Birth Rights of Man) کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کی بجائے سب سے بالاتر قانون "دستور" میں دی جاتی ہے۔ انہیں بنیادی حقوق اس لیے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی بازو خواہ وہ انتظامی ہو یا قانون ساز، ان کی خلاف

---

[1] - The New Shorter Oxford English Dictionary, Clarendon Press Oxford, 1993, 2/2598-2600

آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری (مرتب ومترجم شان الحق حقی)، اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۴۵۰- ۱۴۵۱

[2] - یہ الگ بحث ہے کہ ایک مسلمان کے لئے ان حقوق کی ادائیگی بھی ازروئے قرآن وسنت اور اخلاق کتنی ضروری ہے۔

ورزی نہیں کر سکتا۔[1]

بنیادی حقوق

ممتاز ماہر قانون سابق چیف جسٹس پاکستان جسٹس محمد منیر نے بنیادی حقوق کی تعریف یوں کی ہے:

> بنیادی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جو ایک آزاد معاشرہ میں بلا تخصیص مذہب وملت، رنگ و نسل، ہر مرد و زن، بوڑھے، جوان اور بچے کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی اساس اس فلسفیانہ نظریہ پر ہے کہ دنیا میں ایک ماورائی قانون کا وجود ہے جو مقننہ کی خواہش پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے بیشتر دساتیر میں ان حقوق کے خلاف قانون سازی کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ ان بنیادی حقوق کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ اور دیگر حکومتی ور یاستی اداروں کو ان حقوق میں مداخلت کرنے پر صریحاً یا معنوی طور پر پابندیاں عائد کرنے پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔[2]

اسلام میں بنیادی حقوق سے مراد شریعت کی طرف سے عطا کردہ وہ حقوق ہیں جو ہر انسان کو بحیثیت انسان پیدائشی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حقوق انسان کی معاشرتی وتمدنی زندگی کے لیے اس کے مدنی الطبع ہونے کی بنا پر نہایت ضروری ہیں۔ اور ان کے بغیر انسان کی بقاء اور اس کی شخصیت کی تعمیر ناممکن ہے۔ اسلام یہ حقوق بلا تفریق جنس، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، قوم اور دین ومذہب ہر انسان کو عطا کرتا ہے اور اسلامی ریاست میں مقیم سربراہ حکومت سے لے کر ایک عام شہری تک یکساں طور پر ان سے مستفید ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔ ان بنیادی اور انسانی حقوق کی تعریف ایک انڈین مفکر نے انگریزی میں یوں کی ہے:

> In reality, the meaning of Human Rights is so wide that it is not easy to define. Normaly, it means, all

---

[1] ۔صلاح الدین، محمد، بنیادی حقوق، ص:۳۲

[2] ۔شرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، پی ایل ڈی پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۳۴

those rights which are necessary for the development of human being. Human rights is releated to the existence and overall growth of human being, it is necessary to his freedom and dignity and a precondition for his physical, moral, social and spiritual growth. These rights provide a congenial environment for physical and moral growth of man.[1]

در حقیقت انسانی حقوق کا معنی و مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اس کی تعریف کرنا آسان نہیں۔ عام طور پر ان کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ وہ تمام حقوق جو بنی نوع انسان کی ترقی (فلاح و بہبود) کے لیے ضروری ہیں۔ انسانی حقوق بنی نوع انسان کے وجود (زندگی) اور مجموعی طور پر ان کی ترقی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی آزادی، مرتبہ و مقام کے لحاظ اور اس کی جسمانی، اخلاقی، سماجی اور روحانی ترقی کے لئے لازمی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ حقوق ایک آدمی کی جسمانی اور روحانی ترقی کے لئے ہمدردانہ ماحول مہیا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد علوی نے مشہور مغربی مفکر لاسکی کے حوالے سے حقوق کی تعریف اور اہمیت یوں بیان کی ہے:

Rights, in fact are those conditions of social life without which no man can seak, in general to be himself at his best.[2]

حقوق اصل میں سماجی زندگی کی وہ شرائط ہیں جن کے بغیر کوئی آدمی عام طور پہ بہترین انداز میں اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔

1 - Sudhir Kumar Singh, Human Rights in Pakistan, Pentagun Press, New Delhi, 2007, P:2

2 - اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۱۲

بنیادی حقوق کا تعین

مغرب میں تین چار صدیوں کی طویل جدوجہد، کشمکش، درجہ بدرجہ معاہدوں اور متعدد منشوروں (جن کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی) کے بعد بالآخر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے "عالمی منشور انسانی حقوق" کے اعلان (The Universal Declaration of Human Rights (UNO) 1948) میں ۳۰ دفعات اور ایک تمہید پر مشتمل جن انسانی حقوق کا تعین اور دنیا میں ان کے نفاذ کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔[1] ان کی نشاندہی اسلام نے چودہ سو سال پہلے کر دی تھی۔ قرآن مجید کی ترتیب انسانی تالیفات کی مانند محدود سوچ اور مخصوص ابواب بندی اور فصول کی ترتیب جیسی نہیں کہ ہمیں اس میں دفعہ وار ان حقوق کی تفصیل مل جائے۔ تاہم قرآن مجید نے بعض مقامات پر ان حقوق کی طرف اپنے معجزانہ ایجاز واختصار میں اشارہ کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں پوری نوع انسانی کو کسی رنگ نسل زبان، مذہب و عقیدہ اور وطن کی تمیز کے بغیر، مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

---

[1] دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Robertson, A. H and Marrills, J.G, Human Rights in the world, Manchester University Press Manchester and New York, 1994, P:1-2 ; Time Dune and Nicholas, Human Rights in global politics, Cambride University Press UK, 1999, P: 103-110

Law relating to protection of Human Rights, Orient Publishing Co. New Delhi, India, 2000 (Millennian Edition), P:1500-1504 سید مودودی، اسلامی ریاست، ص: ۵۵۰ :۵۵۴

صلاح الدین، بنیادی انسانی حقوق، ص: ۳۷ تا ۴۶؛ ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ص: ۷۰۹ تا ۷۱۱؛ ڈاکٹر نثار احمد، خطبۂ حجۃ الوداع، بیت الحکمۃ، لاہور، ص: ۱۳۵ - ۱۳۶

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا [1]

اللہ کریم وہ ذات ہے جس نے تمہارے نفع کے لئے پیدا فرمایا، جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب۔

نحوی ترکیب کے مطابق آیت کریمہ میں لفظ "ما" عموم کے لیے ہے اور اس عموم میں ہر قسم کے شبہ کو "جمیعاً" کے لفظ نے دور کر دیا ہے۔ جمیعاً کا لفظ کل کے معنی میں ہے۔ جس میں دین دنیا کی تمام نعمتیں کھانے پینے، لباس، شادی بیاہ، سواریاں، قدرتی مناظر، حیوانات، نباتات، معدنیات، پہاڑ اور علمی نعمتیں وغیرہ سب آگئی ہیں۔[2] اسی آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے بعض فقہاء و علماء نے کہا ہے کہ اشیاء میں اصل چیز "حلت" ہے۔ اور "حرمت" کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔

هذا يدل على اباحة الاشياء فى الاصل الا ماورد فيه دليل الحظر[3]

یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ اصل میں تمام اشیاء مباح ہیں ماسوا اس چیز کے جس میں حرمت / ممانعت کی دلیل وارد ہوئی ہو۔

علامہ آلوسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

اى خلق لاجلكم جميع ما فى الارض لتنتفعوا به فى امور دنياكم بالذات او بالواسطة وفى امور دينكم بالاستدلال والاعتبار۔[4]

یعنی اللہ نے زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہاری خاطر پیدا کیا ہے تاکہ تم دنیا کے معاملات میں اس کے ذریعے بلاواسطہ یا بالواسطہ فائدہ حاصل کرو اور اپنے دین کے

---

[1] ۔ البقرہ، ۲: ۲۹

[2] ۔ ملاحظہ ہو: ابو حیان اندلسی، تفسیر البحر المحیط، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۳ء، ۱/ ۱۹۳

[3] ۔ دیکھیے: ابن الفرس الاندلسی، ابو محمد عبد المنعم بن عبد الرحیم (م ۵۹۷ھ) ؛ احکام القرآن، دار ابن حزم بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء، ۱/ ۴۶

[4] ۔ روح المعانی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ت۔ن، ۱/ ۲۱۵

معاملات میں استدلال اور اعتبار (عبرت) کے ذریعے فائدہ اٹھاؤ۔

آیت کریمہ میں لفظ "لکم" کی تفسیر میں علامہ زمخشری نے لکھا ہے:

(لکم) لاجلکم ولا نتفاعکم به فی دنیاکم ودینکم۔[1]

یعنی زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہاری خاطر اور اس کے ذریعے تمہارے دنیا اور دین میں نفع اٹھانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ النحل کی آیات ۵ تا ۱۸ میں متعدد اشیاء کائنات کے بارے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ان اشیاء کو محض انسانی منفعت کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ علی ہذا القیاس حضرت آدم و حوا کی تخلیق اور ان کے زمین پر اتارے جانے کے واقعہ کے ضمن میں ارشاد الٰہی ہے:

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔[2]

اور ہم نے (حضرت آدم و حوا اور ان کی پشتی ذریت سے) کہا تم سب (زمین پر) اتر جاؤ۔ تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک وقت (مقررہ) تک نفع اٹھانا۔

"مستقر" میں معاشرے کے اندر سیاسی آزادی اور سماجی استحکام کی طرف اشارہ ہے اور "متاع" میں معاشی و اقتصادی فوائد کا ذکر ہے۔ گویا زمین میں انسانوں کو سیاسی آزادی، سماجی استحکام اور معاشی عدل کے تینوں حقوق بنیادی طور پر یکساں عطا کر دیے گئے ہیں۔ یہ امر الٰہی ہے۔ زمینی زندگی میں کچھ لوگ دوسروں سے یہ حقوق سلب کرنا چاہیں گے۔ یہی استحصالی عمل انسانی زندگی میں تضاد و تصادم اور عداوت کی بنیاد ثابت ہو گا۔ اس تضاد کا حقیقی حل صرف ہدایت ربانی کی اتباع میں مضمر ہے۔ انسان کے تمام تراشیدہ

---

[1] ۔ تفسیر الکشاف، مرکز اہل السنۃ برکات رضا انڈیا، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء، ۱/ ۱۲۷

[2] ۔ البقرۃ، ۲: ۳۶

فلسفے اور نظریے ان تضادات کو بڑھا تو سکتے ہیں ختم نہیں کر سکتے۔ اسی حکم کی تصریح آگے آیت نمبر ۳۸ میں آ رہی ہے۔[1]

محمد اعلیٰ تھانوی نے لفظ "الذمہ" کی وضاحت میں لکھا ہے:

فان اللہ تعالیٰ لما خلق الانسان محلا للامانۃ اکرمہ بالعقل والذمۃ حتی صارا ھلاً لوجوب الحقوق لہ وعلیہ وثبت لہ حقوق العصمۃ والحریۃ والمالکیۃ کما اذا عاھدنا الکفار واعطینا ھم الذمۃ ثبت لھم وعلیھم حقوق المسلمین فی الدنیا وھذا ھو العھد الذی جری بین اللہ تعالیٰ وعبادہ یوم المیثاق۔[2]

بے شک اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو امانت اٹھانے کا اہل بنا کر پیدا فرمایا تو (باقی مخلوقات کے مقابلے میں) اسے عقل اور ذمہ کے ذریعے عزت بخشی یہاں تک کہ انسان اپنے لیے حقوق اور اپنے اوپر عاید ہونے والے فرائض کا اہل قرار پایا۔ اور اس کے لیے (جان ومال وآبرو کے) تحفظ، آزادی اور ملکیت کے حقوق ثابت ہو گئے۔ جیسا کہ ہم کفار سے معاہدہ کریں اور انہیں عقد ذمہ کرنے کا موقع دیں تو ان کے لیے حقوق اور ذمہ داریاں ثابت ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کے لیے حقوق کا ثابت ہونا یہ وہ عہد ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان میثاق کے دن طے پایا۔

---

1 - طاہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر محمد، تفسیر منہاج القرآن (سورۃ البقرۃ)، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۴

2 - کشاف اصطلاحات الفنون، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱/ ۵۱۶

دوسری فصل

حقوق انسانی کی اہمیت وعظمت

اسلام میں انسانی حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان حقوق کا تحفظ شریعت اسلامیہ کے پانچ بنیادی مقاصد میں داخل ہے۔ مشہور اصولی عالم علامہ شاطبیؒ نے شریعت اسلامی کے مقاصد کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔مقاصد ضروریہ ۲۔مقاصد حاجیہ اور ۳۔مقاصد تحسینیہ

مقاصد ضروریہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ موصوف نے لکھا ہے:

(فاما الضرورية) فمعناها انها لابد منها في قيام مصالح الدين والدنيا بحيث اذا فقدت لم تجر مصالح الدنيا على استقامة. بل على فساد وتهارج وفوت حياة۔[1]

جہاں تک ضروری مقاصد کا تعلق ہے تو ان سے مراد وہ مقاصد ہیں جن کے بغیر دین دنیا کے تمام مصالح کے قیام میں چارہ کار نہیں۔ اس حیثیت سے کہ اگر یہ مقاصد پورے نہ ہوں تو دنیا کے مصالح / امور استقامت کے ساتھ جاری نہ ہو سکیں گے بلکہ ان کے فقدان سے دنیا میں فساد اور حرج واقع ہو گا اور زندگی ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اس اجمال کی تفصیل اور وضاحت میں علامہ شاطبی نے لکھا ہے:

ومجموع الضروريات خمسة حفظ الدين والنفس والنسل والمال

---

[1] ۔الشاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ، الموافقات فی اصول الشریعہ، المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء، ۸/۲

والعقل۔[1]

اور کل مقاصد ضروریہ پانچ چیزیں ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت۔

قرآن و سنت اور علماء اسلام کی تصریحات کے مطابق جتنے بھی جائز انسانی حقوق کا پتہ چلتا ہے وہ سب مندرجہ بالا پانچ مقاصد ضروریہ کے اندر آجاتے ہیں۔ جن کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے۔

بندوں کا حق شریعت کے حق پر مقدم

اسلام میں حقوق انسانی کی اہمیت و عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ شریعت نے اپنے حق یا حق اللہ پر بندوں کے حقوق (حقوق العباد) کو مقدم کیا ہے۔ چنانچہ وجوب حج کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ

> حج اس وقت فرض ہو گا جب کہ آدمی اپنے اہل خانہ کے لئے اتنا نان و نفقہ چھوڑ کر جائے کہ وہ اس کے واپس آنے تک اپنی گزر بسر کر سکیں "لان النفقة مستحق للمرءة وحق العبد مقدم على حق الشرع بامره" کیونکہ نفقہ بیوی کا حق ہے اور بندے کا حق مقدم ہے شریعت کے حق پر خود اس (شارع حقیقی) کے حکم سے۔[2]

گویا شریعت کا حکم یہ ہے کہ جہاں بندے کے حق اور شریعت کے حق (حق اللہ) میں تعارض آجائے وہاں بندے کے حق کو مقدم رکھا جائے اور اللہ تعالی اور شریعت کے حق کو مؤخر کر دیا جائے اس لیے کہ بندہ محتاج کمزور اور ضرورت مند ہے جبکہ اللہ تعالی کسی چیز حتی کہ ہماری عبادت کا بھی محتاج نہیں اور نہ

---

[1] ۔حوالہ سابق

[2] ۔مرغینانی، برہان الدین ابی الحسن علی بن ابی بکر (م ۵۹۳ھ)، الہدایہ، کتاب الحج (مع شرح علامہ عبدالحی لکھنوی) ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۱۷ھ، ۱/۳۰۱

اس کی شریعت کسی کی ضرورت مند ہے۔ مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم نے یہ فقہی قاعدہ کلیہ یوں بیان کیا ہے:

اذا اجتمع الحقان قدم حق العباد۔[1]

جب دو حق (حق اللہ اور حق العباد) جمع ہو جائیں (اور ان کے درمیان تعارض کو دور نہ کیا جا سکے) تو حق العباد کو مقدم کیا جائے گا یعنی اسے ترجیح حاصل ہو گی۔

بندے کا حق شریعت یا حق اللہ پر کس طرح مقدم ہے اس کا اندازہ فقہاء کے اس استنباط / قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی آدمی اچانک مصیبت و ہلاکت سے دوچار ہو جائے اور وہ کسی نماز پڑھنے والے کو مدد کے لیے پکارے تو نمازی پر نماز توڑ کر اس کی مدد کرنا واجب ہے۔ اسی طرح نمازی آدمی کو اگر اپنا درہم برابر مال بھی چوری ہو جانے کا خدشہ ہو یا اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خطرہ ہو یا کسی نابینا آدمی کے کنویں وغیرہ میں گر جانے کا گمان غالب ہو تو شرعاً واجب ہے کہ وہ نمازی آدمی اپنی نماز چاہے فرض نماز ہی کیوں نہ ہو، توڑ کر اس نابینا آدمی کو کنویں میں گرنے سے بچائے۔[2]

حالت جنگ میں بھی حقوق انسانی کا احترام

میدان جنگ میں ہر دو فریق ایک دوسرے کو کتنا جانی و مالی نقصان پہنچاتے ہیں، کتنے مظالم ڈھائے جاتے ہیں، کتنی خونریزی ہوتی ہے۔ کتنے بے گناہ لوگوں کو تہ تیغ کیا جاتا ہے، کس طرح خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ کس طرح انسانی حقوق پامال کیے جاتے ہیں، کتنے شہر اور انسانی بستیاں اجاڑ دی جاتی ہیں۔ انسانی تاریخ اور جنگوں کی تاریخ میں ان لرزہ خیز اور ہولناک مظالم کی تفصیل بیان ممکن نہیں۔ ساری تاریخ کو چھوڑ کر صرف جنگ عظیم اوّل (اگست ۱۹۱۴ء) اور جنگ عظیم دوم (۱۹۴۵ء) میں روا رکھی گئی جارحیت اور سفاکیت و درندگی، دہشت و بربریت اور عام انسانی حقوق کی پامالی پر ایک نظر ڈالیں تو انسان کے رونگٹے

---

[1] - ابن نجیم، الاشباہ والنظائر (مع شرح حموی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء، ۳/۲۵۹

[2] - طحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل (م ۱۲۳۱ھ) حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ت۔ن، ص: ۳۷۱-۳۷۲

کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنگ عظیم اول ۱۴ اگست ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی اور ۱۵۶۵ دنوں تک ہوتی رہی، اس میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد تقریباً ۹ ملین نوے لاکھ، شدید زخمی ہونے والوں کی تعداد ۲۲ ملین، اپاہج اور معذور ہو جانے والوں کی تعداد ۲۵ ملین بتائی جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار میدان جنگ کے ہیں۔ جبکہ شہروں میں مرنے اور زخمی ہونے والے افراد کی تعداد جنگ سے کہیں زیادہ ہے۔[1] اس جنگ میں ساڑھے چھ کروڑ افراد دھکیلے گئے، ایک کروڑ فوجی میدان میں مارے گئے۔ ڈیڑھ کروڑ شہری قتل ہوئے۔ دو کروڑ سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ لاکھوں بچے یتیم ہوئے، پچاس لاکھ عورتیں بیوہ ہوئیں لاکھوں عورتیں بچے فوجی اور شہری لاپتہ ہوئے۔[2]

دوسری جنگ عظیم میں ۳۵ ملین انسان ہلاک ہوئے۔ ۲۰ ملین ہاتھ پاؤں سے معذور ہوئے، ۱۷ ملین لیٹر خون زمین پر بہایا گیا۔ ۱۲ ملین حمل ساقط ہوئے، ۱۳ ہزار پرائمری سیکنڈری سکول ۶ ہزار یونیورسٹیاں ۸ ہزار لیبارٹریاں ویران و برباد ہو گئیں۔ تین لاکھ نوے ہزار گولے فضا میں پھٹے۔[3]

دنیا کا کوئی تمدن اور تاریخ کا کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں جنگوں لڑائیوں اور آپس کے اختلافات کا وجود اور اس اختلاف اور جنگ کے نتیجے میں بڑی بڑی اور ہولناک مثالیں موجود نہ ہوں۔ اسلام سے پہلے ان جنگوں میں کوئی ضابطہ اخلاق اور حدود و قیود نظر نہیں آتیں۔ طاقتور فریق طاقت کے استعمال میں کسی اخلاقی ضابطے یا قانون کا پابند نہیں تھا۔ اسلام آیا تو پیغمبر اسلام نے میدان جنگ کو بھی کچھ اخلاقی ضابطے اور حدود و قیود مقرر فرمائیں۔ اسلام کے نزدیک جنگ (جہاد) فی نفسہ مطلوب چیز نہیں لیکن چونکہ یہ

---

1 ۔دیکھیے: مجتبیٰ موسوی لاری، السید، مغربی تمدن کی ایک جھلک، (مترجم مولانا روشن علی)، منصبیہ عربک کالج میرٹھ، انڈیا، ص: ۷۶

2 ۔اعجاز احمد، ضرورت امن، ایشیاء بک سینٹر، لاہور، ص: ۳۳

3 ۔مجتبی موسوی، مغربی تمدن کی ایک جھلک، ص: ۶۷ — ۷۷؛ علامہ مجتبی موسوی نے جنگ عظیم اوّل و دوم کی تباہ کاریوں کی مزید تفصیل بھی بتائی ہے۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔

ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ؟ وسیلہ ہے اس لیے اس عظیم مقصد کی خاطر سے یہ بھی مطلوب ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں جہاد "مقصود لعینہ" نہیں بلکہ "مقصود لغیرہ" ہے اور وہ عظیم مقصد یہ ہے کہ "لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا" کہ دنیا میں اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہو۔[1]

دنیا کی نظر میں جنگ کا مفہوم قتل کرنا، گرفتار کرنا، دشمن کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنا وغیرہ ہے۔ لیکن اسلام میں جنگ کا مفہوم ہی الگ ہے۔ غزوات رسول میں حضور اکرم ﷺ کے عملی اسوۂ حسنہ اور اس سلسلے میں تعلیمات و ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جنگ سے مقصود دشمن کا قلع قمع کرنا، اسے صفحہ ہستی سے مٹا دینا، اس کی تذلیل و توہین کرنا یا اس کے علاقہ و وسائل پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ اس کی قوت کا توڑنا مطلوب ہے۔ جنگ سے مقصود صرف اتنا ہے کہ کم سے کم جانی و مالی نقصان کے ساتھ دشمنان اسلام کا زور توڑ دیا جائے تاکہ جو طاغوتی طاقتیں اسلام کے خلاف کھڑی ہیں۔ وہ اسلام کے مقابلے میں دوبارہ کھڑا ہونے کے قابل نہ رہیں اور یوں ساری دنیا میں اللہ کی شریعت کو قائم کیا جاسکے۔ عین میدان جنگ میں بھی اسلام نے جس طرح انسانی حقوق کا پاس کرنے کی تعلیم دی ہے اور عام قتل و غارت گری سے گریز کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس کا اندازہ مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیب سے مروی اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ جب اسلامی لشکروں کو جہاد پر روانہ فرماتے تو انہیں بطور وصیت فرماتے:

کھجور کے باغات کو تباہ و برباد نہ کرنا، نہ انہیں جلانا، نہ کسی چوپائے کو ذبح کرنا، نہ کسی

---

[1] - بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب من سأل وھو قائم عالما جالسا، ۵۸/۱، رقم الحدیث: ۱۲۳؛ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا الخ، ۱۳۹/۲، رقم الحدیث: ۴۹۲۰؛ علامہ کاسانی نے جہاد کی فرضیت کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: القتال ما فرض لعینہ بل لدعوۃ الی الاسلام، جنگ (جہاد) کی فرضیت خود جنگ کے لیے نہیں بلکہ دعوت اسلام (کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور طاقتوں کو دور کرنے) کے لیے ہے۔ دیکھیے: بدائع الصنائع، ۱۰۰/۷؛ شاید اسی لیے متعدد احادیث میں "جہاد فی سبیل اللہ" کے الفاظ آئے ہیں۔

> پھل دار درخت کو کاٹنا، نہ کوئی گرجا گرانا، نہ بچوں کو قتل کرنا، نہ بوڑھوں کو نہ عورتوں کو، عنقریب تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو عبادت گاہوں میں پابند کر رکھا ہو گا۔ پس تم انہیں اور جس چیز کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو پابند کر رکھا ہے اسے چھوڑ دینا۔[1]

جبکہ ایک دوسری روایت کے مطابق شام کی طرف لشکر روانہ کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا:

> بیشک عنقریب تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے ان عبادت گاہوں میں اپنے آپ کو روک رکھا ہو گا پس تم انہیں اور جس چیز کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو روک رکھا ہے۔ اسے چھوڑ دینا اور شیخ فانی (عمر رسیدہ آدمی) عورت اور بچے کو قتل نہ کرنا اور آبادی کو ویران نہ کرنا، بلا ضرورت درخت نہ کاٹنا اور نہ چوپائے کو ذبح کرنا اور کھجوروں کے باغات نہ جلانا اور نہ انہیں تباہ وبرباد کرنا اور نہ غداری کرنا، نہ مثلہ (لاشوں کی شکل بگاڑ دینا) کرنا، نہ بزدلی دکھانا اور نہ مال غنیمت کی تقسیم میں خیانت کرنا۔[2]

میدان جنگ میں انسانی حقوق کا پاس کرنے، عملی طور پر جنگ میں شریک نہ ہونے والے افراد (بچے، خواتین، بوڑھے، راہب وغیرہ) کے بلا وجہ وجواز قتل، بلا ضرورت جانوروں اور فصلوں کو تباہ کرنے اور انسانی آبادیوں اور عبادت گاہوں کو گرانے سے ممانعت کی یہ وصیت صدیقی "مشتے از خروارے" کے طور پر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث کی نصوص، فقہائے امت کی تصریحات، جنگ میں اسلام کی اخلاقی

---

[1] -دیکھیے: بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین (م۴۵۸ھ)، السنن الکبری، مکتبہ دارالباز مکہ مکرمہ، سعودی عرب، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۴ء، ۱/۸۵، رقم ۱۷۹۰۴؛ السرخسی، المبسوط، دارالمعرفۃ بیروت، ۱۰/۵-۶؛ سحنون، المدونۃ الکبری (کتاب الجہاد)، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ص: ۵۰۰؛ علی متقی، کنزالعمال (کتاب الجہاد باب فی احکام الجہاد)، ۴/۲۰۲، رقم: ۱۱۴۰۲تا۱۱۴۰۷

[2] -حوالہ سابق، ۹/۹۰، حدیث نمبر ۱۷۹۲۹؛ کنزالعمال ۴/۲۰۲، رقم، ۱۱۴۰۲تا۱۱۴۰۷

تعلیمات و ہدایات اور خلفائے اسلام کی ایمان افروز اور حیران کن عملی روایات کی تفصیل خود ایک مفصل کتاب کی متقاضی ہے۔[1]

زیر بحث مسئلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ نے بڑی حیران کن بات فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

> آنحضرت ﷺ کے غزوات و سرایا سے متعلق دیگر تفصیلات کے علاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تین ملین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں، ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں بنتی۔ دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے۔[2]

---

[1] ۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب، ۱/۴۲۳؛ مصدر سابق، کتاب الجہاد، باب قتل النساء فی الحرب، ۱/۴۲۳؛ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد والسیر باب تحریم قتل النساء والصبیان فی الحرب، ۲/۸۴؛ مصدر سابق، کتاب الجہاد والسیر باب النساء الغازیات۔۔۔والنہی عن قتل صبیان اهل الحرب، ۲/۱۱۷؛ ابو داؤد، السنن، کتاب الجہاد باب فی النہی عن المثلۃ، ۲/۳۶۱؛ مصدر سابق، باب فی قتل النساء، ۲/۳۶۲؛ مصدر سابق، باب کراھیۃ حرق العدو بالنار، ۲/۳۶۲؛ مصدر سابق، باب فی قتل الاسیر صبرا، ۲/۳۶۵؛ باب فی قتل الاسیر بالنبل، ۲/۳۶۶؛ باب فی التفریق بین الصبی، ۲/۳۶۸؛ ابن عابدین شامی، حاشیہ ردالمحتار علی الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ت۔ن، ۴/۱۳۱-۱۳۲؛ سحنون بن سعید، المدونۃ الکبریٰ لامام مالک (کتاب الجہاد) متحدہ عرب امارات، ۱۴۲۲ھ، ۳/۱۳-۱۹؛ ترمذی، جامع، ابواب السیر باب فی کراھیۃ التفریق بین الصبی، ص:۲۴۵؛ ترمذی، جامع، ابواب السیر باب فی النہی عن قتل النساء والصبیان، ص:۲۴۶؛ سرخسی، محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر للامام محمد، حرکۃ الانقلاب الاسلامیہ الافغانیہ، ت۔ن، ۱/۴۰-۴۴؛ ابو عبید، قاسم، کتاب الاموال (اردو ترجمہ) پیرہ نمبر ۶۰تا۹۵، ص: ۴۴، ۵۵، ۵۶؛

نوٹ: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی کے مذکورہ حوالہ جات میں درسی طبع کلاں کراچی پیش نظر ہے۔

[2] ۔دیکھیے: خطبات بہاولپور، (خطبہ نمبر ۷: مملکت اور نظم ونسق)، ص: ۱۷۹

مشہور مستشرق ڈاکٹر فلپ کے حتی نے موتہ (شام) پر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے حملہ کرانے کا مقصد بیان کرتے ہوئے جو یہ بات لکھی ہے کہ:

حملے کا مقصد بہ ظاہر یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو قاصد بصری بھیجا تھا، غسانی امیر نے اسے شہید کر دیا تھا لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ جو لوگ دین میں نئے نئے وارد ہوئے تھے، ان کے لیے مال غنیمت حاصل کیا جائے۔[1]

تو یہ بالکل واقعہ کے خلاف اور تعصب پر مبنی ہے۔

اسلام اور مغرب کے تصور حقوق انسانی کا تقابلی جائزہ

اسلام انسانی حقوق کے معاملے میں دیگر اقوام و مذہب سے کس طرح ممتاز و منفرد ہے؟ اس کا اندازہ اس چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کے مذہبی، جنسی، نسلی، علاقائی، طبقاتی اور جماعتی امتیاز کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سارے انسان جس طرح ایک خدا کی مخلوق ہیں اسی طرح وہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔[2] جس طرح ایک ہی ماں باپ کی اولاد شکل و شباہت، رنگ روپ، عقل و فہم اور قوت و صلاحیت میں مختلف ہونے کے باوجود ایک ہی ماں باپ کی اولاد کہلاتی ہے اسی طرح سارے انسان خواہ کالے ہوں یا گورے، عربی ہوں یا عجمی، یورپین ہوں یا امریکن، ہندی ہو یا جاپانی سب کی رگوں میں ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس لیے جسطرح ایک ماں باپ کی اولاد صورت و سیرت میں اختلاف کے باوجود حقوق میں برابر ہوتی ہے اسی طرح سارے انسان بھی رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کے اختلاف کے باوجود حقوق میں برابر تصور کیے جائیں گے۔

عصر حاضر کے نامور فقیہ محمد ابو زہرہ نے اپنی معروف کتاب "اصول الفقہ" میں "معاملۃ المسلمین لغیر ھم" کے عنوان کے تحت شریعت کا بنیادی اصول بتایا ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے غیر مسلموں کے

---

[1] - تاریخ شام (Histoy of Syria) ترجمہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص: ۳۲۶-۳۲۵

[2] - النساء، ۴:۱

ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا؟ اور انہیں کیا حقوق دیے جائیں گے؟ چنانچہ فرماتے ہیں:

اعتبر القرآن بنی الانسان جمیعا یستحقون الکرامة مهما اختلفت اجناسهم ولذا قال سبحانه "ولقد کرمنا بنی آدم ۔۔۔ تفضیلاً" واعتبر المساواة بین بنی آدم فی اهل الحقوق والواجبات حقا طبیعیا مستحقا بمقتضی الفطرة فقد قال الله تعالیٰ "یا ایها الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی ۔۔۔ عند الله اتقٰکم"۔[1]

قرآن مجید نے تمام بنی نوع انسان کو عزت و تکریم کا مستحق قرار دیا ہے۔ چاہے وہ نسلی و خاندانی اعتبار سے جس نسل و جنس سے بھی تعلق رکھتے ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سوار کیا اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔" اور قرآن مجید نے تمام بنی آدم کے درمیان حقوق اور واجبات کے معاملے میں مساوات کو مد نظر رکھا ہے۔ حقوق و واجبات میں یہ مساوات فطری طور پر ان کا طبعی حق ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت (آدم و حوا) سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے معزز (برتر) وہ آدمی ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔"

نبی رحمت ﷺ نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ پہنچنے پر یہود مدینہ سمیت مختلف غیر مسلم قبائل سے "میثاق مدینہ" کے نام سے جو معاہدہ فرمایا اس میں غیر مسلموں کے حقوق کو بھی نہیں بھلایا گیا۔ اس میں انہیں دینی و عدالتی معاملات میں داخلی خود مختاری ہی نہیں بلکہ معاقل (سماجی مالی تحفظ) وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ مساوات عطا کی گئی۔ جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آجائے گی۔ (ان شاء اللہ)

---

[1] ۔ اصول الفقہ، دار الفکر العربی، قاہرہ، مصر، ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء، ص: ۹۳

پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الیٰ عیالہ۔[1]

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ ساری مخلوق میں اللہ کو وہ آدمی سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔

اسلام میں انسان ہونے کی حیثیت سے تمام لوگوں کے درمیان کامل مساوات ہے۔ رنگ، نسل، علاقے اور زبان کی ساری تفریقات بے اصل اور بے وزن ہیں۔ اللہ کے نزدیک ان کا کوئی وزن اور مقام نہیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق[2] سارے لوگ اللہ کریم کی نظر میں امت واحدہ ہیں۔ وہ چونکہ کافر و مسلم سب کا خالق مالک اور رازق ہے اس لیے اس نے اپنی انسانی مخلوق کے لیے انسان ہونے کے ناطے سے جو حقوق مقرر کیے ہیں ان میں کوئی امتیاز نہیں۔ اس نے غیر مسلموں کے جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا ویسا ہی حکم دیا ہے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) جیسا خود مسلمانوں کے جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا۔ پیغمبر اسلام "رحمۃ للعالمین" بنا کر بھیجے گئے ہیں نہ کہ "رحمۃ للمسلمین" بنا کر۔[3] قرآن مجید نے خدا اور اس پر ایمان لانے والوں کے لیے جو حقوق مقرر کیے ہیں وہ دراصل پوری نوع انسانی کے لیے ہیں۔ مسلمان کسی مخصوص نسل یا خاص قوم کا نام نہیں بلکہ اللہ و رسول پر ایمان لانے والوں کا نام ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں حقوق انسانی کے جس عالمی منشور کا اعلان فرمایا، اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد لکھتے ہیں:

1- ولی الدین، خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، ص: ۴۲۵، رقم: ۴۹۹۹ - ۴۹۹۸

2- دیکھیے: الانبیاء، ۲۱:۹۲ (اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ)؛ البقرہ، ۲:۲۱۳ (كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً)؛ الانبیاء، ۲۱:۱۰۷ (وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ)

3- الانبیاء، ۲۱:۱۰۷ (وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ)

خطبہ حجۃ الوداع بنیادی انسانی حقوق کا ایسا عالمی منشور ہے، جو پیغمبر انسانیت، محسن عالم ﷺ کی طرف سے جاری کیا گیا۔ سیدھا، صاف، سچا فرمان۔ اس منشور اعظم کا اجراء نہ کسی سیاسی مصلحت کا نتیجہ تھا نہ کسی وقتی جذبے کی پیداوار۔ یہ نہ کسی طبقہ یا گروہ کی طرف سے دباؤ یا دھونس، دھاندلی سے متاثر ہو کر جاری کیا گیا۔ نہ کسی حال و احوال کا تابع تھا نہ کسی معاہدے کی تکمیل۔ یہ دراصل وہ خطبہ انقلاب تھا جو ہر قسم کی انسانی، حکومتی، سیاسی، معاشرتی، معاشی یا معاہداتی منظوری سے بے نیاز وقت کی آواز بن کر گونجا اور تمام انسانوں کے حقوق کے محافظ و نگران کی حیثیت سے ابھرا اور آئندہ آنے والے تمام زمانوں کے لیے قیامت تک کے لیے شرف آدمیت و احترام انسانیت کے چراغ روشن کر گیا۔ خطبہ حجۃ الوداع میں دیے گئے حقوق، ضمانتیں اور آزادیاں کسی مرد، ادارہ، کسی اجتماع، گروہ یا حکومت و سلطنت کی منظوری یا تائید و تجویز سے مشروط نہ تھیں بلکہ اللہ رب العالمین کی حاکمیت کے تحت حاصل کردہ اختیارات سے کام لیتے ہوئے ہادیٔ اعظم سرور عالم ﷺ جس منشور انسانیت کا اجراء فرمارہے تھے وہ اسی لمحے نافذ العمل ہو گیا اور قیامت تک کے لیے ساری انسانیت کے لیے واجب الاذعان قرار پایا۔[1]

اس کے برعکس مغربی ممالک کا تصور حقوق، انسانی نہیں بلکہ نسلی علاقائی قومی اور نظریاتی تعصبات سے آلودہ ہے۔ وہ جن حقوق کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں انہیں نہ صرف دوسری اقوام تک وسعت دینے کے قائل نہیں بلکہ انہوں نے پوری قوت صرف کر کے اس امر کی ادنیٰ کوشش کی ہے کہ ان کے سوا یہ حقوق کسی اور کو نہ ملنے پائیں۔ چنانچہ صلاح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ فرانس کے منشور انسانی حقوق کو جب ۱۷۹۱ء کے آئین میں شامل کیا گیا تو ساتھ ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی کہ

---

[1] ۔ خطبہ حجۃ الوداع۔ حقوق انسانی کا عالمی منشور، بیت الحکمۃ لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۳۵-۱۳۷

اگرچہ کالونیاں اور ایشیاء، افریقہ اور امریکہ میں فرانسیسی مقبوضات سلطنت فرانس ہی کا ایک حصہ ہیں لیکن اس آئین کا اطلاق ان پر نہ ہو گا۔[1]

اسی طرح برطانیہ میں انسانی حقوق کے معاملے میں امتیاز برتے جانے کے بارے میں صلاح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> یہی حال برطانیہ کا ہے۔ اس کے غیر تحریری دستور میں برطانوی شہریوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ انگریز آقاؤں نے اپنی نو آبادیات میں خود اپنے وضع کردہ قوانین میں کبھی شامل نہیں ہونے دیے۔ ان کا میگنا کارٹا، ان کا قانون حبس بیجا اور ان کا قانون حقوق بس انہی کے لیے تھے۔ اس لیے انھیں بھی "انسانی حقوق" کی دستاویز قرار دینا سراسر مغالطہ آرائی ہے۔ ان دستاویزات کے ذریعے ملنے والے حقوق صرف برطانیہ کے شہریوں تک محدود تھے۔ کسی اور قوم نے اگر خود برطانوی حکمرانوں سے ان حقوق کا مطالبہ کیا تو اسے باغی اور غدار قرار دے کر ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔[2]

آج کل انسانی حقوق اور آزادیوں کی بحث کا نقطہء آغاز بالعموم "میگنا کارٹا" کو قرار دیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کے اس ابتدائی منشور کے پس پردہ کیا بلا امتیاز تمام انسانوں کے حقوق کے تحفظ کا جذبہ کار فرما تھا یا دوسرے سیاسی مقاصد تھے؟ چنانچہ اس منشور کے پس پردہ حقیقت اور غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد لکھتے ہیں:

> اس منشور کا اجراء شہنشاہ انگلستان (ہنری دوم کے بیٹے اور رچرڈ شیر دل کے بھائی) جان (۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۶ء) نے تیرھویں صدی عیسوی (جون ۱۲۱۵ء) میں کیا تھا اور وہ بھی کس طرح؟ صریحاً سیاسی مصلحت کے تحت۔ امراء کی بغاوت کی آگ ٹھنڈی

---

[1] -بنیادی حقوق، ص:۵۴

[2] -حوالہ سابق، ص: ۵۳، ۵۴

کرنے کے لیے اور حالات کے وقتی حل کے لیے "میگنا کارٹا" جاری کیا گیا۔ مطلب بالکل صاف ہے کہ اس میں کسی لحاظ سے ابدی، آفاقی، انسانی عالمی پہلوؤں کی کارفرمائی موجود نہ تھی، اور چونکہ اس منشور کا اجراء برطانوی تاریخ کے ایک مخصوص زمانے، مخصوص حالات میں، مخصوص مقاصد کے پیش نظر، محدود عرصے کے لیے ہوا تھا، اس لیے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کی افادیت بہت حد تک محدود، عارضی، وقتی اور مقامی تھی۔[1]

[1] ۔خطبہ حجۃ الوداع۔ حقوق انسانی کا عالمی منشور، ص: ۱۳۵-۱۳۶

تیسری فصل

حقوق انسانی کی قطعیّت و ابدیت

اسلام میں انسانی حقوق خالق کائنات کے عطا کردہ ہیں نہ کہ کسی حکومت کے۔ حکومت نہ تو کوئی حق عطا کرتی ہے نہ اس کو سلب کر سکتی ہے۔ یہ حقوق انسان کو اس کے مخلوقات میں بلند مرتبہ و مقام کے پیش نظر اللہ کریم کی طرف سے محض فضل و کرم کے طور پر (نہ کہ کسی دباؤ یا مجبوری کے باعث) عطا کیے گئے ہیں۔ مغربی تصور حقوق کی طرح ان کے حصول میں عوام کے احتجاج، تگ ودو اور کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں۔ دنیا کے حکمرانوں اور قانون ساز اداروں کی طرف سے دیے گئے حقوق کے برعکس یہ حقوق مستقل بالذات مقدس اور ناقابل تنسیخ وترمیم ہیں۔ انہیں کسی عذر کی بنا پر تبدیل یا معطل نہیں کیا جا سکتا۔ ان حقوق کو سب سے بڑا اور پائیدار تحفظ خود شریعت اسلامیہ کی طرف سے حاصل ہے۔ شریعت اسلامی مکمل ابدی اور پائیدار ہے۔ حتی کہ شارع حقیقی اللہ تعالیٰ بھی اب ان حقوق میں کمی بیشی یا انہیں سلب نہیں فرمائیں گے اس لیے کہ انبیاء ورسل کی بعثت کا سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ختم ہو چکا ہے۔[1] اور دین اسلام کی شکل میں شریعت مکمل ہو چکی ہے۔[2] اس لیے ایک اسلامی ریاست ان بنیادی حقوق کی ادائیگی کو یقینی بنائے گی۔ اسلامی مملکت کا ریاستی دستور ان بنیادی حقوق کو اپنے طور پر بھی آئینی تحفظ دے گا۔

یہ حقوق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ انسان اگر زمین سے پرواز کر کے چاند یا کسی اور سیارے پر جا کر آباد ہو جائے تو وہاں بھی ان کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو گی۔ جس طرح زمان و مکان کی تبدیلی سے انسان کی جسمانی ساخت اور اس کی فطری و طبعی ضروریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

---

1 - الاحزاب، ۳۳:۴۰

2 - المائدہ، ۵:۳

اسی طرح اس کے حقوق و فرائض کی دائمی حیثیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ ریاست کا کام حقوق کا تعین نہیں بلکہ متعین حقوق کا نفاذ اور ادائیگی ہے۔ ان حقوق میں جان، مال عزت و آبرو کا تحفظ، حصول انصاف، ظلم و زیادتی سے تحفظ، مساوات، آزادی اظہار رائے اور آزادی مذہب و عقیدہ جیسے حقوق ہی شامل نہیں بلکہ ایک نوزائیدہ بچے کی رضاعت اور جنین کے تحفظ زندگی کے حق سے لے کر ایک عورت کے حق مہر اور حق حسن معاشرت تک کے وہ تمام حقوق شامل ہیں جو خدا اور اسکے رسول ﷺ نے مقرر کر دیے ہیں اور جن میں اب قیامت تک کسی کو ردوبدل کا اختیار نہیں۔

اللہ نے جس چیز کو حلال ٹھہرا کر انسان کو اس سے نفع اٹھانے کا حق عطا کر دیا ہے، اسے اب کوئی عالم حرام ٹھہرا سکتا ہے نہ حکومت و پارلیمنٹ۔ حتی کہ کوئی فرد یہاں تک کہ خود پیغمبر بھی اپنے ذات کے لیے اسے حرام قرار دینے کا مجاز نہیں۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے بوجوہ جب شہد نہ کھانے کی قسم کھائی تو اللہ نے یوں تنبیہہ فرمائی:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ۔[1]

اے نبی آپ اس چیز کو کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ نے آپ کے لیے حلال کیا ہے محض اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے جس چیز کو انسانوں کے لیے حرام و ممنوع قرار دیا ہے اسے اب کوئی حکومت، کوئی عدالت اور کوئی قانون ساز ادارہ حلال نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ حقوق انسان کو کسی ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں۔ یہ رنگ، نسل، مذہب، علاقے، زبان اور دوسرے امتیازات سے ماوراء ہیں اور انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہیں۔ یہ کسی ریاست اور پارلیمنٹ کے منظور کردہ یا کسی معاہدہ سے پیدا شدہ نہیں بلکہ انسان کو فطرتاً حاصل ہیں اور اس کے وجود کا لازمی حصہ ہیں۔ کوئی ریاست انہیں تسلیم یا نافذ کرنے سے گریز کرتی ہے تو اسے فطرت کے عطا کردہ حقوق

---

[1] ۔التحریم ۶۶:۱

کو غصب کرنے کا مجرم سمجھا جائے گا۔ ریاست کو ان کی تنسیخ تو کجا ان میں ترمیم تحدید یا کسی عذر کی بنا پر ان کے عارضی تعطل کا بھی اختیار نہیں۔

ہنگامی حالات میں حقوق کی معطلی۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ:

آج کل جمہوری ممالک کے دساتیر میں یہ گنجائش رکھی جاتی ہے کہ ملک میں اگر ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو حکومت یا سربراہ مملکت ایمرجنسی نافذ کر کے شہریوں کے بنیادی حقوق وقتی طور پر معطل کر سکتا ہے۔ جس کے خلاف عدالت میں کوئی اپیل بھی نہیں ہو سکے گی۔ اس اقدام کا جواز یا عدم جواز معلوم کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہنگامی حالت یا ایمرجنسی کسے کہتے ہیں؟ تو جوڈیشل ڈکشنری کے مطابق ایمرجنسی کی تعریف ہے:

An emergency is an unforeseen occurrence or combination of circumstances which calls for immediate action or remedy.[1]

ایک ایمرجنسی ناگہانی غیر متوقع حادثہ و سانحہ ہے یا ایسے حالات کا اکٹھا ہو جانا ہے جو فوری اقدام یا تدارک کا مطالبہ کرتے ہوں۔

جبکہ بلیک لاء ڈکشنری میں ایمرجنسی کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے:

A sudden unexpected happening, ... Emgergency is an unforeseen combination of circumstances that calls for immediate action.[2]

ایک اچانک غیر متوقع وقوعہ یا ایسے ناگہانی حالات کا پیش آ جانا جو فوری اقدام کا تقاضا کرتے ہوں۔ ایمرجنسی کہلاتا ہے۔

---

[1] – Ajyar's Judicial Dictionary, The Law book company, Allahabad, India, 9th ed. 1984, P:372

[2] – Henry Campbell Black, Black's Law Dictionary, 6th ed. P:522-523

چنانچہ دیگر غیر مسلم جمہوری ممالک کے دساتیر کی طرح وطن عزیز پاکستان کے ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں بھی ایمر جنسی کی دفعات شامل ہیں۔ آئین ۱۹۷۳ء کے حصہ دہم (ہنگامی احکام) کے آرٹیکل نمبر ۲۳۲ میں ہے:

If a president is statisfied that a grave emergency exists in which the security of Pakistan, or any part thereof, is threatened by war or external aggression (and by internal disturlance beyond the power of a provincial Government to control), he may issue proclamation of Emergency.[1]

اگر صدر مطمئن ہو کہ ایسی سنگین ہنگامی صورتحال موجود ہے جس میں پاکستان یا اس کے کسی حصہ کی سلامتی کو جنگ یا بیرونی جارحیت کی وجہ سے یا داخلی انتشار کی وجہ سے ایسا خطرہ درپیش ہے جس پر قابو پانا کسی صوبائی حکومت کے اختیار سے باہر ہے تو وہ ہنگامی حالات کا اعلان کر سکے گا۔[2]

آئین ۱۹۷۳ء کے مطابق صدر مملکت کو ہنگامی حالات میں بنیادی حقوق معطل کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ چنانچہ آئین کے حصہ دہم (ہنگامی احکام) کے آرٹیکل نمبر ۲۳۳ کی دفعہ نمبر ۲ میں ہے:

جس دوران ہنگامی حالت کا اعلان نافذ العمل ہو، صدر بذریعہ فرمان یہ اعلان کر سکے گا کہ حصہ دوم کے باب اول کی رو سے عطا کردہ ۵ بنیادی حقوق میں سے ان کے نفاذ کے لیے جن کی فرمان میں صراحت کر دی جائے کسی عدالت سے رجوع کرنے کا حق اور کسی عدالت میں کوئی کارروائی جو اسطرح مصرحہ حقوق میں سے کسی کے نفاذ کے لئے ہو یا جس میں ان حقوق میں سے کسی کی خلاف ورزی کے متعلق کسی سوال کا تعین مطلوب

---

[1] -The Constitution of Paksitan, 1973, Lahore Law Times Publication, Lahore, P:107

[2] -اختر علی قریشی، آئین پاکستان ۱۹۷۳ (مع جدید ترامیم)، ندیم بک ہاؤس، لاہور، ص: ۲۰۳

ہو، اس مدت کے لئے معطل رہے گا جس کے دوران مذکورہ اعلان نافذ العمل رہے اور ایسا کوئی فرمان پورے پاکستان یا اس کے کسی حصہ میں صادر کیا جاسکے۔[1]

اسلام میں درج بالا قسم کے ہنگامی حالات یا خود ساختہ قومی مفاد کی آڑ میں سربراہ حکومت کو کسی شہری کے بنیادی حقوق معطل کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ اصولی طور کسی قانون کو منسوخ، معطل، مؤخر یا اس میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار یا تو خود قانون ساز کو حاصل ہوتا ہے یا پھر اس سے بالاتر کسی ذات کو۔ جبکہ زیر بحث مسئلہ میں بنیادی حقوق عطا کرنے والا کوئی حکمران یا ادارہ ہے نہ کسی انسان یا انسانوں کے تشکیل کردہ کسی ادارہ کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے بالاتر ہوسکتی ہے۔ شریعت نے کسی حکمران کو ایسا کوئی اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی فرد یا پوری قوم کو بنیادی حقوق سے محروم کردے سوائے اس کے کہ کسی ارتکاب جرم پر اسے کسی بنیادی حق سے محروم کرنا قانونی تقاضا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اضطراری حالت میں حرام چیز کا بقدر ضرورت استعمال جائز ہے"۔[2] چنانچہ فقہ کا یہ مشہور قاعدہ ہے کہ

> "الضرورات تبیح المحظورات"۔[3] ضرورتیں / مجبوریاں ممنوع اشیاء کو بھی مباح/جائز بنا دیتی ہیں۔ یہ اباحت انسان کی ذاتی مجبوریوں کے وقت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ضرورت کی آڑ میں دوسروں کے حقوق معطل کر دیے جائیں۔ اس سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ

الاضطرار لایبطل حق الغیر۔[4] اضطرار اور مجبوری کی حالت غیر کا حق باطل

---

[1] ۔ اختر علی قریشی، آئین پاکستان ۱۹۷۳ء، ص:۲۰۶

[2] سورۃ البقرہ ۲: ۱۷۳

[3] ۔ ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ت۔ن، ۱/۱۱۸؛ خالد الاتاسی، محمد، شرح المجلہ، مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ، ۱۴۰۳ھ، ۱/۵۵

[4] ۔ خالد الاتاسی، محمد، شرح المجلہ، ۱/۷۹

نہیں کرے گی۔

علاوہ ازیں عہد نبوی ﷺ اس بات پر گواہ ہے کہ اس عہد میں کبھی کسی شرعی جواز کے بغیر کسی شہری کے بنیادی حقوق معطل نہیں کیے گئے۔ اس میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ریاست مدینہ کبھی ہنگامی حالات سے دوچار نہیں ہوئی۔ غزوہ احزاب اور تبوک وغیرہ جن حالات میں پیش آئے ان سے بڑھ کر کیا ہنگامی حالات ہوسکتے تھے مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی شہری کے بنیادی حقوق معطل نہیں کیے گئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے شہری حقوق کی تفصیلات کے ضمن میں شخصی آزادی (Personal Liberty) کے بنیادی حق پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ "اسلام کسی غیر معمولی حالت (State of Emergency) میں بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کیے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کردے" پھر مولانا موصوف نے اپنی اس رائے کے استدلال میں ریاست مدینہ کی ہنگامی صورتِ حال پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> مدینہ کے متعلق معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک دن بھی اس پر ایسا نہیں گزرا ہے جب وہاں ہنگامی حالت (State of Emergency) نہ رہی ہو۔ ریاست ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی، اندر بھی انتشار موجود تھا اور بیرونی حملہ کا خطرہ بھی ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ ایک طرف پہلو میں یہود سرگرم سازش تھے۔ دوسری طرف عین مسلمانوں کے اندر منافقین ففتھ کالم کی حیثیت سے اسلامی سوسائٹی کے ہر حصہ میں سنسنی اور اضطراب پھیلانے، مسلمانوں کے درمیان تفریق ڈالنے، ان کی جنگی تیاریوں کی جاسوسی اور ان کے فوجی رازوں کو معلوم اور آشکارا کرنے کے لیے دن رات جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے خطرہ کا یہ حال تھا کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوگیا اس وقت تک قریش خود مدینہ کے یہود اور منافقین کے سازباز کے ساتھ حملے پر حملے کرتے رہے۔ قریش کے حملوں سے نجات ملی تو منتشر قبائل نے زور باندھا۔ ان کا زور ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ رومیوں اور غسانیوں کے خطرے نمودار ہوگئے اور یہ خطرات

ابھی دور نہیں ہوئے تھے کہ آں حضرت ﷺ نے وفات پائی۔[1]

اسی طرح خلفاء راشدینؓ کے زمانے میں بھی کبھی درج بالا قسم کے ہنگامی حالات کی آڑ میں حقوق معطل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ خلافت راشدہ کے دور میں بعض اوقات اندرونی بدامنی کی وجہ سے ملکی حالات نہایت ہنگامی اور غیر معمولی نوعیت کے رہے مثلاً، عہد صدیقی میں مانعین زکوۃ کا فتنہ، ارتداد، بغاوتیں اور عہد علوی میں سیاسی افراتفری اور باہمی خانہ جنگی کی نوبت وغیرہ لیکن شہریوں کو غیر قانونی طور پر کبھی ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا گیا۔

عہد فاروقی میں شرعی تقاضا کے تحت مؤلفۃ القلوب کو زکوۃ نہ دینا اسی طرح عراق کی فتح میں سواد عراق کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم کرنے کی بجائے ریاست کی ملکیت قرار دینا وغیرہ جیسے اقدامات بنیادی حقوق کی معطلی کے ضمن میں نہیں آتے۔ بلکہ ایسا کرنا ایک شرعی تقاضا تھا۔ جو صحابہ خصوصاً حضرت بلال بن رباحؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ، سواد عراق کی زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کے پرزور حامی تھے۔ کئی دنوں کے بحث مباحثہ کے بعد حضرت عمرؓ نے سورۃ الحشر کی آیت نمبر ۱۰ سے استدلال کرتے ہوئے سب صحابہ کو قائل کرلیا کہ یہ زمین تمام مسلمانوں کے لیے وقف ہے۔[2]

---

[1] ۔ اسلامی ریاست، ص:۱۱۴

[2] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: امام ابویوسف، کتاب الخراج، ص:۳۵۔ یحیٰ بن آدم قرشی، کتاب الخراج، ص:۴۲،۴۸؛ ابو عبید، کتاب الاموال (اردو ترجمہ)، ص:۸۵ — ۹۱

چوتھی فصل

تحفظ حقوق کے لئے فکری و نظریاتی تربیت

انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ انسانی حقوق کی پامالی اور بنی نوع انسان کے ساتھ ظلم و زیادتی ہمیشہ انسانوں نے ہی کی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی مخلوق نہیں جو اپنے افراد جنس کے ساتھ وہ معاملہ کر رہی ہو جو انسان اپنے ہم جنس افراد سے کر رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ انسان کا ذہنی فتور، اس کا اپنی اصلیت و حقیقت اور منصب کو بھول جانا، مقصد تخلیق کو فراموش کر دینا اور خداداد اختیارات اور صلاحیتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ قرآن مجید نے فرعون کے اپنی قوم و رعایا کے ساتھ ظلم، حقوق کی پامالی اور اس ظلم و زیادتی کی بنیادی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ۔[1]

بے شک فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں (خدائی کا دعویٰ کر کے) تکبر کیا اور اس زمین (پر بسنے) والوں کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو کمزور سمجھ رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں (لڑکوں) کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ رکھتا تھا۔ بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

اسی طرح فرعون کی ذہنیت و سوچ کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ۔[2]

---

[1] - القصص، ۲۸:۴

[2] - الزخرف، ۴۳:۵۴

پس اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا تو انہوں نے بھی (انکار کرنے کی بجائے) اس کی اطاعت کی۔ بے شک وہ نافرمان قوم تھی۔

یعنی فرعون اپنی حکومت و اقتدار کے بل بوتے پر اپنے مقابلے میں اپنی قوم کے افراد کو پست و ذلیل اور کمزور سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہی انداز فکر خدائی کے دعوئ اور آمرانہ روش کا ذریعہ بنا۔ اسلام نے حقوق کے تحفظ کے لئے عملی اقدامات سے پہلے اس استحصالانہ اور ظالمانہ فکر و سوچ کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی سوچ بدل جائے تو سارے معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام کی چند اصلاحی تعلیمات اور افکار درج ذیل ہیں:

مطالبہ حق کی بجائے ایتائے حق کی تعلیم

انسانی حقوق کی ادائیگی اور اس معاملے میں کوئی شکایت کا موقع نہ دینے کے لئے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو خود غرضی کی بجائے ایثار کی تعلیم دی ہے اور اپنے حق پر دوسروں کے حق کو مقدم سمجھنے والے انصاری صحابہ کی اللہ تعالیٰ نے تحسین فرمائی ہے۔[1] اسلام مطالبہ حق (Demand of Rights) کی بجائے ایتائے حق (Fulfilment of Rights) پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔[2] اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اوپر عائد دوسرے افراد کے حقوق کی ادائیگی کے لیے ہر وقت کمربستہ رہے اور یہاں تک کہ وہ صرف حق کی ادائیگی تک ہی محدود نہ رہے جو اس پر فرض ہے، بلکہ فرض کے ساتھ مزید نیکی سے بھی کام لے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مشہور آیت ہے جو ہر ہفتہ جمعہ کے خطبہ میں بھی عموماً دہرائی جاتی ہے کہ

1۔ دیکھیے، الحشر، ۵۹:۹

2۔ حدیث نبوی ہے: "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ" اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے کہیں بہتر ہے۔ دیکھیے: خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الزکوٰۃ باب من تحل لہ المسئلۃ و من لا تحل لہ)، ص: ۱۶۲، رقم: ۱۸۴۳؛ صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۱۴۲۹؛ ابوداؤد، رقم الحدیث: ۱۶۴۸؛ النسائی، رقم الحدیث: ۲۵۳۲

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔[1]

بے شک اللہ (تمہیں) عدل کا حکم دیتا ہے اور (عدل کے ساتھ) احسان کا۔

عدل کا مفہوم تو یہ ہے کہ وہ حقوق جو شریعت اور قانون کی رو سے کسی فرد پر لازم ہوں (یعنی فرائض) وہ ان کی ادائیگی کرے جبکہ احسان یہ ہے کہ فرض و عائد حقوق سے بڑھ کر بھی وہ دوسرے افراد معاشرہ سے حسن سلوک کرے۔ مثلاً مزدور کی مقررہ تنخواہ پر مزید رقم مزدور کو دی جائے، یہ احسان ہے۔ حقوق کے معاملے میں اسلام کا عطا کردہ یہ تصور احسان انسانی معاشرے کو سراپا امن و آشتی اور باہمی پیار و محبت کا گہوارہ بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ایک فرد کا فرض دوسرے کا حق ہے۔ جب ہر فرد اپنے فرائض کو ادا کرے گا یعنی دوسروں کے حقوق پورا کرنے کے لیے کمربستہ رہے گا تو لامحالہ معاشرے میں کسی طرف سے بھی حقوق کی عدم ادائیگی کی وجہ سے مطالبہ حقوق کی صدا بلند نہ ہوگی اور پورے معاشرے کے حقوق از خود پورے ہوتے رہیں گے اور اس طرح معاشرہ قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کے احترام کا آئینہ دار بن جائے گا۔ اسلام میں چونکہ اساسی زور فرائض کی ادائیگی اور ایتائے حقوق پر ہے اس لیے کوئی بھی فرد اس وقت تک اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے فرائض ادا نہ کر چکا ہو اور فرائض کی ادائیگی کی صورت میں حقوق کا حصول ایک قدرتی اور لازمی تقاضے کے طور پر خود بخود ہی پائے تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

حق کا مسئلہ در حقیقت فرض کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر فرض ٹھیک ادا ہوتا رہے تو حق کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جونہی فرض کی ادائیگی معطل ہوتی ہے، حق کا سوال ابھر آتا ہے۔ قرآن مجید نے بنی نوع انسان، اہل کتاب اور اہل ایمان کو جہاں جہاں خطاب کیا ہے، انھیں ان کا فرض یاد دلایا ہے۔ پورے قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نظر نہیں آتی جس میں اہل حقوق سے خطاب کر کے انہیں اپنے حقوق کے حصول کے لئے احتجاج اور سڑکوں پر آنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اسلام میں اس حکم اور

---

[1] ۔ النحل، ۱۶:۹۰

ترغیب کی ضرورت اس لیے بھی پیش نہیں آتی کہ اسلامی حکومت کے قیام کا بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ اقتدار و اختیارات کی قوت کو فرائض کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے کام میں لائے اور حقداروں کو ان کا حق پہنچائے۔

خلیفۃ الرسول حضرت ابو بکرؓ کا مانعین زکوٰۃ کے خلاف اعلانِ جنگ اور اس معاملے میں سخت رویہ اختیار کرنا اور حضرت عمرؓ جیسے صحابہ کے مشورہ کے باوجود کسی نرمی کو روانہ رکھنا اسلامی ریاست کے اسی مزاج و کردار کا آئینہ دار ہے۔ اس کے لیے حقداران زکوٰۃ نے کوئی احتجاج کیا تھا اور نہ انھوں نے خلیفہ کو کوئی درخواست دی تھی۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے مامور ہی اس کام پر تھے کہ جس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے اسے ادائیگی فرض پر مجبور کریں اور جس کا کوئی حق اللہ نے مقرر کر دیا ہے، وہ اس تک پہنچائیں۔[1]

اندازہ کیجیے جس معاشرے میں سارا زور ہی ایتائے حقوق پر ہو اور خود حکومت بھی اپنے اختیارات و وسائل فرائض کو ادا کرنے پر صرف کر رہی ہو تو کیا وہاں انسان کے بنیادی حقوق کا کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی شکل میں انسانی تاریخ نے پہلی بار دیکھا کہ مفتوح کو بھی کوئی مذہب فاتح کے حقوق عطا کرتا ہے۔ کیا اس سے قبل کسی فاتح نے کسی مفتوح سے کہا تھا کہ میرے مذہب کی رو سے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو میرے ہیں۔ تمہیں اپنے عقیدے اور مذہب کی پوری آزادی حاصل ہے۔ چاہو تو اپنے عقیدے پر قائم رہو اور اگر ہمارے مذہب کو سچا مانو تو ہمارے ساتھ فاتحین کی صف میں شامل ہو جاؤ۔

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، (کتاب الزکوٰۃ الفصل الثالث کی پہلی حدیث) ص: ۱۵۷، رقم: ۱۷۹۰، نیز صحیح بخاری، رقم: ۱۳۹۹؛ ابو داؤد، رقم: ۱۵۵۶؛ النسائی، رقم: ۳۰۹۳؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳/۱۸۲؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ الحقانیہ، پشاور، ت۔ن، ۳/۷۰۳؛ ہیکل محمد حسین، صدیق اکبر (اردو ترجمہ از محمد اسحاق بھٹی)، الفیصل لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۸۵ - ۱۸۶

اقتدار و حکومت میں امانت و نیابت کا تصور

علم سیاسیات میں مقتدر اعلیٰ یا حاکم اعلیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اسکا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے، اسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں، افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں، اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں، اس کے دیے ہوئے ہیں اور وہ جس حق کو سلب کر لے وہ از خود معدوم ہو جاتا ہے۔

جب کسی انسان کو اس قسم کے لا محدود اختیارات حاصل ہوئے تو انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے انسانیت پر ظلم اور حقوق کی پامالی بھی ضرور ہوئی۔ کیونکہ اتنے اختیارات کا ہضم کرنا عام انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے اسلام نے ظلم و ناانصافی اور حقوق کی پامالی کی اس بنیاد اور جڑ ہی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ زمین پر کسی بھی انسان کا منصب، بالکل خود مختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ اور حاکم اعلیٰ کے خلیفہ اور نائب کا ہے۔ اس کو ایک خاص دائرے کے اندر تصرف کا اختیار ضرور حاصل ہے۔ لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا تفویض کردہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا وہی تصرف جائز اور معقول ہے جو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہو، ان سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس نیابت کے تصور کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے ہر اس تصرف کے لئے جوابدہی کرنی پڑے گی جو اصل مستخلف یعنی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہو۔

دوسرے حکومت و اقتدار کے بارے اسلام نے یہ تصور دیا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری اور امانت ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے امارت کا سوال کیا تو امارت کی نزاکت بتاتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

انت ضعیف وھی امانۃ وھی یوم القیامۃ خزی وندامۃ الا من اخذھا

بحقها وادی ما علیه فیها۔ [1]

اے ابوذر تو کمزور ہے اور یہ امارت و حکومت بہت بڑی امانت ہے اور بروز قیامت امیر کے لئے رسوائی اور ندامت کا باعث ہے۔ البتہ اس آدمی کے لئے رسوائی و ندامت کا باعث نہیں ہو گی جس نے اس کو اس کے حق کے ساتھ اختیار کیا اور امارت و حکومت میں جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی اسے صحیح معنوں میں ادا کیا۔

احتساب آخرت کا تصور

انسانی فطرت ہے کہ جب تک انسان کو کسی باز پرس اور احتساب کا ڈر نہ ہو وہ کماحقہ اپنے فرائض اور ذمہ داری سر انجام دیتا ہے نہ غلط کاریوں سے باز آتا ہے۔ دنیا میں اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی ایسے بلند مرتبہ و مقام اور منصب کا حامل ہو اور اتنا طاقتور ہو کہ اس سے اوپر کوئی ایسا آدمی نہ ہو جو اس سے باز پرس اور پوچھ گچھ کر سکے۔ اب یہ بات عقل و انصاف کے منافی ہے کہ وہ سیاہ سفید جو کچھ چاہے کرتا رہے اور کبھی اسکا حساب کتاب نہ ہو۔ اس لیے انسان کو لگام ڈالنے کے لئے شریعت نے اخروی باز پرس کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ اسے بنیادی عقائد اسلام میں شمار کیا ہے۔ قرآن مجید میں اخروی باز پرس، بارگاہ الٰہی میں پیشی اور دنیوی زندگی میں کی گئی ہر نیکی و بدی کے حساب کتاب کا جتنا تکرار کیا گیا ہے، شاید ہی اتنا تکرار کسی دوسرے عقیدہ کا کیا گیا ہو۔ قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی میں بڑی تفصیل اور تکرار کے ساتھ بڑے موثر پیرایوں میں احتساب آخرت کا تصور انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان احادیث کا شمار واحاطہ مطلوب نہیں۔ صرف ایک روایت ملاحظہ ہو، حضور ﷺ نے فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالا میر الذی علی الناس

1۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الامارۃ باب کراھۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ، ۲/۱۲۱ رقم الحدیث: ۱۹۷۴؛ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۹

راع وھو مسئول عن رعیته۔[1]

سن لو تم میں سے ہر ایک آدمی نگران (حاکم) ہے اور بروز قیامت اس سے باز پرس کی جائے گی تو (اس قاعدے کے تحت) لوگوں پر امیر یا حکمران بھی ایک نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا بارے پوچھا جائے گا۔ اسی اخروی احتساب کے خوف سے حضرت عمرؓ جیسے عشرہ مبشرہ میں داخل خلیفہ کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ اور ایک دوسری روایت کے مطابق فرمایا کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کے بارے مجھ سے باز پرس فرمائیں گے۔[2] اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک مرتبہ رات بھر روتے رہے حتیٰ کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ صبح بیوی نے اس گریہ و ازاری کا سبب پوچھا تو فرمایا! ہاں میرا حال یہ ہے کہ میں اسود و احمر تمام امت مسلمہ کا والی بنایا گیا ہوں۔ مجھے ملک کے دور دراز علاقوں میں پڑے غرباء، مساکین، فقراء، محتاج، قیدیوں اور ان جیسے مظلوم و مقہور لوگوں کی یاد آئی تو مجھے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے بارے مجھ سے ضرور سوال کرے گا اور نبی اکرم ﷺ ان کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا فرمانے والے ہوں گے۔ تو میں اس بات سے ڈر گیا کہ اس وقت اللہ کے سامنے کوئی عذر نہیں چل سکے گا اور نہ حضور کے سامنے کوئی حجت پیش کر سکوں گا۔ یہ سوچ کر میں ڈر گیا اور رونے لگا۔[3]

احتساب کے اس تصور و عقیدہ کے ذریعے اسلام نے اپنے ماننے والوں بالخصوص حکمرانوں کو کسی بھی فرد کے حقوق کی پامالی اور ظلم و زیادتی سے باز رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

---

[1] ۔ بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب الاحکام پہلا باب) ۲/۱۰۵۷، رقم: ۷۱۳۸ نیز (کتاب النکاح باب قولہ قوا انفسکم واھلیکم نارا) ۲/۷۷۹؛ مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب الامارۃ باب فضیلۃ الامیر العادل الخ) رقم: ۴۷۲۴، ۲/۱۲۲؛ ہیثمی، مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ۵/۲۰۷

[2] ۔ دیکھیے: ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳/۳۰۵؛ ابن جوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۶۴ھ، ص: ۱۶۱

[3] ۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۷

پانچویں فصل

تحفظ حقوق کے لیے عملی اقدامات

اسلام نے لوگوں کے حقوق کی حفاظت و ادائیگی کے لئے صرف اخلاقی ہدایات اور اخروی بشارتوں اور وعیدوں پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے لئے عملی اقدامات اور قانونی دفعات بھی رکھی ہیں۔ انسان کی جبلت و فطرت کو اس کے خالق سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے۔ بعض طبائع ایک چیز کو محض "بات" سے نہیں بلکہ "لات" سے سمجھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے اللہ کریم نے انبیاء و مرسلین، آسمانی کتابوں اور قیام عدل کے لئے میزان اتارنے کے بعد "لوہا" نازل فرمانا بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔[1]

بے شک ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں (معجزات) دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (ترازو) نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت ہیبت و قوت ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی (بہت سے) فائدے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے ٹکڑا "وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ" کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

یعنی ہم نے لوہا اس آدمی کو راہ راست پر لانے کے لیے بنایا جو حق کا انکار کرتا ہے اور اپنے اوپر (انبیاء و رسل اور آسمانی کتب کی صورت میں) حجت قائم ہونے کے بعد بھی اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان نبوت کے بعد

---

[1] -الحدید، ۵۷: ۲۵

تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا جس کے دوران مکی سورتیں آپ پر وحی کی گئیں۔ ان تمام سورتوں میں مشرکین کے ساتھ علمی بحث مباحثہ، توحید کا بیان اور کھلے دلائل و معجزات کا ذکر ہے۔ جب مخالفین پر حجت قائم ہو گئی تو اللہ نے اہل ایمان کو ہجرت کا حکم فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کی مخالفت و تکذیب کرتے اور قرآن کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، ان کے ساتھ تلواروں اور گردنیں اڑانے کے ذریعے جنگ کریں۔[1]

عصر حاضر کے اردو مفسر پیر کرم شاہ الازہریؒ نے درج بالا آیت کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے:

کسی معاشرے میں عدل کے قیام کی یہی صورت ہے کہ حقوق اللہ بھی پوری طرح ادا کیے جائیں۔۔۔۔ اسی طرح حقوق العباد کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ کسی کا حق تلف نہ کیا جائے۔ کسی پر زیادتی نہ کی جائے۔ کسی کے جان، مال اور آبرو پر دست درازی نہ کی جائے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر عدل و انصاف کو بروئے کار لایا جائے اور اگر باہمی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اسکا تصفیہ اس میزان یعنی عقل سلیم کے مطابق کیا جائے جسے حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت بخشی گئی ہو اور اگر حق و انصاف کے سامنے کوئی شخص سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ روشن اور واضح دلائل و براہین کے بعد بھی باطل سے چمٹا رہتا ہے اور حق کو نیچا دکھانے کے لئے کوشاں رہتا ہے تو اس وقت اس کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو لوہے کا ڈنڈا بھی عطا فرمایا ہے۔ جس کی ایک ضرب اچھے اچھے بد دماغوں کا دماغ درست کر سکتی ہے۔[2]

جبکہ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

---

[1] ۔ تفسیر القرآن العظیم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۹ء، ۴ / ۳۱۳

[2] ۔ تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۰۰ھ، ۵ / ۱۲۵

یعنی جب رسولوں کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نازل کرنے کا اصل مقصود قیام قسط ہوا تو یہ کام مجرد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو رسولوں کو بینات یعنی نہایت واضح دلائل کے ساتھ اور کتابوں کو میزان اور کسوٹی بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں پر عقلی و اخلاقی پہلو سے اچھی طرح حجت تمام ہو جائے۔ دوسری طرف لوہا بھی اتارا کہ جو لوگ اتمام حجت کے بعد حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے اغراض کے لیے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے ہی پر تلے ہوں ان کو طاقت کے ذریعے زیر کیا جائے۔[1]

اسی طرح ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے درج بالا انسانی نفسیات کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

ان اللہ لیزع بالسلطان ما لا یزع بالقرآن۔[2]

بیشک اللہ تعالیٰ سلطان (حکومت و اقتدار) کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح عدل و انصاف اور انسانی حقوق کا تحفظ چاہتا ہے، وہ صرف وعظ و تذکیر سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے حکومتی اختیارات و اقتدار کا ڈنڈا بھی درکار ہے۔ الغرض اسلام نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے صرف زبانی تعلیمات و ہدایات اور اخروی بازپرس کا خوف دلانے اور بشارت و وعیدات پر ہی اکتفا نہیں بلکہ اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔ تحفظ حقوق کے لئے اسلام کے چند عملی اقدامات درج ذیل ہیں۔

حکومت—تحفظ حقوق کی ذمہ دار

اسلام نے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت پر ڈالی ہے۔ ابو عبید نے

1- تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء، ۸/۲۳۰

2- زغلول، ابو ہاجر محمد السعید بن بسیونی، موسوعۃ اطراف الحدیث، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء، ۴/۱۹۰

کتاب الاموال کا آغاز ہی اس بات سے کیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں ایک امیر اپنی رعایا کے تحفظ حقوق کا کس قدر ذمہ دار ہے اور امارت و حکومت کتنی نازک ذمہ داری ہے۔ اس ضمن میں ابو عبید نے متعدد احادیث و آثار نقل کیے ہیں۔ جن کا اندراج طوالت کا باعث ہو گا۔ اسی سلسلے میں ابو عبید نے ابو عبیدہ بن عبداللہ کا یہ اثر نقل کا ہے کہ:

> امام عادل کی صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے گلہ شکوہ کی آوازوں کو جو اللہ تک پہنچائی جاتی ہیں خاموش کر دیتا ہے اور جور پسند امام کی پہچان یہ ہے کہ اس کے خلاف اللہ سے بہت زیادہ شکوے شکایتیں کی جاتی ہیں۔[1]

دنیا میں مظلوم آدمی کا آخری اور ظاہری سہارا حکومت ہوتی ہے یا حکومتی ادارے انتظامیہ اور عدلیہ وغیرہ۔ اگر اس کی ان حکومتی اداروں میں دادرسی نہ ہو تو وہ بارگاہ الٰہی میں استغاثہ اور شکایت کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ بارگاہ الٰہی میں رعایا کی اسی شکایت سے بچنے اور ان کے حقوق کے تحفظ و ادائیگی کے لیے ہی حضرت فاروق اعظمؓ رات کو زیادہ تر بے فکر سونے اور محو آرام ہونے کی بجائے مدینہ منورہ اور ارد گرد کے علاقہ میں گشت فرمایا کرتے تھے۔ جس کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں۔[2]

ایک عامل حضرت سعد بن ابی وقاص نے رعایا سے اوجھل ہونے کے لیے پردہ تان لیا تو حضرت عمر نے ان کے محل / دفتر کو ہی جلا دیا۔[3]

عزالدین بن عبد السلام نے سیدنا عمر فاروقؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں" پھر اس کی تشریح میں انہوں نے

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: کتاب الاموال، ص، ۹ — ۱۰

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، الفاروق، اسلامک بک سنٹر، لاہور، ۲۰۰۵، ۲/ ۳۳۳-۳۳۶؛ ہیکل محمد حسین، عمر فاروق (اردو ترجمہ از محمد مسعود عبدہ) الفیصل لاہور، ت۔ن، ص: ۷۵۳-۷۵۴

[3] ۔ ابن قیم، الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ (فصل نمبر ۷) ص: ۲۸

لکھا ہے:

> اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ وہ اللہ رب العالمین سے ان کی تکمیل کے طالب ہوں۔ حکمرانوں پر مسلمانوں کے جملہ حقوق کے بارہ یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے۔[1]

لوگوں کے تحفظ حقوق کے معاملے میں حکمرانوں کی شرعاً میں کیا ذمہ داریاں ہیں؟ اس سلسلے میں ایک اور حدیث نبوی ملاحظہ ہو: سانحہ کربلا کا مرکزی کردار عبیداللہ بن زیاد مشہور صحابی حضرت معقل بن یسارؓ کے مرض الوفات میں آپ کی عیادت کے لئے آیا تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی کچھ عرصہ کے لیے مزید باقی ہے تو تمہیں یہ حدیث نہ بتاتا۔ پھر آپ نے فرمایا:

> قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ما من عبد یسترعیه الله رعیة فلم یحطها بنصیحة الا لم یجد رائحة الجنة۔ متفق علیه (واللفظ للبخاری)۔[2]

> میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جس بندے کو اللہ کسی رعیت کا راعی یعنی حاکم و نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری نہ کرے تو وہ حاکم جنت کی

1۔ قواعد الاحکام فی مصالح الانام، مطبعہ حسینیہ، قاہرہ، ۱۹۳۴ء، ۱/۱۴۸

2۔ دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الاحکام باب من استرعی رعیة فلم ینصح)، ۲/۱۰۵۸، رقم: ۷۱۵۰؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الامارة باب فضیلة الامیر العادل الخ)، ۲/۱۲۲، رقم: ۴۷۳۱؛ خطیب تبریزی، مشکوٰة المصابیح (کتاب الامارة والقضاء۔ الفصل الاول) ص: ۳۲۱، رقم: ۳۶۸۷

خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

اس حدیث کی شرح میں مولانا منظور نعمانیؒ نے لکھا ہے:

> اس حدیث میں اور اس کے علاوہ بعض اور حدیثوں میں بھی امیر یعنی صاحب حکومت کو "راعی" اور اس کے زیر حکومت عوام کو "رعیت" کہا گیا ہے۔ اصل عربی زبان میں راعی کا معنی چرواہے اور نگہبان کے ہیں اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی حفاظت و نگہبانی اس کے ذمہ ہو۔ صرف یہ دو لفظ یہ بتلانے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام میں حکومت و امارت کا کیا تصور ہے اور حکمرانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ فرض شناس چرواہے ان جانوروں کو جن کا چرانا اور جن کی نگرانی و نگہبانی ان کے ذمہ ہوتی ہے، سرسبز چراگاہوں میں لے جاتے ہیں، درندوں، چوروں اور رہزنوں سے ان کی حفاظت کرتے ہیں اور شام کو گھر واپس لاتے ہیں۔ اسی طرح ان کو کھلانا پلانا اور ان کی دیکھ بھال بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ان حدیثوں نے بتلایا کہ اسلام میں یہی حیثیت خلیفہ اور حکمران کی ہے وہ عوام کا محافظ اور رکھوالا ہے اور ان کی ضروریات کی فکر اس کی ذمہ داری ہے اور اگر وہ اس سلسلہ میں بے پروائی برتے گا تو اللہ کے نزدیک مجرم ہوگا۔[1]

لوگوں کے تحفظ حقوق کے معاملے میں خود پیغمبر اسلام ﷺ نے کیا عملی نمونہ چھوڑا ہے۔ اس سلسلے میں کتب حدیث و سیرت میں متعدد و بینظیر مثالیں موجود ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے سربراہ حکومت ہونے کی حیثیت سے کس طرح لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے اور لوگوں کے انفرادی و ذاتی حقوق کی حفاظت کی اور انہیں ادنی زیادتی سے بھی بچایا ہے۔ چنانچہ قاضی ابو یعلیٰ نے باسند یہ روایت نقل کی ہے کہ:

---

[1] ۔معارف الحدیث، ادارہ اشاعت حدیث، لاہور، ت۔ن، ۷/ ۳۳۶

كان لسمرة بن جندب نخل في حائط رجل من الانصار، وكان يدخل عليه واهله فيؤذيه، فشكاذالك الانصاري الى رسول الله ﷺ فقال له بعه فابي قال فاقطعه فابي قال: هبه ولك مثلها في الجنة فابي فقال رسول الله ﷺ: انت مضار اذهب فاقلع نخله۔[1]

ایک انصاری آدمی کے باغ / حویلی میں سمرہ بن جندب کا ایک کھجور کا درخت تھا، یہ سمرہ بن جندب اور ان کے اہل خانہ اس انصاری کے حویلی میں داخل ہوتے تو اس سے اس انصاری کو ذہنی اذیت ہوتی۔ اس انصاری نے اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تو آنجناب نے سمرہ سے فرمایا: یہ کھجور کا درخت اس انصاری کو بیچ دو۔ اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا پھر اسے اکھیڑ لو۔ اس نے انکار کیا تو فرمایا: اسے یہ درخت ھبہ کر دو جس کے بدلے میں اللہ تمہیں اس کی مثل جنت میں درخت عنایت فرمائے گا۔ سمرہ نے یہ بات بھی نہ مانی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو ضرر پہنچانے والا آدمی ہے (اور اسلام میں کسی کو ضرر پہنچانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی)۔ پھر آپ نے اس انصاری سے فرمایا: جاؤ اور اس کی کھجور کا درخت اکھیڑ کر باہر پھینک دو۔

الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ یہ روایت سنن ابی داؤد میں بھی موجود ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ آنجناب ﷺ نے اس انصاری آدمی سے اذیت و ضرر کا ازالہ پہلے نرمی سے کرنے کی کوشش فرمائی مگر جب نرمی اور شرافت کی زبان اس کو سمجھ نہ آئی تو پھر سختی سے اس اذیت و ضرر کے ازالہ کا حکم فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی اپنی حکومت کا جو پالیسی بیان دیا اس میں خلیفہ کی حیثیت سے تحفظ حقوق کے معاملے میں جو اپنی ذمہ داری بیان فرمائی، اسے متعدد محدثین و

---

1 ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۸ء، ص: ۲۸۵

2 ابو داؤد، السنن (کتاب القضاء باب فی القضاء)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۳/ ۱۵۶، حدیث نمبر ۳۶۳۶

مؤرخین نے نقل کیا ہے۔ فرمایا:

میری نظر میں معاشرہ کا سب سے زیادہ طاقتور وہ کمزور شخص ہو گا جس کے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہو گی تا آنکہ میں اس کے جملہ حقوق واپس نہ دلا دوں۔ اسی طرح میرے نزدیک معاشرہ کا سب سے کمزور فرد وہ طاقتور شخص ہو گا جو اللہ کے حقوق غصب کرتا ہے تا آنکہ میں اس سے غصب شدہ حقوق واپس نہ لے لوں۔[1]

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی نے حنفی فقیہ سید علی زادہ کے حوالے سے امیر حکومت کے فرائض بتاتے ہوئے لکھا ہے:

ولا یدع فقیرا فی ولایته الا اعطاہ ولا مدیوناً الا قضیٰ عنه دینه ولا ضعیفا الا اعانه ولا مظلوماً الا نصرہ ولا ظالماً الا منعه عن الظلم ولا عاریا الا کساہ کسوۃ۔[2]

وہ اپنی مملکت کے اندر کوئی ایسا فقیر نہ چھوڑے جس کو عطا نہ کر دے، کوئی ایسا مقروض نہ چھوڑے جس کی طرف سے قرض ادا نہ کر دے، کوئی کمزور نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی اعانت کرے کوئی مظلوم نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی مدد کرے۔ کوئی ظالم نہ چھوڑے مگر یہ کہ اسے ظلم سے روک دے اور کوئی آدمی ننگے بدن نہ رہنے دے الا یہ کہ اسے لباس پہنا دے۔

علاوہ ازیں ایک اسلامی ریاست میں امام کے تقرر کا واجب ہونا، محکمہ قضا کا قائم کیا جانا، محکمہ احتساب اور دیوان المظالم کا قیام، قاضیوں کا تقرر اور پولیس وغیرہ جیسے محکموں کے قیام کا بڑا مقصد یہی ہے

---

1 ۔ دیکھیے: ابو عبید، کتاب الاموال، ص:۹؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، مصطفی البابی، مصر، ۱۹۳۶ء، ۴/۳۱۱؛ ابن اسحاق، سیرۃ النبی، ۲/۱۸۷؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳/۹۷؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ الحقانیہ پشاور، ۶/۶۹۲؛ ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، ص: ۵۱۰

2 ۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۴ء، ص: ۱۲۹ - ۱۳۰

کہ حکومت ان محکموں اداروں اور عاملوں کی مدد سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کی سرکاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے اور ریاست کے کسی بھی شہری کو اپنی حق تلفی اور اپنے ساتھ کسی بھی قسم کا احساس نہ ہونے دے۔[1] علامہ ماوردی نے "فی عقد الامامۃ" کی بحث میں لکھا ہے کہ امام و خلیفہ کے لیے دس امور لازم و فرض ہیں دیگر امور کے علاوہ بطور خاص انسانی حقوق کے حوالے سے اس پر لازم ہے کہ:

(تیسرا فریضہ) ملک کی حفاظت کرے اور دشمن سے اسے بچائے۔ تاکہ تمام لوگ اطمینان سے اپنی زندگی کے کاروبار میں مصروف ہوں اور بغیر جان و مال کے خطرے کے اطمینان سے سفر کر سکیں۔

(آٹھواں فریضہ) بیت المال سے مستحقین کے لئے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کرے نہ ان میں اسراف ہو نہ امساک اور یہ وظیفے اور تنخواہیں مستحقین کو بلا تقدیم و تاخیر وقت پر دی جائیں۔

(دسواں فریضہ) خود تمام امور سلطنت کی نگرانی کرتا رہے اور تمام واقعات سے باخبر رہے تاکہ امت کی پاسبانی اور ملت کی حفاظت وہ خود کر سکے اور عیش و عشرت یا عبادت میں مشغول ہو کر اپنے فرائض دوسروں کے حوالے نہ کر دے کیونکہ ایسی صورت میں دیانت دار بھی خیانت کرنے لگتا ہے اور وفادار بھی خواہ کی نیت میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (حضرت داؤد علیہ السلام سے) فرمایا:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ لہذا لوگوں کے درمیان حق و صداقت سے فیصلہ / حکومت کرو اور خواہشات نفسانی کے پیچھے نہ پڑ جانا ورنہ وہ تمہیں

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الماوردی، الاحکام السلطانیہ (چھٹا باب: فی ولایۃ القضاء)، ساتواں باب: فی ولایۃ المظالم اور بیسواں باب: فی احکام الحسبۃ)

اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گی۔[1]

نفاذِ حدود و تعزیرات

بعض جرائم پر اسلام نے حدود و تعزیرات (شرعی سزائیں) بھی مقرر فرمائی ہیں۔ اسلامی حکومت میں حدود کا نفاذ کسی حکمران کی صوابدید پر ہے نہ کوئی حکمران انہیں سیاسی انتقام کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ ان کے نفاذ سے مقصود اسلامی ریاست میں بسنے والے ہر فرد (مسلم و غیر مسلم کی تمیز کے بغیر) کی عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ اور انسانیت کی تکریم ہے نہ کہ توہین۔ ان حدود و تعزیرات سے دوسرا بڑا مقصد کسی کی حق تلفی اور اس پر کسی قسم کے ظلم و زیادتی کے ارتکاب سے لوگوں میں ڈر اور خوف پیدا کرنا ہے۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے کہ حد کا لغوی معنی ہی روکنا ہے۔ اسی لیے دربان کو حداد کہتے ہیں کیونکہ وہ اجنبیوں کو گھر میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ از روئے شریعت حد کا معنی ہے: مقرر شدہ سزا جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر واجب ہوتی ہے۔ تعزیر حد سے مختلف ہے کیونکہ وہ غیر مقرر شدہ ہوتی ہے۔ درے مارنا یا جیل میں بند کرنا تعزیر ہے اس کے علاوہ اور قسم کی سزا ہو تو اسے بھی تعزیر کہیں گے۔ قصاص بھی حد سے مختلف ہے کیونکہ قصاص باوصف اس کے کہ مقرر شدہ سزا ہے، حد نہیں کیونکہ یہ بندے کا حق ہے (نہ کہ اللہ تعالیٰ کا) اسی لیے قصاص میں عفو و درگزر اور صلح روا ہیں۔ حد کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس شخص پر حد نافذ ہوتی ہے اسے اعادہ جرم سے باز رکھتی ہے اس صورت میں جبکہ اس سے سزایاب کی جان کا اتلاف نہ ہو اور دوسرے لوگ ایسی سزا کو نافذ ہوتے دیکھ کر اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔[2]

---

[1] - الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری البغدادی (م ۴۵۰ھ)، الاحکام السلطانیہ والولایات الدینیہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء (الطبعۃ الاولی)، ص: ۱۸؛

نوٹ: اسلامی حکومت اپنی مسلم و غیر مسلم رعایا کے حقوق کے تحفظ کی کتنی ذمہ دار ہے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید مودودیؒ، خلافت و ملوکیت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص: ۷۶-۷۹

[2] - دیکھیے: بدائع الصنائع (اردو ترجمہ از خان محمد چاولہ)، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ۱۹۸۷ء، ۷ / ۱۰۱

دیگر شرائع اور ملکی قوانین مثلاً رومن لاء کی طرح اسلام میں حدود و تعزیرات کو بطور انتقام کے جاری نہیں کیا جاتا، بلکہ حدود شرعیہ کے نفاذ کا مقصد وحید نظام تمدن کے اختلال کو روکنا، مظلوم کی حمایت، شریف اور امن پسند شہریوں میں احساس تحفظ پیدا کرنا اور سماج دشمن عناصر کے دل میں خوف پیدا کر کے انہیں ایسی حرکات سے باز رکھنا ہے جن کے باعث اللہ کی زمین میں فساد جنم لیتا اور معاشرے کا اخلاقی معیار پست ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں حدود شرعیہ کے فلسفے پر گفتگو فرماتے ہوئے لکھا ہے:

> بعض معاصی کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کی ہے۔ یہ وہی معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا، نظام تمدن میں خلل پیدا ہوتا اور مسلمانوں کے معاشرے کی طمانیت اور سکون قلب رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ معاصی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ دو چار مرتبہ ارتکاب کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے اور ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معاصی میں محض آخرت کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب اپنے معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور ساری زندگی سوسائٹی کے دیگر افراد کے لئے سامان عبرت بنا رہے اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرم کرنے کی جرأت کریں۔ اس کی ایک واضح مثال زنا ہے۔ زنا کا محرک صنفی خواہش کا غلبہ ہے، عورتوں کے حسن و جمال سے اس جذبے کو تقویت ملتی ہے اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے عورت کے اہل خاندان کو سخت رسوائی بھی اٹھانی پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے کشت و خون ہوتا ہے۔ چونکہ اکثر یہ فعل فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے اور اس کی سزا عبرت ناک نہ رکھی جاتی تو اس برائی کے پھیل جانے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی۔ اس کی دوسری مثال سرقہ یعنی چوری ہے۔ چونکہ انسان بسا اوقات اپنے لئے کوئی جائز اور حلال ذریعہ معاش نہیں پاتا ہے، اس لئے وہ چوری کو اپنا ذریعہ معاش بنالیتا ہے۔ زناکاری کی طرح دو ایک بار کرنے سے اس کی بھی لت پڑ جاتی ہے اس لئے

ضروری ہوا کہ اس کے لئے بھی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے۔[1]

یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ انسانی جان، مال، نسل اور عقل کا تحفظ شریعت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے۔ جہاں ان بنیادی مقاصد کے کلی طور پر ضائع ہونے کا خدشہ ہو وہاں ان کے تحفظ کے لیے حدود کی شکل میں شریعت نے سخت اقدام کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ سختی سے حکم دیا ہے۔ مذکورہ بنیادی مقاصد شریعت میں انسانی جان کا تحفظ کئی پہلوؤں سے اولین اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام انسانی جان کے تحفظ کے بارے میں کسی نرمی کا قائل نہیں۔ اسی طرح اسلام انسانی عزت و آبرو کے معاملے میں بھی کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہر شخص کے جائز طریقے سے حاصل کیے ہوئے مال کا تحفظ بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی ریاست ان مقاصد شریعت کا تحفظ نہیں کر سکتی تو اس کی بقا کا کوئی جواز نہیں۔ مشہور فقیہ و محدث علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

من وجب علیہ حق فامتنع من ادائہ فانہ یضرب حتی یؤدیہ۔[2]

جس آدمی پر کوئی حق واجب ہو اور وہ اس کی ادائیگی نہ کرے تو اسے مارا پیٹا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ صاحب حق کا حق ادا کر دے۔

لہٰذا ہر حوالے سے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم و غیر مسلم کی تمیز کے بغیر اپنی تمام رعایا کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے تحفظ کا اہتمام کرے۔

---

[1] ۔شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء، ۲/۱۵۷

[2] ۔ابن قیم جوزیہ، اعلام الموقعین عن رب العالمین (فصل کلام احمد فی السیاسۃ الشرعیۃ)، ۴/۲۸۷

باب سوم

اسلامی نظریاتی ریاست اور غیر مسلم

پہلی فصل

اسلامی ریاست کی تعریف

زیر نظر کتاب چونکہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق سے متعلق ہے۔ اسلیے مناسب ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ اسلام اور علماء و مفکرین اسلام کے نزدیک "اسلامی ریاست" کسے کہتے ہیں؟ یعنی کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کی کم از کم شرائط اور تقاضے (Minimum Requirements of Islamic State) کیا ہیں؟ تو اس سلسلے میں "ریاست" (State) کے مادہ اشتقاق، اسکی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کی وضاحت کے لیے سیاسی مفکرین کی تعریفات اور اقوال کی تفصیل میں جائے بغیر مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست میں جہاں تک ان کے ظاہری ڈھانچے اور عناصر ترکیبی کا تعلق ہے تو ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ علماء سیاست کے مطابق ایک عام ریاست جس طرح اس چیز کی محتاج ہے کہ اس کے قبضہ میں ایک مخصوص علاقہ ہو، وہ داخلی طور پر با اقتدار اور خارجی حیثیت سے خود مختار ہو، اسکے پاس ایک سیاسی ادارہ (حکومت) ہو جو ان کے ارادوں کی تنفیذ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے[1] وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اسلامی ریاست بھی اپنے وجود پذیر ہونے کیلیے درج بالا ساری چیزوں کی محتاج ہے، لیکن جہاں تک دونوں کے بنیادی اصول و مقاصد کا تعلق ہے تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ایک اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا مالک یا اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، تکوینی و تشریعی اعتبار سے اسی کے احکام اور اوامر و نواہی دوسرے لفظوں میں قرآن و سنت بلند و برتر اور سب سے اعلیٰ قانون (Supreme Law) کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ انسان روئے زمین پر اس کا نائب اور

---

[1] - تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو۔ Encyclopaedia Britanica London, 1960, V. 21 P.336، اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۳۹۳ھ - ۱۹۷۳ء، ۱۰/۴۱۹-۴۱۶

خلیفہ ہے۔ اسلام کے اس نقطہء نظر سے ایک اسلامی ریاست میں عوام کلی اقتدار کے مالک نہیں ہوتے بلکہ وہ اجتماعی طور پر اپنے منتخب نمائندوں کے ان اختیارات کے ذریعے جن کی حدود کا تعین قرآن وسنت کی طرف سے کیا جاچکا ہے، حکومتی نظم ونسق چلاتے ہیں۔ اس کے برعکس مغرب کی لادینی سیکولر (Secular) جمہوری ریاستوں میں عوام کو اقتدار کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے اور ان کے نمائندوں کا وضع کردہ دستور و آئین ہی ملک کا سپریم لاء مانا جاتا ہے۔ انہی کی رائے سے قوانین بنتے اور ان میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ جس قانون کو چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے ختم کر دیں۔ جبکہ ایک اسلامی ریاست میں یہ بات نہیں ہوتی۔ یہاں ایک بالاتر قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے ذریعے دیتا ہے جس کی اطاعت ریاست پارلیمنٹ عوامی نمائندوں تمام سرکاری اداروں اور پوری قوم کو کرنی پڑتی ہے۔[1]

ایک اسلامی ریاست اور جمہوری لادینی ریاست میں حاکمیت واقتدار اعلیٰ کے اسی اصولی فرق اور نقطہء نظر کے بنیادی اختلاف کا اثر غیر مسلم شہریوں یا اقلیتوں کے حقوق اور ان کے دیگر معاملات و مسائل پر بھی پڑتا ہے۔ جسکی تفصیل اپنے مقام پر آجائے گی۔

مولانا مودودی نے سورۃ النور کی آیت نمبر ۵۵ (وعد اللہ الذین امنوا منکم الخ) کے حوالے سے اسلامی ریاست کی اصل حقیقت وحیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ آیت دو اہم دستوری نکات کی تصریح کرتی ہے۔ اول یہ کہ ایک اسلامی ریاست کا صحیح مقام خلافت ہے نہ کہ "حاکمیت"۔ دوم یہ کہ ایک اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ پوری امت مسلمہ اسکی حامل ہوتی ہے جسے اللہ نے آزاد ریاست عطا کی ہو۔ پہلے نکتے کی

---

[1] - ایک اسلامی ریاست اور مغربی جمہوری ریاست میں اصولی فرق اور اختلاف کی تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: سید مودودی، خلافت وملوکیت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص: ۵۴-۵۷؛ سید مودودی، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۶۷، ص ۱۳۷-۱۲۹ نیز ص ۳۲۲-۳۱۱؛ اصلاحی، امین احسن، مولانا: اسلامی ریاست دارالتذکیر لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۲- ۲۹؛ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر: اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور-۲) شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۵-۲۰۵

تشریح یہ ہے کہ حاکمیت اپنی عین حقیقت ہی کی اعتبار سے اس امر کی متقاضی ہے کہ صاحب حاکمیت کی اپنے ذات سے خارج کوئی ایسی طاقت نہ ہو جو اس کے اختیارات کو محدود کرتی ہو اور اس کو خود اسکے اپنے بنائے ہوئے قوانین وضوابط کے سوا کچھ اوپر سے مسلط کیے ہوئے قوانین وضوابط کا پابند بناتی ہو۔ اب اگر ریاست پہلے ہی قدم پر یہ مان لے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم اس کے لیے بالاتر قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف نہ اسکی منتظمہ کام کر سکتی ہے نہ اسکی مقننہ کوئی قانون بنا سکتی ہے اور نہ اسکی عدلیہ کوئی فیصلہ کر سکتی ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں حاکمیت کے دعوی سے دستبردار ہو گئی ہے اور اس نے حکمرانی میں دراصل خدا اور رسول ﷺ کے ایجنٹ (خلیفہ) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

دوسرے نکتے کی تشریح یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔ جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی حاکمیت (Popular Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (Popular Vicegerency) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ خلافت کا یہ محدود اقتدار قرآن کی مذکورہ بالا تصریح کی رو سے کسی ایک شخص یا طبقے کو نہیں بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے، جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے، ان کے مشورے سے کام کرے اور اسی وقت تک حکمران رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔"[1]

اس چیز کی وضاحت میں ایک دوسری جگہ مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

"یہ چیز اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست (Theocracy) کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے اس فرق کے ساتھ کہ اہل مغرب جس چیز کو

1- اسلامی ریاست ص: ۳۷۰-۳۷۱

لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کیلیے ان کی جمہوریت میں عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ انکے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند ہے۔[1]

فقہاء اسلام نے اسلامی ریاست کی جگہ دارالاسلام کی اصطلاح (جس کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے) استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک دارالاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان آزادی اور سکون سے رہتے ہوں اور جہاں انہیں اسلامی احکام پر عمل کرنے اور شعائر اسلام کے اظہار کی کھلی آزادی ہو۔ دوسرے جہاں نظریہ اسلام کی بالادستی ہو اور تیسرے مسلمان سیاسی اعتبار سے آزاد و خود مختار ہوں۔[2]

جدید دور میں مغربی استعمار و نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر خلافت کے خاتمے اور ممالک اسلامیہ کے بہت سی قومی ریاستوں میں منقسم ہو جانے کے سبب دارالاسلام کی قدیم اصطلاح اور اس سے متعلقہ بہت سے تصورات کچھ غیر متعلق سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ فقہاء اسلام نے آج سے کم و بیش ایک ہزار دو سال قبل دارالاسلام، دارالحرب اور دارالصلح کی جو حد بندیاں کی تھیں۔ وہ آج کے زمینی حقائق کی روشنی میں اجنبی

---

[1] - حوالہ بالا، ص: ۳۴۰

[2] - دارالاسلام کی یہ وہ تین بنیادی شرائط ہیں جو امام ابو حنیفہؒ نے دیگر فقہاء کے مقابلے میں شرح و بسط سے بیان کی ہیں۔ اس وجہ سے دارالاسلام کی مباحث میں ان کا حوالہ کثرت سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور۔ ۲)، ص: ۵۳؛ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے فتاوی میں کافی کے حوالہ سے دارالاسلام کی تعریف یوں بیان کی ہے۔ "دارالاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان حکمران کے احکام و فرامین بمطابق شرع اسلامی آزادانہ طور پر جاری، نافذ ہوتے ہوں اور وہ علاوہ اس کے مسلمان حکمرانوں کے ماتحت (عملداری میں) ہو اور وہاں وہ اپنے اختیار و اقتدار کو آزادانہ طور سے بروئے کار لاتا ہو۔" دیکھیے: فتاوی عزیزی مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۴۱ھ، ص: ۱۶

معلوم ہوتی ہیں۔[1]

اسلامی ریاست اور مسلم ریاست میں فرق

اسلامی ریاست کی تعریف، پہچان اور خدوخال کی ضروری وضاحت کے بعد ایک اسلامی ریاست اور مسلم ریاست میں اصولی اعتبار سے کوئی فرق تو نہیں ہونا چاہیے مگر بدقسمتی اور سوئے اتفاق سے چونکہ تمام عالم اسلام میں اس وقت کسی بھی اسلامی ملک پر شرعی و فقہی اعتبار سے اسلامی ریاست کا اطلاق مشکل ہے، اس لیے اس فرق کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلم ریاست (Muslim State) سے مراد وہ ریاست ہے جس کا آئین (Constitution) اور انتظامی ڈھانچہ (Exective Structure) وہ نہ ہو جو ایک خالص اسلامی ریاست کا ہوتا ہے۔ اسکے باوجود وہاں کی حکومت اور اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور عوام کی اکثریت بھی اہل اسلام پر مشتمل ہو۔ اس تعریف کی رو سے آج کے دور میں تمام مسلمان ممالک مسلمان ریاستیں تو ہیں مگر انہیں اصولی اعتبار سے اسلامی ریاستیں نہیں کہا جاسکتا۔ اسلیے کہ وہ گزشتہ سطور میں بیان کردہ اسلامی ریاست کے تصور پر پورا نہیں اترتیں۔

مشہور نو مسلم اسلامی مفکر محمد اسد زیر بحث مسئلہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> A state inhabited predominantly or even entirely by Muslims is not necessarily synonymous with an "Islamic State". It can become truly Islamic only by Virtue of a conscious application of the sociopolitical tenets of Islam to the life of the nation, and by an incorporation of those tenets in the basic constitution of the country.[2]

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمود احمد غازی، دور جدید کے چند اجتہاد طلب مسائل، ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ، ۱۳: ۴ (شمارہ اپریل ۲۰۰۲ء)، ص: ۱۵-۱۶

[2] – The Principles of State and Government in Islam, University of California Press Berkeley and Los Angeles (chapter:1), P:1

کسی مملکت میں اسلامی آبادی کی بھاری اکثریت یا کاملاً اسلامی آبادی کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ اسلامی مملکت ہے۔ ہر مملکت اسی وقت حقیقی اسلامی مملکت بنتی ہے جب قوم کی زندگی کے لیے اسلام کے سیاسی و عمرانی اصول قصد و اہتمام سے نافذ کیے جاتے ہیں اور جب وہ اصول ملک کے بنیادی دستور میں شامل ہو جاتے ہیں۔[1]

اہل علم سے مخفی نہیں کہ اسلام فی نفسہ اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتا ہے، اس کے اپنے مستقل اور دائمی اصول وضوابط ہیں۔ مسلمانوں کا طرز عمل اسلام کی کسوٹی نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کے طرز عمل کو بھی اسلام کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جائیگا کہ وہ کس درجہ کے مسلمان ہیں۔ اسلامی ریاست کیلیے ضروری ہے کہ اسکی بنیاد نظریہ خلافت پر قائم ہو۔ جو خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرلے، خدا اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت کو قانون برتر اور اولین ماخذ قوانین مانے اور حدود اللہ کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو۔ اسلامی ریاست میں اقتدار کی اصل غرض وغایت خدا کے احکام کا اجراء اور اسکی رضا کے مطابق برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا فروغ ہے۔

---

[1] - اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول (ترجمہ مولانا غلام رسول مہر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۲

دوسری فصل

اسلام میں مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم

اسلام میں انسانوں کے درمیان تقسیم و تفریق کی بنیاد دیگر اقوام و مذاہب کی طرح اشتراک نسل، اشتراک وطن، اشتراک زبان، اشتراک رنگ اور پیشہ یا معاشی اغراض وغیرہ کے اشتراک پر نہیں بلکہ اسلامی عقیدہ و نظریہ اور اصولوں کی اساس پر ہے۔ صحیح بخاری کی ابتداء میں "حدیث جبریل" کے مطابق جو آدمی توحید و رسالت اور دیگر اسلامی عقائد اور فرائض و ارکان کو دل سے مانتا اور زبان سے اقرار کرتا ہے وہ مومن ہے چاہے وہ کسی بھی نسل، کسی بھی وطن اور کسی بھی رنگ سے تعلق رکھتا ہو اور چاہے وہ جو کوئی بھی زبان بولتا ہو۔ دنیا بھر کے مومن اس عقیدہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ایمانی و اسلامی بھائی ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔[1]

(بیشک سارے مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں)

اسکے مقابلے میں کسی رنگ، نسل، وطن، زبان کی تخصیص و تمیز کے بغیر وہ تمام لوگ جو اسلام کے بنیادی عقائد و ارکان پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ قرآن کے نزدیک "کافر" ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جس آدمی نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا اور اللہ کے آخری و آفاقی نبی حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی رسالت پر ایمان لایا وہ شرعی اصطلاح میں "مسلم" ہے اور جس آدمی نے دعوت اسلام کو قبول کیا نہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان لایا تو وہ "غیر مسلم" ہے۔ اس اعتبار سے تمام لوگ اسلام کے نزدیک صرف دو بڑے گروہوں "مسلم" (Belivers) اور "غیر مسلم" (Non-Belivers) میں تقسیم ہیں۔

[1] ۔سورۃ الحجرات ۴۹:۱۰

انسانوں کے درمیان اسلام کی اس تقسیم و تفریق پر قرآن مجید کی متعدد نصوص موجود ہیں جن کا شمار طوالت کا باعث ہو گا۔[1]

قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق غیر مسلم لوگ اگرچہ عقیدہ و نظریہ کے اعتبار سے "نجس" ہیں تاہم انسان ہونے کے ناطے انہیں اسلام میں تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ اسلام ان کے جان و مال اور عزت و آبرو اور دیگر حقوق کے تحفظ کی تعلیم ہی نہیں بلکہ عملی ضمانت دیتا ہے جس کی تفصیل آئندہ ابواب میں آ رہی ہے اور اسی چیز کی تشریح و توضیح زیر تحقیق مقالہ سے مقصود ہے۔

اسلام قومیت کے مندرجہ بالا غیر اختیاری عوامل یا عناصر ترکیبی (نسل، رنگ، زبان، وطن ،جغرافی یکجائی وغیرہ) میں سے کسی عامل کو بھی ایسا درجہ نہیں دیتا جس پر معاشرت اور تمدن کی بنیاد رکھی جا سکے اور اس کو ایک سیاسی نظام کے لیے اساس کار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ جسکی بنیادی وجہ انسانی تاریخ کا یہ مشاہدہ و تجربہ ہے کہ ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں بہت سی خرابیاں اور معاشرتی فساد در آتا ہے۔ مثلاً اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے ، ہر معاملہ میں اس کے زاویہ نگاہ پر انسانیت کی بجائے نسلی اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے، اسکی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف اپنی قوم ہوتی ہے، اس کے لیے یہ بات بڑی مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملہ میں اس نقطہء نگاہ سے بھی غور کرے کہ یہ سب ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء و ارکان ہیں۔ دوسرے ان عوامل سے ترکیب شدہ قومیں عموماً خود حق اور باطل کیلیے معیار کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ جو چیز ان کے حق اور مفاد میں جاتی ہو وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو ان کے مفاد کے خلاف پڑتی ہو وہ باطل قرار پاتی ہے، نسل و نسب اور زبان و وطن سے بنی ہوئی قومیتوں میں ساری اہمیت عام انسانی اخلاقیات کی بجائے انہی چیزوں کو حاصل ہوتی ہے اور قوم کے ہر

---

[1] ۔ دیکھیے: سورۃ التغابن ۶۴:۲ ؛ سورۃ محمد، ۴۷:۲-۱ ؛ سورۃ الجاثیہ، ۴۵:۱۳-۳ ؛ سورۃ البقرہ، ۲۵۶-۲:۲۵۷ ؛ سورۃ السجدہ، ۳۲:۲۰-۱۸ ؛ سورۃ المجادلہ ۵۷: ۱۹-۲۲ وغیرہ

فرد سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ نہ سن سکے اور انکی حمایت ونصرت میں مرنے مارنے کیلیے تیار ہو جائے۔ عربی میں اسی چیز کو " عصبیت " کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں صحابیؓ رسول حضرت واثلہ بن الاسقع کی بیٹی کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ کو یہ کہتے سنا کہ

قلت یا رسول اللہ ما العصبیۃ قال ان تعین قومک علی الظلم۔ [1]

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ تو اپنی قوم کی (محض اپنی قوم ہونے کی وجہ سے) ظلم پر مدد کرے۔

اس قسم کی ناروا عصبیت سے پیغمبر اسلام ﷺ نے یوں اپنی براءت ونفرت کا اظہار فرمایا ہے۔

لیس منا من دعا الی عصبیۃ ولیس منا من قاتل علی عصبیۃ ولیس منا من مات علی عصبیۃ۔ [2]

وہ آدمی ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی طرف (لوگوں کو) دعوت دی اور وہ آدمی بھی ہم میں سے نہیں جو عصبیت کے تحت لڑا اور وہ بھی ہم میں سے نہیں جو عصبیت پر مر گیا۔

اسلام نے تمام انسانوں کو عقیدہ و نظریہ کی بنیاد پر مسلم اور غیر مسلم دو گروہوں میں کیوں تقسیم کیا ہے؟ اسکی عقلی اور عملی وجہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

دنیا کی ہر قوم اور ہر نظام کے ماننے والوں کا یہ حق ہمیشہ تسلیم کیا گیا کہ جب وہ اپنے لیے بین الاقوامی تعلقات کا نظام تشکیل دیں یا بین الاقوامی لین دین کیلیے قواعد وضوابط مرتب کریں تو اپنے اور پرائے کا فرق ملحوظ رکھیں۔ یہ بات انسان کے مزاج میں شامل ہے کہ وہ اپنے اور پرائے میں بہر حال فرق رکھتا ہے۔ جو تعلقات اپنوں سے رکھے جاتے ہیں وہ پرائیوں سے نہیں ہوتے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جو معاملہ

---

1 - ابو داؤد، سلیمان بن اشعث: السنن (کتاب الادب باب فی العصبیۃ)، دارالفکر بیروت س۔ن، ۳/۳۳۱، حدیث نمبر ۵۱۱۹

2 - حوالہ سابق، ۳/۳۳۲، حدیث نمبر ۵۱۲۱

وہ اپنے قریبی لوگوں سے کرتا ہے وہ معاملہ اجنبی لوگوں سے نہیں کرتا۔ یہ خاصہ بشریت ہے کہ وہ اپنے کو اپنا اور پرائے کو پرایا سمجھے۔ اپنے کے ساتھ قرابت اور مراعات کے روابط رکھنا اور پرائے سے نسبتاً اجنبیت برتنا بڑی حد تک انسان کے لیے فطری سی بات ہے۔ اسلام نے بھی دین فطرت ہونے کی حیثیت سے بہت سے احکام میں اس چیز کا خیال رکھا ہے۔[1]

پھر کس چیز کو اپنا اور پرایا ہونے کا معیار اور دارومدار ٹھہرایا جائے؟ آیا دیگر اقوام کی طرح رنگ ، نسل، خاندان، زبان اور علاقہ کی وحدت کو اپنے اور پرائے کا معیار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ تو موصوف نے عقلی و نقلی اعتبار سے اس چیز کو غلط اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ثابت کرتے ہوئے کہا ہے۔

صرف نظریہ اور عقیدہ ہی ایسی چیز ہے جس پر دنیا کے انسانوں کو بلاامتیاز رنگ و نسل متحد کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بنیادوں کے برعکس عقیدہ اور نظریہ انسان اپنی آزاد مرضی اور شعوری ارادے اور اختیار سے اپناتا ہے۔ وہ غلط نظریات سے تائب ہو کر درست نظریہ جب چاہے اختیار کرلے۔ باطل عقائد سے جب توفیق ہو دست بردار ہو کر صحیح عقیدہ اپنالے۔ اسلیے اگر انسان ایک عاقل اور باشعور مخلوق ہے تو اسکے نظام اور اجتماعیت کی بنیاد بھی اسکی شعوری کوشش اور عاقلانہ فیصلے کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے اور وہ کوئی ایسی بنیاد ہی ہوسکتی ہے جس کو انسان اپنے آزادانہ فیصلے سے اپنا سکے۔ رنگ، نسل اور جائے پیدائش انسان کے اپنے اختیار سے باہر کی چیزیں ہیں۔ اس لیے ان کی بنیاد پر اسلام کے بین الاقوامی قانون کی عمارت استوار نہیں کی جا سکتی۔[2]

الغرض اسلام انسانوں کے درمیان اسلامی عقائد اور اصول کے اختلاف کے سوا ہر اختلاف کو غیر عقلی اور غیر فطری قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو ماننے کیلیے تیار نہیں کہ ایک ہی آدم کی اولاد میں محض اس بنا

---

[1] - خطبات بہاولپور ۲، اسلام کا قانون بین الممالک، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۶۲

[2] - حوالہ سابق ص ۶۴

پر فرق کیا جائے کہ ایک شخص کالا ہے دوسرا گورا ہے، ایک شخص جرمن نسل سے اور دوسرا اطالوی نسب سے ہے، یا ایک آدمی عربی بولتا ہے، دوسرا ترکی، ایک سرزمین عرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا عجم میں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان عوامل کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تقسیم و تفریق کی نفی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"لوگو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ سن لو نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر اور اسی طرح نہ کسی سرخ کو کسی سیاہ فام پر اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سرخ (گورے رنگ والے) پر فضیلت حاصل ہے مگر تقوی کے سبب سے"[1]

مولانا امین احسن اصلاحی نے زیر بحث مسئلے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آخر میں خلاصہ بحث کے طور پر لکھا ہے:

"اب تفصیل سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ غیر مسلم اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں بن سکتے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس تفریق کا باعث کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قومیت کے ان وسیع تصورات کو جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اپنانے کی بجائے ایسے محدود تصورات پر اصرار کرتے ہیں جن سے امن و سلامتی کی بجائے زمین میں ہمیشہ فساد بپا رہتا ہے۔ اسلام ان کو نسل و نسب اور ملک و وطن کی تنگ نالیوں سے نکال کر وحدت الہ، وحدت آدم اور وحدت فطرت انسانی کے عالمگیر اصولوں پر لانا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنی تنگ نظریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ بجائے اس کے کہ ان کی خاطر اپنے آپ کو ان تنگ نظریوں میں گرفتار کرا دے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔"[2]

غیر مسلموں کی قانونی حیثیت

اب سوال یہ ہے کہ درج بالا صراحت کے مطابق اگر غیر مسلم لوگ اسلامی قومیت کا جزء نہیں

---

[1] - دیکھیے، بیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ، ۴/۲۸۹، حدیث نمبر ۵۱۳۷

[2] - اسلامی ریاست ص ۹۹

اور نہ بننا چاہتے ہیں تو ایک اسلامی ریاست میں انکی قانونی حیثیت کیا ہے؟ اسلام ان سے کس طرح کا برتاؤ کرتا ہے؟ اور انہیں کیا حقوق دیتا ہے؟ تو اس کے جواب کیلیے ہی زیر تحقیق موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے۔ انسانوں کے درمیان عقیدہ و نظریہ کی بنیاد پر یہ تقسیم شریعت اسلامیہ کی نظر میں ایسی چیز نہیں جو انسانی زندگی اور انسان کی فکر و سوچ اور عمل پر اثر انداز نہ ہو۔ اسلام کے نزدیک یہ وہ مرکزی و محوری اور اس قدر اہمیت کی حامل تقسیم ہے جس پر صرف آخرت میں نتائج مرتب نہیں ہوں گے بلکہ دنیا اور حکومت کے بہت سارے احکام کا دارومدار بھی اسی نظریاتی تقسیم پر ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اسلامی ریاست کی خصوصیات کے ضمن میں اسلامی ریاست کو "جماعتی اور اصولی ریاست" قرار دیتے ہوئے زیر بحث نکتے کی یوں وضاحت کی ہے:

> دوسری بات جو اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مقصد اور اسکی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاست کو صرف وہ لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں۔ جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو۔ جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اسکی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اسکی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کر لے خواہ وہ کسی نسل کسی ملک کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس ریاست کو چلانے کیلیے بنائی گئی ہے اور جو اسے قبول نہ کرے، اسے ریاست کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ریاست کی حدود میں ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلام کے قانون میں متعین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کے جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے

گی لیکن بہر حال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی۔ کیونکہ یہ ایک اصولی ریاست ہے جس کے نظم ونسق کو وہی لوگ چلاسکتے ہیں جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔[1]

ایک اسلامی ریاست میں سیاسی حقوق کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم کو یکساں حیثیت کیوں حاصل نہیں؟ یہ فرق کیوں رکھا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے محمد صلاح الدین نے لکھا ہے:

اسلام کا یہ پہلو تو مطعون کیے جانے کے بجائے سراہے جانے کے قابل ہے کہ وہ اپنے حدود ریاست میں اللہ کے باغیوں اور غداروں کو نہ صرف امن وسکون سے رہنے کی اجازت دیتا بلکہ انہیں انسانی حقوق کے معاملے میں مسلمانوں کے مساوی حیثیت بھی دیتا ہے۔ ان کے درمیان فرق ہے تو صرف اتنا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کرنے کی بنا پر اس کے نفاذ کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں جبکہ غیر مسلم اس حاکمیت کو تسلیم نہ کرکے خود اپنے انکار کی بنا پر اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے گئے۔ وہ اگر اللہ پر ایمان لے آئیں تو خود بخود اس ذمہ داری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہونے کے مستحق بن جائیں گے۔ لیکن جب تک وہ اپنے انکار پر قائم ہیں، انہیں مقتدر اعلیٰ اپنے احکام و ہدایات کے عملی نفاذ کی ذمہ داری میں کیسے شریک کر سکتا ہے؟[2]

دارالاسلام اور دارالحرب کا فرق

اعتقادی و نظریاتی اعتبار سے انسانوں کی اس تقسیم (مسلم اور غیر مسلم) کی بنیاد پر ہی فقہاء اسلام نے ساری دنیا کو عموماً دو داروں "دارالاسلام اور دارالحرب" میں تقسیم کیا ہے۔ بعض فقہاء نے ان دو داروں

---

[1] - اسلامی ریاست ص ۱۳۷-۱۳۶

[2] - بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۴۵

کے علاوہ "دارالعہد" کا ذکر بھی کیا ہے اور اس سے مراد وہ علاقہ لیا ہے جو مسلمانوں کے بادشاہ کے زیر حکم آجائے اور دارالاسلام کے ساتھ صلح کے ذریعے ملے نہ کہ فتح اور تلوار کے زور پر۔[1] اس تعریف کی رو سے درحقیقت ایسا علاقہ دارالاسلام میں ہی داخل ہے۔

بہر کیف ان دونوں داروں کی تعریف مختلف فقہاء نے مختلف الفاظ میں کی ہے۔[2]
ہم یہاں اختصار کی خاطر صرف عصر حاضر کے ایک فقیہ ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی کی جامع تعریف پر اکتفا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر اسلامی احکامات اور شعائر نافذ ہوں اور مسلمان وہاں اپنی قوت اور شان کے ساتھ امن و سلامتی سے رہ رہے ہوں۔ اس کا دفاع مسلمانوں پر فرض ہوتا ہے اور اس علاقے کے جو حصے دشمن نے دبا لیے ہوں ان کا واپس لینا بھی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ بشرطیکہ اس طرح مقصد حاصل ہو جائے۔ ورنہ پھر قریب والے اور درجہ بدرجہ دیگر ساتھ ملنے والے علاقے کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر فلسطین وغیرہ جو علاقے پہلے دارالاسلام کا حصہ تھے اور بعد میں ان پر دشمن نے قبضہ کر لیا تو جب بھی اسلامی قوت میسر آجائے دراندازدشمن کو وہاں سے نکالنا فرض ہے۔[3]

دارالحرب

ڈاکٹر صاحب موصوف نے دارالحرب کی تعریف کچھ یوں کی ہے:
یہ وہ علاقے ہیں جہاں اسلامی اقتدار کی حدود سے باہر ہونے کی وجہ سے اسلام کے دینی اور سیاسی

---

[1] - زیدان عبدالکریم، احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام، مؤسستہ الرسالۃ بیروت، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء، ص: ۱۶

[2] - تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: حوالہ مذکور ص ۱۶ تا ۱۹

[3] - العلاقات الدولیہ فی الاسلام (اردو ترجمہ بنام "بین الاقوامی تعلقات – اسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ" از مولانا حکیم اللہ) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۴۴-۱۴۳

احکام نافذ نہ ہوں۔ یعنی ان میں وہ غیر مسلموں کے زیر اقتدار ہوں۔ جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے جن میں امام ابو یوسف ؒ اور امام محمد ؒ بھی شامل ہیں۔ ان کے نزدیک اس رائے کی بنیاد اسلامی اقتدار کی عدم موجودگی ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے امام ابو حنیفہ ؒ کے نزدیک دارالاسلام کے دارالحرب میں تبدیل ہونے کے لیے تین شرائط کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> چنانچہ تیسری شرط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ ؒ نے دار کی حیثیت متعین کرنے کے لیے وہاں کے شہریوں کے پاس عہد امان ہونے یا نہ ہونے کو بنیاد بنایا ہے چنانچہ جہاں پر مسلمانوں کو غیر مشروط امن حاصل ہو وہ علاقہ دارالاسلام ہو گا اور جہاں ایسا امن حاصل نہ ہو وہ دارالحرب ہو گا۔[1]

دارالحرب کی اصطلاح اور لغوی معنی سے یہاں ہمیشہ جنگی صورت حال اور جنگ کی کیفیت ہونے کی طرف کسی آدمی کا ذہن جا سکتا ہے اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازی فرماتے ہیں:

> ان اصطلاحات سے بعض اوقات کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مسلمان دارالاسلام سے باہر ساری دنیا کو دشمن سمجھتے ہیں اور ہر غیر مسلم سے سدا برسر پیکار رہنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ دارالحرب کے یہ معنی ہیں اور نہ دارالاسلام سے باہر کے علاقوں کیلیے دارالحرب واحد اصطلاح ہے۔ دارالحرب کی تعریف امام ابو حنیفہ ؒ کے نقطہء نظر کی رو سے (جن کے موقف کو سمجھنے میں بہت غلطیاں ہوتی آئی ہیں) یہ ہے کہ دارالحرب وہ علاقہ ہے جہاں اسلام کے احکام نافذ نہ ہوں، جو غیر مسلموں کے سیاسی اقتدار اور بالادستی کے تابع ہو اور جہاں یا تو مسلمانوں کو امن و تحفظ حاصل نہ ہو یا

---

[1] - حوالہ مذکور ص: ۱۴۵-۱۴۴

اگر حاصل ہو تو وہ کسی غیر مسلم قوت کی عطا کا نتیجہ ہو۔ [1]

[1] - اسلام کا قانون بین الممالک ص ۶۷

تیسری فصل

عقائد کی بنیاد پر غیر مسلموں کی اقسام اور اسلامی نقطہء نظر

یہ بات پیچھے گزر چکی ہے کہ وہ تمام لوگ(رنگ نسل زبان علاقہ کی تمیز کے بغیر) جنہوں نے اسلام کی دعوت دین و توحید کو قبول کیانہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی دائمی و آفاقی نبوت و رسالت پر ایمان لائے تو وہ شرعی نقطہء نظر سے غیر مسلم ہیں۔مذہبی رسوم اور اعتقاد و نظریات کے باہمی اختلاف کے باعث ان غیر مسلموں کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کا الگ نام ہے۔[1]

غیر مسلمین کی ان تمام اقسام کے متعلق اسلام کی کیا سوچ ہے ؟اور وہ ان کے ساتھ کس قسم کا عملی رویہ اختیار کرتا ہے؟اس چیز کی وضاحت کیلیے قرآن وسنت کی نصوص اور فقہاء اسلام کے باہمی اختلاف کی تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔تاہم ان تمام تفصیلات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس معاملے میں اسلامی نظریہ سے ان کا قرب اور بعد اور پھر اہل اسلام کے ساتھ ان کا عملی رویہ اور طرز عمل ہی باہمی تعلق کی بنیاد ہے۔[2] ڈاکٹر محمود احمد غازی کے الفاظ میں "جس غیر مسلم گروہ کا عقیدہ اور نظریہ اسلامی تعلیمات سے جتنا قریب اور جس کا طرز عمل جتنا دوستانہ اور مصالحانہ ہو گا۔اس کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات اتنے ہی قریبی اور دوستانہ ہوں گے اور اس کو اتنی ہی مراعات دی جائیں گی۔اس کے برعکس جو قوم گروہ یا ملک نظریہ توحید اور عقیدہ اسلام سے جتنا دور ہو گا اور جس کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ جتنا مخالفانہ اور معاندانہ ہو گا اس سے تعلقات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ایسے گروہوں سے تعلقات اور لین دین

---

1 ۔ تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: زیدان،عبد الکریم:احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام،مؤسسۃ الرسالۃ بیروت،۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء،ص ۲۱-۱۵

2 ۔ دیکھیے: سورۃ التوبہ،۹:۲۹اور سورۃ الممتحنہ،۶۰:۸،اور ان آیات کی تفسیر

میں مسلمانوں کو انتہائی محتاط رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔"[1]

اسی اصول کی بنا پر اسلام نے دوسرے غیر مسلموں کے برعکس اہل کتاب (یہود و نصاری) کو خصوصی عزت دیتے اور رعایت کرتے ہوئے ان کے ذبیحہ اور کھانے کو اہل اسلام کے لیے حلال نیز ان کی پاک باز عورتوں کے ساتھ مسلمان مردوں کا نکاح جائز قرار دیا ہے۔[2] پھر کسی مسلمان مرد کی کتابیہ عورت سے شادی کے بعد اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس مسلمان آدمی کے سسرال اور اسکی اولاد کے تمام ننھیالی رشتے (نانا، نانی، ماموں، خالہ، وغیرہ) اہل کتاب سے ہوں گے اور ان سب ذوی القربی سے صلہ رحمی اور ان کے حقوق کی پاسداری اس مسلمان کیلیے شرعا لازمی ہوگی۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

کن غیر مسلموں سے عقد ذمہ جائز ہے؟

بہر کیف کن غیر مسلموں سے جزیہ کے عوض عقد ذمہ (جسکی وضاحت آگے آرہی ہے) کیا جاسکتا دوسرے لفظوں میں انہیں اسلامی ریاست میں شہریت حاصل کرنے کا حق دیا جاسکتا ہے؟ تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ اہل کتاب (یہود و نصاری)[3] سے جزیہ لینے پر تو سب فقہاء کا اتفاق ہے۔ کیونکہ اس پر قرآن مجید کی صریح نص موجود ہے۔

چنانچہ ارشاد الہی ہے:

ترجمہ: اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر

---

1 - اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور۔ ۲) ص: ۶۹-۶۸

2 - دیکھیے: سورۃ المائدہ ۵:۵ (وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ الخ)

3 - فقیہ مفسر جصاص رازیؒ نے آیت جزیہ (سورۃ التوبہ، ۲۹:۹) اور سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۵۶ (ان تقولوا انما انزل الکتاب علی طائفتین من قبلنا) سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ صرف یہود و نصاری پر ہی اہل الکتاب کا اطلاق ہوتا ہے۔ دیکھیے: جصاص رازی، احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ کراچی ت۔ن ۱/۱۳۵

اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے حرام کیا ہے
اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں ہاتھ سے (رعیت بن کر)
اور (اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر کے) اپنی پستی کا احساس کرتے ہوئے۔[1]

غیر مسلموں کے دیگر گروہوں اور طبقات یا مختلف قسموں سے جزیہ قبول کرنے یا نہ کرنے اور آج کی اصطلاح میں انہیں شہریت دینے یا نہ دینے کے بارے امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں چار صفحات پر مشتمل ایک مستقل فصل "فصل فی المجوس وعبدة الاوثان واهل الردة" کے عنوان سے قائم کرتے ہوئے تفصیل اور متعدد احادیث اور ائمہ کے اقوال درج کیے ہیں۔ جن کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔ ان احادیث اور اقوال سے استدلال کرتے ہوئے امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے:

جمیع اهل الشرک من المجوس وعبدة الاوثان وعبدة النیران والحجارة والصائبین والسامرة توخذ منهم الجزیة ما خلا اهل الردة من اهل الاسلام واهل الاوثان من العرب فان الحکم فیهم ان یعرض علیهم الاسلام فان اسلموا والاقتل الرجال منهم وسبي النساء والاطفال۔[2]

تمام اہل شرک (مشرکین) مثلاً مجوس، بتوں کے پجاری، آگ اور پتھر کے پجاری، صائبین (ستارہ پرست) اور سامرہ سے جزیہ قبول کیا جائے گا ماسوا اہل اسلام میں سے مرتدین کے اور عرب کے بت پرستوں کے کیونکہ ان کے بارے حکم یہ ہے کہ ان پر اسلام پیش کیا جائے اگر اسلام قبول کر لیں تو فبہا ورنہ ان کے مرد قتل کر دیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے۔

---

1 ۔ سورۃ التوبہ ۹:۲۹

2 ۔ کتاب الخراج، دار المعرفة بیروت لبنان، ۱۹۷۹ء / ۱۳۹۹ھ، ص: ۱۲۹-۱۲۸، نیز دیکھیے: سحنون بن سعید، المدونة الکبری لامام مالک، الامارات العربیة المتحدة، ۱۴۲۳ھ ۹/ ۹۳-۹۰؛ امام شافعی، الرسالة، مکتبة العلمیة بیروت، ص: ۴۳۰

تاہم غیر مسلموں کے مذکورہ گروہ ذبیحہ اور نکاح کے معاملے میں اہل کتاب کی مانند نہیں۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے یہی حکم ثابت ہے۔ اسی پر جمہور علماء کا عمل ہے اور اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں [1]

زیر بحث مسئلے میں احناف کا موقف یہ ہے کہ مشرکین عرب سے اسلام یا تلوار کے بغیر کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ عرب کے اہل کتاب اور عجم کے تمام قسم کے کفار سے جزیہ قبول (عقد ذمہ) کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح امام مالکؒ کے نزدیک بھی مشرکین عرب اور ایک روایت کی رو سے مرتدین کے سوا تمام قسم کے غیر مسلموں سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے جبکہ امام شافعیؒ نے آیت جزیہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ سوائے اہل کتاب کے خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے کسی غیر مسلم سے جزیہ قبول نہیں کیا جائیگا۔ [2]

اسلام سے مرتد آدمی کی طرف سے جزیہ / عقد ذمہ کی عدم قبولیت پر بھی سب فقہاء کا اتفاق ہے۔ [3]

المختصر زیر بحث مسئلے میں یہ مقام زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ فقہاء اسلام نے اس معاملے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تفصیلی اور مدلل بحث الموسوعۃ الفقہیۃ (کویت) میں موجود ہے۔ [4]

مشرکین عرب سے قبول جزیہ کا معاملہ

جہاں تک مشرکین عرب سے قبول جزیہ یا عقد ذمہ دوسرے لفظوں میں انہیں حقوق شہریت

---

[1] - حوالہ سابق نیز جصاص، احکام القرآن، ۳/۱۳۵؛ ابو یعلی: الاحکام السلطانیہ، مصطفی حلبی مصر، ۱۳۵۷ھ ص: ۱۳۸

[2] - دیکھیے: جصاص، احکام القرآن، ۳/۱۳۶؛ قرطبی: الجامع لاحکام القرآن، المکتبہ العربیہ قاہرہ مصر، ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء، ۸/۱۱۰؛ آلوسی، روح المعانی مکتبہ امدادیہ ملتان۔ ت۔ن، ۱۰/۷۹

[3] - دیکھیے: مرغینانی، الہدایہ (کتاب السیر باب الجزیہ) مع اردو ترجمہ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۷/۱۳۴؛ سرخسی، کتاب المبسوط (کتاب السیر باب المرتدین)

[4] - تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ، الکویت، الموسوعۃ الفقہیہ، ۱۴۶۰ھ / ۱۹۸۵ء، ۱۷۷-۱۵/۱۹۶، دار المعرفۃ بیروت لبنان الطبعۃ الثانیہ ت ن، ۱/۹۸ ومابعد

دینے یانہ دینے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں جیسا کہ اوپر گزرا، احناف کا موقف یہ ہے کہ ان کے لیے اسلام یا تلوار کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ اس کیلیے علامہ کاسانیؒ نے نقلی دلائل کے علاوہ عقلی دلیل یہ دی ہے کہ عقد ذمہ کی مشروعیت اسلیے ہے کہ غیر مسلمین اہل الذمہ کی حیثیت سے جب مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور محاسن اسلام میں غور و فکر اور تامل کریں گے تو اس طرح ان کے اسلام لانے کی امید کی جا سکتی ہے جبکہ یہ چیز مشرکین عرب کے ساتھ عقد ذمہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ لوگ محض تقلید اور عادت کے پابند ہیں۔ وہ عادت اور اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کے سوا کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اس کے سوا وہ ہر چیز کو مذاق اور پاگل پن تصور کرتے ہیں۔ اسلیے ان سے امید نہیں کہ وہ شریعت کے محاسن میں تامل کر کے اسلام قبول کر لیں گے۔ لہذا تلوار ہی ان کے لیے اسلام کی طرف داعی کے طور پر متعین ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے جزیہ قبول نہیں فرمایا تھا۔[1]

مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کے اس سخت رویے یا ان کی طرف سے جزیہ / عقد ذمہ قبول نہ کرنے کے معاملے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک ایسی اصولی توجیہ بیان کی ہے جس سے اس سلسلے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ موصوف "غیر مسلموں کے حقوق" کی بحث میں بعض شبہات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ شریعت الٰہی نے ان غیر مسلموں میں جن پر براہ راست کسی رسول ﷺ کے ذریعہ سے خدا نے اپنے دین کی حجت پوری کی ہے اور ان غیر مسلموں میں جن پر براہ راست کسی رسول کے ذریعہ سے نہیں بلکہ عام اہل حق کے واسطہ سے حجت تمام کی گئی ہے، فرق کیا ہے۔ جہاں تک اس دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے دونوں کیساتھ کبھی ایک سا معاملہ نہیں کیا گیا۔[2]

---

1 - بدائع الصنائع، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۷/ ۱۱۱

2 - اسلامی ریاست ص ۱۷۶

اس بنیادی فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہات کی کچھ تفصیل بیان کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں:

> قرآن مجید میں مختلف انبیاء علیہم السلام کے اپنے قوموں کے مشرکین کے ساتھ کشمکش کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کے ان دونوں گروہوں میں سے پہلے کے بارہ میں خدائی دستور یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعہ حق واضح کر دیا ہے اور تبلیغ دعوت کی جو شرطیں ایک رسول کیلیے اس کے ہاں مقرر ہیں، وہ پوری ہو چکی ہیں تو اس کے بعد اس قوم کے کفار و مشرکین (غیر مسلموں) کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جینے کی مزید مہلت نہیں دی ہے۔ ایسے لوگوں کو پھر لازماً مٹا دیا گیا ہے۔[1]

پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے مسلسل بیس سال تک انتہائی دلسوزی اور حد درجہ ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ دعوت دینے اور منہ مانگے معجزے دکھانے کے باوجود جب مشرکین عرب اسلام لانے پر تیار نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ اب ان سے مصالحت، رواداری کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ اشہر حرم گزر جانے کے بعد انہیں اسلام اور تلوار میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دے دو۔ اگر یہ تلوار کا انتخاب کریں تو پھر انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو اور اس وقت تک امان نہ دو جب تک کہ یہ اسلام قبول نہ کر لیں۔ یہ سارے احکام سورۃ التوبہ میں موجود ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

---

[1] ۔ حوالہ سابق ص ۱۷۷

چوتھی فصل

عملی رویہ کے اعتبار سے غیر مسلموں کی مختلف اقسام اور اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کے ساتھ سیاسی تعلق اور عملی رویہ کے اعتبار سے غیر مسلموں کی درج ذیل قسمیں ہیں:

محاربین (Belligerents)

وہ غیر مسلم لوگ، اقوام اور ممالک جن کا رویہ اسلامی ریاست اور اہل اسلام کے ساتھ معاندانہ مخالفانہ اور جنگ و قتال کا ہے اور اہل اسلام کے ساتھ بغض و عداوت رکھتے اور انہیں کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، انہیں فقہی اصطلاح میں "محاربین" کہا جاتا ہے۔ فقہاء اسلام نے کتب فقہ میں "کتاب السیر" اور "کتاب الجہاد" کے عنوانات کے تحت ایسے اعداء اسلام (محاربین) کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں حالت امن اور جنگ کے تفصیلی احکام بیان کیے ہیں۔ جنگ کی صورت میں بھی اسلام نے ان کے ساتھ انصاف کا حکم دیا اور کسی بھی قسم کی زیادتی، ناانصافی، دھوکہ دہی، حد سے تجاوز، مقتولین کے مثلہ، درختوں کو کاٹنے، فصلوں کو نقصان پہنچانے اور عمارات تباہ کر دینے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح دشمن کے ان افراد کو جوش انتقام میں قتل کرنے سے منع کر دیا ہے جو عملی طور پر میدان جنگ میں شریک ہوتے اور نہ مد مقابل آتے ہیں مثلاً بچے، خواتین، بوڑھے وغیرہ[1]

اس معاملے میں اسلام نے محاربین (Belligerents) کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک اہل قتال (Combatants) دوسرے غیر اہل قتال (Noncombatants)۔ اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں

1۔ تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو: سرخسی محمد بن احمد، شرح السیر الکبیر لامام محمد، حرکۃ الانقلاب الاسلامیہ الافغانیہ، ۱/۴۴-۴۰؛ ابو عبید: کتاب الاموال (اردو ترجمہ) پیرہ نمبر ۶۰ اور نمبر ۹۵ اور صفحہ نمبر، ۳۴،۵۵،۵۶

حصہ لیتے ہیں یا عقلاً، عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد۔ اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے۔ مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضاء، مجنوں، سیاح، خانقاہ نشین زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ اسلام نے طبقہ اول کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے اور طبقہ دوم کے لوگوں کو جیسا کہ اوپر گزرا، قتل کرنے سے منع کر دیا ہے۔ پھر اہل قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان کے بھی کچھ حقوق متعین کیے ہیں اور کسی بھی قسم کی زیادتی اور بربریت کے مظاہرہ سے منع کیا ہے۔ جن کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں ہو سکتا۔[1]

اگر ایسے غیر مسلم اہل اسلام سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے نہ کسی قسم کی زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں اور نہ جنگ پر آمادہ ہوتے ہیں تو اسلام نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی نیکی اور انصاف کا حکم دیا ہے: مثلاً ارشادِ الٰہی ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔[2]

اللہ کریم تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارہ میں نہیں لڑے اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ بیشک اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے ہی محبت رکھتا ہے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اپنے اور اسلامی ریاست کے دشمنوں سے جو مثالی حسن سلوک فرمایا اور جس کمال ہمدردی اور خیر خواہی کا مظاہرہ فرمایا۔ وہ ایک الگ ایمان افروز داستان ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید مودودی، الجہاد فی الاسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص: ۲۳۲ ـ ۲۳۵؛ نیز سید مودودی، تفہیمات، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۴/ ۲۱-۲۵

[2] ۔ سورۃ الممتحنۃ ۶۰:۸

نہیں۔ تاہم ایک واقعہ کا حوالہ دینا بے جا نہ ہو گا۔ وہ یہ کہ فتح مکہ سے قبل جب ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط پڑا تو اہل مکہ کے محاربین بلکہ حد درجہ معاندین ہونے کے باوجود پیغمبر رحمت ﷺ نے قائد مکہ ابوسفیان بن حرب کے پاس پانچ سو اشرفیوں پر مشتمل ایک خطیر رقم بھیجی کہ مکہ مکرمہ کے غرباء اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دے۔ جس پر ابوسفیان نے جھنجلا کر کہا۔ محمد چاہتا ہے کہ اب مکے کے غرباء اور نوجوانوں کو ورغلا کر بھٹکائے اور ہمارے خلاف کھڑا کر دے۔[1]

محاربین کے ساتھ اہل اسلام کے درج بالا عملی رویے اور اسلام کی تعلیمات و ہدایات کے مقابلے میں اہل علم سے مخفی نہیں کہ انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار اور مہذب اقوام نے جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں ہر فریق نے اپنے دشمن کے فوجی ٹھکانوں ہی کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اسکولوں ،ہسپتالوں، عبادت گاہوں اور رفاہ عامہ کے ہزاروں مراکز کو بمباری کا نشانہ بنایا گیا جس میں خواتین معصوم بچوں اور مریضوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ دور نہ جایئے پچھلے چند سالوں میں روس نے افغانستان میں جو کچھ کیا اور امریکہ اب عراق کے بعد افغانستان میں اسرائیل فلسطین میں اور بھارت کشمیر میں اپنے مخالفین کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے، اسکے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور افسوسناک بات یہ ہے کہ انسانی خون سے ان ہولی کھیلنے والوں کو اس پر کوئی شرمندگی بھی نہیں۔ زیر بحث معاملے میں ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ تجزیہ و تبصرہ قابل ملاحظہ ہے کہ:

> دنیا کے مدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ "اگر کسی قوم کی تہذیب اور ثقافت کا معیار معلوم کرنا ہو تو جنگ میں دشمن کے ساتھ اس قوم کے سپاہیوں کے طرز عمل کا مطالعہ کرنا چاہیے" چنانچہ جب ہم اس کسوٹی پر اسلام اور اس کے متبعین کو کس کر دیکھتے ہیں، تو مسلمان سب سے ممتاز، بلند حوصلہ اور فیاض دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو آج مغرب اور

---

[1] - دیکھیے: شیبانی، محمد بن حسن امام (م۱۸۹ھ)، السیر الکبیر مع شرح السرخسی (باب صلۃ المشرک) حرکۃ الانقلاب الاسلامیہ الافغانیہ، ۱۴۰۵ھ، ۹۶/۱

مہذب دنیا میں بھی ایک باقاعدہ قانون جنگ موجود ہے لیکن یہ اس لیے تشنہ اور غیر منصفانہ ہے کہ اس کا دائرہ عمل صرف "مہذب" یعنی صرف یورپی اقوام تک محدود ہے۔ جہاں تک غیر یورپی اور کمزور اقوام کے ساتھ رواداری اور نرمی برتنے کا تعلق ہے، سو اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسکے خلاف یہ کمزور قوموں پر انسانیت سوز مظالم کرنا لازم سمجھتے ہیں۔[1]

سید امیر علی نے اسلام کے جنگی آداب اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام ﷺ اور خلیفۃ الرسول ابو بکر صدیقؓ کی ہدایات درج کرنے کے بعد عیسائیوں کے میدان جنگ میں طرز عمل سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا ہے:

شہزادہ امن (The Prince of Peace) کے پیروزمانہ حال تک انتہائی بے دریغی سے آبروریزی، خانہ سوزی، تاخت و تاراج اور جوانوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کے بلا تمیز قتل میں مشغول رہے ہیں۔ روئے ارض پر ان کے نائب، کیا پوپ اور کیا بطریق، کیا بشپ اور کیا پادری، ان جرائم کو نگاہ استحسان سے دیکھتے رہے ہیں اور اکثر انتہاء درجہ کے انسانیت سوز مظالم سے مکمل بریت کے فتوے دیتے رہے ہیں۔[2]

مستامنین (حاملین پروانہ امن)

People who are assured for protection

وہ غیر مسلم لوگ یا کسی دشمن ملک کا شہری جو کسی ذاتی کام، تجارت، کاروبار، تعلیم، سیر و سیاحت یا اسلامی ریاست کے کسی باشندے سے ملاقات وغیرہ کی غرض سے حکومت سے ایک معین مدت تک امان کا

---

1 ۔ مضمون: اسلام میں انسانی خون کا احترام، مطبوعہ ماہنامہ دارالتقوی لاہور، شمارہ نومبر ۲۰۱۱ء، (ج ۱ ش ۲)

2 ۔ روح اسلام (اردو ترجمہ از محمد ہادی حسین)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۰ء، ص: ۱۸۲-۱۸۳

پروانہ یا آج کی اصطلاح میں ویزہ لیکر اسلامی ریاست میں داخل ہو، وہ فقہی اصطلاح میں "مستامن" کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح لغوی اعتبار سے لفظ امن اور امانت سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ایسا شخص جسکی جان و مال اور عزت و آبرو مسلمانوں کیلیے ایک امانت ہے، جس کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں وقتی امان لیکر آنے والے ایسے تمام لوگوں "مستامنین" کے حقوق کا بھی اسلام نے پاس کیا ہے۔ کسی مسلمان شہری کیلیے جائز نہیں کہ وہ اس کی جان مال کے ساتھ تعرض کرے۔ تمام مسلمانوں پر اس وقتی معاہدہ یا امان نامہ کی رعایت کرنا واجب ہے۔[1] اس میں اصل یہ ارشاد الٰہی ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ۔[2]

اور اگر مشرکین میں سے کوئی آدمی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیجئے یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی کو سن لے (غور و فکر کرے) پھر اسے اسکے امن کی جگہ پہنچا دیجئے۔

اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے فقیہ مفسر امام جصاصؒ نے لکھا ہے۔

يدل على ان على الامام حفظ هذا الحربي المستجير وحياطته ومنع الناس من تناوله بشر[3]

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام (خلیفہ۔ حکومت) پر پناہ لینے والے حربی (مستامن) کی حفاظت اور لوگوں کو اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے منع کرنا واجب ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مشہور مفسر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے:

---

[1] - تفصیل کیلیے دیکھیے: کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۷/۱۰۷-۱۰۹؛ ابن عابدین، محمد امین شامی، رد المحتار علی الدر المختار (باب المستامن) مکتبہ امدادیہ ملتان، ت۔ن۔ ۶/۲۷۵

[2] - سورۃ التوبہ، ۹:۶

[3] - احکام القرآن، دار الکتاب العربی بیروت لبنان، ت۔ن، ۳/۸۴

اس سے غرض یہ ہے کہ دارالحرب (دشمن ملک) کا جو آدمی سفارت کی غرض یا تجارت یا صلح و مصالحت یا اس قسم کی کسی دوسری غرض سے دارالاسلام (اسلامی ریاست) میں آئے اور امام (خلیفہ۔ سربراہ حکومت) یا اس کے قائم مقام سے امان طلب کرے تو وہ پورے دارالاسلام میں آزادی سے گھوم پھر سکتا ہے حتی کہ اپنے جائے امن اور اپنے وطن واپس لوٹ جائے۔[1]

موجودہ دور میں لوگوں کیلیے شاید یہ خواب وخیال کی بات معلوم ہو اس لیے کہ اس وقت ایک ملک کا باشندہ جب دوسرے ملک میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ عموماً وہ سلوک کیا جاتا ہے جو چور اچکوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے حتی کہ جامہ تلاشی کے مرحلہ سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ پھر اسکی اس طرح نگرانی کی جاتی ہے جیسے کسی جرائم پیشہ آدمی کی۔ فقہائے اسلام نے تو مستامن کے حقوق کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ مستامن کو دارالاسلام میں کاروبار کی اور اپنے پیسے کو کار خیر میں خرچ کرنے کی اجازت ہو گی۔ جب تک وہ دارالاسلام میں ہے اسکی حیثیت ذمی کی ہے۔ دارالاسلام میں اس کا کوئی وارث نہیں ہے اور وہ اپنا پورا مال کسی مسلمان یا ذمی کے نام وصیت کر دے تو وہ نافذ ہو جائے گی۔ وارث ہو تو ایک تہائی کی وصیت کر سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے مال کے ایک حصہ کی وصیت کرے تو یہ بھی نافذ ہو جائے گی۔ باقی مال اس کے ان وارثوں کو جو دارالحرب میں ہوں لوٹا دیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک گو وہ ازروئے قانون وارث نہیں ہیں لیکن یہ مستامن کا حق ہے کہ اس کا مال واپس کر دیا جائے۔ کوئی مسلمان یا ذمی اس کے نام وصیت کرے تو یہ بھی نافذ ہو گی۔[2]

ان مستامنین کو اسلامی ریاست میں وہ تمام عمومی اور خصوصی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو مستقل معاہدین یا اھل ذمہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ جنکی تفصیل آگے حقوق کی بحث میں آجائے گی۔ کیونکہ اس

---

[1] ۔ تفسیر القرآن العظیم، سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۳ھ ۱۹۷۳ء، ۲/ ۳۳۷

[2] ۔ ابن عابدین، محمد امین شامی، ردالمحتار علی الدر المختار (کتاب الوصایا فصل فی وصایا الذمی وغیرہ) مکتبہ امدادیہ ملتان، ت۔ن، ۱۰/ ۴۰۵؛ سحنون بن سعید بن سحنون، المدونۃ الکبری، شیخ زاید بن سلطان النہیان الامارات العربیہ المتحدہ، ۱۴۲۲ھ، ۳/ ۴۶

معاملے میں فقہاء نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ

المستأمن بمنزلة الذمی فی دارنا۔[1]

دارالسلام میں مستامن کا وہی مرتبہ و مقام اور وہی حیثیت ہے جو ذمی کی ہے۔

اسی طرح علامہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) فرماتے ہیں:

امام پر واجب ہے کہ مستامنین (ویزا لے کر آنے والے) جب تک ہمارے ملک میں ہیں ان کی مدد کرے اور ہر ظلم و زیادتی سے انہیں بچائے جیسا کہ اس پر اہل الذمہ کے معاملے میں یہ بات واجب ہے۔ کیونکہ جب تک لوگ دارالاسلام میں موجود ہیں وہ اس کی ولایت (حکومت) کے ماتحت ہیں۔ لہذا حفاظت کے معاملے میں ان کا حکم وہی ہے جو اہل الذمہ کا ہے۔[2]

اہل صلح یا معاہدین

(People who are granted the pledge of Protection by the Islamic State)

وہ غیر مسلم لوگ جنہوں نے اسلامی ریاست سے جنگ میں شکست کھانے سے پہلے اس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر یا اسکی اخلاقی و سیاسی برتری سے متاثر ہو کر یا اپنے مصالح و مفادات کے پیش نظر با قاعدہ ایک معاہدہ کے تحت اپنے آپ کو اسلامی ریاست کی ماتحتی میں دے دیا ہو۔ رعایا ہونے کے ناطے تو یہ لوگ اور اہل عنوہ المعروف "اھل ذمہ" دونوں برابر ہیں لیکن ان کے حقوق کا فیصلہ تنہا اسلامی حکومت نہیں کرتی بلکہ وہ معاہدہ کرتا ہے جو ان کے اور اسلامی حکومت کے درمیان طے پاتا ہے۔ اسلامی حکومت اس

---

[1] -کاسانی، بدائع الصنائع، ۶/ ۸۱

[2] -شرح السیر الکبیر، دارالمعارف النظامیہ حیدر آباد ہند، ۴/ ۱۰۸-۱۰۹

معاہدے میں کسی قسم کے ردوبدل کی مجاز نہیں۔ جو شرائط اور حقوق و مراعات بوقت معاہدہ فریقین میں طے پائیں گے، وہ پورے کیے جائیں گے۔ چنانچہ امام ابو عبیدؒ نے باسند یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انکم لعلکم تقاتلون قوما فیتقونکم بأموالھم دون انفسھم وابناءھم، ویصالحونکم علیٰ صلح فلا تأخذوا منھم فوق ذالک، فانہ لا یحل لکم۔[1]

"قوی امکان ہے کہ تمہاری لڑائیاں ایسے لوگوں سے ہوں جو تمہیں مال دے کر اپنے اور اپنے بچوں کی جانیں بچانے کی پیشکش کریں اور تم سے معاہدہ صلح کرلیں تو ایسے لوگوں سے شرائط صلح سے زائد نہ لینا اسلیے کہ وہ (شرائط صلح پر اضافہ) تمہاری لیے حلال نہیں"

اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امام عبیدؒ نے لکھا ہے:

"یہ حدیث صلحی علاقہ کے متعلق بتارہی ہے کہ از روئے سنت صلح کے ذریعے طے شدہ خراج اور دیگر شرائط میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائیگا خواہ مفتوح قوم اس سے زائد دینے کی طاقت ہی کیوں نہ رکھتی ہو۔ ابو عبید نے اپنی اس رائے پر اس روایت سے بھی استشہاد کیا ہے کہ ایک شخص حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آیا اور اس نے بتایا: فلاں فلاں زمین متعینہ خراج سے زیادہ ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ تو آپ نے فرمایا: ان لوگوں پر اضافہ کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ہم نے ان لوگوں سے معاہدہ صلح کرلیا ہے۔[2]

زیر بحث مسئلے میں امام ابو عبید کی یہ رائے بھی ہے کہ شرائط صلح میں اضافہ تو ممنوع ہے لیکن کمی ممکن ہے کیونکہ حضرت عمرؓ اگر یہ دیکھتے کہ اہل صلح مجبور ہیں اور شرائط صلح کے مطابق مقررہ رقم ادا کرنے

---

[1] ۔ ابوعبید القاسم، کتاب الاموال (باب الوفاء لاھل الصلح)، ص:۶۹ پیرہ نمبر ۳۸۸؛ نیز بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ)، ۱۴/ ۴۹، رقم ۱۹۲۴۱

[2] ۔ حوالہ مذکور، پیرہ ۳۸۹-۳۹۰

کے قابل نہیں تو انکی قوت برداشت کے مطابق کمی کر دیتے تھے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے مذکورہ حدیث میں زائد رقم لینے پر تو پابندی لگائی ہے مگر ایسی صورت میں جبکہ وہ متعینہ رقم ادا کرنے کے قابل نہ رہیں جزیہ کہ رقم میں کمی نہ کرنے کے متعلق کوئی قید نہیں لگائی۔[1]

سنن ابی داؤد میں الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ یہ روایت کچھ اس طرح ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

لعلکم تقاتلون قوما تظهرون علیهم فیتقونکم باموالهم دون انفسهم وابنائهم (وفی روایة فیصالحونکم علی صلح) فلا تصیبوا منهم فوق ذالک فانه لا یصلح لکم[2]

ہو سکتا ہے کہ تمہاری کسی قوم سے جنگ ہو اور تم ان پر غلبہ پا رہے ہو تو وہ تمہیں اپنے اموال (خراج) کے بدلے اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچانے کی پیشکش کرے۔ (جبکہ ایک روایت میں ہے کہ وہ تم سے ایک صلح نامہ طے کر لیں) تو پھر اس مقررہ خراج سے (ایک حبہ بھی) زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہاری لیے جائز نہ ہو گا۔

جبکہ سنن ابی داؤد ہی کی ایک دوسری روایت اس سلسلے میں یوں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الا من ظلم معاهدا او انتقصه اوکلفه فوق طاقته واخذ منه شیئا بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامة[3]

خبردار جو آدمی کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالے گا اور اس سے کوئی چیز اسکی مرضی کے خلاف وصول کرے گا تو اس کے خلاف

---

[1] - حوالہ سابق

[2] - ابوداؤد، السنن (کتاب الخراج باب تعشیر اهل الذمہ)، ۲/ ۱۷۰، حدیث نمبر ۳۰۵۱

[3] - حوالہ سابق، ۲/ ۱۷۲، حدیث نمبر ۳۰۵۲

(معاہد کی طرف سے) قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ان احادیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کیسا تھ صلح نامہ میں جو شرائط طے ہو جائیں۔ ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج بڑھایا جاسکتا ہے، نہ انکی زمینوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے نہ انکی عمارتیں چھینی جاسکتی ہیں نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کیے جاسکتے ہیں نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جاسکتا ہے نہ انکی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جاسکتا ہے جو ظلم یا انتقام یا "**تکلیف مالا یطاق**" اور "**اخذ بغیر طیب نفس**" کے حدود میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہاء اسلام نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدون نہیں کیے ہیں اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا ہے کہ انکے ساتھ معاملہ بالکل شرائط کے مطابق ہوگا۔[1]

اہل عنوہ / اہل الذمہ (People of the contract or protected)

"اہل عنوہ" المعروف "اہلُ الذمہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی ریاست کے خلاف جنگ کی ہو اور اسکی تلوار سے شکست کھانے کے بعد اسلامی حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوئے ہوں۔ یہ لوگ اسلامی حکومت کی مفتوح رعایا ہوتے ہیں۔ حکومت ان مفتوح و مغلوب مخالفین کا عام جنگجوؤں کی طرح قتل عام نہیں کرتی بلکہ انہیں آزادی کے ساتھ جینے اور ترقی کرنے کے مواقع دیتی ہے۔ حکومت صرف ان کے جنگ کے قابل مردوں پر جزیہ لگاتی ہے اور جو زمینیں ان کے زیر کاشت ہوتی ہیں ان پر ان سے خراج وصول کرتی ہے۔ ان کے تمام انسانی، شخصی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی اور معاشی حقوق (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) بذریعہ قانون محفوظ کر دیے گئے ہیں جو شریعت اسلامی کا ایک لازمی جزء ہیں اور ایک اسلامی حکومت پر ان کی حفاظت اور ادائیگی اسی طرح واجب ہے جس طرح شریعت کے دوسرے

---

[1] - اسلامی ریاست ص ۲۴۴؛ نیز الجہاد فی الاسلام، ص: ۲۷۶

احکام کی حفاظت و ادائیگی واجب ہے۔ان حقوق کی ادائیگی شرعی حکم کے طور پر ہے نہ کہ اہل الذمہ کے ساتھ احسان کے طور پر۔

ذمیوں کی جان مال اور عزت و آبرو کو اسی طرح تقدس و تحفظ حاصل ہے جس طرح مسلمانوں کو حاصل ہے۔اس سلسلے میں فقہ حنفی میں یہ اصول ہے کہ: "عقد الذمۃ فی افادۃ العصمۃ کالخلف عن عقد الاسلام"[1] جان ومال کے معصوم و محترم ہونے میں عقد ذمہ کو عقد اسلام کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔یعنی جس طرح قبول اسلام سے مسلمان کی جان ومال اور عزت و آبرو محترم ہو جاتے ہیں۔ایسے ہی عقد ذمہ سے غیر مسلم کی جان،مال اور عزت و آبرو محترم ہو جائیں گے۔

ذمی (A person who is granted the pledge of protection by Islamic state) اور معاہد (One whose responsibility has been taken) میں اس پہلو سے فرق ہے کہ ذمی کو اسلامی ریاست (جیسا کہ ابھی اوپر گزرا) اپنی طرف سے حقوق دیتی ہے جبکہ معاہد ریاست سے کیے گئے معاہدہ کے تحت اپنے حقوق کا تعین کرتا ہے۔مگر ہمارے علماء جب ذمی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ دونوں طرح کے لوگ اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔علامہ ابن اثیرؒ نے معاہد کے متعلق لکھا ہے۔

> المعاهد من كان بينك وبينه عهد واكثر ما يطلق في الحديث على اهل الذمة وقد يطلق على غيرهم من الكفار اذا صولحوا على ترك الحرب مدة ما[2]

معاہد آدمی وہ ہے کہ تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی عہد و پیمان (معاہدہ) ہو۔حدیث میں اس کا زیادہ تر اطلاق اھل الذمہ (ذمیوں) پر ہوتا ہے،اور کبھی ان کے علاوہ یہ ان غیر مسلموں کیلیے بھی

---

[1] ۔کاسانی،بدائع الصنائع،۷/۱۱۱

[2] ۔ ابن الاثیر مجد الدین مبارک بن محمد الجزری (م ۶۰۶ھ) النہایہ فی غریب الحدیث،احیاء التراث العربی بیروت لبنان ت۔ن،۳/۳۲۵،(مادہ عہد)

بولا جاتا ہے جن سے کسی مدت تک کیلیے جنگ بندی کی صلح ہو جائے۔

ذمی کی طرح معاہد پر بھی کسی نوع کی دست درازی کا کسی کو حق نہیں ہو گا۔ ابن اثیر اسکے مال کی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لانه معصوم المال يجري حكمه مجرى حكم الذمي[1]

اسلیے کہ اسکے مال کو عصمت اور حفاظت حاصل ہے۔ اس پر وہی حکم نافذ ہو گا جو ذمی پر نافذ ہوتا ہے۔

معاہدین اور اھل عنوہ / اھل الذمہ کے علاوہ وہ غیر مسلم جو کسی اور صورت میں اسلامی قلمرو میں آکر آباد ہو گئے ہوں مثلاً ہجرت کر کے یا تجارتی مقاصد کیلیے اسلامی ریاست میں آئے اور یہیں آباد ہو گئے ہوں تو وہ بھی قانونی طور پر اھل الذمہ کے زمرے میں آجاتے ہیں اور ان کے لیے بھی وہ تمام حقوق ہیں جو دوسری قسم کے ذمیوں کو دیے گئے ہوں لیکن اسلامی ریاست شریعت کے حدود کے اندر انہیں مزید رعایت بھی دے سکتی ہے۔ اس وقت مسلمان ممالک میں جو غیر مسلم رہائش پذیر ہیں وہ اس تیسری قسم کے تحت آتے ہیں۔ جنہیں آج کل کی مروجہ اصطلاح میں اھل الذمہ کی بجائی "غیر مسلم اقلیتیں" کہا جاتا ہے۔ انہیں اس گئے گزرے دور اور سیاسی اعتبار سے زوال کے زمانے میں بھی اسلامی ممالک میں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو صدیوں پہلے اسلام کے عروج و غلبہ کے زمانے میں اھل الذمہ کو اسلامی ریاستوں میں حاصل تھے۔

[1] - حوالہ مذکور

پانچویں فصل

عقد ذمہ کی تعریف اور آئینی حیثیت

عقد ذمہ اور ذمی کا معنیٰ

اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کیلیے عموماً جو اصطلاح استعمال ہوتی ہی وہ "اھل الذمہ" یا "ذمی" کی ہے۔ اسلیے اھل الذمہ یا ذمیوں (غیر مسلم اقلیتوں) کے حقوق کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری ہے کہ ان الفاظ کے لغوی واصطلاحی معنی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ تو ان الفاظ کے اندر اتنی جامعیت اتنی معنویت اتنی فصاحت وبلاغت اور اتنی گہرائی موجود ہے کہ یہ الفاظ ہی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے معاشرتی مرتبہ ومقام عزت واحترام اور ان کے تمام حقوق (جن کی وضاحت آگے آرہی ہے) کا ایک طرح سے تعین کر دیتے ہیں۔ اسی معنویت کو دیکھتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا ہے:

"ذمی کوئی گالی نہیں ہے اور نہ یہ لفظ شودر اور ملیچھ کا ہم معنی ہے۔ ذمہ عربی زبان میں (Guarantee) کو کہتے ہیں اور ذمی وہ شخص ہے جس کے حقوق ادا کرنے اور محفوظ رکھنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہو۔"[1]

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی ذمی کے لفظ میں پنہاں معنویت کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

"مسلمانوں کے عہد حکومت کی غیر مسلم رعایا جن کا اصطلاحی نام ذمی ہے۔ ذمی کے اس لفظ کو بلا وجہ رسوا کرنے کی کوشش جو کی گئی ہے اور ایسے مہیب تصورات کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ شاید خود مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال میں گونہ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ حالانکہ اس لفظ ہی میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کیلیے باعث ندامت ہو۔ اردو میں بھی ذمہ کا عربی لفظ مستعمل

---

[1] - اسلامی ریاست، اسلامک پبلشرز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۸۳

ہے۔ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلم اقوام کے جن لوگوں کی عزت جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے، ذمہ کے لفظ کے ساتھ نسبت کی "ی" کا اضافہ کر کے ذمی کا لفظ بنا لیا گیا ہے اور رعایا کے اس طبقہ کی تعبیر اس سے کی جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ اس میں مسلمانوں کیلیے شرمانے کی کیا بات ہے"۔[1]

اس کے مقابلے میں جمہوری ممالک میں ایسی رعایا کے لیے "اقلیت" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ قلۃ یا قلیل سے ماخوذ ہے جس کا معنی کم یا تھوڑا ہے جو انگریزی کی (Superlative degree) کے قائم مقام ہے۔ اس اعتبار سے اس کا معنی ہے "کمترین" جبکہ انگریزی میں ایسے لوگوں کے لیے Minority کی اصطلاح مستعمل ہے۔ جو کہ Minor سے ماخوذ ہے اور Minor کے معانی چھوٹا، کم تر، کم درجے کا، نا قابل لحاظ اور خفیف کے ہیں۔[2] یہ اصطلاح معنوی اعتبار سے شہریوں کے اکثریتی یا حکمران طبقہ کو طبقاتی تفاضل و تفاخر جبکہ اقلیتی جماعت کو کمتری اور عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کرنے والی ہے۔ اسکے برعکس اہل الذمہ یا ذمی کا لفظ غیر مسلموں کو تحفظ کا احساس دلانے والا ہے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل ہم آئندہ سطور میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ ذمی کا لفظ لغوی اعتبار سے "ذمۃ" سے ماخوذ ہے اور لفظ "ذمہ" عہد، ضمانت، کفالت، امان، حرمت، ذمہ داری اور حق کے معنوں میں آتا ہے۔ اسی وجہ سے اھل العہد (جو لوگ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کرتے ہیں) کو اھل الذمہ کہا جاتا ہے اور وہ اصطلاح میں وہ تمام

---

[1] - مقالات گیلانی (مقالہ: مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام)، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۹۵-۳۹۴

[2]- Jamia English –Urdu Dictionary, Ministry of Human Resource Development Government of India, New Delhi, India, 1995, 3/843 ; Rabia Pratctical Dictionary, English to English and Urdu, (Minor), Rabia Book House, Lahore, P: 580

مشرکین ہیں جو اسلامی ریاست کو جزیہ دینا قبول کر لیتے ہیں اور "رجل ذمی" (ذمی آدمی) کے معنی ہیں "رجل لہ عہد" یعنی وہ شخص جس سے اسلامی ریاست کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اور اهل الذمہ کو ذمی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اہل اسلام کے عہد اور امان میں داخل ہو جاتے ہیں (لدخولھم فی عھد المسلمین وامانھم)[1]

اصطلاح میں "ذمہ" وہ ذمہ داری ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کے جان، مال، عزت و حرمت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے اوپر لیتی ہے۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کو ذمی یا اهل الذمہ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کی جان و مال اور عزت و آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہے۔[2]

یہ ذمہ داری بڑی ہی مقدس چیز ہے۔ محمد اعلیٰ تھانوی نے قاضی امام ابوزید کے حوالے سے لکھا ہے:

ان الذمة شرعا وصف يصير به الانسان اهلا لما له ولما عليه[3]

بیشک ذمہ شرعی اعتبار سے وہ وصف ہے جس کے ذریعے انسان اپنے حقوق اور اپنے فرائض کا اهل ہو جاتا ہے۔

گزشتہ تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ذمہ کے لفظ میں ذم یا تحقیر کا پہلو نہیں بلکہ اس میں ذمی کی ہر طرح سے حفاظت کی ضمانت اور اس کے تمام حقوق کے تحفظ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے:

الذمة هي الامان لهذا سمي المعاهد ذميا لانه اعطي الامان على ذمة الجزية

---

1 - دیکھیے: ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، ۱۳۷۵ھ ۱۹۵۶ء، ۱۲/۲۲۱

2 - دیکھیے: اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لفظ ذمہ) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۰/۲۵

3 - تھانوی، محمد اعلیٰ (م ۱۱۹۱ھ) کشاف اصطلاحات الفنون، سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۳ء، ۱/۵۱۲

التی تؤخذ منه[1]

ذمہ کے معنی امان کے ہیں اسی وجہ سے معاہد کو ذمی کہا جاتا ہے اسلیے کہ جو جزیہ اس سے لیا جاتا ہے اس کی بنیاد پر اسے امان دی گئی ہے۔

اسی کے مادہ سے "ذمام" کا لفظ آتا ہے جس کی تشریح صاحب لسان العرب نے یوں کی ہے:

الذمام کل حرمة تلزمک اذا ضیعتها المذمة ومن ذالک سمی اهل العهد اهل الذمة[2]

ذمام ہر محترم چیز کو کہا جاتا ہے کہ جب تو اسے ضائع کر دے تو قابل مذمت ٹھہرے اور اسی معنی میں اھل الھد کو اہل الذمہ کہا جاتا ہے (کہ انکے حقوق کی عدم ادائیگی بھی قابل مذمت ہے)

جبکہ المنجد میں مادہ ذمم کے تحت ذمی کی تعریف ان الفاظ میں ہے:

الذی اعطی الذمة ای الامان یعنے الذی امن علی ماله وعرضه ودمه[3]

ذمی وہ شخص ہے جسے ایسا عہد وپیان دیا گیا ہو جس کے باعث وہ اپنے مال اپنی عزت و آبرو اور اپنی جان کے بارے میں مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔

جبکہ عقد ذمہ کی تعریف ہے:

عقد یضمن اقرار بعض الکفار علی ما یدینون به علی الدوام ببذل الجزیة والتزام احکام الاسلام العامة۔[4]

ایسا معاہدہ جو کفار کو جزیہ دینے اور عام اسلامی احکام کی پابندی کے بدلے میں ہمیشہ کے

---

[1] ۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب ۱۲/۲۲۱

[2] ۔ مصدر سابق

[3] ۔ لویس معلوف، المنجد فی اللغۃ (مادہ ذمم) دار المشرق بیروت، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۷

[4] ۔ ابن رشد، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۳/۴۸۹ (حاشیہ)

لیے اپنے دین پر قائم رہنے کی ضمانت دیتا ہے۔

عقد ذمہ کی شرعی و آئینی حیثیت

یہ عقد ذمہ یا عہد و پیمان محض رسمی، دکھاوے کی اور کاغذی کارروائی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت دائمی ہوتی ہے۔ بعد میں آنے والی کوئی حکومت اسکو ختم کرنے کی مجاز نہیں۔ البتہ معاہدین خود معاہدہ توڑ دیں یا شرائط کا پاس نہ کریں تو دوسری بات ہے ورنہ اسلامی حکومت کے نزدیک اس کی حیثیت دائمی ہوتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اھل مقنا، اھل حنین اور اھل خیبر کے ساتھ جو معاہدہ کیا یا جو انہیں امان نامہ دیا اس میں "مادامت السموات والارض" کے الفاظ ہیں۔ یعنی یہ معاہدہ / امان نامہ تاقیامت تمہارے لیے ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی شہادت کے وقت اپنے مابعد خلیفہ کو ذمیوں سے متعلق جو وصیت فرمائی اس میں فرمایا:

واوصیه بذمة الله وذمة رسوله ﷺ ان یوفی لهم بعهدهم وان یقاتل من وارئهم ولا یکلفوا الا طاقتهم[2]

میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ اہل الذمہ کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے جو ذمہ دیا گیا ہے اس کی حفاظت کرے، ان سے جو عہد کیا گیا ہے اسے پورا کرے، ان پر حملہ ہو تو ان کے دفاع میں جنگ کرے اور ان پر اتنا ہی بوجھ (جزیہ) ڈالے جتنا کہ وہ اٹھا سکیں۔

اسلام میں عقد ذمہ کی آئینی حیثیت کیا ہے اور اسے پورا کرنا کس قدر ضروری ہے؟ اس کے بارے میں مشہور حنفی فقیہ علامہ ابو بکر الکاسانیؒ نے عقد ذمہ کی صفت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

جہاں تک عقد ذمہ کی صفت کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے (اہل اسلام کے)

---

[1] - ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (وثیقہ نمبر ۳۴) ص:۵۹

[2] - بخاری: الجامع الصحیح (کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمانؓ الخ)، ۱/۵۲۳، رقم: ۳۷۰۰؛ ابو یوسف کتاب الخراج ص ۱۴؛ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۲۷

حق میں تو لازم ہے کہ مسلمان اسے توڑنے کا کسی حال میں بھی اختیار نہیں رکھتے، البتہ ذمیوں کے حق میں یہ لازم نہیں ہے۔ تاہم فی الجملہ یہ ٹوٹنے کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن یہ صرف تین امور میں سے کسی ایک امر سے ہی ٹوٹ سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ذمی اسلام قبول کرلے کیونکہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، عقد ذمہ تو قبول اسلام کے وسیلے کے طور پر باندھا جاتا ہے اور اس کے اسلام قبول کرنے سے یہ مقصود حاصل ہو گیا۔ دوسرا امر یہ ہے کہ وہ دارالحرب سے جا ملے کیونکہ دارالحرب سے جا ملنے سے وہ بمنزلہ مرتد کے ہو جاتا ہے۔۔۔ تیسرا امر یہ ہے کہ وہ کسی علاقہ پر غلبہ حاصل کرلیں اور مسلمانوں سے لڑنا شروع کر دیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اہل حرب ہو جاتے ہیں اور معاہدہ لامحالہ ٹوٹ جاتا ہے۔[1]

یہ عقد ذمہ اسلام میں کس قدر مضبوط ہوتا ہے اور اسلامی ریاست اس کی کس حد تک پابند ہے ؟اس سلسلے میں علامہ کاسانیؒ نے فقہ حنفی کا نقطہء نظر بیان کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:

"اگر کوئی ذمی جزیہ دینے سے انکار کر دے تو بھی یہ عہد نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کا انکار مال نہ ہونے کے عذر کی وجہ سے ہو۔ لہٰذا شک اور احتمال کے ہوتے ہوئے معاہدہ نہیں ٹوٹے گا۔ اسی طرح اگر وہ نبی کریم ﷺ کی شان میں سب وشتم کرے تو بھی معاہدہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ تو کفر پر کفر کا اضافہ ہے۔ اور معاہدہ اگر اصل کفر کیساتھ باقی رہتا ہے تو کفر کے اضافے کے ساتھ بھی باقی رہے گا۔ اسی طرح اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کر دے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کا مرتکب ہو تو بھی معاہدہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ یہ جو گناہ ہیں جن کا اس نے ارتکاب کیا، یہ قباحت اور حرمت میں کفر سے تو کمتر ہیں۔ تو جب کفر کے ساتھ عقد ذمہ باقی رہتا ہے تو معصیت

---

[1] -بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع۔ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۱۴۰۵ھ، ۷/ ۱۱۲

کے ساتھ بدرجہ اولیٰ باقی رہے گا۔واللہ تعالیٰ اعلم "[1]

جبکہ دیگر ائمہ مجتہدین کے نزدیک ان جرائم سے عقد ذمہ / معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے۔[2]

عقد ذمہ کی اس قدر اہمیت اور اس قدر پاس اس لیے ہے کہ اسلامی ریاست اھل الذمہ سے جو معاہدہ کرتی ہے تو وہ نائب الہیٰ بن کر کرتی ہے اور اس کا اھل الذمہ سے معاہدہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر ایک معاہدہ ہوتا ہے۔اس معاہدہ کا پورا کرنا اسکے لیے ضروری ہے۔وہ ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔اس ذمہ داری کو اسے ہر قیمت پر ادا کرنا ہو گا۔ حتی کہ ان کے تحفظ کیلیے اسے دشمن سے جنگ بھی کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔سید مودودی نے ذمی کی تعریف کے ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"اسلامی حکومت یہ ذمہ محض اپنی طرف سے یا مسلم باشندوں کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے لیتی ہے اور اس کی اہمیت اس درجے کی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں کا قتل عام بھی کر ڈالا جائے تو ہم انتقاماً اپنے ملک میں اس کے ہم مذہب ذمیوں کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ایک اسلامی حکومت میں کوئی پارلیمنٹ ان کے شرعی حقوق غصب کرنے کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔"[3]

عقد ذمہ کے ذریعے اسلامی ریاست اھل الذمہ کے جن حقوق کا ذمہ اٹھاتی اور جنکی تفصیل آگے آرہی ہے،ان کی آئینی حیثیت اور شریعت میں ان کے مرتبہ و مقام کے متعلق مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

---

[1] -حوالہ مذکور،ص: ۱۱۳

[2] -دیکھیے: امام شافعی،الام (مع مختصر المزنی)،۴/۲۰۸-۲۱۰؛ بیہقی،السنن الکبری(کتاب الجزیۃ)،۱۴/۳۹-۴۲؛الموسوعۃ الموسوعۃ الفقھیۃ(کویت)،۷/۱۲۴

[3] - اسلامی ریاست،اسلامک پبلیکیشنز لاہور ص ۴۸۳

"جو حقوق یہاں بیان کیے جارہے ہیں ان کی حیثیت دنیا کے عام دستوری تحفظات کی سی نہیں ہے کیونکہ ایسے تحفظات میں سے اکثر کی اول تو کتاب دستور کی زینت ہونے سے زیادہ کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک جس حد تک حکومت کی حکمت عملی اور اغراض کیلیے ضروری یا مفید ہو۔ یہ سارے حقوق اسلامی شریعت کے اسی طرح اجزاء ہیں جس طرح خدا اور رسول ﷺ کے عائد کردہ دوسرے فرائض اور واجبات۔ اس لیے ان کا بہر شکل اور بہر حال قائم رکھنا اسلامی حکومت کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام وواجبات کا۔ اگر ان میں سے کسی حق کو بھی بغیر کسی واقعی عذر کے ضائع کیا گیا تو اسلامی ریاست صرف اس زمین ہی پر اس کے لیے جوابدہ نہیں بلکہ اسکے بعد اس کی اصل جوابدھی خدا کے سامنے ہے اور وہاں اس مقدمہ میں مظلوم اہل ذمہ کے وکیل جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، خود محمد رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔

ذمیوں کو یہ حقوق مسلمانوں یا ان کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے اور ان کی ضمانت پر دیے جاتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں دانستہ اور بلا عذر کوتاہی خدا اور رسول ﷺ سے خیانت اور غداری ہو گی۔ ذمیوں کے یہ حقوق کم سے کم ہیں۔ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے عطا کیے جانے کی وجہ سے ان میں ذرا سی کمی کرنے کا بھی کسی اسلامی حکومت کو حق نہیں ہے۔ ان سے زیادہ وہ جو چاہے دے مگر ان میں سے کوئی حق کم کرنے کی وہ مجاز نہیں"[1]

ایک اسلامی ریاست جب کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ باقاعدہ یہ معاہدہ کرتی ہے تو اس معاہدہ یا امان نامہ میں کیا کیا ذمہ داری قبول کرتی ہے؟ کن حقوق کی ضمانت دیتی ہے؟ کس طرح اس کے تمام حقوق اور جان ومال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا ذمہ اٹھاتی ہے؟ اور یہ معاہدہ قانونی و آئینی طور پر کتنا قطعی وابدی ہوتا ہے؟ ان چیزوں کا اندازہ ان معاہدات سے لگایا جا سکتا ہے جو عہد نبوی ﷺ اور اس کے بعد خلفاء راشدینؓ، اموی وعباسی خلفاء اور بعد کی اسلامی حکومتوں کے زمانے میں غیر مسلموں سے کیے گئے۔ مثلاً یہود

---

[1] ۔ اسلامی ریاست، دار التذکیر اردو بازار لاہور، ۲۰۰۶، ص ۲۰۱-۲۰۰

مدینہ سمیت دیگر غیر مسلم قبائل کے ساتھ کیا گیا حضور اکرم ﷺ کا مشہور معاہدہ "میثاق مدینہ"، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ نبوی، اہل ایلیا (شام) کے ساتھ حضرت عمرؓ کا معاہدہ، اہل مصر کے لیے حضرت عمرو بن العاصؓ کا امان نامہ وغیرہ ان معاہدات میں غیر مسلموں یا اہل الذمہ کو جس فراخدلی سے تمام انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی اور جس کمال مذہبی رواداری کا مظاہرہ کیا گیا اس کی تفصیل ان شاء اللہ اگلے ابواب میں آ جائے گی۔ تاہم یہاں ذیل میں ہم اس قسم کے معاہدوں کا ایک اجمالی نمونہ دیکھانا چاہتے ہیں جس سے درج بالا سوالات کا جواب اور عقد ذمہ کی آئینی حیثیت اور تمام حقوق و جزئیات کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ عقد ذمہ یا امان نامہ کا یہ نمونہ مشہور انشاء پرداز اور ماہر سیاسیات علامہ القلقشندی نے اپنی منفرد تالیف "صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء" میں درج کیا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے سربراہ یا خلیفہ کی جانب سے کسی غیر مسلم فرد یا قوم کے لیے یہ معاہدہ کن الفاظ میں اور کس اسلوب میں لکھا جانا چاہیے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ جب یہ معاہدہ / امان نامہ لکھا جائے تو ان الفاظ میں لکھا جائے:

هذا كتاب امان كتبه عبدالله فلان ابو فلان امير المؤمنين الفلانى، اعز الله تعالىٰ به الدين وادام له التمكين لفلان الفلانى، فانه قد امنه بامان الله تعالىٰ وامان رسوله ﷺ وامانه على نفسه وماله، وشعره وبشره واهله وولده وحرمه واشياعه واتباعه واصحابه وحاله وذات يده واملاكه ورباعه وضياعه وجميع ما يخصه ويخصهم امانا صحيحا نافذا واجبا لازما لا ينقض ولا يفسخ ولا يبدل ولا يتعقب بمخاتلة ولا دهان ولا موازبة ولا حيلة ولا غيلة واعطاه على ذالك عهد الله وميثاقه وصفقة يمينه بنية خالصة له ولجميع من ذكر معه وعفاله عن كل جريمة متقدمة وخطيئة سالفة الى يوم تاريخ هذا الامان واحله من ذالك كله

واستقبله بسلامة النفس ونقاء السريرة واوجب له من الرعاية ما اوجبه لا مثاله ممن شمله ظله وكنفته رعايته حاضراً وغائبا وملكهٗ من اختياره قريبا وبعيداً وان لايكرهه علىٰ ما لا يريدهٗ ولا يلزمه بما لا يختاره وغيره ذالک مما يقتضيه الحال ويدعو اليه المقام۔[1]

یہ ایک امان نامہ / معاہدہ ہے جسے اللہ کے بندے فلاں بن فلاں امیر المؤمنین فلاں، اللہ اس کے ذریعے دین کو عزت وغلبہ عنایت فرمائے اور اس کے اقتدار کو قائم رکھے، نے فلاں آدمی کے لیے تحریر کیا ہے۔ بے شک امیر المؤمنین نے اسے اللہ تعالیٰ کی امان، اس کے رسول ﷺ کی امان اور اپنی ذاتی امان کی بنیاد پر اسے امان دی ہے۔ اس کی ذات، اس کے مال، اس کے بال، اس کی جلد، اس کے اہل خانہ، اس کی اولاد، اس کی بیوہ، اس کے مددگاروں، اس کے پیرکاروں، اسکے ساتھیوں، اس کے مال، اسکی مقبوضہ چیزوں، اس کی املاک، اس کے گھر بار، اس کی جائیداد اور جو چیز بھی اس کی ملکیت میں ہے، سب کے لیے ایسی امان جو بالکل صحیح ہے۔ جو نافذ العمل، واجب اور لازم ہوگی جسے کبھی توڑا جاسکے گا نہ فسخ کیا جاسکے گا اور نہ تبدیل کیا جاسکے گا۔ اس امان نامہ کے بعد معاہد سے کسی قسم کا فریب، چالاکی، مکاری، حیلہ اور دھوکا نہیں کیا جائے گا اور اس عہد / امان نامہ پر اسے اللہ کا عہد ومیثاق اور اس کی قسم دی جاتی ہے۔ اس کے لیے اور اس کے ساتھ جن لوگوں کا ذکر کیا ہے سب کے لیے خالص نیت کے ساتھ۔ اس امان نامہ / معاہدہ کی تاریخ سے پہلے کی اس کی تمام غلطیاں اور گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیشہ نفس کی سلامتی اور پاکیزگی کے ساتھ پیش آیا جائے گا اور اس کے لیے بھی انہی مراعات کو ملحوظ رکھا جائے گا جو اس قسم کے دیگر معاہدین

[1] - صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء (المقالۃ التاسعۃ۔ الباب الثانی)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳/ ۳۳۰

اور رعایا کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ اور اسے کسی ایسی چیز پر مجبور نہیں کیا جائے گا جسے وہ نہیں چاہتا ہو گا اور اس پر کوئی ایسی چیز لازم نہیں کی جائے گی جسے وہ اختیار کرنا نہیں چاہتا ہو گا۔ اور اس کے علاوہ حسب حال و موقع دوسری ضروری اور وضاحت طلب چیزوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔

عالمی منشور انسانی حقوق کی آئینی حیثیت - تقابلی جائزہ

اسلام میں عقد ذمہ کے ذریعے اھل ذمہ کو جو انسانی اور شہری حقوق دیے جاتے ہیں ان کی آئینی قانونی اور شرعی حیثیت کا مختصر جائزہ لینے کے بعد مناسب ہو گا کہ اقوام متحدہ کے معروف "عالمی منشور انسانی حقوق" (Universal Declaration of Human Rights) مجریہ 10 دسمبر 1948ء کی حقیقت اور آئینی حیثیت کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے عطا کردہ انسانی حقوق اور مفاد پرست اقوام کے دیے گئے نام نہاد انسانی حقوق کے درمیان بنیادی فرق و امتیاز کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے آخر میں اقوام متحدہ کی طرف سے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو پاس ہونے والے عالمی منشور حقوق انسانی کا تذکرہ کیا اور اس کے بعد اسکی آئینی و قانونی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> اس پورے منشور کے کسی جزء سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان و اظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عاید نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاہدہ نہیں ہے جس کی بنا پر دستخط کرنے والی تمام حکومتیں اسکی پابندی پر مجبور ہوں اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پر قانونی وجوب عاید ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔ اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو

جاتی ہے کہ اول مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جائے تو ان کے پیچھے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے حقوق انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نشر فرمایا، وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلامیہ کیلیے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور پاک ﷺ اور خلفائے راشدین ؓ نے چھوڑی ہیں۔[1]

اسی طرح جناب صلاح الدین نے عالمی منشور حقوق انسانی کی "تیس دفعات" کی دفعہ وار تفصیل اور اندارج کے بعد اس منشور کی حقیقت اور اقوام متحدہ کی بے بسی پر متعدد مغربی مفکرین کی آراء اور تبصرہ جات درج کیے ہیں اور آخر میں اسکی آئینی وقعت و حیثیت اور اصلیت سے یوں پردہ اٹھایا ہے:

"منشور انسانی حقوق کے مطالعہ اور اس پر کیے گئے تبصروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر انسان کی اجتماعی کوششیں بھی اس کے لیے پر وقار اور آبرومندانہ زندگی کو کوئی ضمانت مہیا نہیں کر سکیں۔ وہ اپنے اپنے ملک میں حکومتوں کی قہرمانی کے سامنے جتنا بے بس و بے اختیار پہلے تھا اتنا ہی آج بھی ہے بلکہ حکومتوں کے دائرہ کار اور اس کے اختیارات میں مسلسل وسعت واضافہ نے بنیادی حقوق اور شہری آزادیوں کو بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔ منشور انسانی حقوق کی حیثیت ایک خوشنما دستاویز سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں حقوق کی ایک فہرست تو مرتب کر دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک حق بھی اپنے پیچھے قوت نافذہ نہیں رکھتا۔ یہ نہ ریاستوں پر کوئی قانونی پابندی عائد کر کے انہیں بنیادی حقوق سلب کر لینے سے باز رکھنے کا کوئی اہتمام کرتا ہے اور نہ کسی فرد کے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے کسی قانونی چارہ جوئی کا

---

[1] - اسلامی ریاست ص ۵۵۴-۵۵۳

کوئی نظام مہیا کرتا ہے۔ اسطرح یہ منشور تحفظ انسانی حقوق کے معاملہ میں بالکل ناکارہ اور ناقابل اعتماد دستاویز ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہے کہ اس نے انسانی حقوق کا ایک معیار قائم کر دیا ہے اور عالمی انسانی برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کا ارتقائی احساس وشعور بخشتا ہے۔ معاشرہ میں فرد کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اس کی مدد سے نو آزاد ممالک اپنے آئین وضع کرتے وقت بنیادی حقوق کے رسمی باب کو سہولت کے ساتھ مرتب کر لیتے ہیں۔ اس منشور کی حیثیت سراسر اخلاقی ہے۔ قانونی نقطہء نظر سے اس کا کوئی وزن و مقام نہیں۔ بنیادی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے اس منشور کی قوت واہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف سیاسی قیدیوں کے معاملات سے متعلق بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کی شائع شدہ رپورٹ برائے سال ۷۶-۱۹۷۵ کے مطابق اقوام متحدہ کے ۱۴۲ ارکن ممالک میں سے ۱۱۳ ملکوں میں بنیادی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کی گئیں اور طاقت کے بیجا استعمال 'بلاجواز گرفتاریوں' سیاسی قید وبند' جبر وتشدد اور سزائے موت کے واقعات اور پریس پر پابندی' عدلیہ کے اختیارات میں کمی' آمرانہ قوانین کے نفاذ اور بنیادی حقوق منسوخ ومعطل کئے جانے کے اقدامات میں عالمگیر سطح پر تشویش ناک اضافہ ہوا ہے"۔[1]

حقوق انسانی کے حوالے سے مذکورہ بالا تنظیم Amnesty International کی بعد کی سالانہ رپورٹوں میں بھی حقوق انسانی کے علمبردار ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی یہی صورت حال ہے۔ چنانچہ ۲۰۱۰ء کی سالانہ رپورٹ میں حقوق انسانی کے تحفظ کے دعویدار مختلف ممالک کے اندر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے اعداد وشمار (جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی) دیتے ہوئے لکھا ہے:

> No one should be above the law. But all too often, those who commit the worst kinds of human rights abuses are not brought to justice. The world's leaders must do much more to protect people's

---

[1] بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن لاہور (ص ۹۶-۹۵)

rights.[1]

عصر حاضر میں ذمی کی اصطلاح کا جائزہ

پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک میں اس وقت جتنے غیر مسلم لوگ آباد ہیں، آیا ان کیلیے ذمی کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں موجودہ بین الاقوامی صورت حال اور سوچ کچھ اس طرح کی ہے کہ شرعی اصطلاح میں ذمی کا لفظ جیسا کہ اوپر گزرا، چاہے کتنا ہی بامعنی مقدس اور ذمہ داری و حفاظت کا مفہوم لیے ہوئے ہو اور اس میں ذلت و تحقیر کے معنی کی مسلمان جتنی نفی کریں، غیر مسلم اس لفظ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ذمی کے تصور سے وہ دوسرے درجے کے شہری قرار پاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسلامی ممالک میں غیر مسلم شہریوں کا قیام باقاعدہ عقد ذمہ کی رو سے نہیں دوسرے تمام اسلامی ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کو استعماری طاقتوں کی تائید و حمایت حاصل ہے، تیسرے اسلامی ممالک کی سیاسی و عسکری اور معاشی صورت حال بھی سراسر استعماری طاقتوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ ارباب اختیار و اقتدار میں ایمانی جرات اور حمیت و غیرت کا جذبہ بھی قابل رحم حد تک مفقود ہے اسلیے "الضرورات تبیح المحظورات"[2] (مجبوریاں ممنوع چیزوں کو بھی جائز قرار دے دیتی ہیں) کے مسلمہ فقہی قاعدہ کی رو سے ضروری نہیں کہ ان حالات میں غیر مسلموں کیلیے "ذمی" کی اصطلاح پر ہی زور دیا جائے۔ ذمی کی مذکورہ تعریف کے مطابق اگر وہ اللہ اور اسکے رسول کے ذمہ میں نہیں آنا چاہتے تو یہ انکی صوابدید ہے۔ اسکے علاوہ اسلام لفظوں میں الجھنے کی بجائے اصل مقصد کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے معاہدہ میں اہل مکہ کے نمائندے نے "محمد رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ پر اعتراض کیا تو آپ ﷺ نے ان الفاظ پر زور نہیں دیا بلکہ اسکی رائے کے مطابق کاتب معاہدہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے نہ چاہنے کے

---

[1] -http://humanrightshouse.org/14314.html

[2] - ابن نجیم زین الدین بن ابراہیم (م ۹۷۰) الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی ت۔ن، ۱/۱۱۸

باوجود اپنے ہاتھ سے محمد بن عبد اللہ لکھ دیا اور یوں اس معاہدہ صلح کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔[1]

موجودہ حالات میں غیر مسلموں کیلیے ذمی کی اصطلاح کیلیے اصرار نہ کرنے پر خلیفہ راشد حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلے سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے نصاری بنی تغلب کی خواہش پر ان سے جزیہ کی بجائے دو گنا صدقہ (زکوۃ) لینے پر صلح کر لی تھی[2]

غیر مسلموں کے بارے میں "اشداء علی الکفار" کی شان کے حامل خلیفہ حضرت عمرؓ نے بنی تغلب سے جزیہ کی بجائے دوگنا زکوۃ پر صلح کیوں فرمائی؟ اس کی حکمت و مصلحت سے پر تبصرہ کرتے ہوئے ابو عبیدؒ نے لکھا ہے:

> ہمارے خیال میں انہوں نے جزیہ کا نام اڑا کر یہ صورت اسلیے جائز رکھی کہ انہیں بنی تغلب کی طرف سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ وہ جزیہ کے نام سے بیزاری، ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں (اسی نام پر) مجبور کیا گیا تو وہ رومیوں سے جا ملیں گے اور اسلام کے خلاف ان کے مددگار بن جائیں گے۔ پھر ان پر یہ حقیقت بھی منکشف تھی کہ اگر ان سے واجبی جزیہ لینے کے ساتھ ہی اتنی رعایت کر دی جائے کہ اس کا نام (جزیہ) باقی نہ رکھا جائے تو اس سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ بنابریں انہوں نے ان کے لیے جزیہ کا لفظ اڑا دیا اور اسکی واجب الادا رقم صدقہ کے نام سے لینے لگے جو مسلمانوں سے وصول کی جانے والی زکوۃ سے دوگنا ہوتی تھی۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے مخالفین سے جا ملنے کے اندیشہ کا سد

1۔ تفصیل کیلیے دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح مع شرح کرمانی (کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء) داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء،۱۶/۱۱۷، رقم ۳۹۶۶

2۔ دیکھیے: امام ابو یوسف، کتاب الخراج ص: ۱۲۱-۱۲۰؛ ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال (باب نمبر ۷۷۔ پیرہ نمبر ۱۶۹۳ تا ۱۷۰۳) ص: ۷۹۳- ۷۹۸

باب ہو گیا اور دوسری طرف ان کے ذمہ مسلمانوں کے جو واجب الادا حقوق تھے وہ بھی پورے پورے وصول ہو گئے۔ اور اس فیصلہ میں حضرت عمرؓ صائب الرائے اور اپنی جگہ بالکل حق بجانب تھے۔[1]

بالکل یہی صورت حال عالم اسلام میں غیر مسلموں کیلیے ذمی کی اصطلاح استعمال کرنے میں ہے۔لہذا ان کی ذہنی تسکین کے لیے غلبہ اسلام کے زمانے کی مذکورہ اصطلاح پر زور دینے کی بجائے "غیر مسلم اقلیت" کی اصطلاح استعمال کرنے میں شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔

---

[1] ۔ کتاب الاموال (پیرہ نمبر ۱٦۹۹) ص: ۷۹۷،۷۹٦

چھٹی فصل

عقد ذمہ کا حکم، مشروعیت کی حکمت اور شرائط

عقد ذمہ کا حکم

جب اسلامی ریاست کسی غیر مسلم فرد یا قوم سے "عقد ذمہ" کا باقاعدہ معاہدہ کرنے تو علامہ کاسانیؒ کہتے ہیں کہ اس کا فوری اثر یا نافذ العمل حکم ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم "قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر۔۔۔۔حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" کی رو سے ان اہل الذمہ کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی۔ کیونکہ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جزیہ قبول کر لینے کے وقت تک ان سے جنگ کرنے کو مباح ٹھہرایا ہے۔ جب انہوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا تو جنگ کی اباحت ختم ہو گئی۔ جب جنگ کی اباحت ختم ہو گئی تو از خود انکی جانوں کی عصمت ثابت ہو گئی۔ اور اس عقد ذمہ کا دوسرا نافذ العمل حکم یہ ہے کہ ان کے مال بھی معصوم و محفوظ ہو جائیں گے کیونکہ مال نفس کی عصمت کے تابع ہے۔ علاوہ ازیں حضرت علی المرتضیٰؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انما قبلو اعقد الذمۃ لتکون اموالھم کاموالنا ودماءھم کدمائنا[1]

بیشک ان لوگوں نے عقد ذمہ اس لیے قبول (منظور) کیا ہے کہ ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح محفوظ و معصوم ہو جائیں۔

اسی طرح علامہ ماوردی کہتے ہیں کہ جب اہل الذمہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو فوری طور پر ان کے لیے دو حق ثابت ہو جاتے ہیں: "احدھما الکف عنھم و الثانی الحمایۃ لھم"۔ (ایک ان کے

[1] ۔ کاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۱۴۰۰ھ ۷/۱۱۱

ساتھ جنگ کرنے سے رُک جانا اور دوسرا ان کی حمایت وتحفظ) تاکہ جنگ بندی سے وہ امن میں اور حمایت سے اسلامی ریاست کی حفاظت میں آجائیں۔[1]

مشروعیت کی حکمت اور غرض وغایت

گزشتہ صفحات میں یہ وضاحت گزر چکی ہے کہ جب کوئی غیر مسلم قوم اسلامی ریاست کو "جزیہ" کی شکل میں ایک معمولی سا ٹیکس دینا منظور کر لیتی ہے تو ازروئے قرآن اسلامی ریاست اس امر کی پابند ہے کہ اس سے جنگ نہ کرے۔ اس پر کسی ظاہر پرست اور معترض کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جزیہ کا وجوب یا عقد ذمہ کی مشروعیت تو غیر مسلموں کے کفر پر راضی رہنے کے مترادف اور ان سے جزیہ کی شکل میں مال وصول کرنے کیلیے ہے۔ فقہاء اسلام کی دور بین اور باریک بین نگاہوں سے یہ شبہ او جھل نہیں رہا۔ لہٰذا اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود محض جزیہ وصول کرنا نہیں بلکہ انہیں اس بات کی مہلت اور موقع دینا مطلوب ہے کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے محاسن پر غور کریں اور اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ مشہور فقیہ مفسر ابن العربیؒ نے جزیہ کی مشروعیت کی ایک حکمت یہ لکھی ہے کہ

> انہ لو قتل الکافر لیئس من الفلاح ووجب علیہ الھلکۃ فاذا اعطی الجزیۃ وامھل لعلہ ان یتد برالحق ویرجع الی الصواب لا سیما بمراقبۃ اھل الدین والتدرب بسماع ما عند المسلمین الاتری ان عظیم کفرھم لم یمنع من ادرار رزقہ سبحانہ علیھم وقد قال النبی ﷺ لا احد اصبر علی اذی من اللہ یعافیھم ویرزقھم وھم یدعون لہ الصاحبۃ والولد۔[2]

---

[1] ۔ الاحکام السلطانیہ، مصطفیٰ حلبی مصر، ص: ۱۴۳

[2] ۔ احکام القرآن، داراحیاء الکتب العربی، ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۷ء ۲/ ۹۱۳

اگر کافر کو قتل کر دیا جائے (اور جزیہ قبول کر کے اسے زندہ رہنے کا موقع نہ دیا جائے) تو یقیناً یہ اخروی کامیابی سے مایوس ہو جائے گا اور ہلاکت اس پر واجب ہو جائے گی۔ مگر جب اس نے جزیہ دے دیا اور یوں مہلت حاصل کر لی تو ہو سکتا ہے کہ وہ دین حق میں غور و فکر کرے اور سیدھے راستے (دین اسلام) کی طرف لوٹ آئے۔ خصوصاً جب کہ وہ اہل دین کی زندگی کو دیکھے گا اور مسلمانوں کے ہاں موجود شرعی احکام کو ایک عرصہ تک سنے گا (تو یقیناً اسکی ہدایت کی امید کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک اسکے کفر پہ راضی ہونے کا اشکال ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کریم سے بڑھ کر اذیت پر صبر کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ کفار سے درگزر کرتا اور انہیں مسلسل رزق دے رہا ہے، حالانکہ وہ اس کے لیے بیوی اور اولاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

اسی طرح علامہ کاسائیؒ نے غیر مسلموں سے عقد ذمہ کرنے کی بنیادی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> عقد ذمہ کے بعد انہیں جو اپنے حال (کفر) پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان سے جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے تو اس میں ان سے جو جزیہ لیا جاتا ہے اسکی رغبت اور طمع مد نظر نہیں بلکہ اسلام کی طرف دعوت کی خاطر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے تا کہ وہ لوگ جب مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے تو اسلام کے محاسن اور اسکے شرعی احکام میں تامل اور غور و فکر کریں گے اور دیکھیں گے کہ یہ وہ احکام ہیں جنہیں انسانی عقل بھی قبول کرتی ہے تو یہ چیز انہیں اسلام کی طرف دعوت دے گی اور وہ اسکی رغبت کریں گے تو یہ عقد ذمہ ان کے اسلام قبول کر لینے کی امید پر مشروع کیا گیا ہے۔[1]

علی ہذا القیاس علامہ سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ

---

[1] ۔ بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱

اہل حرب میں سے کوئی قوم اگر یہ مطالبہ کرے کہ وہ مقررہ جزیہ اور خراج ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں کے ذمی بننے اور اپنے اوپر اسلامی احکام کا نفاذ قبول کرنے کیلیے تیار ہے تو امام؛ خلیفہ پر واجب ہے کہ وہ انکی اس دعوت کو قبول کرے۔ کیونکہ جس طرح محاربین کے اسلام قبول کر لینے پر ان سے جنگ کا حکم ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ان کے عقد ذمہ سے بھی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جس طرح اگر وہ یہ مطالبہ کریں کہ ان پر اسلام پیش کیا جائے تو انکی یہ دعوت قبول کرنا واجب ہے اسی طرح اگر وہ عقد ذمہ کا مطالبہ کریں تو انکی دعوت قبول کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے وہ باہمی معاملات میں احکام اسلام کی پابندی کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ شریعت کے محاسن دیکھیں اور اسلام لے آئیں تو گویا یہ عقد ذمہ مناسب طریقہ پر دین کی طرف بلانے کے معنی میں ہے۔[1]

علامہ ابن رشد نے لکھا ہے کہ اہل الذمہ کے لیے عقد ذمہ میں صرف اخروی اور دینی فائدہ ہی نہیں بلکہ نقد دنیوی فوائد بھی پنہاں ہیں، لکھتے ہیں:

شرعت الذمة فی الاسلام لما اشتملت علیه من فوائد کثیرة لعقد الصلات السلیمة بین المسلمین وغیرهم وقد وضع الاسلام لها قواعد وافیة اذا روعیت نشأ عنها صلح دائم فیه الطمأنیة والسلامة والامن فاذا عقد الحربی ذمة مع المسلمین اصبح آمنا علی نفسه و ولده وماله بعد ان کان دمه هدرا وولده مستتبا وماله مغنوما وحماه مستباحا۔[2]

---

[1] - شرح السیر الکبیر، دار المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن ت ن، ۳/ ۲۵۰-۲۴۹

[2] - بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد (کتاب الجہاد)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۳/ ۴۹۰

اسلام میں عقد ذمہ کی مشروعیت اس لیے ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پر امن تعلقات قائم رکھنے کے لیے اس میں بہت سے فوائد ہیں اور اسلام نے اس کے لیے ایسے قواعد وضع کیے ہیں کہ جب ان کی رعایت کی جائے گی تو ان سے امن و سلامتی اور اطمینان کی ایک دائمی فضا قائم ہو جائے گی۔ دوسرے جب حربی آدمی مسلمانوں کے ساتھ ذمہ کا معاہدہ کرے گا تو اس کی جان، اولاد اور مال سب محفوظ ہو جائیں گے، ورنہ تو اسلام میں حربی کا خون معاف، اس کی اولاد غلام بنالی جائے گی اور اس کا مال غنیمت کے طور پر لے لیا جائے گا اور اس کی چراگاہ مباح ہو گی۔

زیر بحث اشکال و شبہ کا جواب علامہ قرافی نے بہت عمدہ اور بڑے اصولی انداز میں دیا ہے انہوں نے پہلے اس معاملے میں دین کے اندر طعن کرنے والے بعض لوگوں کی طرف سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ "شریعت اسلامیہ کی شان یا عمومی اصول تو یہ ہے کہ ناگزیز مفاسد میں سے چھوٹے مفسدہ کو برداشت کر کے بڑے مفسدہ کو دور کیا جاتا اور بڑے مفسدہ کے دور کرنے کی خاطر دینوی مصلحت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں اس شرعی اصول کے برعکس معاملہ ہے وہ اس طرح کہ کفار کے اموال میں سے جزیہ کی صورت میں معمولی مفاد اٹھا کر کفر جیسی عظیم خرابی کو بڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے بلکہ یہ کفر تو وہ خرابی ہے جسے دنیا و مافیہا کے بدلے بھی ختم کیا جانا چاہیے چہ جائیکہ جزیہ کے اس معمولی مفاد کی خاطر کفر کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ تو شریعت میں اس کا حکم کیوں وارد ہوا اور اسے کیوں نہیں منع کیا گیا ہے؟ تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ قرافی نے لکھا ہے: (طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کر رہے ہیں)

ترجمہ: "دراصل جزیہ کا قاعدہ بڑے مفسدہ کے دفعیہ اور بڑی مصلحت کے حصول کیلیے چھوٹی خرابی کو اختیار کرنے کے باب سے ہے اور یہی قواعد شرعیہ کی شان اور اصول ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب کافر کو قتل کر دیا جائے گا تو اس پر ایمان اور جنت کی سعادت حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو جائے

گا اور حتمی طور پر اس پر کفر اور ہمیشہ کیلیے جہنم کی آگ میں جلنے اور دین کی ناراضگی کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اللہ کریم نے اس امید پر جزیہ مشروع فرمایا کہ شاید وہ آنے والے وقت میں دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ جب اسے اسلام کے محاسن کا پتہ لگے گا اور جزیہ کی وصولی میں اسے ذلت وخواری پر مجبور ہونا پڑے گا تو بطور خاص اس کے اسلام لانے کی امید کی جاسکتی ہے۔ پھر جب اس نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے اسلام لانے سے اسکی ذریت (اولاد) بھی اسلام لے آئے گی۔ پھر اس طرح اس کی طرف سے کفر کی بجائے اسلام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور بالفرض اگر وہ خود اپنے کفر پر ہی مر گیا اور اسلام نہیں لے آیا تو ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس کے بعد باقی رہنے والی اس کی اولاد اسلام قبول کر لے گی اور اسی طرح قیامت تک اسکی اولاد در اولاد سے اسلام کی توقع کی جاسکتی ہے اور ایمان کی ایک گھڑی بھی کفر کی طویل زمانہ کے برابر (بلکہ بہتر) ہے۔"[1]

عقد ذمہ کی مذکورہ غرض وغایت کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جونہی کوئی ذمی آدمی اسلام قبول کرلے تو شرعی اعتبار سے جزیہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔[2]

اسی طرح بعض اموی حکمران (آل مروان) اھل الذمہ میں سے اسلام قبول کرنے والوں سے بھی اس نقطہء نظر سے جزیہ لیتے رہے تھے کہ یہ ایک شخصی ٹیکس ہے جو کسی کے اسلام قبول کر لینے سے ساقط نہیں ہوتا مگر جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ والیٔ خلافت ہوئے تو یہ صورت حال دیکھتے ہوئے آپ نے عراق میں اپنے عامل عبدالحمید بن عبدالرحمن کو سلام کے بعد لکھا:

---

[1] - الفروق (۱۱۷واں فرق) ۳/۲۲-۲۱

[2] - علامہ جصاصؒ رازی نے اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں وارد ہونے والے تمام شبہات کا جواب دیا ہے۔ دیکھیے۔ جصاص ابو بکر احمد الرازی، احکام القرآن، ۳/۱۴۹-۱۴۸ نیز دیکھیے کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/۱۱۲؛ شعرانی، المیزان الکبری (اردو ترجمہ)، ۳/۳۶۴ السید سابق فقہ السنۃ، ۲/۶۶۸؛ امام ابو یوسف کتاب الخراج (اردو ترجمہ) (پیرہ نمبر ۵۸۲) ص: ۳۹۸-۳۹۹

اما بعد فان الله بعث محمد اداعیاولم یبعثه جابیا. فاذا اتاک کتابی هذا فارفع الجزیة عمن اسلم من اهل الذمة۔ [1]

امابعد، بیشک اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو داعی بنا کر مبعوث فرمایا تھا نہ کہ ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر۔ لہذا جب تمہارے پاس میرا یہ مراسلہ پہنچے تو فوراً اھل الذمہ میں سے ان تمام لوگوں کا جزیہ معاف کردو جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

امام ابو یوسف ؒ نے حضرت عمر بن عبد العزیز ؒ کا مذکورہ مراسلہ (بنام عبد الحمید بن عبد الرحمن) دوسرے انداز میں بیان کیا ہے نیز مزید حقوق بھی بیان کیے ہیں۔ آپ اس مراسلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علماء اہل کوفہ میں سے ایک استاذ نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ عبد الحمید بن عبد الرحمن کے پاس حضرت عمر بن عبد العزیز ؒ کے ہاں سے ایک خط آیا تھا (جس کا مضمون یہ تھا کہ)تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ حیرہ کے کچھ یہودی عیسائی اور مجوسی اسلام لا رہے ہیں جن پر بہت کافی جزیہ عائد ہوتا رہا ہے۔ اب ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ تم نے ان سے (حسب سابق) جزیہ وصول کرنے کی اجازت چاہی ہے۔ اللہ جل شانہ نے حضرت محمد ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل بنا کر۔ ان مذاہب کے پیروؤں میں سے جو لوگ اسلام لے آئیں ان کے ذمہ اپنے مال کی زکوۃ ہوگی۔ ان پر جزیہ نہیں عائد ہو گا۔ ان کی میراث ان کے (غیر مسلم) رشتہ داروں کو ملے گی۔ ان کے درمیان وراثت کی تقسیم اسی طرح ہو گی جس طرح مسلمانوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر اسکا کوئی وراث نہ ہو تو اس کا ترکہ مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا جس کا مال سارے مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ اس شخص سے اگر کوئی خیانت

---

[1] - جصاص، احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ کراچی ت۔ن، ۳/۱۰۵

سرزد ہو جائے تو اس کی دیت بھی اللہ کے اس مال سے ادا کی جائے گی جو سارے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے۔والسلام[1]

عقد ذمہ اور جزیہ کی مشروعیت کی حکمت میں درج بالا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی غرض وغایت تو یہی ہے کہ اہل الذمہ / غیر مسلم اقلیتوں کو اسلام قبول کر کے دائمی نجات پانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ تاہم اسکے علاوہ چند ضمنی مقاصد کی طرف بھی ہماری فقہاء نے اشارہ کیا ہے۔صرف اشارہ ہی نہیں اسکی تفصیل بھی بتائی ہے مثلاً یہ کہ جزیہ دینا اس بات کی علامت ہے کہ اس غیر مسلم فرد یا قوم نے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی ہے۔دوسرے جزیہ غیر مسلم افراد کو ہر قسم کے استحصال اور ظلم و زیادتی سے بچانے کا موثر وسیلہ ہے۔تیسرے اسلامی ریاست کے لیے ایک آمدن کا ذریعہ ہے جسے وہ مصالح عامہ اور رعایا کی بنیادی ضروریات پر خرچ کرتی ہے۔[2]

عقد ذمہ کی شرائط

عقد ذمہ کی شرائط کے ضمن میں بھی فقہاء اسلام نے خاصی تفصیلات ذکر کی ہیں مثلاً بعض محدثین فقہاء اور علماء سیاست نے عبد الرحمن بن غنم اور اہل الجزیرہ کے درمیان طے پانے والے اس معاہدہ کو درج کیا ہے جسکی منظوری عبد الرحمن بن غنم نے خلیفہ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ سے حاصل کی۔ اس معاہدہ میں اسلامی حکومت کی بجائے خود اہل الجزیرہ نے اپنے حوالے سے بہت سی شرائط اور پابندیاں قبول کی ہیں۔[3]

---

[1] ۔ کتاب الخراج (اردو ترجمہ بنام اسلام کا نظام محاصل، از ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی) مکتبہ چراغ راہ کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۸-۳۹۹

[2] ۔ تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو۔ الموسوعۃ الفقہیۃ کویت، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵ء (تحت لفظ جزیہ) ۱۵/ ۱۶۰-۱۵۷

[3] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابویعلی: الاحکام السلطانیہ، مصطفی حلبی مصر، ۱۳۵۷ھ، ص ۱۴۳-۱۴۲، وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیہ، الکویت: الموسوعۃ الفقہیۃ، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵ء ۷/ ۱۲۴ (تحت اہل الذمہ): امام شافعی نے ان

اسی طرح علامہ قرافی نے "الفروق" کے جزء ثالث میں ۱۱۸ ویں فرق کے تحت اس مسئلہ میں دئی پانچ چھ صفحات پر مشتمل بیسیوں شرائط بیان کی ہیں۔ پھر ان شرائط کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ کن شرائط کو پورا نہ کرنے سے عقد ذمہ ٹوٹ جائے گا اور کن سے نہیں ٹوٹے گا۔ وغیرہ وغیرہ[1]

علاوہ ازیں دیگر فقہاء نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے اپنے انداز میں عقد ذمہ کی شرائط بیان کی ہیں۔ تاہم ان میں اکثر شرائط وہ ہیں جن کا آج کے زمانے میں تصور یا ان پر عمل ممکن نہیں۔ لہذا اس مسئلہ میں علامہ ماوردی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے نزدیک مختصر اور جامع ہے۔ دوسرے اس سلسلے میں بعض شرائط پر جو شبہات اور اعتراض وارد ہوتا ہے (جس پر تفصیلی گفتگو آگے آئے گی) اس کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ لہذا ہم اسی کو یہاں نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

چنانچہ علامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ کے تیرھویں باب میں جزیہ کی تفصیلات (مثلاً جزیہ اور خراج میں کتنے جہتوں سے اتحاد اور کتنی جہتوں سے فرق ہے، آیت جزیہ کی تفسیر، کن غیر مسلموں سے عقد ذمہ ہو سکتا ہے اور کن سے نہیں، کن اھل الذمہ سے جزیہ وصول کیا جائے گا اور کن سے معاف ہو گا، جزیہ کی مقدار وغیرہ) بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

جزیہ کے ساتھ دو شرطیں اور قابل لحاظ ہیں ایک ضروری اور دوسری غیر ضروری۔ ضروری شرط میں چھ امور داخل ہیں۔

شرائط کی لمبی چوڑی فہرست بیان کی ہے: دیکھیے: کتاب الام (مع مختصر المزنی دار الفکر بیروت، ۴/۲۰۸-۲۱۰؛ نیز بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ) دار الفکر بیروت، ۱۴/۴۳-۴۴؛ ابن تیمیہ، مجموع فتاوی شیخ الاسلام، حکومۃ سعودی عرب، ۲۸/۶۵۲؛ ابن حزم، المحلی (کتاب الجہاد)، دار الجیل، بیروت، ۷/۳۴۶-۳۴۷؛ القلقشندی، صبح الاعشی (الباب الثالث من المقالۃ التاسعۃ)، ۱۳/۳۵۷-۳۵۸

[1] - الفروق، ۳/۲۸-۲۳

۱۔ کتاب اللہ (قرآن مجید) پر کسی قسم کے طعن یا اس میں تحریف کے مرتکب نہ ہوں۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب و توہین نہ کریں۔

۳۔ دین اسلام کی مذمت اور اس پر اعتراضات نہ کریں۔

۴۔ مسلمان عورت سے زنا کے مرتکب ہوں نہ اس سے نکاح / شادی کا نام لیں۔

۵۔ کسی مسلمان آدمی کو مذہب سے ورغلائیں نہ اسکے مذہب ومال سے کوئی تعرض کریں۔

۶۔ اہل حرب کی اعانت نہ کریں اور نہ ان کے دولتمندوں سے راہ ورسم رکھیں۔

یہ چھ امور بلا شرط کے بھی واجب العمل ہیں۔ شرط محض اطلاع اور عہد کی تاکید و تغلیظ کیلیے کی جاتی ہے۔ شرط کے بعد اگر ان میں سے کسی امر کی پابندی نہ کی گئی تو عہد ٹوٹ جائیگا۔

غیر ضروری شرط میں بھی چھ امور داخل ہیں۔

۱۔ خاکی لباس اور زنار پہن کر اپنی ھئیت ممتاز رکھیں۔

۲۔ اپنی عمارتیں مسلمانوں سے بلند نہ کریں۔ زیادہ سے زیادہ مساوی رکھیں۔

۳۔ پنے ناقوس اور اپنی کتابوں کی آواز مسلمانوں کو نہ سنائیں نہ انہیں حضرت عزیر و مسیح علیہما السلام کی بابت اپنے خیالات بتائیں۔

۴۔ علی الاعلان شراب نوشی کریں نہ صلیبوں اور خنزیروں کا اظہار کریں۔

۵۔ اپنے مردوں کو خاموشی سے دفن کریں شور اور نوحہ نہ کریں۔

۶۔ عمدہ اور اصیل گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔ خچروں اور گدھوں پر سوار ہونے کی ممانعت نہیں ہے۔[1]

علامہ ماوردی کے مطابق یہ چھ امور داخل معاہدہ نہیں۔ شرط کرنے سے لازم ہوتے ہیں۔ شرط کے بعد ان کے ارتکاب سے نقض عہد لازم نہ آئے گا۔ مگر تادیبا مواخذہ اور گرفت ضرور کی جائے اور شرط

---

[1] - الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ از مولوی سید محمد ابراہیم، ترتیب و نظر ثانی عبد المالک عرفانی) قانونی کتب خانہ لاہور ص: ۲۳۸-۲۳۹

نہ کی گئی ہو تو مواخذہ بھی نہ کیا جائے۔[1]

[1] - حوالہ بالا

باب چہارم

غیر مسلموں کے سماجی و تمدنی حقوق

پہلی فصل:

سماجی و تمدنی حقوق- اہمیت وضرورت

گزشتہ باب میں یہ بات پوری تفصیل اور وضاحت سے گزر چکی ہے کہ جو غیر مسلم لوگ / اقوام کسی معاہدہ کے ذریعے یا باقاعدہ جنگ کی صورت میں مجاہدین اسلام سے میدان جنگ میں شکست کھانے کی بعد جب اسلامی ریاست کی سیاسی برتری تسلیم کرتے ہوئے اس کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ تو اسلامی ریاست نہ صرف انہیں عام شہریوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق دیتی ہے بلکہ ایک معمولی جزیہ کے عوض ان کے جان ومال اور عزت و آبرو اور دیگر تمام آئینی و بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پختہ ذمہ پر قبول کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے انہیں آئینی طور پر سوائے چند ایک کے وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو اکثریت اور حکمران جماعت ہونے کی بنا پر مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ فقہائے اسلام کا اس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ

فان قبلوا ذالک فلھم مالنا وعلیھم ما علینا[1]

پھر اگر وہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو ان کے لیے وہی حقوق ہیں جو ہمارے مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان کے اوپر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہمارے اوپر ہیں۔

اب یہ چیز چنداں محتاج دلائل نہیں کہ ایک اسلامی ریاست اھل الذمہ کو جب اپنا شہری تسلیم کرتی ہے تو لامحالہ انہیں آئینی حقوق جنکی تفصیل آگے آرہی ہے اور جنکی خلاف ورزی پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکتا ہے، کے ساتھ سماجی اور معاشرتی و تمدنی حقوق بھی حاصل ہوں گے۔ ان حقوق کی حیثیت اگرچہ اخلاقی ہے کہ انکی خلاف ورزی اور عدم ادائیگی پر قانونی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم اخلاقی اعتبار سے اسلام میں ان معاشرتی اور سماجی و تمدنی حقوق کا مرتبہ اور اہمیت آئینی و قانونی حقوق سے کم نہیں۔ کیونکہ

---

[1] - ابن عابدین شامی، حاشیہ ردالمحتار علی الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ت۔ن، ۴/ ۱۲۸

اھل الذمہ کے یہ معاشرتی حقوق بھی اسی شریعت (قرآن و سنت) نے متعین کیے ہیں جس نے آئینی حقوق کا تعین کیا ہے۔ ان حقوق کا ادا کرنا ایک مسلمان کا اخلاقی و ایمانی تقاضا ہے۔ ان کے ادا نہ کرنے سے اگرچہ دنیا میں قانونی طور پر کوئی تعزیر نہ ہے کیونکہ یہ قانونی جرم نہیں ہے تاہم یہ اسلام میں مقصود اور مستحب و مستحسن ضرور ہیں۔ جن کی بابت آخرت میں بھی بازپرس ہوگی۔

سماجی و تمدنی حقوق کا معاشرتی اعتبار سے ناگزیر ہونا

انسان اپنی بقاء و ارتقاء کیلئے معاشرہ کا محتاج ہے۔ بڑے سے بڑا اور ہر قسم کے وسائل سے مالا مال آدمی بھی اپنی ضروریات و حاجاتِ زندگی تنہا پوری نہیں کر سکتا۔ اس لیے عمرانیات کے مفکرین کے نزدیک انسانی بقاء کیلئے معاشرہ ناگزیر ہے۔ انسان اپنی طبیعت و فطرت اور جبلت کے اعتبار سے معاشرتی مزاج رکھنے والی مخلوق ہے۔ خاندان اور انسانی معاشرے سے وابستہ رہنا اس کی ضرورت اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مشہور اسلامی ماہر عمرانیات علامہ ابن خلدونؒ نے انسان کیلئے معاشرہ کی ناگزیریت کو یوں بیان کیا ہے۔

ان الاجتماع الانسانی ضروری ویعبرا لحکماء عن ھذا بقولھم الانسان مدنی بالطبع ای لابد لہ من الاجتماع الذی ھو المدینۃ فی اصطلاحھم۔[1]

افراد انسان کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے۔

اس کے بعد ابن خلدونؒ نے یہ تفصیل بتائی ہے کہ انسان کے لیے ایک معاشرہ کے اندر رہنا کیوں ضروری ہے؟ کہتے ہیں کہ اکیلا آدمی اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے سے عاجز ہے۔ صرف ایک دن کی غذا کے لیے اسے کتنے ہی لوگوں کی مدد درکار ہے۔ ان کے تعاون کے بغیر وہ غذا نہیں کھا سکتا۔ اسی طرح دیگر

---

[1] ۔ مقدمہ (الفصل الاول فی العمران البشری)، دار الکتاب العربی، بیروت، ص: ۴۸

جانوروں کے برعکس وہ اپنی ذاتی حفاظت کیلئے اسلحہ اور سازوسامان کرنے کیلئے بھی کئی کاریگروں کا محتاج ہے۔[1]

انسان کی اسی فطرت کی طرف علامہ ابن تیمیہؒ نے یوں اشارہ کیا ہے:

وکل بنی آدم لا تتم مصلحتهم لافی الدنیا ولا فی الآخرة الا بالاجتماع والتعاون والتناصر. فالتعاون والتناصر علیٰ جلب منافعهم والتناصر لدفع مضارهم ولهذا یقال :الانسان مدنی الطبع۔[2]

> تمام بنی آدم کی مصلحت دنیا اور آخرت میں انسانی اجتماع باہمی تعاون اور باہمی مدد کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ باہمی تعاون و مدد لوگوں کے منافع کے حصول اور مضرت کے دفع کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔

انسان اور اجتماعی زندگی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے فرد اور اجتماع فلاسفہ اور مفکرین کیلئے ایک انتہائی اہم اور دلچسپ موضوع ثابت ہوئے ہیں۔ برصغیر کے عظیم مفکر ماہر عمرانیات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م۱۱۷۶ھ) کے نزدیک معاشرہ تخلیق کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، وہ فرماتے ہیں:

من عنایة الله سبحانه بالانسان ان خلق الانسان مدنی الطبع لایتم ارتفاقه الا بصحبة بنی نوعه واجتماعهم وتعاونهم[3]

> اللہ تعالیٰ کی انسان پر یہ عنایت ہے کہ اس نے اسے مدنی الطبع پیدا فرمایا۔ چنانچہ اس کا ارتفاق اپنے ہم جنس انسانوں کے ساتھ مل کر رہے بغیر اور ان کے اجتماع اور ان کے تعاون کے بغیر تکمیل نہیں پاسکتا۔

انسان کی درج بالا طبیعت وجبلت کی بنا پر ایک غیر مسلم کا اہل محلہ وعلاقہ کے ساتھ سماجی وتمدنی

---

[1] ۔حوالہ مذکور

[2] ۔ابن تیمیہ، مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام، مملکۃ سعودی عرب، ۶۲/۲۸

[3] ۔البدور البازغہ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد، ۱۹۷۰ء، ص ۸۴

تعلقات و مراسم رکھنا اس کی ایک ضرورت اور لازمی حق ہے۔ جس کی ادائیگی مسلمان معاشرہ پر شرعی و اخلاقی طور پر جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزرا، ضروری ہے۔ لہٰذا آئندہ فصلوں میں ہم غیر مسلموں / اہل الذمہ کے چند اہم اور ضروری سماجی و تمدنی حقوق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں عموم

قرآن و حدیث میں والدین اور عزیز و اقارب کے ساتھ مسلمان معاشرہ میں مقیم یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، پردیسیوں، مسافروں، غلاموں اور ہر قسم کے محتاج و ضرورت مند لوگوں کے ساتھ ہمدردی خیر خواہی اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی برتاؤ کرنے کی مذمت کی گئی ہے اور اسے ایک مسلمان کی شان کے منافی بتایا گیا ہے۔ اہل علم سے مخفی نہیں کہ قرآن و حدیث کی ان نصوص کا حکم عام ہے، اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ جس کسی کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے گا وہ غیر اسلامی رویہ ہو گا۔ انسان کا مرتبہ و مقام تو جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے، بہت بلند ہے، پیغمبر اسلام نے تو جانوروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور کتے جیسے جانور کے ساتھ ہمدردی پر مغفرت اور اجر کی نوید سنائی ہے۔[1] بہر کیف جس انسان کے ساتھ بھی مسلم و غیر مسلم کی تمیز و تفریق کے بغیر غیر اخلاقی رویہ برتا جائے گا وہ اسلامی اخلاق کے منافی ہو گا۔ تفصیلات یہاں ممکن نہیں۔[2] تاہم یہاں ایک دو چیزوں کا ذکر بے جا اور فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔

علامہ مناویؒ نے حرف الہمزہ کے تحت مسند احمد، طبرانی کبیر اور شعب الایمان للبیہقی کے حوالے

1- دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم)، ۲/۸۸۸۔ نیز ابواب المظالم والقصاص، ۱/۳۳۳؛ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب قتل الحیات وغیرھا باب فضل سقی البہائم المحترمۃ واطعامھا، ۲/۲۳۷

2- ملاحظہ ہو: صحیح بخاری کی کتاب الادب، کتاب الاستیذان، صحیح مسلم کی کتاب الایمان اور کتاب البر والصلۃ، سنن ابی داؤد جلد دوم کی کتاب الادب اسی طرح جامع ترمذی کے ابواب البر والصلۃ کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں بیسیوں بلکہ سینکڑوں احادیث اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی موجود ہیں۔

سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ

اجیبوا الداعی ولا تردوا الهدیة ولا تضربوا المسلمین[1]

دعوت دینے والے (امیر ہو یا غریب) کی دعوت قبول کرو اور کسی کا ہدیہ (تھوڑا ہو یا زیادہ) واپس نہ لوٹایا کرو اور مسلمانوں کو زدوکوب نہ کیا کرو۔

اس حدیث کے آخری فقرہ میں، و لاتضربوا المسلمین، کی شرح میں علامہ مناویؒ فرماتے ہیں:

مسلمانوں کو مت مارو سوائے اس کے کہ ان پر کوئی حد لازم آجائے یا کسی غلطی پر تادیب کرنا پڑے بلکہ ان کے ساتھ زیادتی اور عملی طور پر لطف و محبت کا معاملہ کرو۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا زندگی بھر کا اسوہ تھا۔ آپ ﷺ نے کسی خادم یا غلام یا لونڈی کو اپنے ہاتھ سے کبھی نہ مارا۔ تقویٰ سے قریب تر رویہ یہ ہے کہ عفوودرگزر سے کام لیا جائے۔ مسلمان کو بلاوجہ مارنا حرام بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

والتعبیر بالمسلم غالبی فمن له ذمة او عهد معتبر یحرم ضربه تعدیا[2]

مسلمانوں کا ذکر غالب صورت حال (مسلمان معاشرہ) کے پیش نظر ہے ورنہ جس آدمی کا اسلامی ریاست نے ذمہ اٹھا رکھا ہے (ذمی ہے) یا جس آدمی کا ریاست کے ساتھ معتبر معاہدہ ہو، اسے بھی ناحق مارنا حرام ہے۔

اسی طرح مناوی نے سنن ابن ماجہ کے حوالے سے یہ روایت نقل ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا استشار احدکم اخاه فلیشر علیه[3]

جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے بھائی سے مشورہ طلب کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے

1۔ مناوی، محمد عبدالرؤف، فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء، ۱/ ۲۱۲، حدیث نمبر: ۱۹۴

2۔ حوالہ مذکور

3۔ حوالہ مذکور، ۱/ ۳۵۴، حدیث نمبر ۴۲۵

صحیح مشورہ دے۔

اس کی شرح میں علامہ مناویؒ فرماتے ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی سے کسی دینی معاملہ میں مشورہ طلب کرے تو جوبات اس کے حق میں بہتر ہو اسی کا مشورہ دے۔ بعد ازیں فرماتے ہیں:

ذکر الاخ غالبی فلو استشار ذمی کان کذالک[1]

بھائی کا ذکر غالب صورت حال کی بنا پر ہے، اگر کوئی ذمی آدمی مشورہ طلب کرے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

اسی طرح اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس ہر قسم کے مذہبی قومی اور لسانی تعصب (حق اور ناحق میں اپنی ہی قوم کی حمایت) کی نفی کی ہے۔ ایک تنبیہ آمیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

لیس منا من دعا الی عصبیة ولیس منا من قاتل عصبیة ولیس منا من مات علی عصبیة[2]

وہ شخص ہم (امت مسلمہ) میں سے نہیں جس نے عصبیت کی طرف بلایا اور اسی طرح وہ آدمی بھی ہم مسلمانوں میں سے نہیں جس نے عصبیت کی بنیاد پر جنگ کی اور (علیٰ ہذا القیاس) اس آدمی کا بھی ہم سے کوئی تعلق نہیں جو عصبیت پر مرا۔

تمام ادیان و مذاہب عالم میں اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ غیر متعصب دین ہے۔ مشہور اردو سیرت نگار قاضی سلیمان منصورپوری نے خصوصیات اسلام کی بحث میں اسلام کے غیر متعصب دین ہونے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ موصوف اس بحث کی ابتداء میں تعصب کے معنی اور اقسام کے بارے لکھتے ہیں:

"اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اغیار نے بہت سے جھوٹے الزام اس پر لگائے ہیں اور بعض الزام

---

[1] ۔ حوالہ مذکور

[2] ۔ ابو داؤد، السنن (کتاب الادب باب فی العصبیة)، مکتبہ حمانیہ، لاہور، ۲/۳۵۷، رقم: ۵۱۲۱

تو وہ ہیں جو الزام لگانے والوں ہی میں موجود اور ثابت تھے مگر انہوں نے ہوشیاری اور عیاری یہ کی کہ اپنے کرتوت چھپانے کے لیے انہی باتوں کو مسلمانوں کے سر تھوپ دیا اور پھر نااہل مسلمانوں کے افعال کو تعلیم اسلام کا نتیجہ قرار دے کر مذہب اسلام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

الف۔ تعصب کے معنی یہ بھی ہیں کہ عطاء حقوق کے وقت کسی کو حق سے زاید دیا جائے اور کسی کو حق سے کم۔

ب۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی آزادی عقل اور حریت مذہبی پر ناجائز بندشوں کا بار ڈالا جائے۔

ج۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی حمایت میں دیگر مذاہب کو حق حفاظت سے محروم کر دیا جائے۔

د۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی برکات وانوار کے مستحق خود اپنے ہی آپ کو سمجھا جائے اور دوسروں کو ان انوار وبرکات سے بالکل دور رکھا جائے۔

بحمد اللہ کہ اسلام کی تعلیم ان جملہ نقائص سے پاک ہے۔ قرآن عظیم اور رسول کریم ﷺ نے ہمیشہ تعصب کی ان جملہ اقسام کو برا بتایا اور اپنے دامن تعلیم کو اس خارزار سے ہمیشہ بلند تر رکھا۔[1]

زیر بحث معاملے میں خود پیغمبر اسلام ﷺ کا طرز عمل کیا تھا؟ تو اس سلسلے میں سیرت نبوی ﷺ اور احادیث رسول ﷺ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ دنیا کے دیگر مصلحین اور بانیان مذاہب کے برعکس پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ آپ نے جس چیز کے بھی کرنے کا حکم دیا پہلے خود دوسروں سے کہیں زیادہ اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ کا یہی معمول اور طرز عمل ہمیں انسانیت کے ساتھ برتاؤ کے معاملہ میں بھی نظر آتا ہے۔ بغیر کسی مذہبی، لسانی، نسلی، علاقائی تمیز کے سب لوگوں کے ساتھ آنجناب ﷺ کے ہمدردانہ برتاؤ پر سب سے بڑی مستند اور چشم

---

[1] ۔رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ت۔ن، ۳/ ۴۲۹

دید گواہی آپ ﷺ کی اہلیہ محترم ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کی ہے۔ چنانچہ پہلی وحی کے نازل ہونے پر جب آپ ﷺ نے اپنی جان پر خشیت محسوس کی اور گھبرائے ہوئے گھر تشریف لائے تو آں محترمہ نے یوں تسلی دی:

کلا واللہ ما یخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف و تعین علی نوائب الحق[1]

ہرگز نہیں، قسم بخدا! اللہ کریم آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں فرمائے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں، بے آسرا لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیر لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کی وجہ سے پہنچنے والے مصائب میں اہل حق کی اعانت کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے پانچ باتیں گنوائیں جو کمال اسلام کا تقاضا ہیں جن میں ایک یہ تھی کہ

احب للناس ما تحب لنفسک تکن مسلما۔[2]

تم لوگوں کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تب صحیح معنوں میں مسلمان ہو گے۔

جبکہ ایک دوسری روایت میں اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لا یومن احد کم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحبہ الا للہ

---

[1] ۔بخاری، الجامع الصحیح، (باب کیف کان بدء الوحی) ۱/۳، رقم:۳

[2] ۔ترمذی، جامع الترمذی (ابواب الزہد)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/۵۰۵، رقم:۲۳۰۵

عزوجل[1]

تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمام لوگوں کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے اور جب تک کہ وہ آدمی سے رضائے الٰہی کیلئے محبت نہ کرے۔

یہاں بھی الناس کے لفظ میں کوئی تخصیص نہیں۔ تمام انسانوں کی خیر خواہی کا حکم ہے۔

---

[1] - احمد بن حنبل، مسند، ۳/ ۲۷۲ : مسندات انس بن مالک، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، ۲۱/ ۳۵۳، رقم: ۱۳۸۷۵

دوسری فصل:

غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا حکم

اسلام تمام غیر مسلموں کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کا قائل نہیں۔ یہ بات تمام امور و معاملات میں اسلام کی عادلانہ و متوازن پالیسی، اصول عدل اور انصاف کے خلاف ہے کہ غیر مسلموں میں مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ اور تعلقات کے حوالے سے محارب و غیر محارب، معاند و غیر معاند، متعصب و غیر متعصب، بد خواہ و خیر خواہ، جانبدار اور غیر جانبدار، قصور وار اور بے قصور و بے گناہ میں کوئی فرق، امتیاز روا نہ رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۃ الممتحنہ (سورہ ۶۰، پارہ ۲۸) کی ابتدائی چھ آیات میں اہل ایمان کو اللہ و رسول ﷺ کے ساتھ، دین حق کے ساتھ اور خود اہل ایمان کے ساتھ دلی بغض و عداوت اور بیر رکھنے والے اور پیغمبر اسلام ﷺ اور اہل اسلام کو مکہ مکرمہ اور ان کے گھروں سے زبردستی نکالنے والے مشرکین مکہ کے ساتھ محبت و مودت کا رویہ رکھنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ تمام غیر مسلموں کا یہی حکم ہے، اس لیے اس کے بعد قرآن مجید نے یہ تفصیل اور وضاحت ضروری سمجھی کہ

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [1]

اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جنہوں نے نہ تو دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی اور نہ ہی انہوں نے

---

1 سورۃ الممتحنہ، ۶۰: ۸-۹

تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ بلاشبہ اللہ پسند فرماتا ہے انصاف کرنے والوں کو۔
بیشک اللہ تو تمہیں تو روکتا ہے ان لوگوں (کی دوستی) سے جنہوں نے تم سے جنگ کی
دین کے معاملے میں اور انہوں نے تمہیں نکال باہر کیا تمہارے اپنے گھروں سے اور
انہوں نے تمہارے اخراج کے بارے میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو
کوئی ان سے دوستی کرے گا تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔

چنانچہ اردو مفسر مولانا سید مودودیؒ سورۃ الممتحنہ کی ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

سابقہ آیات میں کفار سے جس ترک تعلق کی ہدایت کی گئی تھی اس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ یہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے، اس لیے ان آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ اس کی اصل وجہ ان کا کفر نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ روش ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے اور ان کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی ان کے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور ان کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا (اس کے بعد سید مودودیؒ نے حضرت اسماءؓ کا وہ واقعہ درج کیا ہے جس کی تفصیل زیر نظر فصل اور باب میں آگے آ رہی ہے۔)[1]

پیغمبر اسلام ﷺ نے تو مسلمانوں سے نبرد آزما کفار/اھل الحرب کے ساتھ بھی احسان کا برتاؤ فرمایا ہے۔[2] کیا یہ اھل الحرب کے ساتھ احسان نہیں کہ جنگجو افراد کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں سے

---

[1] - تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۳ء، ۵/۴۳۳

[2] - چنانچہ اہل مکہ بوجہ شدید قحط میں مبتلا ہوئے تو نبی رحمت ﷺ نے ایک تو ثمامہ بن اثال کو حکم دے کر یمامہ کی طرف سے غلہ کی بند شدہ ترسیل جاری کرائی، دوسرے خود بھی قائد مکہ ابو سفیان کے پاس پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم بھجوائی۔ دیکھیے: ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح البخاری، شیش محل روڈ لاہور، ۱۹۸۱ء، ۸/۶۸؛ سرخسی، المبسوط، مطبعۃ

تعارض نہ کیا جائے؟ کیا یہ احسان نہیں کہ دشمن قوم کے بزرگوں، بچوں اور عبادت گزاروں کو نشانہ نہ بنایا جائے؟ اور کیا یہ احسان کے زمرے میں نہیں آتا کہ دشمن کی سرزمین پر موجود حیوانات، درختوں، باغات اور فصلوں کو بلا ضرورت نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اور کیا یہ نیکی نہیں کہ انہیں بالکل خالی ہاتھ نہ کر دیا جائے کہ قوت لا یموت سے بھی محروم ہو جائیں۔[1]

نیکی اور احسان کا مذکورہ بالا حکم قرآنی ان غیر معاند اور بے قصور غیر مسلموں سے متعلق ہے جو اسلامی ریاست کے شہری نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن غیر مسلموں نے جنگ اور عداوت و مخالفت چھوڑ کر بطور ذمی اسلامی ریاست کا شہری بننا قبول کر لیا ہے، شرعی اعتبار سے ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کتنا ضروری ہو گا۔

قطع تعلقی والی آیات قرآنی کا صحیح محمل

قرآن مجید میں سورۃ الممتحنہ کی ابتدائی آیات کے علاوہ متعدد ایسی آیات کریمہ ہیں جن سے بعض ظاہر بین لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے تمام غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور قطع تعلقی بلکہ بد سلوکی اور تعصب پر مبنی رویہ اختیار کرنا شریعت اسلامیہ کا تقاضا ہے۔ مثلاً

۱۔ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَاۤءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ

السعادۃ، مصر، ۱۳۲۴ھ، ۱۰/۹۱-۹۲؛ السرخسی، شرح السیر الکبیر (باب صلۃ المشرک)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱/۷۰؛ ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ص: ۱۹۹

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۱/۴۰-۴۴؛ ابو عبید، کتاب الاموال، پیرہ نمبر ۶۰-۹۵، ص: ۳۴، ۵۵، ۵۶؛ سرخسی، المبسوط، دار المعرفۃ بیروت، ۱۰/۴-۶؛ ابن حزم، المحلی، دار الجیل بیروت، (۰ مسئلہ، ۹۲۵ - ۹۲۶)، ۷/۲۹۴-۲۹۶؛ سحنون، المدونۃ الکبریٰ (کتاب الجہاد)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص: ۴۹۹-۵۰۰؛ ابن خلدون، تاریخ، ۲/۴۶۹؛ سید مودودی، الجہاد فی الاسلام، ص: ۲۲۲

شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً ۔

۲۔ سورۃ النساء کی آیات نمبر ۱۴۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا

۳۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۵۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

۴۔ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۲۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

۵۔ سورۃ المجادلہ کی آیت نمبر ۲۲

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ

درج بالا قسم کی آیات قرآنی کی وضاحت اور ان کا صحیح محمل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی مذکورہ آیات کا بنظر غائر جائزہ لیتا اور ان کے نزول کی تاریخ، ان کے اسباب اور ان میں پوشیدہ معانی کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے سامنے درج ذیل امور کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً: بے شک غیر مسلموں (مخالفین) سے ایک علیحدہ دین، عقائد، افکار اور شعائر کی حامل جماعت کے طور پر دوستی کرنے سے روکا گیا ہے۔ یعنی یہودی، عیسائی، مجوسی وغیرہ کی حیثیت سے نہ کہ پڑوسیوں یا ساتھیوں یا ہم وطنوں کی حیثیت سے۔ چونکہ ایک مسلمان کا دلی تعلق صرف امت مسلمہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اسی لیے ان لوگوں کو دوست بنانے کی ممانعت کئی آیات میں "من دون المومنین" کے الفاظ کے ساتھ آئی

ہے۔ یعنی کوئی آدمی (مسلمان) اپنی جماعت (امت مسلمہ) کے مقابلے میں ان سے محبت رکھے اور نہ ان کا قرب حاصل کرے۔ بے شک کوئی نظام زندگی دینی ہو یا وضعی، اپنے کسی پیروکار کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنے گروہ کو چھوڑ کر کسی اور جماعت سے تعلقات استوار کرے۔ بالفاظ دیگر اس کام کا ارتکاب کرے جسے وطنیت کی اصطلاح میں خیانت (غداری) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ثانیاً: جس مودت (دوستی) سے ان آیات میں روکا گیا ہے وہ ہر اس شخص کی دوستی نہیں جو کسی دوسرے مذہب کا پیروکار ہو اگرچہ وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح پر اور ان کے ذمہ میں ہی ہو۔ بلکہ صرف اس شخص کی دوستی سے ممانعت ہے جو مسلمانوں کو ایذاء پہنچائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی رکھے۔[1]

اس کے بعد علامہ قرضاوی نے اپنی اس رائے پر قرآن مجید کی چند آیات بطور دلیل پیش کی ہیں۔ جن کی تفصیل بلاضرورت طوالت کا باعث ہو گی۔ الغرض یہود و نصاریٰ سمیت تمام غیر مسلمین جو اہل اسلام کے ساتھ معاندانہ رویہ نہیں رکھتے، اسلام دشمن کارروائیوں میں ملوث نہیں ہوتے اور کسی بھی حوالے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے جرم میں شریک نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور انصاف کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ **(ان تبروھم وتقسطوا الیھم)**

غیر مسلموں کے ساتھ بلکہ اپنے پرائے اور دوست دشمن کی تمیز کے بغیر ہر انسان کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ پیش آنے کے مستقل اسلامی اصول کی بقدر ضرورت تشریح و توضیح پیچھے گزر چکی ہے۔ یہاں ہم غیر مسلموں کے ساتھ نیکی کے حکم قرآنی "ان تبروھم" کی قدرے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ غیر معاند، غیر متعصب اور غیر جانبدار کے ساتھ قرآن کا یہ حکم "ان تبروھم" کہ ان کے ساتھ نیکی کرو، قرآن کے سیاق و سباق میں ان غیر

---

[1] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، مکتبہ وھبہ، القاہرہ، مصر، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء (الطبعۃ الثالثۃ)، ص ۴۳-۴۴

مسلموں کے لیے ہے جو اسلامی ریاست کے شہری نہیں تو جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے باقاعدہ اور قانونی طور پر شہری "اھل الذمہ" ہوں۔ انہوں نے اسلامی ریاست کی ماتحتی میں رہنا اور اطاعت قبول کر لی ہو تو ان کے ساتھ نیکی کرنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہو گا۔

ان تبروھم کی وسعت معنی پر ایک نظر

بہر کیف غیر متعصب، غیر معاند اور امن پسند غیر مسلموں کے لیے قرآنی حکم " ان تبروھم" ان کے ساتھ نیکی و احسان کا معاملہ کرو، میں لفظ" بر " قابل توجہ اور مزید تشریح و توضیح کا متقاضی ہے۔ مختلف قرآنی آیات اور احادیث نبوی میں اس لفظ"بر "کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دائرے میں غیر معمولی وسعت پائی جاتی اور اس کے اندر بہت سی نیکیاں آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۷۷ میں ایمان، عقائد، عبادات اور مصائب و جنگ میں صبر سے کام لینے کے علاوہ قریبی رشتہ داروں اور یتیموں مسکینوں وغیرہ ضرورت مندوں پر خرچ کرنے اور ایفائے عہد اور معاہدے کی پابندی کو بھی " بر "کے تقاضوں میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ [1]

> نیکی یہی نہیں کہ تم لوگ (نماز میں) اپنے چہرے پھیر لو مشرق یا مغرب کی طرف اور بس، بلکہ نیکی تو دراصل یہ ہے کہ آدمی سچے دل سے ایمان لے آئے اللہ پر قیامت کے دن پر فرشتوں پر اللہ کی نازل کردہ کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر اور وہ اپنا مال خرچ

[1] ۔البقرۃ، ۲:۱۷۷

کرے اس کی محبت پر رشتہ داروں یتیموں مسکینوں مسافروں اور سوال کرنے والوں کی حاجتوں اور ضرورتوں میں اور گردنوں کے چھڑانے میں اور وہ نماز قائم کرے پابندی کے ساتھ اور زکوٰۃ ادا کرے صحیح طریقے سے اور جو پورا کرتے ہیں اپنے باندھے ہوئے عہد کو جب وہ کوئی عہد کرلیں اور خاص گروہ لوگ جو صبر وبرداشت سے کام لیں سختی اور تکلیف میں اور حالت جنگ میں یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اپنے قول و فعل میں اور یہی ہیں متقی وپرہیز گار۔

اس آیت کی پوری تفسیر و تشریح یہاں مقصود نہیں صرف ،بر، کے مفہوم میں وسعت معنی کو واضح کرنا مطلوب ہے، اردو مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے لفظ بر کی وضاحت میں لکھا ہے:

"بر کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو یا اللہ کے دوسرے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفاء بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف وولاء، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہے جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔۔۔۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق وواجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں، سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کیلئے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ ہم نے جو لفظ (خدا کے ساتھ وفاداری۔ منہ) اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔"[1]

احادیث نبوی میں لفظ" بر "کے استعمال سے اس کی مزید وسعت سامنے آتی ہے۔ جس کے مطابق نیکی اور بھلائی کا ہر کام "بر" میں داخل ہے۔ چنانچہ صحابی رسول حضرت نواس بن سمعانؓ فرماتے ہیں:

---

[1] -تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۵ء، ۱/ ۴۲۱-۴۲۲

سالت رسول اللہ ﷺ عن البر والاثم فقال: البر حسن الخلق، والاثم ماحاک فی صدرک وکرھت ان یطلع علیہ الناس[1]

میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا (کہ یہ دونوں کیا ہیں؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا: نیکی حسن خلق (اچھے اخلاق) کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور لوگوں کے اس پر مطلع ہونے کو تم ناپسند کرو۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بر کا معنی حسن الخلق بتایا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ "حسن خلق" کیا چیز ہے؟ تو امام ترمذی نے مشہور تابعی اور فقیہہ حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ کے حوالے سے حسن الخلق کی یہ تشریح بیان کی ہے:

- ھو بسط الوجہ وبذل المعروف وکف الاذی[2]

یہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے، ان کے ساتھ بھلائی کرنے اور انہیں ہر قسم کی ایذاء رسانی سے رک جانے کا نام ہے۔

اسی طرح ایک حدیث کے مطابق کسی آدمی سے خندہ روئی سے ملنا، اسے نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، راستہ بھولنے والے کو صحیح راستہ بتانا، نابینا آدمی کی رہنمائی کرنا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا اور کسی آدمی کو اپنے ڈول میں سے پانی دینا وغیرہ سب چیزیں نیکی (معروف) میں داخل ہیں۔[3]

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سورۃ الممتحنہ کی درج بالا آیت نمبر ۸ میں غیر معاند، غیر متعصب، بے قصور اور بے گناہ غیر مسلموں کے ساتھ " ان تبروھم " (کہ ان کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرو) کی جو

---

[1] - مسلم، الجامع الصحیح (کتاب البر والصلۃ والآداب باب تفسیر البر والاثم) ۲/۳۱۴، رقم: ۶۵۱۶- ۶۵۱۷؛ ترمذی، جامع (ابواب الزھد عن رسول اللہ ﷺ باب ماجاء فی البر والاثم)، ۲/۵۱۵، رقم: ۲۳۸۹

[2] -ترمذی، جامع (ابواب البر والصلۃ عن رسول اللہ ﷺ باب ماجاء فی حسن الخلق، ۲/۳۶۴، رقم: ۲۰۰۵

[3] -حوالہ سابق (باب ماجاء فی صنائع المعروف)، ۲/۳۵۹، رقم: ۱۹۵۶

بات کہی گئی ہے، اس کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور کس طرح اخلاق حسنہ اور حسن معاملت کی تمام دفعات اس کے اندر شامل ہیں۔ فقہاء اسلام نے اس آیت کریمہ اسے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مسلمان آدمی کو جس طرح کسی مسلمان کے حق میں وصیت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح وہ ذمی کافر کے حق میں بھی وصیت کر سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

ویجوز ان یوصی المسلم للکافر والکافر للمسلم فالاول لقوله تعالیٰ: لا ینھٰکُمُ الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین الخ[1]

اور مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ "ذمی" کافر کے حق میں وصیت کرے اور کافر مسلمان کے لیے۔ مسلمان کی وصیت کافر کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بنیاد پر کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو۔ اور کافر کی وصیت مسلمان کے لیے اس لیے جائز ہے کہ وہ عقد ذمہ کے بعد معاملات میں مسلمانوں کے برابر ہوگئے ہیں۔ لہذا جانبین سے جس طرح زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی جائز ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی جائز ہوگی۔

اسی طرح اس آیت کریمہ کے حوالے سے ایک مسلمان کیلئے کسی ذمی وغیر مسلم شہری کیلئے اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد وقف کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی دوسری معروف کتاب، الجوہرۃ النیرہ، میں ہے:

وان وقف علی ذمی جاز لانه موضع القربة ولهذا یجوز التصدق علیه قال الله تعالیٰ: لا

---

[1] - مرغینانی، ہدایہ، (کتاب الوصایا)، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء، عکس مطبع مصطفائی دہلی، ۱۳۰۲ھ، ۶۴۱/۴

ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم [1]

اگر کوئی مسلمان کسی ذمی (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) پر وقف کرے تو یہ جائز ہو گا، اس لیے کہ وہ اطاعت و بندگی کا محل ہے۔ اسی لیے اس پر صدقہ خیرات کرنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرو۔

علی ھذا القیاس غیر مسلم والدین اور دوسرے عزیز و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی بھی " ان تبروھم" (کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو) کی قرآنی اجازت یا حکم میں داخل ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں فقیہہ مفسر قرطبی لکھتے ہیں:

ھذہ الآیۃ رخصۃ من اللہ تعالیٰ فی صلۃ الذین لم یعادوا المؤمنین ولم یقاتلوھم [2]

یہ آیت اللہ کی طرف سے ان لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے میں رخصت ہے جو مومنوں سے عداوت نہیں رکھتے اور جنہوں نے ان (اہل ایمان) سے جنگ نہیں کی۔

عصر حاضر کے معروف مفسر و محدث مولانا ادریس کاندھلویؒ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبالجملۃ فی الآیۃ دلیل علی جواز البر والاحسان الی الکافر اذالم یکن محاربا لکن یشترط ان لا یقصد تعظیمہ واکرامہ۔ [3]

المختصر آیت میں کافر پر نیکی اور احسان کرنے کے جواز کی دلیل ہے جبکہ وہ محارب نہ

---

1 - ابو بکر بن علی بن محمد، الجوہرۃ النیرہ، علی حامش القدوری کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، عکس مجتبائی، دہلی، ۱۳۲۳ھ، ص ۱۳۹

2 - الجامع لاحکام القرآن، ۱۸/ ۴۰

3 - احکام القرآن، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۵/ ۴۵

ہو۔ تاہم یہ شرط ہے کہ یہ احسان اور نیکی اس کی تعظیم واکرام کی نیت سے نہ ہو۔

جبکہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا باس بان یصل الرجل المسلم المشرک قریبا کان او بعیدا محاربا کان او ذمیا واراد با لمحارب المستامن[1]

اس بات میں شرعاً کوئی حرج نہیں کہ مسلمان آدمی کسی مشرک سے صلہ رحمی کرے وہ خواہ قریبی رشتہ دار ہو یا دور کا۔ محارب ہو یا ذمی اور محارب سے مراد مستامن ہے۔

اسی طرح الکیا الہراسی نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

فیه دلیل علی جواز التصدق علیٰ اهل الذمة دون اهل الحرب ووجوب النفقة للاب الکافر الذمی واما الحربی فیجب قتله[2]

اس آیت میں اہل الذمہ نہ کہ اہل حرب، پر صدقہ کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔ اسی طرح کافر ذمی باپ کے لیے نفقہ کے واجب ہونے کی دلیل ہے البتہ والد اگر حربی ہو تو اس کا قتل واجب ہے۔

علاوہ ازیں متعدد مفسرین امام جصاص، ابن العربی، ابن کثیر اور قرطبیؒ وغیرہ نے درج بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں مختلف الفاظ میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کا یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ان کی مشرک ماں قتیلہ ایک مرتبہ ان سے ملنے کیلئے آئیں تو انہوں نے اپنی مشرک ماں کے ساتھ صلہ رحمی کے بابت نبی رحمت ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے کسی تحفظ کے بغیر انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی۔ علامہ جصاص لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ فتاویٰ عالمگیری، ۵/ ۳۴۷

[2] ۔ الکیا الہراسی، عمادالدین بن محمد الطبری (م ۵۰۴ھ) احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء، ۴/ ۴۰۹

عن عائشة ان اسماء سالت النبی ﷺ عن ام لها مشرکة جاءتنی اصلها قال نعم صلیها[1]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ان کی بہن اسماء نے نبی ﷺ سے اپنی مشرک ماں کی بابت پوچھا کہ وہ میرے پاس آئی ہیں کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔

علامہ موصوف زیر نظر آیت کریمہ کے ٹکڑے "ان تبروھم وتقسطوا الیھم" سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عموم فی جواز دفع الصدقات الیٰ اھل الذمة اذ لیس ھم من اھل قتالنا۔[2]

ان الفاظ کے عموم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اھل ذمہ کو صدقہ اور خیرات دی جاسکتی ہے اس لیے کہ وہ ہم (مسلمانوں) سے لڑنے والے نہیں ہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت اسماءؓ کا یہ واقعہ سورۃ الممتحنہ کی اسی آیت کریمہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس پر انہوں نے جو باب باندھا ہے وہ بھی اسی مضمون کا ہے۔ یعنی "باب صلة الوالد المشرک" مشرک والد یا والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کا باب۔[3]

فتاوی عالمگیری میں مزید وضاحت ہے:

اذا کان لرجل اولامراۃ والدان کافران علیه نفقتهما وبرهما وخدمتهما وزیارتهما[4]

جب کسی مرد یا عورت کے ماں باپ کافر ہوں تو بھی اس پر ان دونوں کا نان ونفقہ، ان کے ساتھ نیکی، ان کی خدمت اور انکی زیارت لازم ہے

---

[1] - جصاص، احکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء، ۵/ ۳۲۷

[2] - حوالہ مذکور

[3] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب الادب، باب صلة الوالد المشرک)، ۲/ ۸۸۴، رقم: ۵۹۷۸

[4] - فتاوی عالمگیری، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۵/ ۳۴۸

سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۷۲: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ــــــ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

کے شان نزول میں مفسرین نے بیان کیا ہے کہ انصار کے کئی رشتہ دار اسلام نہیں لائے تھے اور انصار انکی مالی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن اس خیال سے نہ کرتے کہ وہ مسلمان نہیں اور خود حضور ﷺ نے بھی مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مسلمان فقراء کو ہی اپنے صدقات دیا کریں۔ اس آیت کریمہ سے حکم ملا کہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں بھوکا مرتے دیکھتے رہنا آپ کی رحمت کی خلاف ہے۔ چنانچہ اس کے بعد مسلمان غیر مسلموں کو بھی صدقات نافلہ دینے لگے۔[1]

مفسر ابن کثیر نے ایک روایت نقل کی ہے کہ

فامر رسول اللہ ﷺ بالصدقة بعدها على كل من سألک من كل دين[2]

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ کسی بھی دین کے ماننے والے تم سے سوال کریں تو ان پر صدقہ کرو۔

اسی طرح علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

هذا الكلام متصل بذكر الصدقات فكأنه بين فيه جواز الصدقة على المشركين[3]

یہ کلام (آیت) صدقات کے ذکر سے متصل ہے۔ گویا اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین پر صدقہ (نفلی) کرنا جائز ہے۔

اہل الذمہ کے ساتھ "بر" کے مذکورہ قرآنی حکم میں ان کا احترام بھی داخل ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی نے قاضی عیاض کی ترتیب المدارک کے حوالے سے لکھا ہے:

---

[1] ۔ دیکھیے: ابو عبید، کتاب الاموال، ص: ۲۴۴، بیروت نمبر ۱۹۹۲

[2] ۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱/۵۰۷

[3] ۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء، ۳/۳۲۷

قاضی اسماعیل بن اسحاق (م ۲۸۲ھ قاضی بغداد) کے پاس عیسائی وزیر عبدون بن صاعد آیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور جب اس بارے میں حاضرین کو متعجب پایا تو وزیر کے جانے کے بعد ان سے مخاطب ہو کر کہا: تمہیں تعجب کیوں ہوا؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لا ینھکم اللہ۔۔۔۔۔۔۔ تقسطوا الیھم۔ اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، جبکہ یہ شخص مسلمانوں کی حاجت روائی کرتا اور ہمارے اور معتضد عباسی خلیفہ کے درمیان سفیر کے فرائض سر انجام دیتا ہے اور یہ ایک نیکی ہے۔[1]

بے قصور غیر مسلموں کے ساتھ قرآن کے زیر بحث حکم" ان تبر و ھم"میں لفظ بر، کے اندر نیکی کی کتنی شکلیں داخل ہیں، اس کا اندازہ فقیہہ اور ماہر اصول فقہ علامہ شہاب الدین قرافیؒ کی درجہ ذیل وضاحت سے ہو جاتا ہے جو انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور ان کے ساتھ باطنی محبت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے کی ہے، آپ فرماتے ہیں:

واما ما امر به من برهم من غير مودة باطنية فالرفق بضعيفهم وسد خلة فقير هم

---

[1] - غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۵۲:

نوٹ: مشہور مستشرق A.S. Tritton نے بھی مسلمان خلفاء کی طرف سے غیر مسلموں کو سرکاری ملازمتیں دیے جانے کے باب میں قاضی اسماعیل کے اس واقعہ کو نقل کیا ہے: ٹرٹن کے مطابق قاضی صاحب نے ایک عیسائی وزیر کے احترام پر حاضرین کی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے سورۃ الممتحنہ کی آیت نمبر ۸ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ: This man manages the business of Muslims , he is the ambassador between us and the caliph. What I did was right. (یہ آدمی مسلمانوں کے معاملات کا انتظام کرتا اور ہمارے اور خلیفہ کے درمیان سفیر ہے۔ اس لیے میں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک تھا)۔ دیکھیے:

A.S. Tritton, The Caliphs and their Non-Muslim Sujbect, Oxford University Press, London, Bombay Calcutta, 1930, P: 24

واطعام جائعهم واكساء عاريتهم ولين القول لهم على سبيل اللطف لهم والرحمة لا على سبيل الخوف والذلة واحتمال اذايتهم فى الجوار مع القدرة على ازالته لطفا منا بهم لا خوفاً و تعظيماً والدعاء لهم بالهداية وان يجعلوا من اهل السعادة ونصيحتهم فى جميع امورهم فى دينهم ودنياهم وحفظ غيبتهم اذا تعرض احد لاذيتهم وصون اموالهم وعيالهم واعراضهم وجميع حقوقهم ومصالحهم وان يعاونوا على دفع الظلم عنهم وايصالهم لجميع حقوقهم وكل خير يحسن من الاعلىٰ مع الاسفل ان يفعله [1]

جہاں تک ان غیر مسلموں کے ساتھ نیکی کا معاملہ ہے جس کا ان کی ساتھ باطنی مودت کے بغیر حکم دیا گیا ہے، تو وہ یہ: انکے کمزور آدمی کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا، ان کے فقیر کی ضرورت کو پورا کرنا، انکے بھوکے کو کھانا کھلانا، ان کے ننگے کو کپڑا پہنانا، ان کے ساتھ گفتگو اور بات چیت میں نرمی کرنا، ان کے ساتھ مہربانی اور رحمت کی بنیاد پر نہ کہ ان سے خوف اور ذلت کی بنا پر، پڑوس میں انکی طرف سے ایذاء رسانی کو اس کے ازالہ کی قدرت کے باوجود ان کے ساتھ محض نرمی کرتے ہوئے نہ کہ خوف و تعظیم کے باعث، برداشت کرنا۔ ان کے لیے ہدایت اور اہل سعادت میں سے بننے کی دعاء کرنا، دین دنیا کے تمام امور میں انکی خیر خواہی کرنا، اگر کوئی آدمی انکی ایذا رسانی کے درپے ہو تو انکی عدم موجودگی میں حفاظت کا انتظام کرنا، ان کے اموال بال بچوں عزتوں اور ان کے تمام حقوق اور مصالح کی حفاظت کرنا، ان سے دفع ظلم میں ان کی اعانت کرنا اور انہیں ان کے تمام حقوق دلوانا اور ہر وہ چیز ہے جو کسی بلند مرتبہ کی طرف سے کم تر درجہ کے آدمی کے ساتھ کی جاتی ہے۔

سورۃ النساء کی آیت ۳۶ میں مختلف قسم کے پڑوسیوں (والجار ذی القربی

---

[1] الفروق (الفرق التاسع عشر والمائۃ)، ۳۰/۳۱

والجار الجنب والصاحب بالجنب) کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اس میں ایک قسم "الجار الجنب" بھی ہے۔ بعض علماء نے اس سے غیر مسلم پڑوسی لیا ہے چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

فالوصاۃ بالجار مامور بها مندوب الیها مسلماً کان او کافرا[1]

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم مندوب و مستحب ہے چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر۔

اسی طرح علامہ موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں:

قال العلماء الاحادیث فی اکرام الجار جاءت مطلقة غیر مقیدة حتی الکافر[2]

علماء کا کہنا ہے کہ پڑوسی کے اکرام میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ سب مطلق ہیں۔

ان میں کوئی قید نہیں حتی کہ کافر کی بھی قید نہیں۔

مذکورہ آیت میں ایک پڑوسی " الصاحب بالجنب "پہلو کا پڑوسی، کا بھی ذکر ہے۔ اس سے مراد ہمنشین ہے اور ایسا شخص بھی ہے جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے جیسے بازار جاتے ہوئے، بس پر سفر کرتے ہوئے یا کسی اور طرح ایک دوسرے کی صحبت (مل بیٹھنا) ہو وہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ نیک برتاؤ کیا جائے۔ ان الفاظ میں بھی مسلم و غیر مسلم کی کوئی قید نہیں۔ ایسے ہی پڑوسی کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں، سب میں مسلمان کے ساتھ غیر مسلم بھی شامل ہیں۔

---

[1] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۵/۱۸۵

[2] - حوالہ مذکور، ۵/۱۸۸

تیسری فصل:

باہمی میل جول اور سلام ودعا کا حق

مدنی الطبع ہونے کے ناطے سے جیسا کہ اوپر گزرا، لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا، ملاقات کرنا، مل بیٹھنا اور یوں اپنے جبلی وطبعی تقاضوں کی تکمیل کرنا انسان کا ایک سماجی ومعاشرتی حق ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں مقیم اہل الذمہ / غیر مسلموں کو یہ حق بدرجہ اولیٰ حاصل ہو گا۔ کیونکہ ایک اسلامی معاشرہ کثیر العناصر معاشرہ ہوتا ہے۔ اس میں مختلف طبقات ومذاہب کے حامل افراد اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھتے ہوئے زندگی گزار سکتے ہیں۔ بایں وجہ اسلامی معاشرہ کسی دور میں غیر مسلموں سے خالی نہیں رہا، اس لیے کہ اسلام میں عقیدہ ومذہب کے معاملے میں کسی قسم کا جبر واکراہ جائز نہیں۔ جس کی تفصیل آگے اپنے مقام پر آجائے گی۔ علامہ شامی نے حاشیہ ردالمحتار (فتاویٰ شامی) میں "مطلب فی سکنی اهل الذمة مع المسلمین فی المصر" کا عنوان قائم کرتے ہوئے علامہ سرخسی کے حوالے سے لکھا ہے:

قال السرخسی فی شرح السیر فان مصر الامام فی اراضیهم للمسلمین کما مصر عمر رضی الله عنه البصرة والکوفة فاشتری بها اهل الذمة دوراً وسکنوا مع المسلمین، لم یمنعوا من ذالک فانا قبلنا منهم عقد الذمة لیقفوا علی محاسن الدین فعسیٰ ان یؤمنوا واختلاطهم بالمسلمین والسکنی معهم یحقق هذا المعنی[1]

امام سرخسی نے شرح السیر میں کہا ہے کہ امام / خلیفۃ المسلمین اھل الذمہ کی اراضی / علاقہ میں مسلمانوں کے لیے کوئی شہر آباد کرے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ اور کوفہ کے شہر آباد کیے۔ پھر اھل الذمہ اسی شہر میں گھر خرید لیں اور مسلمانوں کے ساتھ مل

---

[1] ۔حاشیہ ردالمحتار علی الدر المختار، ۴/۲۰۹؛ سرخسی، شرح السیر الکبیر، دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد، ۳/۲۵۴

کر رہائش اختیار کرنا چاہیں تو انہیں روکا نہیں جائے گا، کیونکہ ہم نے ان سے عقد ذمہ اس لیے قبول کیا ہے کہ وہ دین اسلام کے محاسن سے آگاہ ہوں گے تو شاید ایمان لے آئیں اور ان کا مسلمانوں کے ساتھ ملنا جلنا اور انکے ساتھ رہائش رکھنا اس مقصد کو بہتر انداز میں پورا کرتا ہے۔

مدینہ منورہ کے یہودی اھل الذمہ مجلس نبوی میں بیٹھا کرتے تھے اور آنجناب ﷺ انہیں منع نہیں فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی چشم دید گواہی ہے کہ

كانت اليهود تعاطس عند النبي ﷺ رجاء ان يقول لها يرحمكم الله فكان يقول يهديكم الله ويصلح بالكم[1]

یہودی لوگ نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے اس امید پر عمداً چھینک لیا کرتے تھے کہ آپ ﷺ اس کے جواب میں حسب قاعدہ انہیں "یرحمکم الله" الله تمہارے اوپر رحم فرمائے، کے الفاظ سے دعا دیں مگر آپ ﷺ جواب میں فرماتے "یهدیکم الله ویصلح بالکم" اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے باطن کی اصلاح فرمائے۔

عہد نبوی میں مدینہ منورہ میں زیادہ تر یہودی اھل الذمہ ہی مقیم تھے۔ وہ مسلمانوں کی مجالس میں کھلے عام بیٹھتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کی عینی شہادت ہے کہ

ان النبي صلى الله عليه وسلم مر بمجلس فيه اخلاط من المسلمين واليهود فسلم عليهم[2]

---

[1] - ابو داؤد، السنن، کتاب الادب، باب کیف یشمت الذمی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/ ۳۴۵، رقم: ۵۰۳۸

[2] - بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب الاستیذان، باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین)، ۲/ ۹۲۴، رقم: ۶۲۵۴؛ ترمذی، الجامع (ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی السلام علی المجلس فیہ المسلمون وغیرھم)، ۲/ ۵۵۸، رقم: ۲۷۰۲

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان اور یہود مل جل کر بیٹھے ہوئے تھے تو آنجناب ﷺ نے تمام اہل مجلس کو سلام فرمایا۔

اسی طرح مشہور تابعی حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ صحابی رسول ﷺ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کے پڑوس میں ایک یہودی رہائش پذیر تھا۔ ایک دفعہ آپ کے دولت خانہ میں بکری ذبح کی گئی۔ آپ گھر تشریف لائے تو سب سے پہلے پوچھا: کیا تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کو گوشت بھجوایا ہے؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ حضرت جبریل امینؑ مجھے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید فرماتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ اسے وراثت کا بھی حق دار ٹھہرا دیا جائے گا۔[1]

غیر مسلموں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت

فقہائے اسلام نے مسجد حتی کہ مسجد الحرام جیسی پاکیزہ جگہ میں بھی غیر مسلموں / اھل الذمہ کے داخل ہونے اور اہل اسلام کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو جائز بتایا ہے۔[2] امام مالک اور امام شافعیؒ قرآن وحدیث کی بعض نصوص سے استدلال کرتے ہوئے اھل الذمہ کے مسجد حرام میں داخل ہونے کو ناجائز و مکروہ بتاتے ہیں مگر احناف جواز کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ

> عہد نبوی میں مشرک عربوں کے وفود وغیرہ مسجد نبوی میں داخل ہوا کرتے تھے جیسا کہ مروی ہے کہ ابو سفیان حدیبیہ والے سال مسجد میں داخل ہوئے۔ اسی طرح بنو ثقیف کا وفد مسجد میں داخل ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن اعلان فرمایا: جو شخص مسجد میں داخل ہو اس کے لیے امن ہے۔ اس اعلان میں آپ ﷺ نے مسجد کو امن والی جگہ قرار دیا اور انہیں (اہل مکہ کو) اس میں داخل ہونے

1- ترمذی، الجامع (ابواب البر والصلة باب ماجاء فی حق الجوار)، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ۲/ ۴۵۸، رقم: ۱۹۴۳
2- فتاوی عالمگیری، ۵/ ۳۴۶

کی دعوت دی اور نبی اکرم ﷺ انہیں حرام شے کی طرف کس طرح بلاسکتے تھے۔[1]

فقہاء حنابلہ بھی انہی روایات وواقعات سے استدلال کرتے ہوئے عام مساجد میں غیر مسلموں کے داخلہ کو جائز بتاتے ہیں مگر ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے داخلہ کی اجازت کی شرط بھی لگاتے ہیں۔[2]

اسی طرح صاحب ہدایہ احناف کا موقف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ولا بأس بان يدخل اهل الذمة المسجد الحرام" (اور اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ اہل الذمہ مسجد حرام میں داخل ہوں) اس کے بعد صاحب ہدایہ نے امام شافعی اور امام مالک کا زیر بحث معاملے میں عدم جواز اور کراہت کا موقف بتایا ہے، پھر اپنے موقف پر دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ولنا ماروی ان النبي عليه السلام انزل وفد ثقيف في مسجده وهم كفار ولان الخبث في اعتقادهم فلا يؤدي الى تلويث المسجد والآية محمولة على الحضور استيلاء واستعلاء اوطائفين عراة كما كانت عادتهم في الجاهلية"[3]

اور ہماری دلیل یہ روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بنو ثقیف کے وفد کو اپنی مسجد میں اتارا/ٹھہرایا حالانکہ وہ کفار تھے دوسری بات یہ ہے کہ مشرکین کی نجاست /پلیدی ان کے اعتقاد میں ہے جس سے مسجد ظاہری طور پر آلود نہیں ہوتی اور امام شافعی نے جس آیت (انما المشركون نجس الخ) سے استدلال کیا ہے۔ وہ اس امر پر محمول ہے کہ وہ مسجد حرام میں غالب ہو کر داخل نہ ہوں یا ننگے ہو کر مسجد

---

1 - الکاسانی، بدائع الصنائع (کتاب الاستحسان)، دار الفکر بیروت، ۵/ ۱۹۱؛ حموی، شرح الاشباہ والنظائر، ۳/ ۸۴

2 - ابن قدامہ، المغنی، ۸/ ۵۳۲

3 - مرغینانی، ہدایہ، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۷/ ۲۴۳

حرام میں طواف نہ کریں جیسا کہ جاہلیت میں ان کی عادت تھی۔

زیر بحث معاملے میں اسلام نے اس حد تک رواداری کا مظاہرہ کیا ہے کہ مسلمانوں کی خاص عبادت گاہوں یعنی مساجد کے اندر رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہی کو نہیں بلکہ طائف کے بت پرست مشرکین تک کو اجازت مرحمت فرمائی کہ مسجد نبوی ﷺ کے صحن کے پچھلے حصے میں اپنے خیمے نصب کریں صحابہ نے پوچھا: **انزلهم المسجد وهم مشركون؟** آنجناب انہیں مسجد میں اتار رہے ہیں حالانکہ وہ تو مشرک ہیں؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: "ان الارض لا تنجس"[1] بے شک زمین ناپاک نہیں ہوتی۔

اسی طرح جب نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہ نبوی میں آیا تو آپ ﷺ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور پھر انہیں مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی اور انہوں نے اپنے طریقے کے مطابق مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔[2]

غیر مسلموں کے ساتھ میل جول حتی کہ ان کے مساجد جیسی پاکیزہ اور ذکر و عبادت الٰہی کے لیے مختص جگہوں میں داخل ہو سکنے کے مذکورہ اسلامی نقطہ نظر اور فقہی تصریحات کے باوجود اگر کسی زمانے میں اور کسی اسلامی ملک میں اس کے برعکس ہوا ہے اور کسی غیر مسلم کو مسجد میں داخل ہونے سے منع کیا گیا ہے تو یہ منع کرنے والے کا ذاتی فعل تصور ہو گا نہ کہ اسلام کی تعلیم۔ مشہور مغربی مصنفہ محترمہ Batye'or نے ذمی عبادتگاہوں سے متعلق اسلام کے طرز عمل کے بارے جو یہ لکھا ہے کہ

Conversely, nineteenth century European travelers give examples where, if jews or Christians entered

---

[1] ۔زیلعی، عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ، مؤسسۃ الریان، بیروت، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء، ۴/ ۲۷۰، رقم: ۷۴۵۲

[2] ۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱/ ۱۷۶؛ ابن قیم، زاد المعاد فی سیرۃ خیر العباد، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۳/ ۶۲۹؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دارالمعرفۃ بیروت، ۵/ ۶۰-۶۱؛ ابن کثیر، سیرۃ النبی (اردو ترجمہ)، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۲/ ۵۶۲

a mosque in North Africa, it was regarded as a capital offence.[1]

"اس کے برعکس انیسویں صدی کے یورپین سیاحوں نے ایسی مثالیں دی ہیں کہ یہودیوں یا عیسائیوں میں سے کسی آدمی کا شمالی افریقہ میں کسی مسجد میں داخل ہونا سنگین جرم قرار دیا جاتا تھا۔"

پھر محترمہ نے یہ مثال بھی لکھی ہے کہ ایک یہودی کو محض اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ وہ تیونس میں فریتونہ مسجد میں داخل ہو گیا تھا۔[2] تو اس قسم کے اِکا دُکا واقعات کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ یہ جذباتی اور ذاتی قسم کے واقعات ہیں نہ کہ اسلام کی تعلیمات وہدایات اور نہ کسی اسلامی ریاست کا حکم اور پالیسی۔

غیر مسلموں کو سلام کہنا۔ شرعی نقطہ نظر

اب رہی یہ بات کہ غیر مسلموں / اھل الذمہ سے ملاقات کے وقت آیا انہیں پہلے سلام کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، عدم جواز کے قائلین غیر مسلم کو سلام میں پہل نہ کرنے کے موقف میں یہ روایت پیش کرتے ہیں جسے متعدد محدثین نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے:

عن سهيل بن ابي صالح قال خرجت مع ابي الى الشام فجعلوا يمرون بصوامع فيها نصارى فيسلمون عليهم فقال ابي لا تبدوهم بالسلام فان اباهريرة حدثنا عن رسول الله ﷺ قال لا تبدوهم بالسلام فاذا لقيتموهم في الطريق فاضطروهم الى اضيق الطريق[3]

---

[1] - Bat ye'or, The Dhimmi, Fairleigh Dickinson University Press London, 1985, P:58

[2] -Ibid, P:58

[3] - ملاحظہ ہو: عبدالرزاق، المصنف (باب رد السلام على اهل الكتاب)، المجلس العلمي، بیروت، ۱۹۷۰ء، ۶/۱۰، رقم ۹۸۳۷؛ ابوداؤد، السنن (كتاب الادب باب في السلام على اهل الذمة) ۲/۳۶۶، رقم ۵۲۰۵؛ مسلم، الجامع

سہیل بن ابی صالح کہتے ہیں میں اپنے والد کے ہمراہ شام گیا تو لوگ ایسے گرجوں کے پاس سے گزرنے لگے جن میں عیسائی موجود تھے، پس وہ انہیں سلام کہنے لگے۔ اس پر میرے والد نے کہا: انہیں سلام میں پہل / ابتداء نہ کرو کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ہم سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "عیسائیوں کو پہلے سلام نہ کرو بلکہ جب تمہاری ان سے راستے میں ملاقات ہو تو انہیں تنگ رستے کے تنگ حصے میں چلنے پر مجبور کر دو۔"

ابن قدامہ بھی مذکورہ حدیث اور اس مضمون کی دوسری روایات کی بنیاد پر اہل الذمہ کو پہلے سلام کرنا جائز نہیں ٹھہراتے۔[1]

امام نووی اگرچہ خود مذکورہ حدیث کی بناء پر غیر مسلموں کو پہلے سلام کرنے کے قائل نہیں۔ مگر اس مسئلہ میں انہوں نے متعدد صحابہؓ اور فقہاء مثلاً حضرت ابن عباسؓ، ابو امامہؓ، ابن ابی محیریزؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اس ضمن میں عمومی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو سلام میں پہل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح حضرت علقمہؒ اور نخعیؒ وغیرہ کا قول ہے کہ کسی ضرورت اور حاجت اور سبب کی بناء پر انہیں پہلے سلام کرنا جائز ہے۔[2] اس سلسلے میں اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرنے اور فی زمانہ انہیں اسلام سے متعلق ہر قسم کی بدگمانی سے بچانے سے بڑھ کر کونسی بڑی ضرورت اور حاجت ہو سکتی ہی۔ فقہاء نے تو یہاں

الصحیح، کتاب السلام، (باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام وکیف یرد علیھم)، ۲/۲۱۳؛ ترمذی، جامع (ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی الذمی)، ۲/۵۵۷؛ ابن قیم، احکام اھل الذمۃ، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۳ء، ۱/۱۵۲؛ ابن قیم، زاد المعاد، ۲/۴۲۵

[1] ۔ ابن قدامہ، المغنی، مکتبہ الریاض الحدیثۃ، ریاض سعودی عرب، ت۔ن، ۸/۵۳۶

[2] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نووی، شرح صحیح مسلم، (مع صحیح مسلم)، ۲/۲۱۴؛ فتاوی ہندیہ، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء، ۵/۳۲۵

تک لکھا ہے کہ:

اذا دخل ذمی علیٰ مسلم فقام له، ان قام طمعًا فی اسلامه فلا باس به وان قام تعظیماً له من غیر ان ینوی شیئاً مماذ کرنا او قام طمعا لغناه کره له ذالک[1]

جب کوئی ذمی آدمی کسی مسلمان کے پاس آئے اور وہ اس کے لیے کھڑا ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ اس ذمی کے اسلام لانے کے طمع میں کھڑا ہوا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نہیں اور اگر وہ کسی چیز کی نیت کے بغیر جن کا ہم نے ذکر کیا، اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا یا اس کی دولت مندی کے باعث کھڑا ہوا تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے۔

علاوہ ازیں سلام کے دعاء ہونے میں کوئی کلام نہیں اور غیر مسلم کیلئے دعاء نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی تو آپ نے اسے دعاء دی کہ اللہ تمہیں حسین و جمیل رکھے۔ چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے۔[2] فقہاء نے کہا ہے کہ پڑوسی نصرانی سے مصافحہ میں بھی شرعاً کوئی مصائقہ نہیں۔ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ (عالمگیری) میں ہے:

ولا باس بمصافحة المسلم جاره النصرانی اذ رجع بعد الغيبة ويتاذی بترک المصافحة[3]

اس بات میں شرعاً کوئی حرج نہیں کہ مسلمان آدمی اپنے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرے جب کہ وہ گھر سے باہر رہنے کے بعد واپس لوٹے اور مصافحہ نہ کرنے پر وہ ذہنی کوفت (شکایت) محسوس کرے۔

اسی طرح غیر مسلم اھل الذمہ سے ملاقات کے وقت اگر وہ آداب ملاقات کے تحت کسی مسلمان

---

[1] - فتاوی ہندیہ، ۵/۳۴۸

[2] - عبد الرزاق، مصنف، ۱۰/۳۸۴

[3] - فتاوی ہندیہ، ۵/۳۴۸

کو سلام کہتے ہیں تو شرعاً ان کے سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ صحابہ کرامؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اہل کتاب جب ہمیں ملتے ہیں تو وہ ہمیں سلام کہتے ہیں تو ہم ان کے سلام کا جواب کیسے (کن الفاظ میں) دیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم جواب میں "وعلیکم" کہہ دیا کرو۔[1]

اھل الذمہ کے سلام کے جواب میں "وعلیکم السلام" کے مروجہ اور مسنون طریقہ کے برعکس فقط "وعلیکم" اور بعض روایات میں واؤ کے حذف کے ساتھ "علیکم" پر اکتفا کرنے کے جواب نبوی کی وجہ محدثین نے یہ بتائی ہے کہ یہودی چالاکی اور بدنیتی سے اپنی زبانوں کو لوچ دیتے ہوئے "السلام علیکم" کی بجائے "السام علیکم" (تم پر موت واقع ہو) کہا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تو ایک مرتبہ اس معاندانہ سلام کے جواب میں انہیں "علیکم السام واللعنۃ" بھی کہا جس پر حضور ﷺ نے انہیں نرمی کی تلقین فرمائی۔[2] لہذا حضور ﷺ نے ان کے جواب میں "وعلیکم" کہنے کا حکم دیا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے غیر مسلموں / اھل الذمہ میں عموماً مذکورہ بدنیتی اور الفاظ کا ہیر پھیر نہیں پایا جاتا۔ وہ واضح الفاظ میں اگر "السلام علیکم" کہتے ہیں تو کیا ان کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہا جائے گا؟ تو اس کے جواب میں ہمارے فقہاء و محدثین نے قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہوئے جس کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں، اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔[3] علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

---

[1] ۔دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاستیذان، باب کیف الرد علی اھل الذمۃ بالسلام، ۲/۹۲۵، رقم: ۶۲۵۷، ۶۲۵۸؛ مسلم، الجامع الصحیح (باب رد السلام علی اھل الکتاب بالسلام و کیف یرد علیھم)، ۲/۲۱۳-۲۱۴ رقم: ۵۶۵۳؛ عبدالرزاق، المصنف (باب رد السلام علی اھل الکتاب) مجلس علمی بیروت، ۱۹۷۰ء، ۶/۱۱، رقم ۹۸۳۸؛ ابن قیم الجوزیہ، احکام اہل الذمہ، دار الکتاب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، ۱/۱۵۲-۱۵۳

[2] ۔حوالہ مذکور

[3] ۔دیکھیے: عسقلانی، ابن حجر، فتح الباری شرح صحیح بخاری، ۱۱/۴۷-۵۴؛ نووی، شرح صحیح مسلم، (مع صحیح مسلم)، ۲/۲۱۳-۲۱۴؛ حموی، شرح الاشباہ والنظائر، ۳/۸۸

"اگر سامع کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ذمی نے اسے السلام علیکم کہا ہے، نہ کہ "السام علیکم" اور اس بارے اسے کوئی شک نہ رہے تو کیا اس کیلئے جائز ہے کہ وہ اسکے جواب میں "وعلیک السلام" کہے یا صرف "وعلیکم" کے الفاظ پر اکتفا کرے؟ تو اس سلسلے میں ادلہ شرعیہ اور قواعد شریعت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے "وعلیک السلام" ہی کہا جائے۔ کیونکہ یہ بات عدل انصاف کے باب سے ہے اور اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ارشاد الٰہی ہے: "**واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها**" جب تمہیں سلام کی صورت میں تحفہ دیا جائے تو اس سے اچھے الفاظ میں تحفہ سلام کا جواب دو یا کم از کم انہیں الفاظ میں جواب دو۔ تو اس ارشاد الٰہی نے فضل کو مندوب جبکہ عدل کو واجب ٹھہرایا ہے۔[1]

غیر مسلموں کو سلام میں سبقت

علامہ جصاصؒ نے سورۃ النساء کی مذکورہ آیت کریمہ "**واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها**" جب تمہیں سلام کی صورت میں تحفہ دیا جائے تو اس سے اچھے الفاظ میں تحفہ سلام کا جواب دو یا کم از کم انہیں الفاظ میں جواب دو۔ کی تفسیر میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا درج ذیل واقعہ ان کے شاگرد مشہور تابعی حضرت علقمہ کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

> ایک سفر میں ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ تھے۔ اس میں ہمارے ساتھ کچھ غیر مسلم دیہاتی بھی تھے۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ کچھ دور جا کر انہوں (غیر مسلموں) نے ہم سے الگ دوسرا راستہ پکڑا تو حضرت ابن مسعودؓ نے انہیں (الوداعی) سلام کیا۔ اس پر میں نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا: کیا آپ اس میں کوئی کراہت نہیں سمجھتے؟ تو آپ نے فرمایا: "**انه حق الصحبة**" بے شک یہ ساتھ

---

[1] - احکام اہل الذمہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، (الطبعۃ الثانیہ)، ۱/۱۵۷

چلنے اور کچھ دیر ساتھ رہنے کا حق ہے۔[1]

اس واقعہ پر علامہ جصاص کا اپنا تبصرہ یہ ہے کہ:

ظاہرہ یدل علی ان عبداللہ بداھم بالسلام لان الرد لا یکرہ عند احد[2]

اس کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے انہیں پہلے سلام کیا تھا کیونکہ غیر مسلم کے سلام کا جواب دینا کسی کے نزدیک مکروہ نہیں ہے۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے استاذ جلیل القدر تابعی اور فقیہہ حضرت ابراہیم نخعیؒ بھی غیر مسلم کو سلام میں سبقت جائز سمجھتے ہیں، ان کے شاگرد سلیمان الاعمش کا بیان ہے:

میں نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے پوچھا: مجھے ایک نصرانی طبیب کے پاس جانا پڑتا ہے تو کیا میں اس کو پہلے سلام کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں جب تمہیں اس سے کوئی حاجت / کام ہو تو اسے سلام کہہ سکتے ہو۔[3]

جن احادیث میں غیر مسلموں کو پہلے سلام نہ کہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے جیسا کہ اوپر گزرا، اس ہدایت کی ایک توجیہ ابن قیم نے یہ بھی بیان کی ہے کہ "ان ھذا کان فی قضیۃ خاصۃ لما ساروا الی بنی قریظۃ قال لاتبدوھم بالسلام"[4] یہ حکم ایک خاص واقعہ میں دیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ جب صحابہ بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں پہلے سلام نہ کہنا۔

---

[1] -احکام القرآن، ۳/ ۵۲۵، مکتبہ البہیہ مصر؛ امام محمد، کتاب الآثار، مکتبہ اعلیٰ حضرت لاہور، ص: ۴۲۵

[2] -حوالہ سابق

[3] -حوالہ مذکور

[4] -زاد المعاد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۲/ ۴۲۵

چوتھی فصل

سماجی مراسم و تعلقات قائم کرنے کا حق

(اسوۂ رسول ﷺ سے نظائر)

سماج یا انسانی معاشرے میں رہنا انسان کی ایک طبعی اور ناگزیر تمدنی ضرورت ہے جس کی وجہ گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح اہل سماج نے سماجی مراسم و تمدنی تعلقات قائم کرنا بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے جس کے سوا اس کے لیے چارہ کار نہیں۔ اس لیے اسلام نے اھل الذمہ کو اس بات کا حق اور اجازت دی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنے ہم خیال لوگوں کے علاوہ مسلمانوں سے بھی سماجی مراسم و تعلقات قائم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو بھی اس بات کی تعلیم دی ہے کہ وہ غیر مسلم اھل الذمہ سے سماجی مراسم و تعلقات بنا کر حسن اخلاق کا مظاہرہ کریں اور اپنی تیغ اخلاق سے ان کے دلوں کو فتح کرنے کی کوشش کریں۔ عصر حاضر کے مشہور فقیہہ علامہ وھبۃ الزحیلی نے لکھا ہے:

والخلاصة ان الاسلام لا يتوانى لحظة واحدة عن سعيه لاقامة علاقات طيبة مع غير المسلمين لتحقيق التعاون البناء فى سبيل الخير والعدل والبر والامن وحماية الحرمات ونحو ذالک[1]

> خلاصہ یہ ہے کہ بھلائی، عدل، نیکی، امن و امان اور تحفظ طلب چیزوں کی حفاظت و حمایت وغیرہ جیسے امور خیر میں تعاون کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں اسلام ایک لحظہ کی تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتا۔

---

[1] ۔الفقہ الاسلامی وادلتہ ۔ ۸/۴۲۱

بہر کیف آئندہ سطور میں ہم اھل الذمہ کے چند اہم سماجی و تمدنی حقوق پر از روئے اسلام روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا

شادی بیاہ کی تقریبات اور خوشی کے مواقع کی دعوتیں معاشرت کا ایک لازمی جزو ہیں اور ان میں شرکت سماجی و تمدنی مراسم و تعلقات کا ایک حصہ ہے۔ کسی مسلمان کو دعوت دینا یا اس کی دعوت کو قبول کرنے میں تو کلام نہیں۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ آیا کسی غیر مسلم کو دعوت دی جا سکتی ہے اور اسکی دعوت قبول کی جا سکتی ہے؟ تو قرآن و حدیث نے اس کا جواز ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اہل کتاب کے کھانے کے حلال اور جائز ہونے کے بارے میں فرمایا ہے:

وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۔[1]

اور ان لوگوں کا کھانا جنہیں کتاب دی گئی، تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔

علاوہ ازیں خود رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے:

ان یهودیا دعا النبی ﷺ الی خبز شعیر واهالة سنخة فاجابه[2]

ایک یہودی نے نبی اکرم ﷺ کو جو کی روٹی اور چربی کی دعوت دی تو آپ نے اس کی دعوت قبول فرمائی۔

اسی طرح روایات سے ثابت ہے کہ غزوہ خیبر کے ختم ہونے کے بعد ایک یہودی عورت نے آپ کے پاس

---

[1] - المائدہ، ۵:۵

[2] - امام احمد، مسند، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۳/۲۱۰، رقم الحدیث: ۱۳۲۴۳، ۱۳۸۹۶؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۲/۲۹

بکری کا گوشت بھجوایا یا آپ کی دعوت کی۔ جس میں زہر تھا، آپ ﷺ نے لقمہ لیتے ہی اسے تھوک دیا۔ اس کے باوجود اس کا اثر آپ پر ہوا جبکہ آپ کے ساتھی بشر بن براءؓ کا اسی زہر کے اثر سے انتقال ہو گیا۔[1]

انہی روایات کی بنیاد پر فقہاء نے لکھا ہے کہ غیر مسلم کی دعوت قبول کرنا جائز ہے۔

ولا باس بالذهاب الى ضيافة اهل الذمة هكذا ذكره محمد رحمه الله[2]

اھل الذمہ کی ضیافت / دعوت کی طرف جانے میں شرعاً کوئی حرج نہ ہے۔ امام محمدؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے:

اسی طرح غیر مسلموں کو دعوت دینا بھی جائز ہے:

ولا باس بضيافة الذمى وان لم يكن بينهما الا معرفة كذا فى الملتقط[3]

ذمی کی ضیافت / دعوت کرنے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہ ہے اگرچہ ان کے درمیان جان پہچان کے سوا کوئی تعلق (رشتہ داری) نہ ہو۔

علامہ ابن نجیم نے (احکام الذمی) کی بحث میں لکھا ہے

"**ولا تكره ضيافته**" اس کی ضیافت میں کوئی کراہت نہیں۔

اس جملہ کی شرح میں علامہ حموی نے ایک بڑا سبق آموز اور فیصلہ کن واقعہ درج کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

شیخ الاسلام ابوالحسن السغدی کے فتاویٰ میں یہ حکایت ہے کہ ایک مجوسی آدمی بڑا مالدار اور مسلمان فقراء مساکین کی خبر گیری کرنے والا تھا۔ وہ مسلمانوں میں سے

---

1 - بخاری، الجامع الصحیح، (**كتاب المغازى باب الشاة التى سمت للنبى ﷺ بخيبر**)، ۲/۶۱۰ رقم: ۴۲۴۹، (مع حاشیہ)؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲/۲۹؛ ابن خلدون، تاریخ، ۲/۴۳۹

2 - فتاویٰ ہندیہ، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء، ۵/۳۴۷

3 - حوالہ مذکور

بھوکے آدمی کو کھانا دیتا، ننگے بدن کو کپڑے مہیا کرتا، ان کی مساجد پر خرچ کرتا، مساجد کے دیوں کیلئے تیل دیتا اور مسلمان محتاجوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے بیٹے کی "جھنڈ" (پیدائشی بال) اتروانے کے موقعہ پر دعوت کا اہتمام کیا اور بہت سے لوگوں کو اس دعوت میں بلایا تو بہت سے اہل اسلام بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ بعض مسلمانوں نے اسے تحائف بھی دیئے۔ مگر مسلمانوں کی یہ حرکت ان کے ایک مفتی صاحب کو بہت ناگوار گزری۔ تو اس نے اپنے استاد شیخ الاسلام مذکور کو لکھا: کیا آپ نے اپنے شہر کے مسلمانوں کو نہیں دیکھا کہ وہ ایک غیر مسلم کی دعوت میں جا کر مرتد ہو گئے ہیں، اس پر شیخ الاسلام نے فرمایا: بے شک اھل الذمہ کی دعوت قبول کرنا شریعت میں جائز ہے اور کسی محسن آدمی کے احسان کے بدلے میں احسان کرنا فیاضی اور مروت کے باب میں سے ہے۔ دوسری طرف سر منڈانا گمراہ لوگوں "اھل الذمہ" کے شعائر میں سے نہیں ہے اور اتنی بات پر اھل اسلام پر مرتد ہونے کا حکم لگانا ناممکن ہے۔[1]

غیر مسلم کو مہمان ٹھہرانا:

تمدنی اور سماجی تقاضوں میں سے ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ کوئی شناسا یا اجنبی، اسی طرح قریبی یا بعید شخص بطور مہمان آجائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی مقدور بھر خاطر تواضع کی جائے بلکہ اس کے رتبہ کے مطابق اس کا احترام و اکرام بھی کیا جائے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس ضمن میں مشہور ہدایت ہے:

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ[2]

---

1. حموی، غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر، ۸۹/۳
2. - بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ الخ)، ۹۰۶/۲، رقم: ۶۱۳۵؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف)، ۵۰/۱، رقم: ۱۷۳

جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

یہاں "ضیف" (مہمان) کا لفظ مطلق ہے جس میں مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ دوسرے خود نبی رحمت ﷺ کا اپنا ذاتی اسوہ اس بات پر گواہ ہے کہ آنجناب ﷺ کے ہاں غیر مسلم مہمان بھی قیام کرتے اور آپ کی مہمان نوازی سے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ ابوالبصرہ غفاریؓ کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے تو مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کے ہاں مہمان ٹھہرے اور رات کو گھر کی سب بکریوں کا دودھ پی گئے اور تمام اہل بیت رسول ﷺ رات بھر بھوکے رہے۔[1]

اسی طرح کا ایک اور قصہ حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں: ایک رات ایک کافر آنحضرت ﷺ کا مہمان ہوا۔ آپ ﷺ نے ایک بکری کا دودھ پیش کیا، وہ سب پی گیا۔ پھر دوسری بکری کا دودھ دیا گیا وہ بھی ہڑپ کر گیا، پھر تیسری، چوتھی، حتیٰ کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ آنحضرت ﷺ نے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کے اس کمال حسن سلوک کا اثر یہ ہوا کہ وہ صبح کو مسلمان ہوگیا اور پھر صرف ایک بکری کے دودھ سے سیر ہوگیا۔[2]

اسی طرح ایک اور اجنبی اور غیر مسلم شخص نے آپ کے ہاں کھانا کھایا رات گزاری اور بستر پر غلاظت کر کے علی الصبح چلا گیا۔ صبح کو جب آپ وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اسے اپنے دست مبارک سے دھویا۔ بستر کو پاک صاف کیا۔ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار بھول گیا تھا جسے لینے کیلئے واپس آیا تو آپ نے کسی قسم کے غصے کا اظہار نہ فرمایا بلکہ اس کی تلوار اس کے حوالے کر دی۔ وہ اس حسن سلوک اور

---

[1] ۔ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، (اخلاق نبوی، کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ)، ۲/۲۱۷

[2] ۔ مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب الاشربة باب المؤمن یأکل فی معی واحد والکافر یأکل فی سبعة امعاء)، ۲/۱۸۶، رقم: ۵۳۷۹؛ قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، ۱/۱۲۷

کمال برداشت سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔[1]

علاوہ ازیں غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود بارگاہ نبوی ﷺ میں آتے۔ آپ تعلیم امت کی خاطر خود ان کی میزبانی فرماتے۔ چنانچہ جب حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ میں آیا تو آپ ان کی مہمان نوازی کی خدمت بنفس نفیس فرمانے لگے۔ یہ دیکھ کر صحابہؓ نے عرض کیا: یہ خدمت ہم سرانجام دیتے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نهم كانوا لاصحابنا مكرمين واني احب ان اكافئهم[2]

یہ لوگ ہمارے (حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے) ساتھیوں کا اکرام کیا کرتے تھے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کا کچھ بدلہ چکا دوں۔

غیر مسلم کی عیادت:

سماجی تعلقات، روایات، اخلاقیات اور تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ ارد گرد اور متعلقین میں کوئی آدمی بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کی جائے۔ اسلام نے مریض کی عیادت کی ترغیب دی ہے اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب قرار دیا ہے۔[3] ان تعلیمات میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ پھر خود پیغمبر اسلام ﷺ کا اسوہ بھی بتاتا ہے کہ آپ ﷺ نے بنفس نفیس غیر مسلموں کی عیادت فرمائی ہے، مثلاً متعدد محدثین نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ:

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں: ایک مرتبہ ایک یہودی لڑکا جو آپ کی خدمت کیا کرتا تھا، بیمار ہو

1۔ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور، خطبہ نمبر ۱۲، ص: ۳۱۰

2۔ ابن کثیر، سیرۃ النبی (باب الهجرة الى ارض الحبشة) دار المعرفۃ بیروت، ۲/ ۳۱

3۔ دیکھیے: ابو داؤد، السنن (کتاب الجنائز باب ما فی فضل العيادة)، ۲/ ۸۹، رقم ۳۰۹۶-۳۰۹۷؛ ترمذی، جامع (ابواب الجنائز باب ماجاء فی عيادة المريض)، ۱/ ۳۱۵؛ مسلم، الصحیح (كتاب البر والصلة والادب باب فی فضل عياة المريض)، ۲/ ۳۱۷

گیا۔ آپ ﷺ اس کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ اس کے سر کے قریب بیٹھے تو نور نبوت سے دیکھ لیا کہ یہ اس مرض سے بچ نہیں سکے گا۔ آپ ﷺ کی تو بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کے بارے میں سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح ایمان لے آئے اور یوں آخرت کے دائمی عذاب سے بچ جائے۔ اپنے اس خادم کے بارے میں یہ خواہش کیوں نہ ہوتی۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹا اب تو اسلام قبول کر لو۔ اس نے مشورہ کی نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا تو اس نے کہا:

"اطع ابا القاسم" تم ابو القاسم کی بات مان لو

چنانچہ وہ اسلام لے آیا۔ کلمہ شہادت پڑھ چکا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ حضور اکرم ﷺ کو اس کے کلمہ پڑھ لینے سے بہت خوشی ہوئی۔ باہر نکلے تو آپ کی زبان پر اللہ کریم کی حمد و ثناء جاری تھی اور فرما رہے تھے:

الحمد للہ الذی انقذہ بی من النار[1]

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے میری وجہ سے اس لڑکے کو دوزخ کی آگ سے نجات عطا فرمائی۔

جبکہ حدیث کی معروف کتاب، المصنف عبد الرزاق، میں اس روایت کے اندر یہ اضافہ بھی ہے کہ جب وہ لڑکا فوت ہو گیا تو یہودیوں نے چاہا کہ اس کے ورثاء کا کردار ادا کریں (اس کے کفن دفن کا انتظام کریں) مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] - ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجنائز۔ باب اذا اسلم الصبی فمات۔ ۱۸۱/۱ رقم: ۱۳۵۶؛ نیز کتاب المرضی باب عیادۃ المشرک)، ۲/۸۴۳ رقم: ۵۶۵۷؛ بخاری، الادب المفرد (باب عیادۃ المشرک)، ص ۷۷؛ ابو یعلی الموصلی، مسند، ۳/۳۵۴، حدیث نمبر ۳۳۴۷؛ ابن قیم، زاد المعاد فی سیرۃ خیر العباد، ۱/۴۹۴؛ ابو داؤد السنن، کتاب الجنائز باب عیادۃ الذمی، ۲/۸۹، رقم: ۳۰۹۴

نحن اولیٰ به منکم فغسله النبی ﷺ وکفنه وحنطه وصلی علیه[1]

ہم اس بچے کے تم سے زیادہ مستحق ہیں پھر نبی اکرم ﷺ نے اسے غسل دلوایا، اسے کفن پہنایا اس پر حنوط (خوشبو) لگائی اور اس پر نماز جنازہ پڑھی۔

درج بالا روایت پر امام بخاری کا قائم کردہ ترجمۃ الباب ، باب عیادۃ المشرک، بھی قابل توجہ ہے۔ یعنی یہ روایت ان کے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ مشرک کی عیادت جائز ہے۔ اسی طرح حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنو نجار کے ایک شخص کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ عیادت کے دوران اس سے فرمایا: ماموں آپ کلمہ لا اله الا الله کا اقرار کر لیجئے اس نے کہا میں ماموں ہوں یا چچا۔ آپ نے فرمایا، نہیں آپ ماموں ہیں، اس لیے کہ آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ کا تعلق مدینہ منورہ سے تھا، اس نے کہا کیا لا اله الا الله کا اقرار میرے حق میں بہتر ہو گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔[2]

انہی روایات اور اسوہ رسول ﷺ سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء نے کہا ہے کہ غیر مسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

ولا باس بعیادۃ الیهودی والنصرانی لانه نوع بر فی حقهم وما نهینا عن ذالک[3]

اور کوئی حرج نہیں یہودی اور عیسائی کی عیادت میں کیونکہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی نیکی یا حسن سلوک ہے اور ہمیں اس سے منع نہیں کیا گیا۔

علامہ کاسانیؒ نے یہودی لڑکے کی عیادت رسول ﷺ والی درج بالا روایت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے:

کسی یہودی اور عیسائی کی عیادت کیلئے جانے میں کوئی حرج نہیں (اس کے بعد استدلال

---

1 - عبد الرزاق، المصنف، ۶/ ۳۵

2 - امام احمد، مسند، دار صادر، بیروت، ۳/ ۱۵۲، ۱۵۴، ۲۶۸، رقم الحدیث: ۱۲۵۴۳

3 - مرغینانی، ہدایہ، (کتاب الکراهیة) ۴/ ۴۷۲

میں مندرجہ بالا روایت لکھی ہے) نیز اس لیے بھی کہ ہمسائے کی عیادت کرنا حق ہمسائیگی کو ادا کرنا ہے جو مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "والجار الجنب" (اور اجنبی ہمسائے سے بھی حسن سلوک کرو) اور اس میں (مسلم و غیر مسلم کا) کوئی فرق نہیں کیا۔ نیز اس لیے بھی کہ اس کی عیادت کرنے میں اسکو اسلام کی طرف آنے کی دعوت دینا اور اس کے مومن ہونے کی امید پیدا کرنا ہے، لہٰذا یہ کیسے مکروہ ہو سکتا ہے۔[1]

جبکہ فتاویٰ شامی میں ہے: اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کی عیادت جائز ہے۔ مجوسی کی عیادت کو بھی صحیح قول کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے۔[2]

اسی طرح مشہور فقیہہ عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم بیمار ہو جائے تو اس کے مسلمان رشتہ دار کو اس کی عیادت کرنی چاہیے۔

ان كانت قرابة قريبة بين مسلم و كافر فليعد المسلم الكافر[3]

اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے تو مسلمان کو کافر کی عیادت کرنی چاہیے

کسی آدمی سے قرابت اور رشتہ داری ہو تو اس کے حقوق زیادہ ہیں لیکن یہ عیادت کیلئے شرط نہیں ہے۔ یہ ایک دینی اخلاقی بلکہ انسانی تقاضا ہے جسے پورا ہونا چاہیے۔ حضرت سلیمان بن موسیٰ کہتے ہیں:

نعود بنی النصاری وان لم تكن بيننا و بينهم قرابة[4]

ہم لوگ نصاریٰ کی اولاد کی عیادت کرتے ہیں اگرچہ ہمارے درمیان اور ان کے درمیان قرابت نہ ہو۔

---

[1] - کاسانی، ابو بکر علاء الدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (کتاب الاستحسان)، ۵/ ۱۹۱

[2] - شامی، ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار، ۵/ ۳۴۱

[3] - عبد الرزاق، مصنف، ۶/ ۳۵

[4] - حوالہ سابق، ۶/ ۳۶

علامہ ابن قیم نے امام احمد بن حنبل کے حوالے سے لکھا ہے کہ مختلف مواقع پر جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا کسی نصرانی عزیز یا نصرانی پڑوسی کی عیادت کی جا سکتی ہے؟ تو ہر موقع پر اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: **نعم**، ہاں۔[1]

مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم نے بھی، احکام الذمی، کی بحث میں فرمایا ہے:

ولاتکرہ عیادۃ جارہ الذمی۔[2] اپنے ذمی پڑوسی کی عیادت کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

اسی طرح مشہور فقیہہ علامہ ابن تیمیہ (م ۷۲۰ھ) سے جب ایک مرتبہ یہ سوال کیا گیا کہ

ھل یجوز للمسلم اذا مرض النصرانی ان یعود

کیا مسلمان کیلئے جائز ہے کہ جب ایک نصرانی آدمی بیمار ہو جائے۔ تو اس کی عیادت (بیمار پرسی) کرے؟

اس کے جواب میں علامہ موصوف نے فرمایا:

اما عیادتہ فلا باس بھا فانہ قد یکون فی ذالک مصلحۃ لتا لیفہ علی الاسلام[3]

جہاں تک اس کی عیادت کا تعلق / سوال ہے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے میں مصلحت و حکمت موجود ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام کے لئے اس کا دل جیتا جا سکتا ہے۔

غیر مسلم کی تجہیز و تکفین میں شرکت

سماجی تعلقات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اعزہ واقارب میں سے کوئی آدمی مر جائے تو اس کے

---

1 - احکام اہل الذمہ، ۱/۱۵۸

2 - ابن نجیم، الاشباہ والنظائر (مع شرح الحموی)، ۳/۸۹

3 - فتاوی، طبع جدید سعودی عرب، (ترتیب عبدالرحمن بن قاسم وابنہ محمد)، ۲۴/۲۶۵

جنازے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوا جائے۔ مسلمان کے جنازے میں تو کوئی کلام نہیں۔ آیا ایک مسلمان کو کسی غیر مسلم کے جنازے اور تجہیز و تکفین میں بھی شرکت کی اجازت ہے؟ تو علماء وفقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

کسی غیر مسلم کے جنازے کے احترام کے بارے یہ روایت پیچھے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے۔ اس پر عرض کیا گیا: یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ فرمایا: کیا وہ نفس (جان) نہیں ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: موت سے ایک گھبراہٹ ہوتی ہے پس جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جایا کرو (اس کا تعلق، مسلم یا غیر مسلم سے نہیں ہے)۔[1]

جہاں تک غیر مسلم کے جنازے میں شرکت کا تعلق ہے تو مصنف عبد الرزاق کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے ایک شخص نے دریافت کیا: میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ نصرانیہ تھی، کیا میں اس کی تدفین میں شریک ہو سکتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: جنازہ کے آگے چلو اس لیے کہ تم (دینی لحاظ سے) اس کے ساتھ نہیں ہو۔[2] جبکہ ابن قیم کی روایت کے مطابق آپ نے سائل کو یہ جواب دیا: اچھی اولاد ہونے کا ثبوت دو، اس کے کفن کا اہتمام کرو، البتہ اس کی قبر پر دعائے مغفرت نہ کرنا۔[3]

غیر مسلم میت کے اہل مذہب موجود ہوں تو وہ اپنے طریقہ پر عمل کریں گے یہ ان کا مذہبی حق ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ مسلمان رشتہ دار صرف جنازہ کے جلوس میں شریک ہوگا۔ چنانچہ خالد بن عبد اللہ قسری کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ وہ مذہباً نصرانیہ تھیں۔ خالد نے دمشق کے پادریوں کو طلب کیا اور کہا: اس کی تجہیز و تکفین میں وہ طریقہ اختیار کرو جو بادشاہوں کی لڑکیوں کے لیے اختیار کرتے

---

[1] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجنائز باب من قام لجنازۃ یہودی)، ۱/۱۷۵، رقم: ۱۳۱۲؛ مسلم الجامع الصحیح (کتاب الجنائز، فصل فی استحباب القیام للجنازۃ)، ۱/۳۱۰، رقم: ۲۲۲۵

[2] - عبد الرزاق، مصنف، ۶/۳۷

[3] - احکام اھل الذمۃ، ۱/۱۶۰

ہو۔ اس لیے کہ اس کا تعلق بھی بادشاہوں کی اولاد سے تھا۔ پھر گھر کی عورتوں نے پادریوں کی ہدایت کے مطابق انہیں غسل دیا اور تجہیز و تکفین کی۔ جب جنازہ چلا تو خالد اپنی سواری پر نکلے۔ نمایاں اشخاص بھی ساتھ تھے۔ کنارے کنارے چلتے رہے۔ قبر تک پہنچے تو اپنی سواری کا رخ موڑا اور واپس ہو گئے۔ کہا: یہ ہماری ماں کے ساتھ آخری سلوک ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ شیخ عبد اللہ بن ابوزکریا نے اپنی ماں کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ان کا شمار شام کے نمایاں لوگوں میں ہوتا تھا۔ بڑے عابد و زاہد اور فقیہہ تھے۔ مکحول تابعی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بھی اسی پر عمل کرتے تھے۔[1]

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں:

ان کانت قرابة قریبة بین مسلم و کافر فلیتبع جنازته[2]

اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے تو مسلمان کو چاہیے کہ اس (کافر) کے جنازے کے پیچھے پیچھے چلے۔

غیر مسلم کے جنازے میں شرکت ہو تو اس بات کی احتیاط کرنی ہو گی کہ مسلمان کا امتیاز باقی رہے۔ انسانی تعلق اور ہمدردی کا اظہار بھی ہو اور یہ بات بھی واضح ہو کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دین کو وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے مختلف صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ امام ابو بکر جصاص رازیؒ سورۃ لقمان کی آیت کریمہ: **وان جاہداک علیٰ ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعہما وصاحبہما فی الدنیا معروفا۔**[3] کی تفسیر اور اس کے احکام و مسائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقال اصحابنا فی المسلم یموت ابواہ وہما کافران یغسلہما ویتبعہما ویدفنہما لان ذالک

---

[1] - عبد الرزاق، مصنف، ۶/ ۳۷-۳۸

[2] - حوالہ مذکور، ۶/ ۳۶

[3] - سورۃ لقمان ۳۱: ۱۵

من الصحبة بالمعروف التی امر الله بها[1]

اور ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) کا اس مسلمان کے بارے میں کہنا ہے کہ جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اسی کفر پر وہ مر جائیں تو وہ ان کو غسل دے، ان کے جنازے کے پیچھے پیچھے جائے اور ان کی تدفین کا انتظام کرے۔ اس لیے کہ یہ چیز اس بھلائی کے سلوک میں شامل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے (ان کے بارے) حکم دیا ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جب یہ پوچھا گیا کہ مسلمان آدمی کا نصرانی باپ فوت ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ فرمایا: "یشہدہ ویدفنہ" اس کے جنازے میں شریک ہو اور اس کی تدفین کا انتظام کرے۔[2]

علی ھذا القیاس امام احمد بن حنبل سے اس بارے فتویٰ پوچھا گیا تو آپ نے بھی جواز کا فتویٰ دیا۔[3]

غیر مسلم کی تعزیت کرنا

تعزیت کرنا سماجی و تمدنی تعلقات کا ایک لازمی تقاضا اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں داخل ہے۔ پڑوس میں کسی کے عزیز و قریبی رشتہ دار کا انتقال ہو جائے تو اس کا یہ انسانی اور سماجی حق ہے کہ اس کی تعزیت کی جائے اور اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا غیر مسلم آدمی کی تعزیت کی جائے گی یا نہیں؟ اسلامی اخلاقیات اور انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی تعزیت کی جائے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ اگر کسی یہودی و نصرانی کا بیٹا فوت ہو جائے یا قریبی آدمی تو اس کی کیسے (کن الفاظ میں) تعزیت کی جائے گی؟ آپ نے فرمایا: وہ یوں کہے:

---

[1] - احکام القرآن، مکتبہ بہیہ مصر، ۲/۲۳۶

[2] - ابن قیم، احکام اھل الذمہ، ۱/۱۶۰

[3] - دیکھیے: حوالہ مذکور

ان الله کتب الموت علی خلقه فنسأل الله ان یجعله خیر غائب ینتظر . وانا لله وانا الیه راجعون. علیک بالصبر فیما نزل بک لا نقص الله لک عدداً۔[1]

بے شک اللہ نے اپنی تمام مخلوق کے لیے موت لکھ دی ہے (جس سے کوئی مستثنیٰ نہیں) تو ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ جانے والا سب سے اچھا آنکھ سے اوجھل ہونے والا ثابت ہو۔ ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ تمہیں جو صدمہ پہنچا ہے، اس کے لیے تم پر صبر لازم ہے۔ اللہ تمہاری تعداد (نسل) نہ گھٹائے۔

علاوہ ازیں امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک نصرانی آدمی حضرت حسن بصریؒ کے پاس آتا اور آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ وہ فوت ہو گیا تو حضرت حسن بصری تعزیت کی خاطر اس کے بھائی کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے یوں تعزیت کی:

اثابک الله علی مصیبتک ثواب من أصیب بمثلها من اهل دینک وبارک لنا فی الموت وجعله خیر غائب ننتظره علیک بالصبر فیما نزل بک من المصائب۔[2]

اللہ کریم تمہاری اس مصیبت پر تمہیں وہ ثواب عطا کرے جو تمہارے ہم مذہب لوگوں کو عطا کرتا ہے اور موت کو ہم سب کے لیے باعث برکت بنائے اور اسے ایک خیر بنائے جس کا ہم انتظار کرتے ہیں۔ جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے اس پر صبر سے کام لو۔

1- ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۲۱۶

2- حوالہ مذکور، ص: ۲۱۷

درج بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم سے تعزیت کا نہ صرف یہ کہ جواز ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ کسی یہودی یا مجوسی کے بچہ کا انتقال ہو جائے تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اللہ آپ کو اس کا بہت اچھا جانشین عطا فرمائے اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے۔[1] علامہ ابن قیم نے بھی اہل الذمہ کی تعزیت کے جائز ہونے میں حضرت حسن بصری اور دیگر ائمہ کے اقوال نقل کیے ہیں۔[2]

علاوہ ازیں درج بالا فقہاء کی تصریحات سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ خیر القرون میں علماء و صوفیہ کی مجالس میں جہاں مسلمان شریک ہوتے تھے وہاں غیر مسلم لوگ بھی بلا روک ٹوک شریک ہوتے تھے۔

غیر مسلموں سے تحائف وہدایا کا تبادلہ

اعزہ و اقارب، دوست احباب، پڑوسیوں، اہل محلہ اور ملنے والوں کے درمیان تحائف و ہدایا کا تبادلہ ایک سماجی ضرورت اور باہمی محبت و مراسم کے قیام اور دلی رنجشوں کے دور کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے نبی رحمت ﷺ نے آپس میں تحائف وہدایا کے تبادلہ کی ترغیب دی اور تلقین فرمائی ہے۔[3] اب ظاہر ہے تحائف کا لین دین اھل الذمہ / غیر مسلم شہریوں کی بھی ایک فطری ضرورت اور سماجی حق ہے۔ اس لیے اسلام نے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے تحائف لینے دینے کو جائز

---

[1] -شامی، ابن عابدین، ردالمحتار علی الدر المختار، ۵/ ۳۴۱

[2] -احکام اھل الذمہ ۱/ ۱۶۱

[3] -مثلاً ایک حدیث نبوی میں ہے: تهادوا تحابوا (ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے آپس میں محبت بڑھے گی) دیکھیے: بخاری، الادب المفرد (باب قبول الهدیہ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص:۸۷؛ اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے: "تهادوا فان الهدية تذهب وحر الصدر" (ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو بے شک ہدیہ دلی کینہ کو دور کر دیتا ہے) دیکھیے: ترمذی، جامع، (ابواب الولاء والهبة باب ماجاء فی حث النبی ﷺ علی الهدية) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/ ۴۷۹، رقم: ۲۱۳۰

قرار دیا ہے۔ اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر ایسا کرکے ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔[1] مثلاً حضرت ابو حمید الساعدیؓ سے مروی ہے کہ

غزوہ تبوک میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر ایلہ (شام) کے عیسائی بادشاہ (یوحنا بن رؤبہ) نے نبی اکرم ﷺ کو ایک سفید رنگ کا خچر ہدیے میں دیا اور آنجناب ﷺ کو ایک چادر بھی نذر کی۔ جس کے جواب میں آپ ﷺ نے اہل ایلہ کیلئے ان کا سمندری علاقہ لکھ دیا۔[2]

قبیلہ بنو نضیر اور ایک روایت کے مطابق بنو قینقاع کے یہودی مخیریق کی طرف سے وصیت کردہ سات باغات قبول فرمالیے جن کی آمدنی آپ کی ذاتی ہوگئی۔[3] اسی طرح غزوہ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے زہر آلود بکری کا گوشت بھیجا تو آپ نے اسے قبول کرلیا۔[4] علی ہذا القیاس حضرت علی المرتضیٰؓ فرماتے ہیں:

ان کسری اھدی لہ فقبل وان الملوک اھدوا الیہ فقبل منھم[5]

---

1 - دیکھیے: ابن قیم، زاد المعاد (فصل فی حکمہ فیما کان یہدیٰ الیہ) ۵/۷۷-۷۸؛ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۱۱۱، پیرہ ۶۳۳ تا ۶۳۶

2 - بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، باب اذا وادع الامام ملک القریۃ الخ)، ۱/۴۴۸، رقم: ۳۱۶۱؛ نیز بیہقی، السنن الکبریٰ (کتاب الجزیۃ باب ماجاء فی ھدایا المشرکین)، ۱۴۰/۷، رقم ۱۹۳۰۳؛ دارمی، سنن الدارمی، ۲/۲۳۳

3 - دیکھیے: ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور (خطبہ نظام مالیہ و تقدیم)، ص: ۲۷۷؛ ابن شبہ، تاریخ المدینۃ المنورہ، ۱۷۴-۱/۱۷۳

4 - بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الہبۃ وفضلہا الخ باب قبول الہدیہ من المشرکین)، ۱/۳۵۶، رقم: ۲۶۱۷؛ ابن خلدون، تاریخ (غزوہ خیبر)، ۲/۴۳۹

5 - ترمذی، جامع (ابواب السیر- باب ماجاء فی قبول ھدایا المشرکین)، ۱/۴۱۹، رقم: ۱۵۷۶؛ بیہقی، السنن الکبریٰ، (کتاب اباب مذکور)، ۱۴/۷۱، رقم: ۱۹۳۰۵

بے شک کسریٰ (شاہ ایران) نے آپ ﷺ کے لیے ہدیہ بھیجا جسے آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ علاوہ ازیں دیگر بادشاہوں نے آپ کی طرف ہدیے بھیجے جنہیں آپ نے قبول فرمایا۔

متعدد مفسرین و محدثین نے یہ روایت (جس کا ذکر پیچھے بھی ہو چکا ہے) نقل کی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی مشرکہ ماں بیٹی کیلئے کچھ تحائف لائی۔ حضرت اسماءؓ نے اس معاملے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے یہ تحائف قبول کرنے کی اجازت دی۔[1]

علی ہذا القیاس حضرت عمر فاروقؓ سے مکہ مکرمہ میں مقیم اپنے مشرک بھائی کو ایک ریشمی جبہ کا ہدیہ بھیجنا ثابت ہے۔[2]

جبکہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ اپنے غلام کو قربانی کا گوشت اپنے یہودی ہمسائے کو دینے کی نصیحت کرتے ہیں اور یہ ہدایت اتنی مرتبہ دہراتے ہیں کہ غلام حیرت سے یہودی ہمسائے کا اس قدر خیال کرنے کا سبب دریافت کرتا ہے۔ ابن عمروؓ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: **"ما زال جبريل يوصيني"** جبریل مجھے اس وقت تک ہمسائے سے بھلائی کی تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا

---

[1] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الہبۃ وفضلہ الخ باب الہدیۃ للمشرکین)، ۱/۳۵۷ رقم: ۲۶۲۰؛ ابن سعد، الطبقات الکبری (ترجمہ اسماء بنت ابی بکر)، ۸/۲۵۲ ؛ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، (تفسیر سورۃ الممتحنۃ آیت نمبر ۸) ۱۸/۴۰؛ زمخشری، کشاف، مرکز اہل السنۃ برکات رضا گجرات، انڈیا، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء، ۴/۵۰۳؛ قاضی ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ۱۱/۲۳۳؛ اندلسی ابن حیان، تفسیر البحر المحیط، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، ۸/۳۵۷

[2] - ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الہبۃ وفضلہ الخ باب ھدیۃ مایکرہ لبسھا، ۱/۳۵۶ رقم: ۲۶۱۲؛ وباب الہدیۃ للمشرکین، ۱/۳۵۷، رقم. ۲۶۱۸، نیز کتاب الادب باب صلۃ الاخ المشرک، ۲/۸۸۴، رقم: ۵۹۸۱

کہ نہیں اسے وراثت میں بھی حصہ دار نہ بناویں۔[1]

ہبہ بھی تحائف وہدایا کے زمرے میں آجاتا ہے۔ ہبہ کے معاملے میں اہل الذمہ مسلمانوں کی مانند ہیں۔ وہ ہبہ کرسکتے ہیں اور انہیں ہبہ کیا بھی جاسکتا ہے۔ فتاوی ہندیہ (فتاویٰ عالمگیری) میں ہے۔

واهل الذمة فى حكم الهبة بمنزلة المسلمين لانهم التزموا احكام الاسلام فيما يرجع الى المعاملات[2]

ہبہ کے حکم میں اہل الذمہ بمنزلہ مسلمانوں کے ہیں کیونکہ انہوں نے، عقد ذمہ کے ذریعے، معاملات سے متعلقہ تمام امور میں احکام اسلام کی پابندی کا التزام کر رکھا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں امام محمد کی السیر الکبیر کے حوالے سے ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے غیر مسلموں سے ہدایا قبول کرنے کی روایات متعارض ہیں۔ بعض میں ہدایا قبول کرنے اور بعض میں رد کر دینے کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قسم کی متعارض روایات میں علماء نے تطبیق یوں دی ہے کہ جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا تو وہ ایسا شخص ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ کا غالب گمان یہ تھا کہ یہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ پیغمبر اسلام اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے نہیں بلکہ مال و دولت کے طمع میں جنگ (جہاد) کرتے ہیں۔ اور جس غیر مسلم سے ہدیہ قبول فرمالیتے اس کے بارے میں غالب گمان یہ تھا کہ وہ درج بالا کی قسم کی سوچ نہیں رکھتا۔[3]

غیر مسلموں کے ساتھ لین دین

1۔ ابو داؤد، السنن، (کتاب الادب باب فی حق الجوار)، ۲/ ۳۶۰، رقم ۵۱۵۲؛ ترمذی، جامع (ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجوار)، ۲/ ۴۵۸، رقم: ۱۹۴۳

2۔ فتاوی ہندیہ، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ۴/ ۴۰۵

3۔ حوالہ مذکور، ۵/ ۳۴۷؛ نیز دیکھیے: بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب ماجاء فی ھدایا المشرکین للامام)، ۱۴/ ۶۹-۷۲

سماجی تعلقات و مراسم کا ایک اہم اور سر فہرست تقاضا باہمی لین دین، خرید و فروخت، کاروباری تعلقات اور معاملات بھی ہے۔ جو چیزیں شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں۔ مثلاً شراب اور خنزیر وغیرہ ان کی خرید و فروخت اور لین دین کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال ٹھہرایا ہے ان کی تجارت یا مالی لین دین غیر مسلموں سے ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

ان النبی ﷺ اشترىٰ طعاماً من یهودی الیٰ اجل ورهنه درعه من حدید[1]

بے شک نبی اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت تک کھانے کا سامان خریدا اور اس کے پاس اپنی لوہے کی زرہ رہن رکھی۔

حضرت عائشہؓ ہی کی ایک دوسری روایت ہے۔ یہ حیات نبوی ﷺ کے آخری دور کا واقعہ ہے، فرماتی ہیں:

توفی رسول الله ﷺ ودرعه مرهونة عند یهودی بثلاثین صاعا من شعیر[2]

رسول اللہ ﷺ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض بطور رھن رکھی ہوئی تھی۔

اسی طرح یہودی عالم زید بن سعنہ (جو آپ کے حلم اور کمال برداشت کو جانچنا چاہتے تھے اور پھر

---

[1] - بخاری، الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب شراء النبی ﷺ بالنسیئۃ نیز ابواب الرھن باب الرھن عند الیھود وغیرھم، ۱/۳۴۱ رقم: ۲۰۶۸ (امام بخاری نے اس روایت کو اپنی الصحیح میں متعدد مقامات پر نقل کیا اور اس سے مختلف مسائل کا استنباط کیا ہے۔ تفصیل بلا ضرورت طوالت کا باعث ہوگی)؛ مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب المساقاۃ والمزارعۃ باب الرھن وجوازہ فی الحضر والسفر)، ۲/۳۱، رقم: ۴۱۱۵

[2] - دیکھیے: بخاری: الجامع الصحیح، کتاب المغازی باب وفاۃ النبیؐ، ۲/۶۴۱ رقم: ۴۴۶۷؛ نیز کتاب الجہاد باب ما قیل فی درع النبی والقمیص فی الحرب، رقم: ۲۹۱۶؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/۴۴۳؛ ابو یعلی الموصلی، مسند، ۴/۱۱۷؛ قسطلانی، المواھب اللدنیہ، ۲/۳۸۵؛ خفاجی شہاب الدین، نسیم الریاض شرح الشفاء للقاضی عیاض، ۱/۴۷۴

بعد میں مسلمان ہو گئے) سے حضور ﷺ کا قرض لینا ثابت ہے۔[1] علی ہذا القیاس حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہم لوگ موجود تھے کہ ایک مشرک جو پراگندہ بال اور دراز قد تھا، کچھ بکریاں لے کر پہنچا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا یہ فروخت کیلئے ہیں یا تحفہ ہیں؟ اس نے کہا فروخت کیلئے ہیں تو آپ نے اس سے ایک بکری خریدی۔[2]

حضور اکرم ﷺ کا ایک یہودی سے طعام ادھار لینے کے عوض اس کے ہاں اپنی زرہ بطور رہن رکھوانے کی درجہ بالا حدیث کی شرح میں علامہ نووی فرماتے ہیں:

فیہ جواز معاملۃ اھل الذمۃ۔۔۔۔۔۔۔ وقد اجمع المسلمون علی جواز معاملۃ اھل الذمۃ وغیرھم من الکفار اذالم یتحقق تحریم مامعہ[3]

اس حدیث میں اہل الذمہ کے ساتھ معاملہ (لین دین) کا جواز پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور تمام مسلمانوں کا اھل الذمہ اور دوسرے کفار سے معاملہ (لین دین) کے جواز پر اجماع ہے جب کہ غیر مسلم کے پاس موجود چیز کی حرمت ثابت نہ ہو۔

بعض محدثین اور سیرت نگاروں نے حضور اکرم ﷺ کے ناظم مالیات حضرت بلالؓ کی زبانی ایک مشرک (ذمی) سے حضور ﷺ کے لیے قرض لیتے رہنے اور پھر اس کے حضرت بلالؓ کے ساتھ اس قرض کی وصولی کے لیے انتہائی سختی اور بدتمیزی سے پیش آنے (جس کی وجہ سے حضرت بلالؓ کچھ عرصہ کے لیے مدینہ سے چلے جانے اور روپوش ہونے کے لیے تیار ہو گئے مگر اللہ نے اگلے دن اس قرض کی ادائیگی کا غائب

---

[1] دیکھیے: قاضی عیاض، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ (فصل واما الحلم)، ۱/۱۰۹؛

نوٹ: اس قرض کی ادائیگی میں حضور ﷺ نے جس کمال حلم اور مروت و احسان کا مظاہرہ فرمایا، قاضی عیاض نے یہاں اس کی تفصیل بھی لکھی ہے۔

[2] بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب البیوع باب الشری والبیع مع المشرکین واھل الحرب)، ۱/۲۹۵، رقم: ۲۲۱۶

[3] نووی، شرح صحیح مسلم (مع مسلم) کتاب المساقاۃ والمزارعۃ باب الرھن وجوازہ فی الحضر کالسفر، ۲/۳۱

سے سامان فرمادیا اور وہ رک گئے) کی ایک طویل روایت لکھی ہے۔ اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ غیر مسلموں / ذمیوں سے لین دین کرتے تھے۔ نیز انہیں اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ بعض اوقات بدتمیزی پر بھی اتر آتے تھے۔[1]

صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ کے والد کا ایک یہودی سے تیس وسق کھجور قرض لینا اور حضرت جابرؓ کو مہلت دینے کے لیے حضور ﷺ کے اس یہودی سے سفارش کرنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اھل الذمہ سے لین دین کرتے تھے۔[2]

اہل الذمہ سے لین دین کے معاملے میں تمام شرعی نصوص اقوال ائمہ اور فقہی تصریحات کو مدنظر رکھتے ہوئے کویت کے مشہور فقہی انسائیکلوپیڈیا "الموسوعۃ الفقہیہ" میں یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ:

> عام قاعدہ یہ ہے کہ اہل الذمہ خرید و فروخت، اجارہ، کرایہ داری / ملازمت اور دوسرے مالی تصرفات جیسے معاملات میں مسلمانوں کی مانند ہیں۔ (سوائے شراب، خنزیر اور ان جیسی حرام چیزوں کے معاملہ کے جسکی تفصیل آگے آئیگی) اور اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ ذمی پر مالی معاملات میں اسلامی احکام کی پابندی لازم ہے۔ پس خرید و فروخت، اجارہ، مضاربت، مزارعت اور ان جیسے دوسرے مال معاملات و تصرفات جو مسلمانوں سے جائز ہیں وہ اہل ذمہ سے بھی جائز ہیں۔ البتہ ان سے سودی معاملات اور دوسرے فاسد و ممنوع معاملات جو مسلمانوں سے صحیح نہیں وہ ان سے بھی صحیح نہیں جیسا کہ مذاہب (فقہیہ) کے فقہاء نے اس چیز کی صراحت کی ہے۔[3]

---

[1] - دیکھیے: ابو داؤد، السنن (باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین۔ کتاب الخراج والفئی والامارۃ)، ۲/ ۸۲، رقم ۳۰۵۳؛ بیہقی۔ دلائل النبوۃ، مکتبہ اشرفیہ، لاہور، ۱/ ۳۴۸-۳۵۰

[2] - بخاری، الجامع الصحیح، (کتاب فی الاستقراض باب اذا قاص او جازفہ فی الدین فھو جائز)، ۱/ ۳۲۲، رقم: ۲۳۹۶

[3] - الموسوعۃ الفقہیۃ (لفظ اھل الذمۃ)، ۷/ ۱۳۱

سنن ابی داؤد میں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بیمار ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے اور انہیں ایک عیسائی طبیب سے علاج کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا:

ایت الحارث بن کلدہ اخا ثقیف فانہ رجل یتطبب[1]

قبیلہ ثقیف کے حارث بن کلدہ کی طرف رجوع کرو وہ ایک معالج آدمی ہے۔

دوسری طرف آپ ﷺ نے حارث بن کلدہ کو بھی حکم دیا کہ "عالج سعد مما بہ" سعد جس مرض میں مبتلا ہے اس کا علاج کرو۔

اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

وھذا الحدیث یدل علی جواز الاستعانۃ باھل الذمۃ فی الطب[2]

اور یہ حدیث علاج معالجہ میں اہل الذمہ سے مدد لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

جبکہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا باس بان یکون بین المسلم والذمی معاملۃ اذا کان مما لا بد منہ[3]

اس بات میں شرعاً کوئی حرج نہیں کہ مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی معاملہ ہو جبکہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو۔

اسی طرح ابن تیمیہ غیر مسلموں کے ساتھ لین دین اور کوئی معاملہ کرنے کے جواز پر فتویٰ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

واذا کان الیھودی او النصرانی خبیر ابالطب ثقۃ عند الانسان جازلہ ان یستطبہ کما یجوزلہ ان یودعہ المال وان یعاملہ وقد

1- ابو داؤد، السنن، کتاب الطب فی ثمرۃ العجوۃ، ۲/۱۸۵، رقم ۳۸۷۹

2- عسقلانی، ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، دار المعرفہ بیروت، لبنان، ۱۴۲۵ھ / ۲۰۰۴ء، ۱/۳۲۸

3- فتاویٰ عالمگیری (طبع مذکور) ۵/۳۴۸

استأجر رسول اللهﷺ رجلاً مشركاً لما هاجر وكان هادياً ماهراً بالهداية الى الطريق من المكة الى المدينة وأتمنهٔ على نفسه وماله وقد روى ان الحارث بن كلدة۔ وكان كافراً۔ امرهم رسول اللهﷺ ان يستطبوه۔[1]

اگر کوئی یہودی یا نصرانی طب میں مہارت رکھتا اور آدمی کے نزدیک قابل اعتماد ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس سے علاج کرا لے۔ جس طرح سے یہ بات جائز ہے کہ اس کے پاس مال بطور امانت رکھوایا جائے اور اس سے معاملہ کیا جائے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک آدمی کو اجرت پر حاصل کیا جب کہ آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔ کیونکہ وہ آدمی مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف راستے کا جاننے والا اور ماہر راہ شناس تھا۔ اور اس طرح گویا آپ نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان اور مال اس کی امانت میں دے دیا۔ علاوہ ازیں روایت ہے کہ ایک کافر طبیب حارث بن کلدہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم فرمایا تھا کہ وہ اس سے علاج کرائیں۔

اس سلسلے میں یہ بات چنداں دلیل اور غور و فکر کی محتاج نہیں کہ کسی طبیب و حکیم یا ڈاکٹر سے علاج کرانا گویا اپنی زندگی کو اس کے ہاتھ دینے کے مترادف ہے اور اتنا اعتماد ہر شخص پر نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً ایسا آدمی جو مسلمان ہی نہیں بلکہ اسلام دشمن ہے۔ لیکن یہ اسلام کی رواداری اور وسعت ظرفی ہے کہ وہ غیر مسلم طبیب سے علاج معالجہ کرانے اور معاملہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

[1] - ابن تیمیہ، مختصر الفتاوی المصریۃ، دار ابن قیم دمام، سعودی عرب، ۱/ ۴۸۰

پانچویں فصل

غیر مسلموں سے قلبی اور رازدارانہ تعلق - شرعی نقطۂ نظر

گزشتہ ابواب کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں / اھل الذمہ سے صرف سماجی تعلقات و مراسم ہی کی اجازت نہیں دی بلکہ ان کے ساتھ ہر ممکن حسن سلوک، رواداری، ہمدردی، خیر خواہی، نفع رسانی، نیکی اور انصاف کرنے کی بھی تعلیم دی ہے اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام ﷺ، خلفائے اسلام، صحابہ کرام اور دیگر سلف صالحین نے عملی طور پر ایسی مثالیں چھوڑی ہیں، جن کی نظیر دنیا کی دیگر اقوام میں ملنا مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن مجید کی متعدد آیات اور کئی احادیث میں اجمالاً یا تفصیلاً اہل ایمان کو غیر مسلموں کے ساتھ باطنی و دلی محبت اور رازدارانہ دوستی سے منع بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً فقیہہ، مفسر امام جصاصؒ نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ الخ کی تفسیر میں اس مضمون پر مشتمل بارہ عدد آیات قرآنی کے علاوہ ایک حدیث نبوی ﷺ بھی درج کی ہے۔ موصوف نے سورۃ آل عمران کی مذکورہ آیت کی وضاحت میں لکھا ہے کہ نحوی ترکیب کے اعتبار سے اس آیت میں خبر نہیں بلکہ کفار کو دوست بنانے سے نہی ہے۔ اور استدلال میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

نھی اللہ تعالیٰ المومنین بھذہ الآیۃ ان یلاطفوا الکفار[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین کو اسی بات سے منع کیا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔

پھر علامہ جصاصؒ نے ان قرآنی آیات اور آثار کے مد نظر لکھا ہے:

---

1 - احکام القرآن، دار الکتاب العربی، بیروت۔ لبنان، س۔ن، ۹/۲

فهذه الآية والآثار دالة على انه ينبغي ان يعامل الكفار بالغلظة والجفوة دون الملاطفة والملائمة[1]

پس یہ آیات اور آثار اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفار کے ساتھ نرمی اور ملائمت کی بجائے سختی اور تند مزاجی سے معاملہ کیا جائے۔

تعلقات کے مختلف درجات اور ان کا شرعی حکم

قرآن وسنت کی ان نصوص میں تعارض دیکھ کر حقیقت حال سے ناواقف یا عیب جو غیر مسلموں کو تو یہ کہنے کا موقعہ مل جاتا ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کی رواداری، برداشت اور حسن اخلاق کی بھی گنجائش نہیں، جبکہ دوسری طرف سطحی نظر رکھنے والا ایک عام مسلمان بھی شکوک وشبہات اور تردد میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ غیر مسلموں سے عمومی حسن سلوک، ہمدردی خیر خواہی اور دلی اور رازدارانہ محبت، موالات اور بطانۃ میں فرق کی وضاحت کر دی جائے اور اس امر کی صراحت بھی آ جائے کہ ان میں کونسا درجہ جائز ہے اور کونسا ناجائز۔ تو یہ بات چنداں محتاج دلائل نہیں کہ دو آدمیوں، دو جماعتوں یا دو ممالک کے درمیان تعلقات مختلف نوعیت یا مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ ایک درجہ تو مواسات یعنی انسانی ہمدردی، خیر خواہی، نیکی اور انصاف کا ہے۔ تعلق کا یہ درجہ ان تمام کفار کے ساتھ جائز ہے جو اہل اسلام کے خلاف برسرپیکار نہ ہوں اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس معاملے میں قرآن کی ہدایت ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ [2]

تعلقات کا یہ درجہ جب تمام غیر محارب کافروں کے ساتھ جائز ہے تو اہل الذمہ غیر مسلموں کے

---

[1] ۔حوالہ مذکور

[2] ۔الممتحنہ، ۶۰:۸

ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز بلکہ ضروری ہو گا۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ وہ لوگ اہل اسلام کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام کے قریب ہوں گے۔

تعلقات کا دوسرا درجہ مدارات کا ہوتا ہے جس کے معنی ظاہری خوش اخلاقی اور دوستانہ برتاؤ کے ہیں۔ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے جبکہ اس سے مقصود انہیں دینی نفع پہنچانا ہو یا وہ کسی مسلمان کے ہاں مہمان ٹھہریں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو۔ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸ میں "الا ان تتقوا منہم تقۃ" سے یہی درجہ مراد ہے۔ یعنی کافروں سے موالاۃ (قلبی تعلق) جائز نہیں مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات بھی بظاہر موالات کی شکل ہوتی ہے اس لیے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ علامہ جصاص نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب ایک مسلمان کو اپنی جان کے تلف ہونے یا کسی عضو کے تلف ہونے یا کسی سخت جانی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ غیر مسلم سے دلی اعتقاد کے بغیر نرمی اور موالاۃ کا اظہار کرے۔[1]

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

ای تخافوا مخافۃ فلکم موالاتھم باللسان دون القلب وھذا قبل عزۃ الاسلام ویجری فیمن ھو فی بلد لیس قویاً فیھا[2]

یعنی اگر تمہیں ان سے خوف و اندیشہ ہو تو تمہارے لیے ان کی زبانی کلامی دوستی جائز ہے نہ کہ دلی دوستی، یہ حکم بھی اسلام کے غلبہ سے قبل تھا۔ البتہ ایسا علاقہ جہاں مسلمان طاقتور نہ ہوں وہاں اب بھی یہی حکم لاگو ہو گا۔

باہمی تعلقات کا تیسرا درجہ لین دین اور معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کیے جائیں۔ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ انہیں اپنا ملازم رکھنا یا

---

[1] ۔ احکام القرآن، ۲/ ۹

[2] ۔ تفسیر جلالین، تاج کمپنی، کراچی، ص: ۵۴

خود ان کے اداروں اور کارخانوں وغیرہ میں ملازمت کرنا یہ سب جائز ہے، معاملات اور لین دین جب عام کفار کے ساتھ بھی جائز ہے تو اہل الذمہ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا۔

باہمی تعلقات کا چوتھا درجہ قلبی موالاۃ یا دلی و باطنی محبت و مودت خصوصاً قومی، حکومتی، ریاستی اور دینی معاملات یا ملکی سیاست کے داخلہ و خارجہ رازوں میں ان پر اعتماد و تعاون کا ہے تو تعلق کا یہ درجہ صرف اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے۔ طاقتور سے طاقتور اور قریبی سے قریبی غیر مومن کے ساتھ محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کسی مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ قرآن مجید نے سختی سے اہل ایمان کو اس سے منع کیا ہے۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ علامہ جصاصؒ نے اس مضمون کی بارہ آیات نقل کی ہے۔ غیر اہل ایمان کے ساتھ اس قسم کی گہری دوستی اور رازدارانہ تعلق سے کیوں شدت سے منع کیا گیا ہے۔؟ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کی بھی صراحت کر دی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ۔۔۔۔۔۔ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ[1]

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اپنا دوست مت بناؤ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو، تم ان کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ وہ کھلا کفر (اور انکار) کر چکے ہیں اس دین حق کا جو تمہارے پاس آچکا ہے (تمہارے خالق و مالک کی طرف سے) اور وہ نکالتے ہیں اللہ کے رسول کو اور خود تم کو (تمہارے گھروں سے) محض اس بناء پر کہ تم لوگ ایمان رکھتے ہو اللہ پر جو کہ رب ہے تم سب کا (پس تم ایسوں کو اپنا دوست مت بناؤ)۔ اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے اور میری رضا جوئی کی خاطر نکلے ہو تم ان کی طرف چھپا کر دوستی کے پیغام بھیجتے ہو اور مجھے خوب معلوم ہے وہ سب کچھ بھی جو کہ تم لوگ چھپا کر کرتے ہو اور وہ سب کچھ بھی جو کہ تم اعلانیہ طور پر کرتے ہو اور (جان لو

---

[1] - الممتحنة، ۶۰:۱

کہ) تم میں سے جس نے بھی ایسا کیا وہ یقیناً بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔[1]

درج بالا آیت کا حکم اگرچہ عام ہے، تاہم اس کے شان نزول میں جو ایک خاص واقعہ پیش آیا وہ بھی چونکہ زیر بحث موضوع سے متعلق ہے، اس لیے مختصراً اس کا اندراج بھی بے جا نہ ہو گا۔ جو کچھ اس طرح ہے کہ کفار مکہ اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان ۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر جو مشہور معاہدہ ہوا تھا، اہل مکہ نے اس کی خلاف ورزی کی۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو خفیہ طور پر مکہ پر حملہ کی تیاری کا حکم دے دیا۔ ایک مہاجر اور بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ جن کی قریش کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہ تھی اور ان کے بیوی بچے ابھی مکہ ہی میں تھے، نے سوچا کہ میں قریش مکہ کو آپ ﷺ کی تیاری کی اطلاع کر دوں تاکہ اس احسان کے بدلے وہ میرے بیوی بچوں کا خیال رکھیں۔ چنانچہ مکہ مکرمہ جانے والی ایک خاتون کے ہاتھ اس اطلاع پر مشتمل ایک خط اہل مکہ کی طرف روانہ کر دیا۔ حضور ﷺ نے اپنے نور نبوت اور نور وحی سے دیکھتے ہوئے تین صحابہ، حضرت علیؓ، مقدادؓ اور زبیرؓ سے فرمایا کہ جاؤ روضہ خاخ پر تمہیں ایک عورت ملے گی اس کے پاس ایک خط ہے وہ لے آؤ چنانچہ یہ حضرات گئے اور ٹھیک روضہ خاخ پر اس عورت کو پا لیا۔ پہلے تو اس نے بات کو چھپانے کی کوشش کی مگر جب حضرت علی المرتضیٰؓ نے سختی سے خط دینے کو کہا تو اس نے وہ خط نکال کر دے دیا جو اس نے سر کے بالوں میں چھپا رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے وہ خط دیکھا تو حضرت حاطبؓ سے پوچھا یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں نے کفر اختیار کیا ہے نہ اسلام سے پھرا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے اہل و عیال مکہ میں ہیں، وہاں ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں۔ میں نے اس خط کے ذریعے اہل مکہ پر ایک قسم کا احسان کر کے یہ چاہا کہ وہ لوگ اس کے بدلے میں میرے اہل و عیال کا خیال رکھیں گے۔ فتح و نصرت کے جو وعدے اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیے ہیں وہ یقیناً پورے ہو کر رہیں گے کسی کے روکے رک نہیں سکتے۔ حضرت عمرؓ کے اس حرکت پر طیش میں آنے اور اس منافقت کے جرم میں ان کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کرنے کے باوجود آپ ﷺ نے ان کی سچائی اور بدری صحابی ہونے کی بناء پر انہیں معاف فرما دیا۔ تاہم

---

[1] - قادری، غلام سرور مفتی، عمدۃ البیان فی ترجمۃ القرآن، عمدۃ البیان پبلشرز لاہور، ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء، ص: ۹۲۰
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، دار المعارف، کراچی، طبع جدید، ۲ / ۵۰-۵۱

اللہ نے تنبیہ کے طور پر یہ آیت اور اس کے مابعد کی آیات نازل فرمادیں تاکہ آئندہ کوئی مومن کسی دشمن اسلام کے ساتھ اس طرح کا تعلق مودت قائم نہ کرے۔[1]

زیر بحث موضوع کے حوالے سے دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۱۱۸ء

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم اپنوں کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی (اور بربادی) میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ تم لوگ تکلیف اور (نقصان) ہی میں مبتلا رہو، ان کے دلوں کا بغض ان کے مونہوں سے نکلا پڑتا ہے، اور جو کچھ انہوں نے اپنے سینوں میں چھپا رکھا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، ہم نے تو کھول کر بیان کر دیں تمہارے لئے (حقیقت سے آگاہ کرنے والی) نشانیاں (سو تم احتیاط سے کام لو) اگر تم عقل رکھتے ہو۔

امام راغب اصفہانی اور علامہ قرطبی وغیرہ نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ بطانۃ کا مفہوم لکھا ہے:

"بطانۃ" کسی آدمی کے اس خاص دلی اور راز دار دوست اور اس کے معاملات میں دخیل شخص کو کہا جاتا ہے جسے وہ اپنے احوال اور اندرونی معاملات پر مطلع کرے۔[2]

علیم بذات الصدور اللہ کریم نے دشمنان اہل اسلام کی نفسیات اور اہل ایمان سے متعلق

---

[1] - ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب التفسیر تفسیر سورۃ الممتحنۃ) ۲/۷۲۶ رقم: ۴۸۹۰؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الفضائل باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعہ)، ۲/ ۳۰۲، رقم: ۶۴۰۱؛ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۸۸ھ ۴/ ۳۴۴-۳۴۵

[2] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۴/ ۱۷۸؛ راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، نور محمد کراچی. س۔ن، ص:۵۱

ان کی فکر و سوچ کے مد نظر صاف صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا قومی و دینی معاملات میں کسی کو اپنا بھیدی اور راز دار نہ بنائیں۔ کیونکہ یہودی ہوں یا نصاری، منافقین ہوں یا مشرکین ان میں کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیر خواہ نہیں بلکہ یہ لوگ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمہیں بے وقوف بنا کر یا بظاہر خیر خواہ بن کر تمہیں نقصان پہنچائیں۔ ان کی آرزو یہ ہے کہ تم ہمیشہ کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہو۔ جو دشمنی بغض اور خباثت وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے بے ساختہ اظہار کر رہے ہیں۔

غیر مسلموں سے قلبی محبت میں مانع۔ انکی عداوت

کفار کے ساتھ قلبی محبت و مودت کی ممانعت کا حکم ان کی اہل اسلام کے ساتھ اسی جبلی عداوت کی بنا پر ہے نہ کہ کسی مذہبی تعصب کی بنا پر۔ علامہ القرافی نے ان کے بغض و عناد کے بارے میں لکھا ہے:

وینبغی لنا ان نستحضر فی قلوبنا ماجبلوا علیہ من بغضنا وتکذیب نبیناﷺ وانہ لو قدروا علینا لا ستأ صلوا شافتنا واستولوا علی دمائنا واموالنا وانھم من اشد العصاۃ لربنا وما لکنا عزوجل ثم نعاملھم بعد ذالک بما تقدم ذکرہ امتثالا لامر ربنا عزوجل وامر نبیناﷺ لامحبۃ فیھم ولا تعظیماً لھم[1]

> اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بارے میں ان کے جبلی و طبعی بغض اور ہمارے نبی پاک ﷺ کی تکذیب کو اپنے دلوں میں مستحضر رکھیں۔ اور اگر وہ لوگ ہمارے اوپر قدرت پالیں، تو یقیناً ہمیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور ہمارے خونوں، جانوں اور مالوں پر قابض ہو جائیں اور بلاشبہ وہ لوگ ہمارے پروردگار اور ہمارے مالک عزوجل کے شدید ترین نافرمان ہیں۔ اس کے بعد بھی ہم ان سے جو حسن سلوک کا معاملہ کرتے ہیں جس کا

---

[1] - الفروق، ۳/۳۱

ذکر پیچھے گزر چکا ہے، تو وہ اپنے پروردگار عزوجل کے حکم اور اپنے نبی ﷺ کے حکم کے امتثال میں ہے نہ کہ ان کی محبت میں اور نہ ان کی تعظیم کیلئے۔

علامہ قرافی نے کفار کی جس جبلی اسلام دشمنی اور بغض وعناد اور ان کے ساتھ شرعاً قلبی مودت نہ رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ ان کے ساتھ مذہبی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ ان شواہد کی بنیاد پر ہے جن کا اظہار ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ حال ہی میں اس باطنی عداوت اسلام کی ایک زندہ مثال حقوق انسانی کے علمبردار فرانس میں فرانسیسی پارلیمنٹ کی طرف سے مسلمان خواتین وطالبات پر حجاب ونقاب کی پابندی کی قرارداد کی متفقہ منظوری ہے۔[1]

کوئی عیسائی نن سر ڈھانپے تو وہ درست مگر کوئی مسلمان عورت پردہ کرلے تو وہ انہیں برداشت نہیں۔ یہ پردہ اور برقعہ ان کے نزدیک "دہشت گردی" کے زمرے میں آجاتا ہے۔ اسی طرح مغربی ممالک کے کفار کو قرآن مجید اور پیغمبر اسلام ﷺ جو رحمۃ للعالمین بن کر تشریف لائے اور جنہوں نے اپنے قول وعمل سے محسن انسانیت ہونے کا ثبوت دیا، لمحہ بھر کیلئے گوارا نہیں۔ مغرب میں جس طرح مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کو نذر آتش کرکے اور پیغمبر اسلام کے مزاحیہ اور ہتک آمیز خاکے بنا کر اسلام کے خلاف خبث باطن کا اظہار کیا گیا، وہ دور کی نہیں کل کی بات ہے۔[2] الغرض غیر مسلموں سے عدم موالات کا حکم ان کے اہل اسلام کے ساتھ بغض وعداوت کی وجہ سے ہے نہ کہ مذہبی تعصب کی بنا پر۔ چنانچہ علامہ رشید رضا نے سورۃ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۱۸ کی تفسیر میں غیر مسلموں سے بطانۃ (دلی

---

[1] - روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۲ مئی ۲۰۱۰ء، صفحہ آخر

[2] - دیکھیے: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، مؤرخہ ۱۴ جنوری ۲۰۰۶ء، ۸ فروری ۲۰۰۶ء، ۸ فروری ۲۰۱۰ء، ۲۰ مئی ۲۰۱۰ء: روزنامہ جنگ لاہور، مؤرخہ ۲۴ جنوری ۲۰۰۶ء، ۲۰ مئی ۲۰۱۰ء؛ روزنامہ انصاف لاہور، ۶ فروری ۲۰۰۶ء؛ ماہنامہ محدث لاہور شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء؛ ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء؛ ماہنامہ البرہان لاہور، شمارہ اگست ۲۰۱۰ء

دوستی) کی ممانعت کو ان کے بغض وعداوت اور اسلام دشمنی سے مشروط قرار دیا ہے اور اپنے اس موقف پر بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ ساتھ ہی غیر مسلموں کی اہل اسلام کے ساتھ کھلم کھلا دشمنی کے باوجود مشرقی حکمرانوں کا اپنے ذاتی مفادات کی خاطر انہیں اپنا رازدار حتی کہ حکومتی اور گھریلو معاملات میں ان پر اعتماد کرنے کے طرز عمل پر اظہار افسوس بھی کیا ہے۔[1]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے غیر مسلموں سے موالاۃ اور دلی دوستی سے ممانعت کے حکم پر مشتمل آیات کی وضاحت میں لکھا ہے:

> چونکہ ایک مسلمان کا دلی تعلق صرف امت مسلمہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس لیے ان لوگوں کو دوست بنانے کی ممانعت کئی آیات میں "من دون المومنین" کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ یعنی کوئی مسلمان اپنی جماعت (امت مسلمہ) کے مقابلے میں ان سے محبت رکھے اور ان کا قرب حاصل کرے۔ بے شک کوئی نظام زندگی دینی ہو یا وضعی اپنے کسی پیروکار کو اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنی جماعت کو چھوڑ کر کسی اور جماعت سے تعلقات استوار کرے۔ بالفاظ دیگر اس کام کا ارتکاب کریں جسے وطنیت کی اصطلاح میں غداری (خیانت) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[2]

قرآن مجید کی درج بالا صریح نصوص، واضح حکم اور کفار کی کھلم کھلا دشمنی کے باوجود مسلمان حکمرانوں نے اپنے ذاتی مفادات، اغیار سے مرعوبیت، ایمانی حمیت وغیرت سے کورا اور اسلامی تعلیمات سے نابلد ہونے کا جو ثبوت دیا اور جس کے باعث امت مسلمہ زوال وادبار کا مسلسل شکار ہوتی گئی، اس کا رونا پانچویں صدی ہجری کے مشہور عالم ومفسر امام قرطبی نے یوں رویا تھا:

وقد انقلبت الاحوال فی هذه الازمان باتخاذ اهل الکتاب کتبه وامناء وتسودو ابذالک

---

[1] ۔ملاحظہ ہو: تفسیر المنار، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۴/ ۷۱-۷۳

[2] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۷۴

عند الجهلة الاغنياء من الولاة والا مراء [1]

اور اس زمانہ میں حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ اھل کتاب کاتبوں اور امینوں کے اہم مناصب پر فائز ہیں اور یوں وہ حکمرانوں اور جاہل سرمایہ داروں کے ہاں سردار بن چکے ہیں۔

یہ صورت حال تو آج سے دس گیارہ صدیاں قبل کی ہے مگر آج غیر مسلم اقوام اور مغربی طاقتیں پاکستان سمیت عالم اسلام کے زیادہ تر ممالک میں جس طرح دخیل ہو چکی ہیں، وہ مسلمان ممالک پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہیں اور کس طرح انکی مرضی کے مطابق تمام حکومتی معاملات چلائے جا رہے ہیں۔ اور ان کی خواہش پر کس طرح داخلی و خارجی امور میں فیصلے کیے جاتے ہیں یہ ایک الگ المناک اور افسوسناک داستان ہے جس کی تفصیل کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

غیر مسلموں سے رازدارانہ تعلق ممنوع ہونے کی عقلی وجہ

درج بالا نقلی دلائل کے علاوہ اگر عقلی اعتبار سے بھی زیر بحث مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو یہ بالکل عقلی اور منطقی چیز ہے۔ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں: "یقیناً ہر تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام وبقاء اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروں کو اس کے ان مخالفین کے میل جول رازداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازشوں سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جبکہ اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج ولشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو یا مخالفین غلط شبہات اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس قسم کی آیتیں (مثلاً سورۃ آل عمران آیت نمبر ۲۸ اور سورۃ توبہ آیت نمبر ۲۳) اسی موقعہ کی ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آراء ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہو گی فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہو گی جو اس حق کے مٹانے کیلئے

---

[1] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، (سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۱۸) دارالکاتب العربیہ مصر، ۴/۱۷۹

ایزی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے۔[1]

علامہ موصوف کفار و مشرکین سے عدم موالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزوردلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تا کہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمان کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا (اس کے بعد استدلال میں اس مضمون کی متعدد آیات قرآنی درج کی گئی ہیں)۔[2]

علاوہ ازیں یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دشمنان اسلام کی طرف دلی میلان، اور ان کے ساتھ ہر وقت اختلاط اور میل جول زیادہ رکھتے ہیں ان کے اندر سے آہستہ آہستہ قومی تشخص (دینی تصلب) ملی خودداری اور ایمانی حمیت وغیرت رخصت ہو جاتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے کہ جو چیز ممنوع کام کا ذریعہ بنے وہ خود بھی ممنوع ہوتی ہے۔[3] اسلام میں دوسری اقوام کی وضع قطع اختیار کرنے اور ان کی صحبت ومشابہت اختیار کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ انہی وجوہ کی بنا پر ہے۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

---

[1] ۔سیرت النبی، الفیصل لاہور، ۶/ ۸۳

[2] ۔حوالہ مذکور، ۶/ ۸۴

[3] ۔کل امر یتذرع الی محظور فھو محظور ، دیکھیے: خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الزکوۃ۔۔الفصل الاول)، ص: ۱۵۶، رقم: ۱۷۷۹

المرء علیٰ دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل۔[1]

آدمی اپنے دلی دوست کے طور طریقے / دین پر ہوتا ہے اس لیے تم میں سے ہر ایک کو غور کر لینا چاہیے کہ وہ کس آدمی سے دوستی کر رہا ہے۔

کسی غیر مسلم آدمی کو اپنے معاملات خصوصاً حکومتی اور سیاسی امور میں دخیل اور بھیدی بنانا کتنا نازک اور احتیاط طلب معاملہ ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ سے کہا گیا کہ یہاں ایک عیسائی آدمی ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے اور خوشخط ہے اگر اس کو آپ اپنا میر منشی (سیکرٹری) رکھ لیں تو بہتر ہے۔ فرمایا: لا اخذ بطانة من دون المومنین[2] میں اہل ایمان کو چھوڑ کر ایک غیر مسلم کو بھیدی اور راز دار نہیں بناؤں گا۔

اسی طرح یمن کے والی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے یمن میں ایک ذمی کو اپنا کاتب، سیکرٹری تعینات کر لیا تو حضرت عمر بن الخطابؓ نے ابو موسی اشعریؓ پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اسے معزول کرنے کا حکم دیا۔[3]

ایک روایت کے مطابق حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اپنے سرکاری حساب کتاب کا رجسٹر (روزنامچہ) لے کر حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور اسے آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے اسے بڑا پسند کیا اور ابو موسیٰؓ سے فرمایا: تمہارا کاتب کہاں ہے اسے بلاؤ وہ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنائے۔ اس پر حضرت ابو موسیٰؓ نے کہا: وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ آپ نے پوچھا کیا وہ جنبی (ناپاک) ہے؟ انہوں نے کہا نہیں وہ نصرانی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے انہیں ڈانٹ پلائی اور فرمایا۔ جب اللہ نے انہیں مسلمانوں کے معاملات سے دور رکھا ہے تو انہیں قریب مت کرو اور جب اللہ نے انہیں ان کے کفر کے باعث قابل اہانت ٹھہرایا ہے تو سرکاری مناصب پر فائز

---

[1] ۔ خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (کتاب الادب، باب الحب فی اللہ، الفصل الثانی)، رقم: ۵۰۱۹؛ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب من یومر ان یجالس، رقم: ۴۸۳۳

[2] ۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۴/۱۷۹

[3] ۔ ابن العربی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ، احکام القرآن، دار المعرفۃ بیروت۔ لبنان، ت۔ن، ۱/۲۶۷

ر کے انکی تعظیم و تکریم مت کرو۔[1] جبکہ علامہ قرافی نے اس روایت کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ:

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ عریضہ لکھا کہ بصرہ میں ایک نصرانی آدمی ہے۔ جس کے سوا کوئی خراج / محصولات کا حساب کتاب صحیح طریقے سے لکھ نہیں سکتا اور اس مجبوری کے باعث اسے محصولات کی وصولی کا نگران مقرر کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت عمرؓ نے جوابی خط میں انہیں ایسا کرنے سے روکتے ہوئے لکھا: مات النصرانی والسلام ،(وہ نصرانی فوت ہو گیا۔ والسلام) یعنی یہ فرض کر لو کہ وہ نصرانی مر گیا۔ اس کی موت کی صورت میں جو انتظام تم کرو گے وہ اس وقت کر لو۔[2]

زیر بحث معاملے میں گزشتہ تفصیلات و تصریحات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کفار کے ساتھ قلبی اور راز دارانہ تعلق و محبت کی ممانعت بطور خاص دینی اجتماعی قومی ملی اور اہم سیاسی و انتظامی معاملات کے لیے ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذاتی اور دینوی معاملے میں کسی قابل اعتماد غیر مسلم پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے کوئی راز کی بات کرلے تو شرعاً ناجائز نہ ہوگا جس کی دلیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نبوی ﷺ کے سفر میں حضرت ابو بکرؓ نے بنی وائل کے ایک آدمی عبداللہ بن اریقط دیلی کو اجرت پر راہبری کیلئے ہمراہ لیا تھا۔ یہ عبداللہ اگرچہ مذہباً کافر و مشرک تھا مگر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے اس انتہائی رازدارانہ اور پر خطر معاملے میں بھی اس پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے سپرد کی گئیں اونٹیاں غار ثور کے باہر لایا اور یہ مختصر سا قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔[3]

---

1 - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۴/۱۷۹؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/۵۳۲؛ بیہقی، السنن الکبری، ۱۴/۴۸؛ رقم ۱۹۳۳۹

2 - الفروق، ۳/۳۲

3 - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، باب الہجرۃ، ۱/۵۵۱؛ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ۱/۱۷۱؛ ادریس کاندھلوی، مولانا، سیرۃ المصطفیٰ، الطاف اینڈ سنز، کراچی، ۱/۳۶۸؛ ابن کثیر، سیرۃ النبی (اردو ترجمہ مولانا ہدایت اللہ ندوی) مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ۱/۳۶۱

باب پنجم

غیر مسلموں کے عمومی بنیادی حقوق

پہلی فصل

عمومی حقوق اور اس سلسلے میں شریعت کا عمومی قاعدہ

عمومی حقوق یا حقوق عامہ سے مراد وہ تمام حقوق ہیں جو انسان کے لیے معاشرہ کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے لازمی ہیں اور جن کے بغیر اس کے لیے چارہ کار نہیں۔ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے ان حقوق کی تعریف یوں کی ہے:

الحقوق العامة هى الحقوق الازمة للانسان باعتباره فردا فى مجتمع ولا يمكنه الاستغناء عنها۔[1]

حقوق عامہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو انسان کے لیے انسانی اجتماع / معاشرہ میں اس کا ایک فرد ہونے کے اعتبار سے ضروری ہیں ور اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان حقوق سے مستغنی / بے پرواہ ہو سکے۔

دوسرے لفظوں میں حقوق عامہ کا مطلب وہ حقوق ہیں جو انسانی شخصیت کو قائم رکھنے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہیں۔ انھی حقوق کو عام اصطلاح میں انسانی حقوق یا بنیادی حقوق کہا جاتا ہے۔ ان حقوق سے بالعموم وہ حقوق مراد لیے جاتے ہیں جو ناقابل تنسیخ ہوتے ہیں اور ان سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً حفاظتِ جان، حفاظت مال کا حق، عزت و آبرو کے تحفظ کا حق۔ خلوت کے تحفظ کا حق، عقیدہ کی آزادی کا حق، اجتماع کی آزادی کا حق وغیرہ

غیر مسلموں / اہل الذمہ کے حوالے سے ان حقوق کے معاملے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے اور ایک اسلامی ریاست ان حقوق کو ادا کرنے کی کس طرح پابند ہے؟ زیر نظر باب میں اسی چیز کی تفصیل بیان

---

[1] ۔احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء، ص:۴۷

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ذمیوں کے حقوق کے معاملے میں شریعت کا عمومی قاعدہ

ایک اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا (اھل الذمہ) کے حقوق عامہ کا کس طرح خیال رکھتی اور ان حقوق کی منصفانہ ادائیگی کی وہ کس طرح پابند ہے، اس کی تفصیل میں جانے سے قبل مناسب ہے کہ اس معاملے میں اسلام کے عمومی قاعدہ، لازمی اصول، بنیادی پالیسی اور نقطۂ نظر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ، علامہ نسفی اور علامہ ابن عابدین شامی وغیرہ نے لکھا ہے:

> اگر ہم (اسلامی افواج) غیر مسلم قوم کا محاصرہ کرلیں تو جنگ سے قبل ہم انھیں اسلام کی دعوت دیں گے اگر وہ اسلام لے آئیں تو فبھا۔ اگر وہ اسلام لانے سے انکار کریں تو انھیں جزیہ قبول کرنے کی دعوت دی جائے گی بشرطیکہ وہ جزیہ کا محل ہوں جیسا کہ عنقریب آگے آئے گا۔
>
> فان قبلوا ذالک فلھم مالنا وعلیھم ما علینا۔[1]

پس اگر وہ جزیہ دینا قبول کرلیں تو ان کے لیے عصمت خون اور جان ومال کی حرمت کے وہ تمام حقوق ہیں جو ہمارے (مسلمانوں کے) لیے ہیں اور ان پر وہ تمام فرائض / ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہمارے اوپر (مسلمانوں پر عائد ہوتی) ہیں۔

علامہ کاسانیؒ نے اس مفہوم کی ایک حدیث نبوی بھی نقل کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: فاذا قبلوا عقد الذمۃ فاعلمھم ان

1۔ دیکھیے: حاشیہ ردالمحتار علی الدرالمختار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ت۔ن، ۴/۱۲۸؛ نیز القدوری، احمد بن محمد، مختصر القدوری، ضیاء العلوم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ص: ۴۹۶؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب کیفیۃ القتال)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص: ۵۴۴؛ نسفی، کنزالدقائق (کتاب السیر والجہاد)، ص: ۱۷۸

لھم ما للمسلین وعلیھم ما علی المسلمین[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر جب وہ عقد ذمہ (ذمی کی حیثیت سے اسلامی ریاست میں رہنا) قبول کرلیں تو انھیں بتادو کہ ان کے لیے وہ تمام حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان پر وہی چیزیں لازم ہوں گی جو مسلمانوں پر ہیں۔ اسی طرح صاحب ہدایہ نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

"انما بذلوا الجزیة لیکون دماءھم کدمائنا واموالھم کاموالنا"[2] بے شک انہوں نے جزیہ اس لیے دیا ہے کہ ان کے خون ہمارے خونوں اور ان کے اموال ہمارے مالوں کی طرح معصوم و محترم ہو جائیں۔

علیٰ ہذا القیاس امام سرخسی نے شرح السیر الکبیر میں لکھا ہے:

ولانھم قبلوا عقد الذمة لتکون اموالھم وحقوقھم کاموال المسلمین وحقوقھم۔[3]

اور اس لیے کہ انھوں (غیر مسلموں) نے عقد ذمہ اسی لیے قبول کیا ہے کہ ان کے مالوں اور حقوق کو وہی حیثیت و مرتبہ اور حرمت حاصل ہو جائے جو مسلمانوں کے مالوں اور ان کے حقوق کو حاصل ہے۔

جبکہ مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم نے "احکام الذمی" کی بحث میں لکھا ہے کہ چند احکام کو چھوڑ کر باقی معاملات میں "حکمہ حکم المسلمین" اس کا حکم وہی ہے جو دوسرے مسلمانوں کا ہے۔[4] لہذا دونوں

---

[1] ۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۷/۱۰

[2] ۔ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب کیفیۃ القتال)، ص: ۵۴۴؛ زیلعی، نصب الرایۃ (کتاب الدیات) مؤسسۃ الریان، بیروت، ۴/۳۶۹، رقم: ۷۸۸۲

[3] ۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۳/۳۵۰

[4] ۔ الاشباہ والنظائر (مع شرح الحموی) ۳/۸۳

کے حقوق میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

شبلی نعمانی نے فقہ حنفی کی خصوصیات میں ایک خصوصیت ذمیوں کے حقوق کے حوالے سے بھی لکھی ہے، فرماتے ہیں:

> ایک بڑی خصوصیت جو حنفی فقہ کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ذمیوں یعنی ان لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کی حکومت میں مطیعانہ رہتے ہیں، نہایت فیاضی اور آزادی سے حقوق بخشے ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر کسی امام اور مجتہد کے مسائل میں نہیں ملتی۔ اگرچہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت خود شارع کی ہدایتوں میں جابجا موجود ہے لیکن چونکہ وہ عام کلیات ہیں۔ اس کے علاوہ شارع کے بعض اقوال بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اس لیے ان کی تعبیر مطالب میں اختلافات پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم کچھ شبہ نہیں کہ جو تعبیر امام ابو حنیفہؒ نے کی ہے وہی صحیح تعبیر ہے۔ اسلام نہایت وسیع دنیا پر حکمران رہا ہے اور اس کی حدود حکومت میں سینکڑوں غیر قومیں آباد تھیں اور ہیں۔ اس لیے اگر ان کے حقوق کی واجبی حفاظت نہ کی جائے تو ایک دن بھی امن قائم نہیں رہ سکتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں۔ دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی غیر قوم کو نہیں دیے۔ یورپ جس کو اپنے قانون اور انصاف پر بڑا ناز ہے، بے شک زبانی دعویٰ کر سکتا ہے لیکن عملی مثالیں نہیں پیش کر سکتا۔ حالانکہ امام ابو حنیفہؒ کے یہ احکام اسلامی گورنمنٹوں میں عموماً نافذ تھے اور خاص کر ہارون الرشید اعظم کی وسیع حکومت انھی احکام کی پابند تھی۔[1]

اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے ایک مسلمان اور ذمی کے قصاص اور دیت میں برابری کے حنفی مؤقف پر امام رازیؒ کا یہ طعنہ نقل کیا ہے کہ "ان کے نزدیک ابو بکر صدیقؓ کا خون اور ایک ذلیل ذمی کا خون

1۔ سیرۃ النعمان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ت۔ن، ص:۲۰۹-۲۱۰

برابر ہے۔" پھر اس طعنہ کا بڑے وثوق سے جواب دیا ہے، لکھتے ہیں:

> حنفیوں نے اس مسئلہ کی تعمیم میں کہیں یہ مثال نہیں دی ہے۔ امام رازیؒ نے اس غرض سے کہ وہ اس مسئلہ کو بدنما کر کے دکھائیں۔ خود یہ مثال فرض کی ہے لیکن ہم فخر کے ساتھ اس طعنہ کو قبول کرتے ہیں۔ بے شبہ انصاف اور حق کی حکومت میں شاہ و گدا مقبول و مردود کا ایک رتبہ ہے۔ بے شبہ یہ اسلام کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی رعایا کو اپنے برابر سمجھا۔ اسلام کو اس انصاف پر ناز ہو سکتا ہے۔ اگر امام رازی کو عار آئی ہے تو آئے خود صحابہ کا قول اور عمل کیا تھا؟ حضرت علیؓ کا قول ہے "**من كانت لهٗ ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا**" ذمی کا خون ہمارا خون ہے اور اس کی دیت ہماری دیت ہے۔ حضرت علیؓ پر موقوف نہیں۔ تمام مہاجرین و انصار کا یہی قول تھا اور اس پر عمل درآمد تھا۔[1]

زیر بحث مسئلے میں متعدد فقہاء نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مذکورہ اصولی قول نقل کیا ہے:

> انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماءهم كدمائنا۔[2]
>
> بے شک ان لوگوں نے عقد ذمہ (ذمی کی حیثیت سے اسلامی ریاست میں رہنا) اس لیے قبول کیا ہے کہ ان کے اموال ہمارے (مسلمانوں کے) اموال کی طرح اور ان

---

[1] ۔حوالہ سابق، ص:۲۱۰-۲۱۱

[2] ۔دیکھیے: کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱؛ سرخسی، ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل (م ۴۹۰ھ) اصول السرخسی، مکتبہ المعارف ریاض، ت۔ن، ۱/۱۹۰؛ ابن عابدین شامی، حاشیہ ردالمحتار علی الدرالمختار، ۴/۱۲۹؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب کیفیۃ القتال)، ص: ۵۴۴-۵۴۵

کے خون ہمارے خونوں کی طرح محترم ہو جائیں۔

اسی طرح علامہ قرافی نے عقد ذمہ کی غیر معمولی اہمیت اور ذمہ داری کے حوالے سے لکھا ہے:

"ان عقد الذمة یوجب حقوقاً علینا لھم لانھم فی جوارنا وفی خفارتنا، وذمة اللہ تعالیٰ وذمة رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم ودین الاسلام فمن اعتدی علیھم ولو بکلمة سوء اوغیبة فی عرض احدھم او نوع من انواع الاذیة اواعان علی ذالک فقد ضیع ذمة اللہ تعالیٰ وذمة رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم وذمة دین الاسلام۔"[1]

بے شک عقد ذمہ ان کے حقوق کی ادائیگی ہمارے اوپر واجب کر دیتا ہے کیونکہ (ازروئے عقد ذمہ) وہ ہماری امان، ہماری حفاظت، اللہ تعالیٰ کے ذمہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام کے ذمہ میں ہیں۔ پس جس آدمی نے ان پر زیادتی کی چاہے کوئی بری بات کہہ کر یا ان میں سے کسی کی آبرو میں غیبت کر کے یا کسی قسم کی اذیت پہنچا کر یا ان چیزوں پر اعانت کر کے تو اس آدمی نے اللہ تعالیٰ کے ذمہ، اس کے رسول ﷺ کے ذمہ اور دین اسلام کے ذمہ کو ضائع کیا۔

اسی طرح علامہ قلقشندی نے عقد ذمہ کے نزد امام و خلیفۃ المسلمین پر لازم ہونے والے امور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

ثم یجب الکف عنھم بأن لا یتعرض متعرض لأنفسھم ولا اموالھم ویضمن ما اتلف منھا ولا تراق خمورھم الا ان یظھروھا ولا تتلف خنازیرھم اذا اخفوھا ولا یمنعون التردد الی کنائسھم، ولا ضمان علیٰ من دخل دار احد منھم فاراق خمرہ وان کان متعدیا

---

[1] ۔الفروق،۳/۲۹

بالدخول ، واوجب ابو حنيفة عليه الضمان ويجب ذب الكفار عنهم مادامو ا في دارنا بخلاف ما اذا دخلوا دار الحرب۔[1]

پھر ان اہل الذمہ سے ہر قسم کی زیادتی سے رکنا واجب ہے۔ بایں طور کہ کوئی آدمی ان کی جانوں اور مالوں کے درپے ہو۔ اور جس آدمی نے ان اموال میں سے کسی چیز کو تلف (ضائع) کیا تو وہ اس کا ضامن ہو گا۔ اسی طرح ان کی شرابیں بہانے کی کسی کو اجازت نہیں الّا یہ کہ وہ بر سر عام شراب نوشی کا ارتکاب کریں اور نہ ان کے خنزیروں کو تلف کیا جائے گا جبکہ وہ انہیں چھپا کر (چاردیواری کے اندر) رکھتے ہوں۔ انہیں اپنے گرجوں میں آنے جانے سے نہیں روکا جائے گا۔ اگر کوئی آدمی زبردستی ان میں سے کسی کے گھر میں داخل ہو کر اس کی شراب بہادے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر تاوان واجب ہو گا۔ علاوہ ازیں جب تک وہ دارالاسلام میں مقیم ہیں کفار / دشمنوں سے انہیں بچانا اور ان کا دفاع کرنا بھی واجب ہے۔ البتہ جب وہ دارالحرب میں چلے جائیں تو اسلامی ریاست پر ان کا دفاع واجب نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدینؓ کے عہد میں اہل الذمہ سے متعدد معاہدے کیے گئے جن میں سے بعض کے مندرجات کی تفصیل آگے آرہی ہے، ان میں اہل الذمہ کے تمام بنیادی حقوق کی ادائیگی کا زبانی کلامی وعدہ نہیں بلکہ تحریری طور پر ضمانت دی گئی۔ اور ان معاہدات کی پائیداری اور مضبوطی (Validity) کے لیے صرف معاہدہ کنندہ حکمران ہی کے نہیں بلکہ گواہوں کے بھی دستخط ثبت کیے گئے۔ نامور محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے الوثائق السیاسیۃ (سیاسی وثیقہ جات) میں اس طرح کے بیسیوں معاہدات کا نمونہ درج کیا ہے۔

اسلام کی انھی تعلیمات کے پیش نظر مسلمان خلفاء کو غیر مسلم رعایا کے حقوق کا کتنا اہتمام تھا؟ اس

---

[1] - صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء (الباب الثالث من المقالۃ التاسعۃ)، ۱۳/۳۶۱

کا اندازہ سید امیر علی کی درج ذیل صراحت سے لگایا جاسکتا ہے۔

خلفاء بغداد کو اپنے حریف خلفائے قرطبہ کی طرح غیر مسلموں کی فلاح کا اتنا خیال تھا کہ انھوں نے ذمیوں کی سلامتی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا۔ اس شعبے کے سربراہ کا لقب بغداد میں کاتب الجہبذہ اور ہسپانیہ میں کاتب الذمام تھا۔[1]

غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی ضمانت

اسلام دیگر مذاہب و اقوام کے مقابلے میں اپنی غیر مسلم اقلیتی رعایا کے بنیادی حقوق کی کس طرح ضمانت دیتا اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں مفتی نذیر احمد خان ایڈوکیٹ کا درج ذیل تقابلی نوٹ لائق ملاحظہ ہے۔ مفتی موصوف لکھتے ہیں:

عمومی طور پر کسی ملک کے شہریوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ اقلیت (Minority)

2۔ اکثریت (Mejority)

مؤخر الذکر اول درجہ کے شہری کہلاتے ہیں۔ ملک کے اصل حکمران یہی لوگ ہوتے ہیں۔ قانون اپنی وضع تنسیخ یا ترمیم و تبدیل میں انھی اکثریتی باشندگان کے رواجات کا تابع ہوتا ہے جبکہ مقدم الذکر باشندگان کی شہریت اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہے کہ وہ اکثریتی باشندگان کے رواجات کے ترجمان قانون کی عمل داری قبول کریں گے۔

عصر حاضر کی مغربی تہذیب جو اپنے آپ کو انسانیت دوستی اور بلا امتیاز رواداری سے عبارت تصور کرتی ہے، کہنے میں تو یہ تہذیب انسانیت دوست بھی ہے اور بلا امتیاز اقوام عالم میں رواداری اور عدل و انصاف کی سرخیل بھی۔ لیکن ان تمام دعوؤں کے باوجود ان مغربی ممالک میں آباد اقلیتیں خصوصاً امریکہ

---

[1] ۔روح اسلام (اردو ترجمہ) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (باب اسلام کی سیاسی روح)، ص: ۴۲۷

اور برطانیہ کے مسلمان شہری اپنے ان بنیادی حقوق سے محروم ہیں، جن کا کہ ان کے رواجات، روایات اور مذھب تقاضا کرتے ہیں۔ اکثریتی ذہن کا لاگو کردہ قانون اور ضابطوں کے تحت زندگی کی سرگرمیاں چلانے اور شاہراہ حیات کے پیدا کردہ مسائل انھی قوانین کے مطابق حل کرنے پر مجبور ہیں۔ خواہ وہ حل ان کی روایات سے انتہائی درجہ متصادم کیوں نہ ہو۔

اس کے مقابلے میں اسلام نے اپنے دورِ عروج میں غیر مذاہب سے معارضانہ رول رکھنے کے باوجود انھیں کھلے بندوں برداشت کیا۔ غیر مذاہب والوں کے بنیادی اور قانونی حقوق کی نہ صرف ضمانت دی بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اپنے غیر مسلم شہریوں کے مذھبی اور قانونی حقوق کا مکمل تحفظ کیا۔[1]

اھل الذمہ کے حقوق کے حوالے سے اسلامی ریاست کی بنیادی پالیسی بیان کرتے ہوئے صلاح الدین نے لکھا ہے:

> ذمیوں کے حقوق کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی ریاست جس طرح مسلمانوں کے معاملے میں قرآن و سنت کے طے کردہ حقوق کے نفاذ و احترام کی پابند ہے۔ اسی طرح وہ ذمیوں کے معاملہ میں بھی قرآن و سنت ہی کی قائم کردہ حدود کی پابند ہے۔ گویا ذمیوں کے حقوق بھی غیر منفک (Inalienable) ہیں۔ مسلمانوں کو ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ اسلامی حکومت شریعت کے مقرر کردہ حقوق میں کوئی کمی نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ ذمیوں کو زائد حقوق دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں حقوق کے تعین اور ان کے تحفظ کے اعتبار سے مسلمانوں اور ذمیوں کی پوزیشن بالکل یکساں ہے۔ دونوں کے حقوق کی ضمانت (Gaurantee) قرآن و سنت نے دی ہے۔ اپنے حقوق کے معاملہ میں جو آئینی اور

---

[1] ۔توہین رسالت، اقلیتیں اور قانون تحفظ مذاہب، بیت السلام کراچی، ۲۰۱۰ء، ص:۱۵۹-۱۶۰

عدالتی تحفظات مسلمانوں کو حاصل ہیں وہی تحفظات ذمیوں کو بھی حاصل ہیں بلکہ تحفظ کے لحاظ سے انھیں مسلمانوں پر برتری حاصل ہے۔ (پھر موصوف نے اس برتری کی چند مثالیں درج کی ہیں)[1]

جبکہ مولانا سید مودودیؒ نے زیر بحث مسئلے کی وضاحت یوں کی ہے:

ذمی شہریوں سے مراد وہ تمام غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کی حدود میں رہ کر اس کی اطاعت و وفاداری کا اقرار کریں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ دار الاسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا باہر سے آکر ذمی بننے کی درخواست کریں۔ اس طرح کے شہریوں کو اسلام ان کے مذھب، کلچر اور پرسنل لاء کے تحفظ اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ان پر صرف اپنے ملکی قوانین نافذ کرتا ہے۔ ان کو ملکی قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے حقوق دیتا ہے، ان کے لیے کلیدی مناصب کے سوا ہر قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھلے رکھتا ہے، ان کو شہری آزادیوں میں مسلمانوں کے ساتھ برابر شریک کرتا ہے، ان کے ساتھ معاشی معاملات میں مسلمانوں سے الگ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا اور مملکت کے دفاع کی ذمہ اری سے انھیں مستثنیٰ کر کے اس کا پورا بار صرف مسلمانوں پر ڈالتا ہے۔[2]

درج بالا تصریحات سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں غیر مسلم شہری / اھل الذمہ مسلمان شہریوں کی مانند ہیں۔ تاہم اس عمومی قاعدہ میں ایک استثناء بھی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست اپنے بنیادی اصول و ضوابط اور شرعی ہدایات کے مطابق بعض حقوق سے متمتع ہونے کے لیے ایک شہری کے واسطے مسلمان ہونا شرط ٹھہراتی ہے جس کی طرف مولانا مودودی نے بھی

---

[1] - بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ص:۳۱۹

[2] - اسلامی ریاست، ص:۳۵۳

مذکورہ عبارت میں اشارہ کیا ہے اور مزید تفصیل بھی ان شاء اللہ آگے آجائے گی۔ بہرکیف آئندہ سطور میں ہم غیر مسلم شہریوں کے چند اہم اور نمایاں بنیادی حقوق پر اسلامی نقطہ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

دوسری فصل

جان کے تحفظ کا حق

(Right to the Protection of Life)

اسلام اور انسانی جان کی قدر و قیمت

انسانی تمدن اور معاشرے کی جان اور روح رواں اور ساری دنیا کی آبادی اور چہل پہل کا مرکز و محور چونکہ انسان کا وجود ہے اس لیے دنیا کی تمام شریعتوں اور مہذب قوانین میں انسان کی جان اور اس کا خون محترم تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کے بنیادی اور عمومی حقوق میں سب سے مقدم، مقدس، محترم اور مہتم بالشان حق اس کی زندگی اور جان کا تحفظ ہے۔ کیونکہ باقی تمام حقوق کا دار و مدار اسی زندگی اور جان پر منحصر ہے۔ یہ زندگی بلا امتیاز کئی تکوینی مصالح کے تحت ہر انسان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک نعمت عظمیٰ[1] اور امتحان الٰہی ہے۔[2] اس لیے اسلام میں کسی بھی انسان اور حکومت کو از روئے قرآن اس بات کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ کسی قانونی اور عدالتی جواز کے بغیر ناحق ایک انسان کو اس کی زندگی سے محروم (قتل) کر دے۔[3] اسلام کے نزدیک انسانی جرائم میں کسی بے گناہ انسان کا قتل ایسا جرم اور گناہ ہے جسے پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔[4] انسانی جان کی عظمت و حرمت پر مشتمل قرآن و سنت کی نصوص ایک الگ کتاب کی متقاضی ہیں جن کا احاطہ اور تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ تاہم مسئلہ کی وضاحت کے لیے

---

1 - سورۃ البقرہ، ۲۸:۲

2 - سورۃ الملک، ۲:۶۷

3 - دیکھیے: سورۃ الانعام، ۱۵۱:۶؛ سورہ بنی اسرائیل، ۳۳:۱۷؛ سورۃ الفرقان، ۶۸:۲۵

4 - دیکھیے: سورۃ المائدہ، ۳۳:۵

ایک روایت کا اندراج بے سود نہ ہو گا۔

چنانچہ انسانی خون کی عظمت کے حوالے سے امام جصاص نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۹۴ (یا ایها الذین آمنوا اذا ضربتم فی سبیل الله الخ) کی تفسیر میں ایک عجیب اور عبرت آموز روایت لکھی ہے: وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یا شانِ نزول یہ ہے کہ:

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے بھیجے گئے ایک دستہ (سریہ) کی راستے میں ایک آدمی کے ساتھ ملاقات ہو گئی جس کے پاس کچھ بکریاں بھی تھیں۔ اس نے اس فوجی دستہ کو السلام علیکم کہا اور پھر کلمہ طیبہ (لا اله الا الله محمد رسول الله) بھی پڑھا۔ اس کے باوجود فوجی دستہ میں سے ایک آدمی نے اسے قتل کر دیا۔ جب یہ فوجی دستہ واپس لوٹا تو انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ آپ ﷺ نے اس قاتل شخص سے فرمایا: "لم قتلته وقد اسلم" (تو نے اسے کیوں قتل کیا جب کہ وہ اسلام لا چکا تھا؟) تو اس نے عرض کیا کہ اس نے کلمہ طیبہ اپنی جان بچانے کے لیے پڑھا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ وہ دل سے کلمہ نہیں پڑھ رہا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مقتول کے اہل خانہ کی طرف اس کی دیت کی رقم بھجوائی اور اس کی بکریاں بھی لوٹا دیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ قاتل آدمی کچھ دنوں کے بعد فوت ہو گیا۔ مگر جب اسے دفن کیا گیا تو زمین نے اسے قبر سے باہر پھینک دیا۔ اسے دوسری بار دفنایا گیا۔ پھر زمین نے باہر پھینک دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ اس پر نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: بے شک زمین اس سے بھی برے آدمی کو قبول کر لیتی ہے مگر اس کے معاملے میں اللہ نے ارادہ فرمایا کہ وہ تمہیں دکھا دے کہ اس کے ہاں انسانی خون کی کتنی عظمت ہے۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ اس پر پتھر ڈال کر اس کی لاش کو ڈھانپ دو۔[1]

---

[1] - احکام القرآن، ۳/ ۲۲۲

اسی طرح علامہ موصوف فرماتے ہیں: حضرت اسامہ بن زید کے بارے میں ایک روایت ہے کہ انہوں نے ایک جنگی مہم (سریہ) میں ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا جس نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا تھا۔ نبی رحمت ﷺ نے اسامہ سے فرمایا۔ تو نے اسے کلمہ طیبہ پڑھ لینے کے بعد بھی قتل کر دیا؟ حضرت اسامہ نے جواب دیا کہ اس نے ایسا جان بچانے کی خاطر کیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا "**ھل شققت عن قلبه**" (تو نے اس کا دل پھاڑ کر کیوں نہ دیکھ لیا) پھر فرمایا: قیامت کے دن کلمہ طیبہ کے بدلے میں کون تیرا مددگار ہوگا۔[1]

اللہ کے ہاں انسانی جان کے اسی تقدس و حرمت کی بنا پر رنگ نسل اور عقیدہ و مذہب کی تمیز کے بغیر انسانی جان کا تحفظ شریعت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد خمسہ میں شامل ہے۔[2] قرآن و سنت کی ان نصوص کی بنیاد پر اسلامی ریاست میں ایک غیر مسلم / ذمی کی جان بھی ازروئے قانون اتنی ہی قیمتی اور لائق احترام و حفاظت ہے جتنی کسی مسلمان شہری کی۔ قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا خون برابر ہے جب کوئی غیر مسلم فرد یا قوم عقد ذمہ کے ذریعے اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کرتی ہے تو اس عقد ذمہ کا سب سے پہلا حکم یا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی جان کے لیے عصمت ثابت ہو جاتی ہے جسے ناحق توڑنے کا کسی کو اختیار نہیں۔[3] یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کے زمانے میں مفتوحہ اقوام سے جتنے معاہدے کیے گئے (جن میں سے بعض زیر تحقیق مقالہ میں موجود ہیں) ان میں سب سے پہلے انہیں جان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔

انسانی خون کی حرمت اور اس خداداد حرمت کی پامالی پر وعید کے انداز میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد متعدد طرق سے مروی ہے کہ "**اول ما یقضی فیہ بین الناس یوم القیامۃ فی**

---

[1] - حوالہ مذکور

[2] - دیکھیے: شاطبی، الموافقات فی اصول الشریعہ، ۲/۸

[3] - دیکھیے: کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱

الدماء"[1] قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے جس معاملے کا فیصلہ کیا جائے گا وہ انسانی خون کا معاملہ ہو گا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخ ساز خطبہ یوم النحر میں تمام لوگوں پر واضح فرمایا کہ تمھارے خون اتنے ہی لائق احترام ہیں جتنا آج کا دن (یوم النحر) اس شہر (مکہ مکرمہ) اور اس مہینے (ذوالحجہ) میں قابل احترام ہے۔[2]

اسلام نے انسانی جان کی یہ حرمت عظمت اور قدر و قیمت اس زمانے میں متعین فرمائی جب دنیا میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ اس معاملے میں تقابلی مطالعہ کے طور پر مولانا مودودیؒ کی لرزہ خیز وضاحت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

> عرب کی خونخواریوں کا نام تو اس سلسلہ میں دنیا نے بہت سنا ہے مگر ان ممالک کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی جو اس زمانہ میں دنیا کی تہذیب و شائستگی اور علم و حکمت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ روم کے کولوسیم (Colosseum) کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں، جس میں ہزارہا انسان شمشیر زنی (Gladiatory) کے کمالات اور رومی امراء کے شوق تماشا کی نذر ہو گئے۔ مہمانوں کی تفریح کے لیے یا دوستوں کی تواضع کے لیے غلاموں کو درندوں سے پھڑوا دینا یا جانوروں کی طرح ذبح کرا دینا یا ان کے جلنے کا تماشا دیکھنا، یورپ اور ایشیاء کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔[3]

اس کے مقابلے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہِ رحمت میں انسانی خون کی کتنی قدر و قیمت ہے؟ اس چیز کا اندازہ ڈاکٹر حمید اللہ نے عہد نبوی کی جنگوں کے مقتولین کی کل تعداد سے لگایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب

---

[1] - نسائی، السنن (کتاب المحاربۃ باب تعظیم الدم)، ۲/۱۶۲، رقم: ۳۹۹۲

[2] - ملاحظہ ہو: خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (کتاب المناسک باب خطبۃ یوم النحر - الفصل الاول)، ص: ۲۳۳، رقم: ۲۶۵۹

[3] - الجہاد فی الاسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷، ص: ۲۷

ریاست مدینہ کی تیز رفتاری سے وسعت اور پھیلاؤ کے ضمن میں فرماتے ہیں:

یہ مملکت ابتداء میں ایک شہری مملکت نہیں تھی بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی۔ لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ اس توسیع کا آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں بلکہ ایک وسیع سلطنت کا دارالسلطنت تھا۔ اس وسیع سلطنت کا رقبہ تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پر امن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں۔ آنحضرت ﷺ کے غزوات و سرایا سے متعلق دیگر تفصیلات کے علاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تین ملین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں بنتی۔ دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے۔ دشمن کے مقتولین کی تعداد اس سے کم تھی۔ مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمنوں سے بھی کم تھی۔ مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان جنگ احد میں ہوا کہ ستر آدمی شہید ہوئے اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ بہر حال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے میں دو سے بھی کم ہے جس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح اسوہ حسنہ بن کر دنیا بھر کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔[1]

---

[1] - خطبات بہاولپور (خطبہ: مملکت اور نظم و نسق)، ص: ۱۷۹

ذمی کے قصاص میں مسلمان کا قتل

انسانی جان کی مذکورہ حد درجہ قدر وقیمت کے پیش نظر اس کی حرمت وعصمت کو قائم رکھنے کے لیے اسلام کا مستقل قانون ہے کہ اسلامی ریاست میں اگر اکثریتی یا فاتح وحاکم قوم (مسلمانوں) کا کوئی فرد اپنی اکثریت اور حکومت واقتدار کے نشہ میں غیر مسلم اقلیتی رعایا کے کسی فرد کو بے گناہ قتل کر دیتا ہے تو اسے مقتول ذمی کے بدلے قتل کر دیا جائے گا۔ تاہم اسلام کے اس عادلانہ قانون کی تفصیل اور تشریح و توضیح سے قبل زیر بحث معاملے میں دنیا کے عمومی طرز عمل پر ایک نگاہ ڈال لینا بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ مشہور مقولہ ہے: "تعرف الاشياء باضدادها" چیزوں کی صحیح پہچان ان کی ضد سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں معروف اہل قلم رئیس احمد جعفری ندوی کا درج ذیل تجزیہ وتبصرہ کافی ہے۔

> اب تک یہ اصول تسلیم شدہ چلا آ رہا ہے کہ فاتح اور حاکم قوم کے افراد جو حقوق رکھتے ہیں وہ مفتوح اور محکوم قوم کے افراد کو حاصل نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں نہ جانے کتنے آدمی ہر سال انگریزوں کی ٹھوکروں سے تلی پھٹ جانے کے باعث ہلاک ہوتے تھے مگر کسی انگریز کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔ اطالیہ نے جب حبش فتح کیا تو ہر حبشی کا خون معاف تھا۔ امریکی فاتح کی حیثیت سے جاپان میں داخل ہوئے، نہ جانے کتنے جاپانی ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئے مگر کیا مجال ہے کہ کوئی امریکی موت کی کرسی پر بٹھایا ہو۔ جاپان کو چھوڑیے خود امریکہ کے اندر ہر سال ایک معقول تعداد حبشیوں کی امریکیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتی رہتی ہے حالانکہ امریکہ دراصل انہی کا ملک ہے امریکی تو درحقیقت پردیسی ہیں۔ لیکن اسلام کا نظریہ اس باب میں بالکل مختلف ہے۔[1]

اسلام نے قتل کی سزا "قصاص" متعین کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] - اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع اول ۱۹۵۵ء، ص: ۱۰۰-۱۰۱

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِى الۡقَتۡلٰى اَلۡحُرُّ بِالۡحُـرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰى بِالۡاُنۡثٰى فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ۔[1]

اے ایمان والو! تم پر (ناحق) مقتولوں کے باب میں قصاص (خون کا بدلہ لینا) فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلہ میں آزاد اور غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت (سے بدلہ لیا جائے)۔ ہاں جس کسی کو اس کے فریق مقابل کی طرف سے (مالِ صلح پر) کچھ معافی حاصل ہو جائے تو مطالبہ معقول طریق پر کرنا چاہیے اور مطالبہ کو اس (فریق) کے پاس نیکی سے پہنچا دینا چاہیے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے۔ پس جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا تو اس کے لیے درد ناک عذاب ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ جصاص رازیؒ نے "باب قتل المؤمن بالکافر" (کافر کے بدلے مؤمن کے قتل کا بیان) کے عنوان سے زیر بحث مسئلہ پر بڑی تفصیل سے اور مدلل بحث کی ہے۔ وہ اس باب کے شروع میں ہی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، زفر اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ "یقتل المسلم بالذمی" (ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائے گا) اس کے بعد اپنے اس موقف پر دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں:

سائر ما قدمنا من ظواهر الآی یوجب القتل المسلم بالذمی اذ لم یفرق شئ منها بین المسلم والذمی وقوله تعالیٰ (کتب علیکم

---

[1] - البقرہ، ۱۷۸:۲

القصاص فی القتلیٰ) عام فی الکل۔[1]

ہم نے جو اوپر دلائل بیان کیے ہیں، وہ ذمی کے بدلے مسلمان کے قتل کو واجب ٹھہراتے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول (مقتولوں کے بارے میں قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے) سب میں عام ہے۔

بعد ازیں علامہ جصاصؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اپنے موقف پر کئی آیات استدلال میں پیش کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں:

ولیس فی الآیة فرق بین المسلم والکافر وجب اجراء حکمها علیهما۔[2]

آیت میں مسلم اور کافر کے درمیان کوئی فرق نہیں لہذا اس کے حکم کا نفاذ مسلم و کافر دونوں پر ہو گا۔

زیر بحث مسئلے میں بعض فقہاء مثلاً ابن شبرمہ، امام ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی رحمہم اللہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ذمی کے بدلے مسلمان قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ لہذا زیر بحث مسئلے کی توضیح و تشریح کے لیے اس رائے پر ایک تحقیقی و تنقیدی نظر ڈال لینا بے سود نہ ہو گا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک استفسار کے جواب میں اپنے پاس ایک کتاب کے اندر درج بعض شرعی احکام کی وضاحت فرمائی تو اس میں ایک حکم یہ بھی تھا: "وان لا یقتل مسلم بکافر"۔[3] اور یہ کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کے بدلہ (قصاص) میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ بعض دوسری کتب حدیث میں یہ

---

[1] - احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۲ء، ۱/۱۷۳

[2] - حوالہ مذکور، ۱/۱۷۴

[3] - بخاری، الصحیح (کتاب الدیات باب لا یقتل المسلم بکافر)، ۲/۱۰۲۱، رقم: ۶۹۱۵؛ ابن ماجہ، السنن (ابواب الدیات باب لا یقتل مسلم بکافر)، ص: ۱۹۱، رقم: ۲۶۵۸ تا ۲۶۶۰

روایت ان الفاظ کے ساتھ آتی ہے:"**لا یقتل مؤمن بکافر ولا ذوعھد فی عھدہ**"[1] کسی مومن کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی معاہد کو قتل کیا جائے گا جب تک کہ اس سے معاہدہ ہے۔

ان احادیث کی بنیاد پر امام مالک، امام شافعیؒ، امام احمد اور بعض دوسرے فقہاء رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمان قاتل کو کافر کے بدلے (قصاص) میں قتل نہیں کیا جائے گا۔[2]

ان احادیث میں ذمی کے مسلمان قاتل سے قصاص نہ لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے کوئی دوسری سزا بھی نہیں دی جائے گی اور نہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی ہو گی۔ حکومت اس کے خلاف تادیبی اور قانونی کارروائی کرتے ہوئے اسے قید وبند کی سزا دے سکتی ہے۔

جبکہ دوسری طرف امام شعبیؒ، ابراہیم نخعیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ مسلمان قاتل سے بھی ذمی کا قصاص لیا جائے گا۔[3] ان حضرات کی بڑی دلیل یہ ہے کہ مقتولین کے قصاص کے سلسلے میں قرآن وسنت میں جو احکام آئے ہیں ان میں کہیں ایسی کوئی تفصیل نہیں کہ ذمی کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً ارشادِ الٰہی ہے:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔[4]

---

[1] ۔ دیکھیے: ابو داؤد، السنن (کتاب الدیات باب ایقاد المسلم من الکافر)، ۲/۲۷۷، رقم: ۴۵۳۰؛ نسائی، السنن (ابواب القسامۃ باب سقوط القود (من المسلم للکافر)، ۲/۲۴۱ رقم: ۴۷۴۸؛ عسقلانی، فتح الباری شرح البخاری، ۱۲/۳۲۴

[2] ۔ دیکھیے: ابن قدامہ، المغنی، ۷/۶۵۲؛ امام مالک، موطا (کتاب العقول باب ماجاء فی دیۃ اھل الذمۃ)، ص: ۶۷۵؛ زیلعی، نصب الرایہ (کتاب الجنایات)، ۴/۳۳۴

[3] ۔ دیکھیے: القدوری، المختصر القدوری (کتاب الجنایات) ص: ۴۰۳؛ البھترالوی، المظہر النوری حاشیہ القدوری، ص: ۴۰۳؛ ظفر احمد عثمانی، اعلاء السنن (کتاب الجنایات باب قتل المسلم بالکافر)، ۱۸/۹۵-۱۰۵ (زیر بحث مسئلہ پر اعلاء السنن میں یہاں تفصیلی اور مدلل بحث کی گئی ہے)

[4] ۔ المائدہ، ۵:۴۵

اور ہم نے توراۃ میں ان (یہود) پر یہ فرض کر دیا تھا کہ جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا بدلہ آنکھ، ناک کا ناک، کان کا کان اور دانت کا بدلہ دانت اور تمام زخموں میں قصاص (برابری) ہے۔

یہاں "النفس بالنفس" (جان کے بدلے میں جان) میں مسلمان اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جہاں تک درج بالا حدیث کا تعلق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کافر کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا تو قاتل سے ذمی کافر نہیں بلکہ حربی کافر مراد ہے۔ ظاہر ہے جس سے جنگ ہے اس کا خون ایک مسلمان یا ذمی و معاہد کے خون کے برابر نہیں ہو سکتا۔ حربی کافر مباح الدم ہوتا ہے جبکہ ذمی کافر ریاست کی طرف سے باقاعدہ تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس معاملے میں مسلمان کے برابر ہو گا۔

حضرت علی المرتضیٰؓ کی مذکورہ روایت کا سیاق بتاتا ہے کہ راوی جس وقت کی گفتگو نقل کر رہا ہے اس وقت حضرت علیؓ کا مقصد اس کے سامنے مکمل حدیث نقل کرنا نہیں تھا بلکہ ایک غلط تاثر یا خود ساختہ عقیدہ و ذہنیت کی اصلاح مقصود تھی۔ وہ یہ کہ ایک مخصوص ذہنیت کے زیر اثر یہ افواہ اڑائی گئی تھی کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کو دین کے کچھ ایسے احکام اور راز بتائے گئے ہیں جو دوسرے لوگوں کو نہیں بتائے گئے۔ کسی آدمی نے اس چیز کی وضاحت کے لیے حضرت علی المرتضیٰؓ سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: نہیں خدا کی قسم نہیں البتہ اس صحیفہ میں کچھ احکام ہیں۔ سائل نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے تو فرمایا: دیت کے احکام، قیدیوں کو رہا کرانے کے احکام اور یہ حکم کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔[1]

روایت کا سیاق بتا رہا ہے کہ حضرت علیؓ کا مقصود تمام احادیث اور تمام احکام نقل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ صرف اور صرف ان احادیث اور احکام کے عناوین نقل کر رہے تھے اور ان کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو ان کے صحیفہ میں تھے جب کہ دوسری مذکورہ روایت (**لا يقتل مؤمن بكافر ولا ذو عهد في**

---

[1] - بخاری، الصحیح (کتاب الدیات باب لا یقتل المسلم بالکافر)، ۲/۱۰۲۱، رقم: ۶۹۱۵؛ ابن ماجہ، السنن (ابواب الدیات باب لا یقتل مسلم بکافر)، ص: ۱۹۱، رقم: ۲۶۵۸

عہدہ) میں یہ حکم کس قدر مکمل شکل میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلم یا ذمی کسی حربی کافر کے بدلے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ جس کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اسی کافر کے بدلے ذمی (ولا ذو عہد فی عہدہ) کو بھی قتل نہ کیا جانے کا حکم ہے۔[1]

ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کے چند نظائر

دوسری بات یہ ہے کہ ان روایات کے مقابلے میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان سے ذمی کا قصاص لیا گیا مثلاً:

1۔ عہد نبوی میں ایک مسلمان نے کسی ذمی شخص کو قتل کر دیا۔ اس کا مقدمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا "انا احق من وفی بذمته وفی روایة انا اکرم من وفی بذمته" (اس ذمی کے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حق دار اور ذمہ دار میں ہوں) پھر قاتل کے قتل کرنے کا حکم دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔[2]

2۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر دیا جائے

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: طحاوی، شرح معانی الآثار، ۳/ ۹۰-۹۱، حدیث نمبر ۴۹۳۳-۳۴؛ عینی، البنایہ شرح الہدایہ، ۱۳/ ۸۱؛ ظفر احمد عثمانی، اعلاء السنن (کتاب الجنایات باب قتل المسلم بالکافر)، ۱۸/ ۱۰۳-۱۰۵

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: البلخی، ابو عبد اللہ الحسین بن خسرو، مسند الامام الاعظم ابی حنیفہ، المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ، ۲/ ۲۴۰، رقم ۹۴۹؛ شیبانی، امام محمد بن حسن، کتاب الاصل المعروف بالمبسوط، دار المعارف النعمانیہ، حیدر آباد دکن (کتاب الدیات)، ۴/ ۴۸۸؛ الزیلعی، نصب الرایہ (کتاب الجنایات باب مایوجب القصاص ومالا یوجب)، ۵/ ۸۸-۸۹؛ عسقلانی، فتح الباری، ۱۲/ ۳۲۴؛ بیہقی، السنن الکبری، ۸/ ۳۰؛ یحیٰ ابن آدم قرشی، کتاب الخراج، ص: ۷۴ (پیرہ نمبر ۲۳۸)؛ عینی، البنایہ شرح الہدایہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳/ ۷۹

تاکہ وہ اسے قصاص میں قتل کر دیں چنانچہ وہ آدمی مقتول کے ورثاء کے سپرد کر دیا گیا اور انھوں نے اسے قتل کر دیا۔[1]

3۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں آپ کے پاس ایک مسلمان کو لایا گیا جس پر ایک ذمی کے قتل کا الزام تھا۔ جب قتل کا جرم ثابت ہو گیا تو آپ نے اسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ مقتول کے بھائی نے آ کر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کر دیا ہے مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا: "لعلهم فزعوک او هددوک" شاید انھوں نے تمھیں ڈرایا دھمکایا ہے؟ اس نے کہا نہیں ایسی کوئی بات نہیں مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آ جائے گا تب آپ نے قاتل کو رہا کر دیا اور فرمایا:

(انت اعلم من كانت له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا۔)

تم جانتے ہو جس آدمی کا ہم (اسلامی ریاست) نے ذمہ اٹھا رکھا ہو تو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت (خون بہا) بھی ہماری دیت کی طرح ہے۔

جبکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس موقعہ پر فرمایا:

انما بذلوا الجزية لتكون دماء هم كدمائنا و اموالهم كاموالنا[2]

بے شک انھوں نے (اسلامی ریاست) کو جزیہ دینا اس لیے قبول کیا ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح (محترم) اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح محترم ہو جائیں۔

الزیلعی نے اس مقام پر چند اور آثار نقل کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ذمی کے بدلے مسلمان قاتل کو

---

[1] - دیکھیے: عبد الرزاق، مصنف، ۱۰/۱۰۱؛ بیہقی، السنن الکبری، ۸/۳۲؛ زیلعی، نصب الرایہ، ۵/۹۰؛ عینی، البنایہ شرح الہدایہ، ۱۳/۸۰

[2] - دیکھیے: جصاص، احکام القرآن، ۱/۱۷۴؛ بیہقی، السنن الکبری، ۸/۳۴؛ الزیلعی، نصب الرایہ، ۵/۹۰

قصاص میں قتل کیا جائے گا۔[1]

اسی طرح علامہ شبلی نعمانی نے تاریخ اسلام سے چار پانچ واقعات اور بھی درج کیے ہیں جن میں خلفاء اسلام نے ذمی مقتولوں کے قصاص میں مسلمان قاتلوں کے قتل کا حکم دیا۔ ان کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔[2]

ذمی کی دیت۔ مسلمانوں کے برابر

اگر کوئی آدمی غلطی سے مارا جائے تو از روئے قرآن قاتل پر قصاص کی بجائے دیت (خون بہا) لازم ہوتی ہے۔[3] اب سوال یہ ہے کہ آیا ذمی کی دیت بھی مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی؟ تو اس مسئلہ میں بھی روایات میں اختلاف کی بنیاد پر فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کی تہائی ہے۔ اور امام مالک و احمد رحمہا اللہ کے نزدیک مسلمان کی دیت کا نصف 2/1 ہے۔[4] جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے نزدیک ذمی کی دیت بھی وہی ہے جو مسلمان کی دیت ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہدایہ میں فقہ حنفی کا مسلک یوں بیان ہوا ہے:

ودية المسلم والذمي سواء۔[5]

(اور مسلمان اور ذمی کی دیت / خون بہا برابر ہے۔)

---

[1] ۔الزیلعی، نصب الرایہ تخریج احادیث الہدایہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء، ۵/ ۹۰-۹۱

[2] ۔ملاحظہ ہو: مقالات شبلی (مذہبی) دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۴۹ھ، ص: ۱۹۵ تا ۱۹۷

[3] ۔دیکھیے: النساء، ۴:۹۲

[4] ۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن رشد، بدایۃ المجتہد، ۲/ ۶۶؛ ابن قدامہ، المغنی، ۱۲/ ۵۵؛ امام مالک، موطا (کتاب العقول باب ماجاء فی دیۃ اھل الذمہ)، قدیمی کتب خانہ کراچی، ص: ۶۷۴؛ کاندھلوی، اشفاق الرحمن، کشف المغطاء عن وجہ الموطا (حاشیہ موطا امام مالک)، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص: ۶۷۴

[5] ۔مرغینانی، الہدایہ، اسلامی کتب خانہ لاہور، ت۔ن، ۴/ ۵۷۹

اس نقطۂ نظر کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ۔[1]

اگر مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمھارا معاہدہ ہو تو اس کے اہل خانہ / ورثاء کو پوری دیت دینا ہو گی۔

متعدد آثار و روایات سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہو گی۔[2]

زیر بحث مسئلے میں فقہاء کا اختلاف بیان کرتے ہوئے مولانا محمود حسن نے لکھا ہے:

امام شافعیؒ اور جمہور علماء نے "لا یقتل مسلم بکافر ولا یؤخذ دیۃ المسلم" (کافر کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ مسلمان سے دیت لی جائے گی) کے ارشاد نبوی سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی قصاص نہیں۔ جبکہ امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسف، امام محمد، زفر اور امام ثوری رحمہم اللہ کا نقطہء نظر یہ ہے کہ ذمی کی دیت (خون بہا) بھی مسلمان کی دیت کی مانند ہے۔ کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ معاہد کے بدلے میں مسلمان سے قصاص لیے جانے کے مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ارشادِ نبوی ہے "بے شک انھوں نے ہمیں مال / جزیہ اس لیے دیا ہے تاکہ ان کے اموال اور جانیں ہماری طرف سے محفوظ ہو جائیں۔ ان کے لیے وہی حقوق و مراعات ہیں جو ہمارے (مسلمانوں کے) لیے ہیں اور ان کی اوپر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہمارے اوپر ہیں۔" پس معلوم ہوا کہ

---

[1] ۔النساء، ۴:۹۲

[2] ۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عبد الرزاق، مصنف، ۱۰/ ۹۵-۹۸ نیز زیلعی، نصب الرایہ (کتاب الدیات)، مؤسسۃ الریان بیروت، ۴/ ۳۶۶-۳۶۸

اہل الذمہ کا حکم بھی وہی ہے جو اہل اسلام کا ہے۔[1]

جصاص رازی احناف کا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دية الكافر مثل دية المسلم واليهودي والنصراني والمجوسي والمعاهد والذمي سواء۔[2] کافر کی دیت مسلمان کی دیت کے مثل ہے اور اس معاملے میں یہودی، نصرانی مجوسی، معاہد اور ذمی سب برابر ہیں)

اسی طرح مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

وقتل المسلم بالذمي، ودية الكافر والمسلم سواء۔[3]

مسلمان کو ذمی کے قصاص میں قتل کیا جائے گا اور کافر (ذمی) اور مسلمان کی دیت برابر ہے۔

ایک اشکال: حکم نبوی پر بعض یہودی سرداروں کا قتل

یہاں ایک اشکال اور سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ گذشتہ تصریحات کے مطابق ایک طرف تو اسلام غیر مسلم شہریوں کی جان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ خود اپنے حکم سے بعض یہودی سرداروں کعب بن اشرف اور ابورافع وغیرہ کو قتل کرا دیتے ہیں۔[4] یہ اشکال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ حدیث و سیرت کی اکثر کتابوں میں جہاں حکم نبوی پر ان کے قتل کرائے جانے کی روایات موجود ہیں، وہاں عموماً وہ محرکات، اسباب، وجوہ اور اسلامی ریاست کے خلاف ان کی مسلسل سازشیں

---

[1] ۔التقریر للترمذی، (مطبوعہ مع جامع ترمذی)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص:۵۵

[2] ۔احکام القرآن (باب دیات اھل الکفر)، ۳/ ۲۱۲

[3] ۔الاشباہ والنظائر (مع شرح الحموی)، ۳/ ۹۱

[4] ۔ان یہودی سرغنوں کے حکم نبوی پر قتل کیے جانے کی تفصیل صحیح بخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف، باب قتل ابی رافع؛ صحیح مسلم کتاب الجهاد والسیر باب قتل کعب بن الاشرف طاغوت الیہود اور دیگر متعدد کتب حدیث و سیرت میں موجود ہے۔

بلکہ بغاوت سامنے نہیں لائی جاتی جس کی بناء پر ان کے خلاف ریاست کو یہ کارروائی کرنا پڑی۔ ریاست کے خلاف اس قسم کی سازشیں اور بغاوت کوئی مسلمان شہری کرے تو یقیناً اس کی سزا بھی یہی ہوگی۔ بہر کیف اس اشکال کا تفصیلی جواب ان شاء اللہ باب ہشتم میں آئے گا۔

ذمی کے ناحق قتل پر وعید نبوی ﷺ

کسی ذمی / غیر مسلم شہری کے ناحق قتل پر اسلامی ریاست میں قانونی طور پر جو سزا مقرر ہے، اس کی مختصر وضاحت درج بالا سطور میں آگئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معاہد / ذمی کے ناحق قتل پر اخروی وعیدیں بھی سنائی ہیں تاکہ کوئی مسلمان کسی ذمی پر ہاتھ اٹھانے کا سوچ بھی نہ سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"الا من قتل نفسا معاهدة له ذمة الله وذمة رسوله فقد اخفر بذمة الله فلا يرح رائحة الجنة وان ريحها لتوجد من مسيرة سبعين خريفا وفي رواية اربعين عاماً۔"[1]

سن لو جس نے کسی معاہد / ذمی کو قتل کیا جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے تو اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑ دیا پس وہ (اس جرم کی سزا میں) جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی مسافت پر بھی پائی جاتی ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ چالیس سال کی مسافت سے پائی جاتی ہے۔

اسی طرح اس جرم کی سنگینی واضح کرتے ہوئے ایک اور حدیث میں آپ نے متنبہ فرمایا:

عن عبدالله بن عمرو عن النبي ﷺ قال من قتل معاهدا لم يرح

[1] ۔ترمذی، جامع (ابواب الدیات، باب ماجاء فیمن یقتل نفسا معاہدا) ۱/ ۳۹۱-۳۹۲ رقم: ۱۴۰۳؛ ابن ماجہ، السنن (کتاب الدیات باب من قتل معاہدا) (ص: ۳۸۶ رقم: ۲۶۸۶-۸۷؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب لا یأخذ المسلمون من ثمار اھل الذمۃ) ۱۴/ ۵۰؛ رقم ۱۹۲۴۳-۱۹۲۴۴

رائحة الجنّة وان ريحها لتوجد من مسيرة اربعين عاماً۔[1]

عبداللہ بن عمرو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی نے کسی معاہد / ذمی کو قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت پر بھی پائی جاتی ہے۔

جبکہ ایک روایت میں آپ ﷺ نے کسی معاہد / ذمی کے ناحق قتل پر جنت کے حرام ہونے کی وعید سنائی۔[2]

ذمیوں کی جان کا تحفظ اور فقہاء اسلام

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی جان کے تحفظ کے معاملے میں اسلام کی مذکورہ بالا تعلیمات کا ہی لازمی اثر اور نتیجہ تھا کہ اگر کسی مسلمان حکمران نے جذبات میں آکر اپنے اقتدار و اختیارات اور سیاسی قوت و طاقت کے بل بوتے پر کسی غیر مسلم شہری کو ناحق قتل کرنے کی کوشش کی تو فقہاء اسلام نے آگے بڑھ کر اسے اس غیر شرعی اقدام سے روک لیا ہے۔ چنانچہ سلطنت ترکی کے حکمران سلطان ابراہیم نے ایک موقعہ پر ممالک محروسہ کے تمام عیسائیوں کو قتل کرانا چاہا تو اس وقت کے شیخ الاسلام نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ روک لیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبانی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک جہاز ترکی سے عرب روانہ ہوا۔ اس میں حرم شاہی کی ایک حرم بھی تھی اور حرم کے ساتھ بچہ بھی تھا۔ مالٹا کے بحری قزاقوں نے اس ترکی جہاز پر حملہ کیا۔ کش مکش کے بعد جہاز والے مغلوب ہوگئے اور حرم سرا کی لونڈی اپنے بچہ کے ساتھ مالٹا والوں کے ہاتھ آئی۔ حالانکہ یہ بچہ ابراہیم کا زائدہ نہ تھا لیکن حرم شاہی کے ساتھ اس کو پاکر یہی مشہور کر دیا گیا کہ ایک عثمانی شہزادہ گرفتار ہوا ہے۔ اس شہرت کے ساتھ اس بچہ کو جبراً عیسائی بنالیا گیا اور مذہبی تعلیم

---

[1] ۔بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الدیات، باب من قتل ذمیا بغیر جرم)، ۲/۱۰۲۱، رقم: ۶۹۱۴

[2] ۔ابوداؤد، السنن، (کتاب الجہاد باب (۱۶۴) فی الوفاء للمعاہد وحرمۃ ذمتہ)، ۲/۳۲، رقم: ۲۷۶۰

دے کر مذہبی پیشوا بھی لوگوں نے اس کو بنالیا۔ لکھا ہے کہ مالٹا کے عیسائیوں میں عثمانی پادری کے نام سے مشہور ہوا۔ سارے یورپ والے اس پادری کو ترکوں کے شاہی خاندان کا شہزادہ سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جزیرہ کریٹ پر بھی اسی زمانہ میں مالٹاوالوں نے حملہ کر دیا۔ بہر حال اس عام رسوائی اور فضیحت کے سوا جو اس فرضی ترکی شہزادے کے پادری بن جانے کی وجہ سے سلطنت ترکی کی ہو رہی تھی۔ دوسرے واقعات نے بھی انتقام کے جذبہ کو ہوا دی۔ ابراہیم پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی جنون میں اس نے یہ فرمان نافذ کیا کہ ممالک محروسہ کے ایک ایک عیسائی کو چن چن کر قتل کر دیا جائے۔ مگر ان بے قصور عیسائیوں کی جان بچانے کے لیے اس وقت بھی جو آگے بڑھا وہ سلطنت ترکی کا شیخ الاسلام ہی تھا۔ امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے:

''ان شیخ الاسلام عارضه بشدة فتوقف عن انفاذ ہذا الامر۔''[1]

بے شک شیخ الاسلام پوری شدت و قوت کے ساتھ اس ابراہیم کے آڑے آگئے چنانچہ وہ اپنے حکم کے نافذ کرنے سے رُک گیا۔

---

[1] ۔ مقالات گیلانی (مقالہ: مسلمان حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جا شکایت)، ص: ۲۶۴ (بحوالہ شکیب ارسلان، تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ۱۹۳۶ء، ۲/۲۴۸)

فصل سوم

مال و جائیداد اور عزت و آبرو کے تحفظ کا حق

(Right to the Protection of Property and Honour)

قرآنِ مجید نے دوسروں کے مال کو اپنے مال کا درجہ دیتے ہوئے ہر غیر مشروع اور ناجائز طریقے سے ہتھیانے اور تصرف میں لانے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ۔[1]

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔

سورۃ المائدہ کی آیت 29 میں بھی اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے بالکل انھی الفاظ میں ایک دوسرے کا مال کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ ان آیات میں خطاب اگرچہ مؤمنین سے ہے مگر "بینکم" کے دائرہ کی وسعت میں فقہاء نے ساری نسل آدم کو داخل کیا ہے اور صرف مسلمانوں کے مال تک حکم کو محدود نہیں رکھا ہے۔ مسلم ہو یا کافر کسی کا بھی مال دغا، فریب، ظلم وغیرہ سے لینا جائز نہیں۔ صرف کافر حربی کے مال پر تصرف و تسلط جائز ہے کہ اس سے اعلان جنگ ہو ہی چکا ہے، لیکن اس سے بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ خاص قیود و شرائط کے ساتھ۔ رشوت، جعلسازی، خیانت، کافر حربی کے معاملات میں بھی درست نہیں۔[2]

اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے تاریخ ساز اور اسلامی تعلیمات کے نچوڑ خطبہ حجۃ الوداع میں بڑے مؤثر جستجو طلب اور حیرت انگیز اسلوب بیان میں اہل اسلام پر واضح فرمایا کہ تمھارے خون اموال اور عزتیں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح قابل احترام ہیں جس طرح مکہ مکرمہ میں ذی الحجہ کے مہینہ کے

---

[1] ۔البقرہ، ۱۸۸:۲

[2] ۔عبدالماجد دریابادی، ترجمہ و تفسیر قرآن، تاج کمپنی لاہور (یکجا جلد)، ص: ۷۳

اندر یوم النحر (قربانی کا دن) لائق عزت واحترام ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کے زمانہ حکومت میں اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی مفتوحہ اقوام سے جو معاہدے کیے گئے (جن میں سے بعض معاہدے مقالہ ہذا میں درج ہیں) ان میں انہیں جان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ مال کے تحفظ کی بھی ضمانت دی گئی۔

دوسروں کے مال کی اسی حرمت کے پیش نظر اہل الذمہ کے مال کی حفاظت و حرمت کے بارے علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

> عقد ذمہ کا دوسرا / فوری نافذ العمل حکم مال کی عصمت کا ہے۔ کیونکہ مال کی عصمت جان کی عصمت کے تابع ہے اور حضرت علی المرتضیٰؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: بے شک انھوں (اھل الذمہ) نے عقد ذمہ اس لیے قبول کیا ہے کہ ان کے اموال ہمارے اموال کی مانند اور ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح معصوم ہو جائیں۔[2]

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد "**اموالھم کاموالنا**" (ان کے اموال ہمارے مالوں کی مانند ہیں) کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے مالوں کی حفاظت و حرمت اور عصمت ویسی ہی ہو گی جیسی اہل اسلام کے مالوں کی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے اہل الذمہ کی اس حد تک رعایت کی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی مملوکہ شراب یا اس کے مملوکہ خنزیر جو ان کے نزدیک "مال متقوم" کا درجہ رکھتے ہیں، کو بھی تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ در مختار اور دیگر کتب فقہ میں ہے:

---

[1] - ولی الدین، مشکوۃ المصابیح (کتاب المناسک باب خطبۃ یوم النحر) المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء، ۲/۸۱۶، رقم الحدیث:۲۶۵۹؛ بخاری، الصحیح (کتاب العلم باب رب مبلغ اوعی من سامع) باب نمبر ۹

[2] - بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱

ويضمن المسلم قيمة خمره وخنزيره اذا اتلفه۔[1]

مسلمان اس (ذمی) کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اسے تلف کر دے۔

اسی طرح ان کے شراب کے برتن وغیرہ توڑے گا تو قیمت کا ضامن ہو گا۔[2]

علامہ سرخسی نے معاہدین / اهل الذمہ کے اموال کی حرمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فليس ينبغي للمسلمين ان يأخذوا شيئاً من دورهم واراضيهم ولا ان ينزلوا عليهم منازلهم لانهم اهل عهد و صلح وقد نادى منادى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم خيبر لا احل لكم شيئاً من اموال المعاهدين، ولانهم قبلوا الذمة لتكون اموالهم وحقوقهم كاموال المسلمين وحقوقهم۔''[3]

مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان کے گھروں اور زمینوں میں سے کوئی چیز لے لیں۔ ان (مسلمانوں) کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ ان کے گھروں میں اتر پڑیں۔ کیونکہ انھوں (معاہدین) نے اسلامی ریاست سے معاہدہ اور صلح کر لی ہے اور خیبر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک منادی نے یہ اعلان کیا تھا کہ معاہدین کے اموال میں سے کوئی چیز تمھارے لیے حلال نہیں۔ دوسرے انھوں نے عقد ذمہ اس لیے قبول کیا ہے کہ ان کے اموال اور حقوق مسلمانوں کے اموال اور

1۔ حصکفی، الدرالمختار، ۲/ ۲۲۳؛ حموی، شرح الاشباہ والنظائر، ۳/ ۸۵؛ ابن عابدین شامی، ردالمحتار علی الدرالمختار، ۳/ ۲۷۴-۲۷۳

2۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد، ہند، ت۔ن، ۳/ ۲۵۸

3۔ شرح السیر الکبیر، ۳/ ۲۵۰

حقوق کی مانند ہو جائیں۔

اہل الذمہ کے اموال کے حوالے سے اسلام کی درج بالا تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درج بالا فرمان کے مطابق خلفاء و اہل اسلام ہمیشہ ذمیوں کے مال و جائیداد کی حرمت کا پاس کرتے رہے۔ چنانچہ یحییٰ بن آدم قرشی نے اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ لکھا ہے کہ:

> حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو لکھا کہ حضرت سعید بن زید کو زمین کا کوئی قطعہ دے دیا جائے۔ انھوں نے ایک ذمی ابن الرفیل کی زمین سعید بن زید کو الاٹ کر دی۔ اس پر ابن الرفیل حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور کہا امیر المومنین! آپ نے ہم سے کس چیز پر صلح فرمائی تھی؟ آپ نے فرمایا: اس بات پر کہ تم ہمیں جزیہ دو گے اور ہم اس کے بدلے میں تمھاری زمین تمھارے اموال اور تمھاری اولاد کی حفاظت کریں گے۔ اس نے کہا آپ نے تو میری ملکیتی زمین سعید بن زید کو الاٹ کر دی۔ یہ سن کر آپ نے حضرت سعدؓ کو لکھا کہ اس کی زمین اسے واپس کر دی جائے۔ یہ کمال انصاف دیکھ کر وہ اسلام لے آیا۔ جس پر حضرت عمرؓ نے اس کا سات سو درہم وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔[1]

الغرض جس طرح اہل الذمہ کی جان اور زندگی کا تحفظ اسلامی ریاست کی ذمہ داری اور ان کا بنیادی حق ہے جس کی قدرے تفصیل اوپر آ گئی ہے، اسی طرح ان کے اموال و جائیداد کی حفاظت اور احترام بھی ان کا لازمی حق اور اسلامی ریاست کا فرض ہے۔ کسی آدمی کو ان کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرنے اور ان کی املاک و جائیداد سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ ہو گی۔ چنانچہ حضرت خالد بن ولیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں جنگ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا۔ جنگ کے بعد یہود نے آ کر شکایت کی کہ لوگ ہمارے پھلوں اور غلوں پر ٹوٹ پڑے ہیں جبکہ یہ چیزیں میدان میں نہیں بلکہ محفوظ جگہوں پر ہیں۔ یہود سے چونکہ معاہدہ ہو چکا تھا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

---

1 ۔ کتاب الخراج، (مشمولہ در موسوعۃ الخراج)، ص:۶۰

"الا لا یحل اموال المعاہدین الا بحقھا۔"[1]

خبردار سن لو! معاہدین کے اموال (تمھارے لیے) حلال نہیں سوائے اس کے کہ ان کے لینے کا (ریاست کی طرف سے) حق ہو۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک یہودی نے جو بڑا شریر تھا، یہ شکایت کی کہ لوگ ہمارے جانوروں کو ذبح کر رہے ہیں، ہمارے پھل کھا رہے ہیں، عورتوں کے ساتھ مار پیٹ ہو رہی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی شکایت پر توجہ فرمائی، لوگوں پر سخت ناراض ہوئے، نماز پڑھی خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"ان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم ما علیھم۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اہل کتاب کے گھروں میں بغیر اجازت داخل ہونے کو حلال قرار نہیں دیا ہے اور نہ ان کی عورتوں کو مارنے اور نہ ان کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے جبکہ وہ اپنے اوپر واجب (جزیہ) کو تمھیں ادا کریں۔

اسلامی معاشیات کے مشہور ماہر ابو عبید قاسم بن سلامؒ نے کتاب الاموال کے بیسویں باب میں زیر بحث موضوع سے متعلق متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل اسلام اہل الذمہ کے مال و جائیداد کے معاملے میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے۔ چند روایتیں ملاحظہ ہوں:

1۔ صعصعہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا: ہم ذمیوں کے علاقے سے گزرتے ہیں تو ان کی کچھ چیزیں اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔ انھوں نے پوچھا بغیر قیمت ادا کیے؟ میں نے کہا: ہاں بغیر کسی قیمت کے۔ اس پر آپ نے فرمایا: تم وہی کر رہے ہو جو اہل کتاب کہا کرتے تھے کہ "لیس

---

[1] ۔ ابو داؤد، السنن (کتاب الاطعمہ باب ماجاء فی اکل السباع)، ۲/۱۷۷، رقم ۳۸۰۵

[2] ۔ ابو داؤد، السنن، (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب فی تعشیر اھل الذمہ)، ۲/۸۱، رقم ۳۰۴۹؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب لا یأخذ المسلمون من ثمار اھل الذمۃ)، ۱۴/۴۹، رقم ۱۹۲۴۰

علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون"۔[1] (امیوں کے بارے میں ہم پر کوئی (گرفت کی) راہ نہیں اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔)[2]

2۔ ابو عبداللہ (حضرت سعد کے آزاد کردہ غلام) یا ابو عبدالرحمن (ابو عبید کو شک ہے) کہتے ہیں کہ میں حضرت سعدؓ کے ساتھ تھا کہ رات ہمیں باغ میں گزارنا پڑی۔ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ یہ باغ ذمی کا تھا۔ چنانچہ ہم نے اس باغ کے مالک کی تلاش کی لیکن وہ ہمیں نہ ملا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے کہا: اگر تمھیں یہ پسند ہو کہ کل اللہ سے مسلمان کی حیثیت سے ملو تو اس باغ کی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچانا چنانچہ ہم دونوں نے بھوکے پیٹ رات گزار دی حتی کہ صبح ہو گئی۔[3]

3۔ یزید بن ابی مالک کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جن میں حضرت عمر بن الخطابؓ بھی موجود تھے، جابیہ میں تھی۔ اس موقع پر ایک ذمی شخص، حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور اس نے انھیں بتایا کہ لوگ (مسلمان) اس کے انگور تیزی سے لے جا رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اس طرف نکل گئے جہاں انھوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو دیکھا کہ وہ اپنی ڈھال میں انگور بھرے اٹھائے لیے جا رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا ارے تو بھی یہ حرکت کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا امیر المومنین! ہم فاقہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ واپس ہو گئے اور انھوں نے حکم دیا کہ انگور والے کو اس کے انگوروں کی قیمت دے دی جائے۔[4]

شراب اور خنزیر کی تلفی پر تاوان

اہل الذمہ کی ایسی اشیاء جو مسلمانوں کے نزدیک ناپاک اور حرام ہیں، انھیں بھی کوئی نقصان پہنچانا

1۔ سورہ آل عمران، ۳:۷۵۔

2۔ کتاب الاموال، پیرہ نمبر ۴۱۵، ص: ۲۲۱

3۔ حوالہ مذکور، پیرہ نمبر ۴۱۸، ص: ۲۲۲

4۔ حوالہ مذکور، پیرہ نمبر ۴۶۳، ص: ۲۲۳

جائز نہیں ورنہ فقہ حنفی کی رو سے اسے تاوان دینا ہو گا۔ مثلاً شراب اور خنزیر ، فقہ حنفی میں اگر یہ چیزیں ی مسلمان کی ملکیت میں ہوں اور کوئی دوسرا مسلمان انھیں نقصان پہنچائے یا تلف کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں لیکن اگر یہ چیزیں کسی ذمی کی ملک میں ہوں اور مسلمان انھیں ضائع کر دے تو اسے تاوان دینا ہو گا کیونکہ اہل الذمہ کے نزدیک ان کی قیمت ہے۔ ان کے نزدیک خنزیر کی حیثیت وہی ہے جو مسلمان کے نزدیک بکری کی ہو سکتی ہے یا شراب ہے تو وہ اسے سرکہ کی طرح مباح اور قیمت والی چیز سمجھتا ہے۔ ونحن امرنا بان یترکھم و ما یدینون (اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم انہیں اور ان کے اختیار کردہ دین کو چھوڑ دیں)[1]

سلام میں چوری کی سزا چور کا ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا۔[2]

اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت پس (اے حکمرانو) دونوں کے ہاتھ بطور حد کاٹ دو۔

پھر چوری کا ارتکاب کوئی مسلمان کرے یا ذمی۔ اسی طرح مسروقہ مال مسلمان کا ہو یا ذمی کا دونوں ں یہی سزا ہے۔ امام احمد، امام شافعی، اور احناف سب کے نزدیک کوئی مسلمان خواہ کسی مسلمان کا مال چوری رے گا یا ذمی کا اس پر چوری کی حد لاگو ہو گی۔ اسی طرح کوئی ذمی اس جرم کا ارتکاب کرے تو وہ بھی سزا کا مستحق ہو گا۔ علامہ الزبیدی فرماتے ہیں: اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی ں چوری کرے گا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔[3]

غرض اسلامی ریاست اس امر کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ اھل الذمہ کو ہر طرح کا مالی تحفظ فراہم

1۔ دیکھیے: مرغینانی، ہدایہ (کتاب الغصب)، اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۳/ ۳۸۴

2۔ سورہ المائدہ، ۵:۳۸

3۔ الزبیدی، ابو بکر بن علی، الجوہرۃ النیرۃ شرح مختصر القدوری، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص: ۳۳۰

کرے تا کہ وہ ہر خطرہ اور اندازہ سے آزاد پورے اطمینان کے ساتھ اپنی مالی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

ذمی کا مال ناجائز طریقے سے کھانا ممنوع

گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے ایک ذمی کے مسلمان قاتل کو قصاص میں قتل کیے جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اہل الذمہ نے جزیہ دینا اس لیے قبول کیا ہے کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح محترم اور ان کے اموال ہمارے (اہل اسلام کے) اموال کی طرح محترم و محفوظ ہو جائیں۔ اب اس فیصلہ کی رو سے مسلمانوں کے مال و جائیداد کے متعلق جو احکام قرآن و حدیث میں آئے ہیں بعینہ ان کا اطلاق اھل الذمہ کے مال و جائیداد پر بھی ہو گا مثلاً اہل ایمان کو ہدایت ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔[1]

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔

فقہاء مفسرین کی صراحت کے مطابق باطل سے مراد ہے ہر ناجائز طریقہ سے حاصل کردہ مال، اور فقہاء نے اکل باطل کی جو تفصیل لکھی ہے اس میں قمار، غصب، حق تلفی وغیرہ کے ساتھ ایک مد یہ بھی بڑھا دی ہے کہ وہ مال بھی باطل ہی کے حکم میں آجاتا ہے جو اس مال کے مالک سے بغیر اس کی خوشدلی کے حاصل کیا جائے یا مالک گو اسے خوشدلی سے دے رہا ہو لیکن خود شریعت نے اس مد کو ناجائز قرار دیا ہو۔[2]

اس حکم کی رو سے جس طرح کسی مسلمان کا مال دھوکہ فریب، جعل سازی وغیرہ سے لینا جائز نہیں اسی طرح کسی ذمی کا مال ناجائز طریقے سے ہتھیانا بھی جائز نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاء اسلام نے اس معاملے میں ہمیشہ بڑی احتیاط سے کام لیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں کسی شخص نے گھوڑ پال سکیم کے مطابق دجلہ کے کنارے ایک رمنہ بنانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے وہاں کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا کہ اگر وہ زمین کسی ذمی کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی

---

[1] ۔ سورۃ البقرہ، ۲:۱۸۸ نیز سورۃ النساء، ۴:۲۹

[2] ۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن (تحت سورۃ البقرہ:۱۸۸)، ۲/۳۳۸

نہ گزرتا ہو تو اسے زمین دے دی جائے۔[1]

دراصل آغازِ اسلام میں ہی یہ مسئلہ طے پا گیا تھا کہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی مقبوضہ زمینیں انھی کے قبضہ میں رہیں گی۔ اس لیے اسلامی حکومت کو ذمیوں کی اراضی ان سے چھیننے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس بارے میں امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

"ولیس له ان یأخذها بعد ذالک منهم وهی ملک لهم یتوارثونها ویتبایعونها"[2]

(حکومت کو یہ اختیار نہیں کہ ذمیوں سے ان کی زمین چھین لے، وہ زمین ان کی ملکیت ہے، وہ نسل در نسل اس کے وارث ہوں گے اور وہ اس کی خرید و فروخت بھی کر سکتے ہیں۔)

علامہ شامی نے مصر اور شام کی فتوحات کے بعد وہاں کی زمینوں پر سابقہ مالکان کی ملکیت کو ثابت کرتے ہوئے ایک شرعی قاعدہ کلیہ کے طور پر لکھا ہے کہ:

"لیس للامام ان یخرج شیئا من ید احد الا بحق ثابت معروف۔"[3]

امام / حکومت کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ کسی آدمی کی ملکیت سے کوئی چیز قانونی طور پر ثابت اور معروف حق کے بغیر حاصل کرے۔

نامور فقیہ امام سرخسی نے "اموال المعاہدین" کے عنوان سے مستقل باب میں اہل الذمہ کے اموال کی حرمت بیان کرتے ہوئے فتویٰ دیا ہے کہ:

قال واذا اودع المسلمون قوماً من المشرکین فلیس یحل لهم ان یأخذ واشیئا من اموالهم الا بطیب انفسهم للعهد الذی جری

---

[1] ۔البلاذری، فتوح البلدان، (باب تمصیر البصرة)، ص: ۳۵۹

[2] ۔امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۴

[3] ۔شامی، ابن عابدین، حاشیہ رد المحتار علی الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ت۔ن، ۴/ ۱۸۱

بيننا وبينهم فان ذالک العهد فی حرمة التعرض للاموال والنفوس بمنزلة الاسلام فكما لا يحل شيئي من اموال المسلمين الا بطيب انفسهم فكذالک لا يحل شئی من اموال المعاہدين۔[1]

جب مسلمان کسی مشرک قوم سے معاہدہ کرلیں تو پھران کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان کے مالوں میں سے کوئی چھوٹی سی چیز بھی ان کی دلی رضامندی کے بغیر لے لیں۔ بوجہ اس عہد / معاہدہ کے جو ہمارے اور ان کے درمیان طے پاچکا ہے۔ کیونکہ شرعی طور پر یہ معاہدہ اموال اور جانوں کے ساتھ تعرض کی حرمت میں بمنزلہ اسلام کے ہے۔ تو جس طرح مسلمانوں کے اموال میں سے کوئی چیز ان کی خوش دلی اور رضامندی کے بغیر لینا جائز نہیں، اسی طرح معاہدین کے اموال میں سے بھی کوئی چیز لینا جائز نہیں۔

پھر علامہ سرخسی نے اپنے اس فتوی پر حضرت ابو ثعلبہ الخشنی سے مروی غزوہ خیبر کے موقعہ پر یہود کی شکایت پہ اس حدیث نبوی سے استدلال کیا ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جس کے آخر میں حضور اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ

لا احل لكم شيئاً من اموال المعاہدين الا بحق۔[2]

میں تمہارے لیے معاہدین کے اموال میں سے کوئی چیز حلال نہیں ٹھہراؤں گا الا یہ کہ اس کے لینے کا شرعی طور پر کوئی حق ہو۔

غیر مسلموں کے اموال کی حرمت - تاریخ اسلام سے چند نظائر

غیر مسلموں / ذمیوں کے اموال کو حاصل حرمت کا اندازہ درج ذیل چند تاریخی نظائر سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

---

[1] - سرخسی، شرح السیر الکبیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء، ۱/ ۹۵

[2] - حوالہ مذکور، ۱/ ۹۶

یہود کے معاہدہ کو توڑنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں مدینہ منورہ سے جلا وطن کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی، تو ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ نہیں کر لیا بلکہ انھیں حکم دیا کہ جلا وطنی سے قبل اپنی زمینیں اور مالوں کو فروخت کر لو۔[1] اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کوفے میں جو جامع مسجد تعمیر ہوئی اس میں کچھ ملبہ وہاں کی قدیم عمارات کا استعمال کیا گیا۔ اگرچہ ان کا قانونی وارث کوئی نہ تھا لیکن چونکہ وہ عمارات ذمیوں کی زمین میں تھیں، اس لیے ذمیوں کو ان کی قیمت ان کے جزیے کی رقم سے منہا کر دی گئی۔[2]

علامہ شبلی نعمانی اس قسم کے متعدد واقعات جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس کے سوا سینکڑوں واقعات ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ذمیوں کے مال اور جائیداد سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔"[3]

خلفائے اسلام / اسلامی حکومتوں نے اموال کے معاملے میں غیر مسلم شہریوں (اهل الذمہ) کو کس طرح تحفظ اور انصاف فراہم کیا۔ ذیل میں ایک تاریخی جھلک ملاحظہ ہو:

احمد بن طولون کا ایک کمانڈر مصر کے کسی شہر کا والی کمانڈر تھا۔ ایک عیسائی راھب احمد بن طولون کے محل / دربار میں اس کے ظلم کی شکایت لے کر آیا۔ ایک دربان نے جو اس والی کا خاص آدمی تھا۔ اسے

---

1 - دیکھیے: صحیح بخاری (کتاب الاکراہ، باب فی البیع المکرہ) رقم: ۶۹۴۴؛ صحیح بخاری (کتاب الاعتصام، باب ماذکر النبی وحض علی اتفاق اھل العلم) رقم: ۷۳۴۸؛ ابخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجھاد، باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب) الخ، ۴۴۹/۱ رقم: ۳۱۶۷؛ ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ)، ۷۲/۲، رقم: ۳۰۰۳

2 - البلاذری، فتوح البلدان، ص: ۲۹۴ (فی ذکر تمصیر الکوفۃ)؛ شبلی نعمانی، الفاروق، المیزان لاہور، ص: ۲۱۵

3 - مقالات شبلی (مذہبی)، ۱۹۸/۱

دیکھ لیا۔ اس نے اس سے پوچھا تمھارا کیا معاملہ ہے؟ راھب نے جواب دیا: اس والی نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور مجھ سے تین سو دینار ہتھیا لیے ہیں۔ تو اسے دربان نے کہا: تو اس کے ظلم کی شکایت نہ کر، تین سو دینار تجھے میں دے دیتا ہوں۔ پھر وہ اسے اپنے گھر لے گیا اور اسے تین سو دینار دے دیے۔ راھب نے اسی کو غنیمت سمجھا اور واپس چلا گیا۔ احمد بن طولون کو کسی طرح اس واقعہ کی خبر مل گئی۔ اس نے اپنے والی دربان اور راھب تینوں کو دربار میں طلب کر لیا اور کمانڈر سے کہا: کیا تیری ضروریات پوری نہیں کی جاتیں؟ کیا تجھے رزق میں کشادگی میسر نہیں؟ اور کوئی ایسا محرک بھی نہیں جو تجھے دست ظلم دراز کرنے پر برانگیختہ کرے، پھر کس چیز نے تجھے ایسا کرنے پر اکسایا؟ اس کے بعد اس نے والی کو شہر کی امارت سے اور دربان کو دربانی سے معزول کر دیا۔ بعد ازیں عیسائی راھب کو بلایا اور پوچھا: اس نے تجھ سے کتنے دینار لیے تھے؟ اس نے بتایا: تین سو دینار۔ احمد بن طولون کہنے لگا: تیرا برا ہو، تین ہزار دینار کیوں نہیں کہتا۔ جتنے کہو گے اتنے لے کر دوں گا۔ بہر کیف اس نے مذکور والی / کمانڈر سے غصب شدہ دینار وصول کیے اور انھیں راھب کو واپس کیا۔[1]

عزت و آبرو کے تحفظ کا حق

(Right to the Protection of Honour)

جان و مال کے تحفظ کے اولین حق کے بعد ایک شہری کا دوسرا بڑا حق یہ ہے کہ حکومت اپنے قانونی اختیارات و وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی عزت و آبرو اور ناموس کی حفاظت کرے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر تمام انسانوں کے خون مال اور عزت و آبرو کو قابل احترام قرار دیا ہے۔ زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچانا، اسے گالی دینا، مارنا پیٹنا، یا غیبت کی شکل میں اس کی عزت نفس مجروح کرنا جس طرح ایک مسلمان کے حق میں ناجائز ہے اسی طرح ذمی کے حق میں بھی

---

[1] - صالح بن حسین العاید، حقوق غیر المسلمین فی بلاد الاسلام، ص:۵۱-۵۲

ناجائز ہے۔ کسی بڑے سے بڑے مسلمان، حکومتی عہدیدار یا اکثریت کے فرد کو اسلامی ریاست میں اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم / اقلیتی فرد کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالے۔ زیر بحث معاملے میں قرآن و حدیث کی عمومی تعلیمات و ہدایات سے استنباط و استشہاد کرتے ہوئے معروف اصولی عالم امام قرافیؒ فرماتے ہیں:

ان عقد الذمة یوجب حقوقا علینا لھم لانھم فی جوارنا وفی خفارتنا وذمة اللہ تعالیٰ وذمة رسولہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ودین الاسلام فمن اعتدی علیھم ولو بکلمة سوء او غیبة فی عرض احدھم او نوع من انواع الاذیة او اعان علی ذالک فقد ضیع ذمة اللہ تعالی وذمة الرسول ﷺ وذمة الاسلام۔[1]

بے شک عقد ذمہ ہمارے اوپر ذمیوں کے بہت سے حقوق واجب کر دیتا ہے کیونکہ وہ ہماری پناہ اور حفاظت میں ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ اور دین اسلام کی ذمہ داری میں ہیں۔ پس جس آدمی نے ان پر زیادتی کی خواہ بری بات کی صورت میں یا غیبت کر کے اس کی عزت کو داغدار کیا یا اسے کسی بھی قسم کی (ذہنی یا جسمانی) اذیت پہنچائی یا اس کے خلاف کسی کی مدد کی تو یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی ذمہ داری کو پامال کیا۔

گذشتہ صفحات میں یہ واقعہ تفصیل سے درج ہو چکا ہے کہ عہد فاروقی میں مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے اپنی خاندانی بڑائی کے زعم میں اور گھڑ دوڑ میں اپنی شکست کا غصہ نکالنے کے لیے جب ایک قبطی (ذمی) کو بھرے مجمع میں کوڑے مار کر اس کی توہین و تذلیل کی تو شکایت ملنے پر حضرت عمرؓ نے گورنر کے صاحبزادے کو عام لوگوں کے سامنے اسی مظلوم قبطی کے ہاتھوں کوڑے مروائے اور یوں دنیا

---

[1] ۔ الفروق، ۳۰/۱۴

پر واضح کر دیا کہ کسی غیر مسلم / ذمی کی عزت و آبرو کسی مسلمان کی عزت و آبرو اور ناموس سے کم نہیں۔ [1]

اسی طرح ذمیوں کے متعلق کسی قسم کی تحقیر کا لفظ استعمال کرنا شریعت کی نگاہ میں ناپسند ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ عمیر بن سعید حمص کے والی تھے۔ ایک موقعہ پر ان کے منہ سے ایک ذمی کے متعلق الفاظ نکل گئے۔ "اخزاک الله (اللہ تعالیٰ تجھے رسوا کرے) اس پر انھیں اس قدر تاسف اور ندامت ہوئی کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں آکر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ میں اس ملازمت میں نہ ہوتا تو میرے منہ سے ایسے الفاظ نہ نکلتے۔ [2]

اسلام نے عزت و ناموس کی حرمت اور عفت و عصمت کو اس حد تک ملحوظ رکھا ہے کہ پر امن غیر مسلم شہری تو کجا اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ جنگ کے دوران بھی اگر حربی / دشمن کی عورتوں سے سابقہ پیش آجائے تو بھی یہ روا نہیں کہ ان کی عزت کو نقصان پہنچایا جائے۔ [3] حنفی فقیہ ابن نجیم نے "احکام الذمی" کے باب میں ایک عمومی قاعدہ کے طور پر لکھا ہے کہ "حکمه حکم المسلمین" ذمی کا حکم بھی وہی ہے جو دوسرے مسلمانوں کا ہے۔ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ حموی نے ذمی آدمی کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے لکھا ہے:

"ویفهم من کلام المصنف ان المسلم اذا سب الذمی یعزر"

مصنف کے کلام سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی آدمی کو گالی دے تو اسے (مسلمان کو) سزا دی جائے گی۔

علامہ حموی نے مذکورہ عمومی قاعدہ کی وضاحت میں یہ بھی فرمایا ہے:

---

[1] ۔ ہیکل محمد حسین، الفاروق عمر (اردو ترجمہ)، الفیصل لاہور، ص: ۷۵۸؛ شبلی نعمانی، الفاروق، المیزان لاہور، ص: ۳۰۹

[2] ۔ شبلی نعمانی، الفاروق، المیزان، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۶۷؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۰/ ۳۰

[3] ۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء، طبع اول، ۱۰/ ۴۲۱

''وفی القنیة لا یقال له یاکافر ویأثم القائل ان اذاہ۔''[1]

اور قنیہ میں ہے کہ اسے اے کافر! کہہ کر نہیں بلایا جائے گا۔ اس طرح بلانے سے اگر اسے ذہنی اذیت پہنچتی ہے تو ایسا کہنے والا گنہگار ہو گا۔

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں بھی قنیہ کے حوالے سے ہے:

''لو قال لیهودی او مجوسی یاکافر یأثم ان شق علیه۔''[2]

اگر کسی آدمی نے کسی یہودی یا مجوسی کو کہا: اے کافر! تو اگر یہ بات اس پر شاق گزرتی ہے تو ایسا کہنے والا گنہگار ہو گا۔ جبکہ فقہ حنفی کی معروف کتاب در مختار میں ہے:

''یجب کف الاذی عن الذمی وتحرم غیبته کالمسلم۔''

ذمی کی ایذاء رسانی سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت (برائی) کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان کی غیبت حرام ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اس جملہ کی وضاحت اور تشریح میں لکھا ہے

لانه بعقد الذمة وجب له مالنا فاذا حرمت غیبة المسلم حرمت غیبته بل قالوا: ان ظلم الذمی اشد۔[3]

یہ بات اس لیے ہے کہ عقد ذمہ کی وجہ سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں تو جب مسلمان کی غیبت حرام ہے تو اس (ذمی) کی غیبت بھی حرام ہو گی، بلکہ علماء نے تو یہ بھی کہا ہے کہ ذمی پر ظلم کرنا (مسلمان پر ظلم کرنے کی بنسبت) زیادہ سخت ہے۔

اسلام میں اسلامی ریاست کے اندر بسنے والے غیر مسلموں کی عزت و آبرو کا تحفظ اس حد تک ملحوظ

---

[1] ۔ حموی، غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر، ۳/۸۳

[2] ۔ فتاوی عالمگیری، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۵/۳۴۸

[3] ۔ ابن عابدین شامی، حاشیہ رد المحتار، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۹۹۸ء، ۶/۲۱۰

رکھا گیا ہے کہ جس طرح کسی مسلمان کی ہجو (عیب گیری کرنا، معائب شمار کرنا، گالی دینا اور مذمت کرنا)[1] شرعی اعتبار سے حرام ہے اسی طرح کسی غیر مسلم ذمی کی ہجو میں کوئی لفظ زبان سے نکالنا بھی حرام اور ناجائز ہے۔[2] اھل الذمہ کی عزت و آبرو کا تحفظ اور ان کا انسانی احترام اسلام کے نزدیک ان کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وفی الواقعات عظام الیهود لها حرمة اذا وجدت فی قبورهم کحرمة عظام المسلمین حتی لا تکسر لان الذمی لما حرم ایذاءه فی حیاته لذمته فتجب صیانة نفسه عن الکسر بعد موته۔[3]

اور واقعات میں ہے کہ یہود، غیر مسلموں کی ہڈیاں جب ان کی قبروں میں پائی جائیں تو ان کے لیے اسی طرح کی حرمت و احترام ہے جس طرح مسلمانوں کی ہڈیوں کے لیے حرمت ہے۔ یہاں تک کہ انھیں توڑا نہیں جائے گا، کیونکہ کسی ذمی کو اس کے عقد ذمہ کے باعث جب اس کی زندگی میں ایذاء پہنچانا حرام ہے تو اس کی موت کے بعد اس کی ذات اور ہڈیوں کو توڑنے سے بچانا بھی واجب ہو گا۔

اہل الذمہ کے مذہبی جذبات و احساسات کا احترام

اسلام نے اھل الذمہ کی عزت نفس کا خیال کرتے ہوئے ان کے مذہبی جذبات و احساسات کے احترام اور انتہائی شائستہ و ترغیبی انداز میں ان سے بات کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

---

[1] - بلیلاوی، مصباح اللغات، ص: ۹۸۰ (مادہ ہجو، ہجاء)

[2] - دیکھیے: ابن ہمام، شرح فتح القدیر (باب من تقبل شہادتہ ومن لا تقبل) ۱۷/۱۳۴ (مکتبۃ شاملۃ)؛ ابن نجیم، البحر الرائق، دار المعرفۃ، بیروت ۷/۸۸؛ ابن عابدین، رد المحتار (کتاب الحظر والاباحۃ مکتبہ شاملہ، ۲۶/۳۳۱

[3] - ابن نجیم، زین العابدین، البحر الرائق (کتاب الجنائز، فصل السلطان احق بصلواتہ)، دار المعرفۃ بیروت۔ لبنان، (الطبعۃ الثانیہ)، ۲/۳۱۰

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔[1]

اور تم اہل کتاب سے بحث مباحثہ / مناظرہ نہ کرو مگر انتہائی عمدہ طریقہ سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے (اظہار قرب و محبت کرتے ہوئے) کہو ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے اور دوسرے ہمارا اور تمھارا معبود بھی ایک ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

اپنی مذہبی عبادت گاہوں اور کتابوں سے عقیدت و محبت تمام اہل مذہب کے نزدیک ایک طبعی و قدرتی چیز ہے۔ اسلام نے اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے اہل ذمہ کی مذہبی کتابوں کے احترام کا بھی حکم دیا ہے تاکہ ان کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ چنانچہ غزوہ خیبر کے مال غنیمت میں چند نسخے توراۃ کے بھی مسلمان مجاہدین کے ہاتھ میں آگئے۔ یہودیوں نے ان نسخوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ تو نبی رحمت ﷺ نے ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے انہیں وہ نسخے واپس لوٹانے کا حکم دیا اور ان مقدس و مذہبی کتب کے ساتھ وہ توہین آمیز سلوک نہ فرمایا جو رومیوں نے یروشلم کی فتح کے وقت کیا تھا کہ کتب مقدسہ کو جلا دیا۔[2] جبکہ انسانی حقوق کا علمبردار امریکہ اور اس کے اتحادی آج بھی قرآن مجید اور صاحب قرآن کی بے حرمتی کر کے اہل اسلام کے مذہبی جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچانے سے باز نہیں آتے۔[3]

---

[1] ۔العنکبوت، ۲۹: ۴۶

[2] ۔دیکھیے: ہیکل، حیاۃ محمد، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۹۰

[3] ۔روزنامہ اساس، لاہور، مورخہ ۲۳ فروری ۲۰۱۲ء؛ نیز دیکھیے: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، روزنامہ جنگ، لاہور، وغیرہ، مورخہ ۱۲ ستمبر ۲۰۱۲ء ومابعد

علیٰ ھذا القیاس اھل کتاب کے مذہبی جذبات کے احترام کی خاطر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا کہ وہ ان کی آسمانی کتابوں کی تکذیب کریں۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوھم وقولوا امنا باللہ وما انزل الینا الآیۃ۔[1]

اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ہی ان کی تکذیب کرو بلکہ یوں کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس کتاب پر جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس کتاب پر بھی جو تمھاری طرف نازل کی گئی۔

غیر مسلموں کے مذہبی جذبات و احساسات کے حد درجہ احترام اور انصاف کی ایک منفرد مثال عہد فاروقی میں فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے پیش کی جس کی نظیر دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۱ھ میں اسکندریہ فتح ہوا تو وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک تصویر کی ایک آنکھ کو اسلامی فوج کے کسی لشکری نے اپنے تیر سے پھوڑ ڈالا، جس سے عیسائیوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ انہوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچ کر یہ مطالبہ کیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تصویر بنا کر ان کو دی جائے تاکہ وہ بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب دیا: تصویر دینے کی کیا ضرورت ہے ہم لوگ موجود ہیں تم جس کی آنکھ چاہو پھوڑ ڈالو۔ پھر اپنا خنجر ایک عیسائی کے ہاتھ میں دے کر اپنی آنکھیں سامنے کر دیں، یہ سن کر عیسائی کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا، اپنے دعویٰ سے یہ کہہ کر باز آیا کہ جو قوم اس درجہ دلیر فیاض اور بے تعصب ہو، اس سے انتقام لینا سخت بے رحمی اور بے قدری ہے۔[2]

---

[1] - بخاری، الجامع الصحیح (کتاب التفسیر باب قول اللہ تعالیٰ قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا، البقرہ:۱۳۶)، ۲/۶۴۴، رقم: ۴۴۸۵؛ نیز بخاری، الصحیح (کتاب الاعتصام باب قول النبی لا تسالوا اھل الکتاب)، ۲/۱۰۹۴، رقم: ۷۳۶۲؛ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب مایجوز من تفسیر التوراۃ، رقم: ۷۵۴۲

[2] - ملاحظہ ہو: صباح الدین عبد الرحمن، اسلام میں مذہبی رواداری، ص:۱۰۵

چوتھی فصل

ہر قسم کی زیادتی سے بچاؤ کا حق

جب کوئی غیر مسلم عقد ذمہ / معاہدہ کے ذریعے اسلامی ریاست کا شہری بن جاتا ہے تو شرعی طور پر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کے جان مال اور عزت و آبرو کے تحفظ جس کی ضروری تفصیل گذشتہ اوراق میں گزر چکی ہے، کے علاوہ ہر قسم کی زیادتی سے اسے بچائے، اس کا دفاع کرے اور اس کی طرف بڑھنے والا ہر ہاتھ اور ظالمانہ اقدام روک دے۔ امور سلطنت و حکومت کے مشہور عالم امام ماوردی نے لکھا ہے:

”ویلتزم لهم یعنی اهل الذمة ببذل الجزیة حقان: احدهما الکف عنهم والثانی الحمایة لهم لیکونوا بالکف امنین وبالحمایة محروسین۔“[1]

اہل الذمہ جب جزیہ دینا قبول کر لیتے ہیں تو ان کے لیے مسلمانوں پر دو حق لازم ہو جاتے ہیں۔ پہلا حق ان سے جنگ کرنے سے رک جانا ہے اور دوسرا حق ہر ظلم و زیادتی میں ان کی حمایت / بچاؤ کرنا ہے تاکہ وہ جنگ، وغیرہ کے رک جانے سے امن میں آ جائیں اور حکومت و اہل اسلام کی حمایت کے باعث محفوظ ہو جائیں۔

فقہاء اسلام نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اہل الذمہ سے ظلم کا دور کرنا اور ان کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ کیونکہ جب انھوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا تو انھوں نے اپنے اوپر ہونے والے ہر ظلم کے

[1] - الاحکام السلطانیہ، ص: ۱۴۳

وفاع کا التزام کر لیا اور وہ اہل دار الاسلام میں سے ہو گئے۔[1]

اھل الذمہ پر ظلم وزیادتی نہ کرنے کی تعلیمات اسلام

مشہور فقیہ اور قاضی القضاۃ امام ابو یوسف ؒ نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کو اہل الذمہ کے ساتھ حسن سلوک اور انہیں ہر ظلم و اذیت سے بچانے کی یوں ہدایت فرمائی:

وقد ینبغی یا امیر المؤمنین ایدک اللہ ان تتقدم فی الرفق باھل ذمة نبیک وابن عمک محمد ﷺ والتفقد لھم حتی لا یظلموا ولا یؤذوا ولا یکلفوا فوق طاقتھم ولا یؤخذ شئی من اموالھم الا بحق یجب علیھم۔[2]

اے امیر المؤمنین! اللہ آپ کی تائید و نصرت فرمائے آپ کے لیے مناسب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں (اہل الذمہ) کے ساتھ نرمی میں سبقت کرنے والے بن جائیں جن کی حفاظت کا ذمہ آپ کے نبی اور آپ کے چچا کے بیٹے حضرت محمد ﷺ نے لیا ہے اور ان کی نگرانی کریں حتی کہ ان پر نہ ظلم کیا جائے نہ انہیں کسی قسم کی اذیت پہنچائی جائے اور نہ انہیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دی جائے اور نہ ان کے اموال سے کوئی چیز لی جائے الا یہ کہ ان پر کوئی حق واجب ہوتا ہو۔

امام ابو یوسف ؒ نے اس نصیحت میں امیر المؤمنین کو اہل الذمہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی یاد دلایا کہ

من ظلم معاھداً او کلفه فوق طاقته فانا حجیجه۔

جس آدمی نے کسی معاہد / ذمی پر ظلم کیا یا اس کی طاقت سے زیادہ اسے تکلیف دی (اس کی طاقت وہمت سے

---

1 ۔ دیکھیے: شافعی، امام، الام، ۴/ ۱۲۷-۱۲۸: ابن قدامہ، المغنی، ۵/ ۵۶۶: سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۱/ ۱۴۰: کاسانی، بدائع الصنائع. ۵/ ۲۸۱

2 ۔ کتاب الخراج: (مشمولہ در کتاب موسوعۃ الخراج) دار المعرفۃ بیروت، لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص: ۱۲۵

زیادہ اس پر جزیہ وخراج کا بارڈالا) تو میں خود اس کی طرف سے جھگڑا یادعوی پیش کرنے والا بنوں گا۔

اسی طرح اس نصیحت میں امام موصوف نے امیر المؤمنین کو اھل الذمہ کے حوالے سے حضرت عمر فاروقؓ کی یہ وصیت بھی بتائی کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا تھا:

اوصی الخلیفة من بعدی بذمة رسول الله ﷺ ان یوفی لهم بعهدهم وان یقاتل من وراءهم ولا یکلفوا فوق طاقتهم۔[1]

میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ (اھل الذمہ) کے بارے یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ کیے گئے عہد (عقد ذمہ) کو پورا کرے اور ان کے تحفظ کی خاطر جنگ سے بھی گریز نہ کرے اور ان کی طاقت سے زیادہ انہیں تکلیف نہ دے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس بات کا خیال اور احساس ہمیشہ دامن گیر رہا کہ جن ذمی لوگوں کی ہر طرح کی حفاظت کا ذمہ اسلامی ریاست نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ذمہ داری کی بنیاد پر لیا ہے، ان کے ساتھ کہیں زیادتی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جہاں وہ اپنے عمال کو ہدایات فرماتے رہتے وہاں صرف سرکاری اطلاعات پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ مختلف علاقوں/صوبوں سے آنے والے پرائیویٹ وفود سے بھی اس معاملے میں اطمینان حاصل فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ بصرہ کا ایک وفد ملاقات کے لیے آیا تو اس سے فرمایا: "لعل المسلمین یفضون الیٰ اهل الذمة بأذی" کہیں ایسا تو نہیں کہ مسلمان اہل الذمہ کو اذیت پہنچاتے ہوں؟ انہوں نے بتایا: "ما نعلم الا وفاء" ہم تو یہی جانتے ہیں کہ مسلمان ان سے کیے گئے عہد کی پوری پابندی کرتے ہیں۔[2]

امام ابو یوسفؒ نے حضرت ہشام بن عروہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ جب شام سے

---

[1] - حوالہ سابق

[2] عبد الکریم زیدان، احکام الذمیین والمستامنین، ص: ۷۶

واپس آرہے تھے تو راستے میں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ماجرا ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: ان کے ذمہ جزیہ ہے جو انہوں نے ابھی تک ادا نہیں کیا۔ اس کی ادائیگی کے لیے انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے، تو حضرت عمرؓ نے پوچھا: یہ لوگ کیا کہتے اور جزیہ ادا نہ کرنے کا کیا عذر پیش کرتے ہیں؟ لوگوں نے بتایا: یہ کہتے ہیں "لا نجد" (ہمارے پاس ادائیگی کے لیے رقم موجود نہیں)۔ تو آپ نے فرمایا: انہیں چھوڑ دو اور اس چیز کی انہیں تکلیف نہ دو جس کی یہ طاقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "لوگوں کو تکلیف نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں لوگوں کو عذاب / تکلیف دیتے ہیں اللہ انہیں قیامت کے دن عذاب دے گا۔" اس کے بعد آپ نے انہیں چھوڑنے کا حکم دیا اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔[1]

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ اہواز کے ذمی اپنا گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تو آپ نے اس کی تحقیقات کے لیے بصرہ سے دس سچے اور نیک سیرت مسلمانوں کو طلب کیا۔ ان میں سے ایک احنف بن قیس بھی تھے، ان سے پوچھا کہ ذمی مسلمانوں کے ظلم کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں یا اور کسی سبب سے؟ انہوں نے کہا کہ ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوا وہ خود بلا کسی سبب کے بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کی مرضی کے مطابق سلوک ہوتا ہے۔ مگر اس بیان سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی تو عقبہ بن غزوان والی بصرہ کو لکھ بھیجا کہ لوگوں کو ذمیوں کے ساتھ ظلم و زیادتی سے روکو اور اس سے ڈرو اور محتاط رہو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری بدعہدی یا ظلم کی وجہ سے حکومت تم سے چھین لی جائے۔ خدا نے تمہیں عدل و سچائی کے وعدہ پر حکومت عطا کی ہے، اس لیے اس عہد کو پورا کرو اور اس کے حکم اور مرضی پر عمل کرو اس وقت خدا تمہاری مدد کرے گا۔[2]

ذمیوں پر کسی بھی قسم کی زیادتی سے بچنے کا حضرت عمرؓ کو کتنا اہتمام تھا؟ اس کا مزید اندازہ حضرت

---

[1] -کتاب الخراج (مشمولہ "موسوعۃ الخراج") ص: ۱۲۵

[2] -شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص: ۲۴۴

سعد بن ابی وقاصؓ کے نام حضرت عمرؓ کے اس مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں آپ نے انہیں مفصل ہدایات دی ہیں۔ اس مکتوب میں ذمیوں کے بارے میں یہ ہدایات تھیں کہ:

فوج کا پڑاؤ ذمیوں کی آبادی سے دور رکھا کرو۔ ان کی آبادی میں انہی لوگوں کو جانے کی اجازت دو جن کی دیانت و امانت پر تم کو پورا بھروسہ ہو اور جو ان کے ساتھ برا سلوک نہ کریں۔ کیونکہ تم پر ان کے جان ومال کے احترام اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہے جن کو پورا کرنا تمہاری آزمائش ہے جس طرح ان پر ان کے عہد کی پابندی کی ذمہ داری اور اس کی آزمائش ہے۔ جب تک وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک رکھو اور جن لوگوں نے تم سے صلح کرلی ہے، ان پر ظلم کر کے دشمن پر فتح حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔[1]

زیر بحث معاملے میں حضرت عمرؓ ہی کی کمال احتیاط کا ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو:

شام کی آخری سرحد پر ایک شہر تھا جس کا نام عربسوس تھا اور جس کی سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی۔ شام جب فتح ہوا تو یہ شہر بھی فتح ہوا اور صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ لیکن یہاں کے لوگ در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ادھر کی خبریں ان کو پہنچاتے رہتے تھے۔ عمیر بن سعد وہاں کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی کمینہ خصلت کا جو "انتقام" لیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ عمیر بن سعد کو کہا: جس قدر ان کی جائیداد، زمین، مویشی اور اسباب ہے، سب شمار کر کے ایک ایک چیز کی دوچند قیمت دے دو اوران سے کہو کہ کہیں اور چلے جاؤ۔ اگر اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک برس کی مہلت دو اور اس کے بعد جلا وطن کر دو۔ چنانچہ وہ اپنی شرارت سے باز

---

[1] -شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص:۲۵۰

نہ آئے تو اس حکم کی تعمیل کی گئی۔[1]

اسی طرح اہل الذمہ سے زیادتی کے ازالے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو: جس کا پس منظر یہ ہے کہ اموی حکومت کے زمانے میں جب اسلامی قوانین کی پوری پابندی نہ رہ گئی تھی اور وہ اپنے مصالح اور مفادات کے مقابلے میں مسلمانوں کے حقوق کا بھی لحاظ نہیں کرتی تھی۔ جس کی تفصیل زیر تحقیق موضوع سے خارج ہے، تو ذمیوں پر بھی بعض زیادتیاں ہوئیں۔ لیکن اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے زمانے میں اس کی پوری تلافی کر دی۔ انہوں نے جب حکومت کے غصب کردہ اموال کو واپس کرنا شروع کیا تو ذمیوں نے بھی اپنے مطالبات ان کے سامنے پیش کیے۔ چنانچہ ایک ذمی نے دعوی کیا کہ خلیفہ ولید کے لڑکے عباس نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اتفاق سے عباس حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے پوچھا: اس ذمی کے دعوی کا کیا جواب دیتے ہو؟ اس نے کہا امیر المؤمنین! ولید نے یہ زمین مجھ کو جاگیر میں دی تھی۔ اس کی سند میرے پاس موجود ہے۔ اس پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا: لیکن خدا کی کتاب ولید کی سند سے مقدم ہے اور زمین ذمی کو واپس دلا دی۔[2]

حضرت عمرؓ نے شام کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا، اس کے الفاظ یہ تھے:

وامنع المسلمین من ظلمهم والاضرار بهم واكل اموالهم الا بحلها و وف لهم بشرطهم الذی شرطت لهم فی جمیع ما اعیتهم۔[3]

مسلمانوں کو منع کرنا کہ ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں نہ ان کا مال بے وجہ کھانے پائیں اور جس قدر شرطیں تم نے ان سے طے کی ہیں، سب وفا کرو۔

اسلامی ریاست میں اہل الذمہ پر کسی بھی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے، خلفاء اسلام کو اس چیز کا کتنا

---

[1] - شبلی نعمانی، الفاروق، ۲/ ۲۶۷-۲۶۸

[2] - شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص: ۲۵۲-۱۵۳

[3] - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۸۲؛ شبلی نعمانی، الفاروق، ۲/ ۳۶۳-۳۶۴

احساس تھا، اس کا اندازہ حضرت علی المرتضیٰؓ کی اپنے محصل کو درج ذیل ہدایت سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

دیکھو جب تم ان کے پاس (جزیہ کی وصولی کے لیے) پہنچو تو ان کے سردی کے کپڑے بیچنے کی کوشش کرنا نہ گرمی کے نہ ان کا رزق (خوراک) بیچنا جسے وہ کھاتے ہیں اور نہ کوئی ایسا چوپایہ جس پر وہ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ جزیہ کی وصولی کے لیے کسی کو کوڑا مارنا نہ سزا کے طور پر اسے کھڑا کرنا۔ خراج کی وصولی کے لیے ان کی کوئی چیز فروخت نہ کرنا۔ کیونکہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان سے درگزر سے کام لیں۔ اگر تم نے میری ان ہدایات کی خلاف ورزی کی تو میرے سوا اس پر اللہ بھی تمہاری گرفت فرمائے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کا علم ہو گیا تو تمہیں اس عہدے سے معزول بھی کر دوں گا۔[1]

یہ صراحت پیچھے مختلف مقامات پر گزر چکی ہے کہ اسلامی حکومت اھل الذمہ/غیر مسلم شہریوں سے جزیہ ان کی حفاظت اور دفاع کے بدلے میں وصول کرتی ہے۔ اگر اسلامی حکومت کسی وجہ سے ان کی حفاظت اور دفاع نہ کر سکے تو اسے جزیہ لینے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ایسی صورت میں ان سے جزیہ و خراج وصول کرنا ان کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کے مترادف ہے۔ اسلام نے اھل الذمہ کے ساتھ تو اس قسم کی ناانصافی اور زیادتی کی بھی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے تاریخ انسانی کا یہ منفرد اور بے مثال عدل و انصاف پر مبنی واقعہ بڑی تفصیل سے درج کیا ہے کہ مشہور سپہ سالار اسلام حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے جب شام کے کئی علاقے فتح کر لیے اور انہوں نے جزیہ کی ادائیگی پر آپ سے صلح کر لی تو آپ کے کمال حسن برتاؤ کو دیکھ کر دشمنان اسلام کے خلاف وہ آپ کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہی معاہدین کے جاسوسوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو بتایا کہ رومیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک لشکر جرار جمع کر لیا ہے۔ یہ

---

[1] - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۶۰

صورت حال معلوم کر کے حضرت ابو عبیدہؓ نے رومیوں کے مقابلہ کے لیے اپنی افواج کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لہذا انہوں نے شام کے تمام مفتوحہ علاقوں کے والیوں کو لکھا کہ اہل الذمہ سے جو جزیہ اور خراج تم نے وصول کیا ہے انہیں واپس کر دو اور ان سے کہو: رومیوں کا لشکر جرار ہمارے خلاف جمع ہو چکا ہے۔ ان حالات میں ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے لہذا وہ مال تمہیں واپس کرتے ہیں جو تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں تم سے وصول کیا۔ اگر اللہ نے ہمیں فتح و کامیابی سے سرفراز فرمایا تو ہم اس معاہدہ صلح پر باقی رہیں گے جو ہمارے اور تمہارے درمیان ہو چکا ہے۔[1]

پیغمبر اسلام کو غیر مسلم اھل الذمہ پر زیادتی نہ ہونے کا کس قدر احساس تھا، اس کا اندازہ اس وصیت نبوی سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ ﷺ نے ﷺ اہل ذمہ کے بارے میں فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے:

> نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم مصر فتح کرو تو قبطیوں سے اچھا برتاؤ کرنا۔ ان کے لیے ذمہ اور صلہ رحم ہے۔ امام لیث نے کہا: اس کی وجہ یہ تھی کہ ام اسماعیل (حضرت ہاجرہ) انہی میں سے تھیں۔[2]

اسلامی تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اگر کسی مسلمان حکمران نے اسلامی تعلیمات کے برعکس غیر مسلم رعایا سے کسی قسم کی زیادتی کی ہے تو دوسرے حکمران نے اس کی تلافی کر دی ہے۔ مثلاً بلاذری نے لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص کے لوگوں سے حضرت امیر معاویہؓ نے سات ہزار دو سو دینار سالانہ پر

---

[1] ۔ کتاب الخراج (مشمولہ کتاب موسوعۃ الخراج)، ص:۱۳۸-۱۳۹؛ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، نفیس اکیڈمی، کراچی، ص:۲۰۶ .

[2] ۔ مسلم، الصحیح (کتاب الفضائل، باب وصیۃ النبی باھل مصر، ۲/ ۳۱۱، رقم: ۶۴۹۴-۶۴۹۳؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب الوصاۃ باھل الذمۃ)، ۱۴/ ۵۲، رقم: ۱۹۲۵۲' بلاذری، فتوح البلدان، طبع مذکور، ص:۳۱۶

صلح کرلی تھی۔[1] اہل قبرص اس صلح پر قائم رہے۔ لیکن جب اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان والی بنا تو اس نے ان کے خراج میں ایک ہزار دینار کا اضافہ کر دیا۔ جو عمر بن عبد العزیزؒ کے خلیفہ ہونے تک جاری رہا۔ مگر انہوں نے اس اضافہ کو ان سے ساقط کر دیا۔ پھر ہشام بن عبد الملک اموی نے اس ساقط شدہ اضافہ کو دوبارہ جاری کر دیا۔ جو ابو جعفر منصور عباسی کے خلیفہ ہونے تک جاری رہا۔ اس نے کہا: یہ ان کا حق ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ ہمیں یہ نہیں چاہیے کہ ان پر ظلم کر کے اپنی دولت بڑھائیں۔ اور اس نے اسی صلح پر جو معاویہ نے ان سے کی تھی، ان کو واپس کر دیا۔[2]

اھل الذمہ کی خارجی دشمنوں سے حفاظت

شرعی اعتبار سے حکومت کی ذمہ داری صرف یہی نہیں کہ وہ اہل الذمہ کو داخلی طور پر ظلم و زیادتی سے بچائے بلکہ اگر کوئی خارجی دشمن بھی ان پر حملہ کرتا ہے تو ان کا دفاع حکومت پر لازم ہے۔ علامہ قرافی نے امام ابن حزم ظاہری کے حوالے سے لکھا ہے:

وكذالك حكى ابن حزم فى مراتب الاجماع لهٗ ان من كان فى الذمة وجاء اهل الحرب الىٰ بلادنا يقصدونه وجب علينا ان نخرج لقتالهم بالكراع والسلاح ونموت دون ذالك صوناً لمن هو فى ذمة الله تعالىٰ وذمة رسوله فأن تسليمه دون ذالك اهمال بعقد الذمة۔[3]

اور اسی طرح ابن حزم نے اپنی کتاب مراتب الاجماع میں بیان کیا ہے کہ جو آدمی ہمارے (مسلمانوں کے) ذمہ میں ہو اور اھل الحرب اسی ذمی کو گرفتار کرنے کے

---

[1] - بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ از سید ابو الخیر مودودی) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص:۳۲۷

[2] - حوالہ مذکور، ص:۲۲۹

[3] - الفروق، ۳/۲۹-۳۰

ارادے سے ہمارے ملک میں آئیں تو ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم گھوڑے اور اسلحہ لے کر ان سے جنگ کرنے کے لیے نکلیں اور اس آدمی کو بچانے کی خاطر جان دے دیں جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمہ میں ہے۔ کیونکہ اس ذمی کو دشمن کے حوالے کرنا عقد ذمہ کا لحاظ نہ کرنے کے مترادف ہے۔

اسی طرح امام مالک اھل کتاب پر جزیہ کے مسائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انما وضعت علیھم الجزیۃ وصالحوا علیھا علیٰ ان یقروا ببلادھم ویقاتل عنھم عدوھم۔[1]

بے شک ان پر جزیہ عائد کیا جاتا اور اس شرط پر ان سے صلح کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شہروں میں بدستور برقرار رہیں گے اوران کے بچاؤ کی خاطر ان کے دشمن سے جنگ کی جائے گی۔

علاوہ ازیں اھل الذمہ جب دشمن کے ہاتھ میں قیدی بنا لیے جائیں تو اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ انہیں دشمن کی قید سے رہائی دلائے چاہے اس کے لیے اسے فدیہ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے ہم عصر مشہور فقیہہ امام لیثؒ (م ۱۹۵ھ) کا اس معاملے میں کہنا ہے کہ

اری ان یفدوھم من بیت المال ویقرون علی ذمتھم۔[2]

میرے خیال میں انہیں بیت المال سے فدیہ دے کر چھڑایا جانا اور ان کے عقد ذمہ کو برقرار رکھا جانا چاہیے۔

اس ضمن میں مشہور واقعہ ہے کہ جب تاتاری شام پر غالب آ گئے۔ بہت سے مرد اور عورتیں قیدی بنا لیے گئے تو اس وقت کے شیخ الاسلام شیخ ابن تیمیہؒ تشریف لے گئے تا کہ قیدیوں کی رہائی کے سلسلے

---

[1] ۔موطا (کتاب الزکوۃ باب فی جزیۃ اھل الکتاب)، ص: ۳۲۰، رقم: ۶۲۰

[2] ۔ابو عبید، کتاب الاموال، ص: ۱۲۷

میں تاتاری بادشاہ (قطلوشا / قازان) سے بات کریں۔ اس پر تاتاری بادشاہ نے مسلمان قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت دے دی جبکہ ذمی قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر شیخ ابن تیمیہؒ نے فرمایا:

"لانرضی الا بافتکاک جمیع الاساری من الیهود والنصاری، فهم اهل ذمتنا ولاندع اسیراً لامن اهل الذمة ولامن اهل الملة فلما رأی اصراره وتشدده اطلقهم له۔[1]

ہم یہود و نصاریٰ کے تمام قیدیوں کو چھڑائے بغیر راضی نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ ہمارے ذمہ میں ہیں۔ لہذا ہم کوئی قیدی نہیں چھوڑیں گے نہ اہل الذمہ میں سے اور نہ مسلمانوں میں سے۔ پس جب اس نے آپ کے اصرار اور سخت موقف کو دیکھا تو آپ کی خاطر انہیں بھی چھوڑ دیا۔

اسی طرح فقہاء نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ جب اہل الحرب غیر مسلم ذمیوں پر غالب آجائیں، یوں انہیں قیدی بنالیں اور ان کے مال چھین لیں۔ پھر اسلامی ریاست دوبارہ ان پر قابو پالے تو انہیں سابقہ عقد ذمہ کی طرف لوٹانا واجب ہے اور انہیں غلام بنانا جائز نہیں، عام اہل علم کی یہی رائے ہے جیسا کہ صاحب المغنی نے بھی کہا ہے کیونکہ ان کا سابقہ عقد ذمہ باقی ہے اور ان کی جانب سے کوئی ایسی چیز نہیں پائی گئی جو عقد ذمہ کو توڑنے والی ہو اور حرمت میں ان کے اموال کا حکم وہی ہے جو مسلمانوں کے اموال کا ہے۔[2]

امام بخاری نے کتاب الجہاد میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے: "باب يقاتل عن اهل الذمة ولا يسترقون" (اس چیز کا بیان کہ اہل الذمہ کی حفاظت کی خاطر انکی طرف سے جنگ کی جائے گی اور انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا) پھر اس باب کے اندر حضرت عمرؓ کی اہل الذمہ کے ساتھ وفاء

---

[1] - صالح بن حسین العاید، حقوق غیر المسلمین فی بلاد الاسلام، ص:۵۸

[2] - ملاحظہ ہو: ابن عابدین، ردالمحتار، ۳/ ۲۴۳-۲۴۴؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/ ۴۴۴؛ الموسوعۃ الفقہیہ (الکویت)، ۷/ ۱۲۷ (اھل الذمۃ)

عہد اور ان کی خاطر جنگ کرنے کی اس وصیت کو بیان کیا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔[1]

اہل الذمہ اور فقہاء اسلام کا دفاع

اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اگر کسی مسلمان حکمران نے اھل الذمہ کے ساتھ زیادتی کی یا کرنے کی کوشش کی تو فقہاء اسلام نے اس زیادتی پر اس کی گرفت فرمائی۔ چنانچہ یہ واقعہ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ صالح بن عبد اللہ نے جبل لبنان کے عیسائیوں کو بغاوت کے جرم میں جلاوطنی کی سزا دی۔ مشہور فقیہ حضرت امام اوزاعیؒ کو اس کا علم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بغاوت تو چند آدمیوں نے کی تھی لیکن جلاوطن سب عیسائیوں کو کر دیا گیا ہے۔ اس پر آپ نے صالح مذکور کو ایک طویل خط تحریر فرمایا۔ جس میں آپ نے قرآن و سنت کی رو سے اس فیصلہ کے غلط ہونے کو واضح فرمایا اور پھر عیسائی اھل الذمہ کی حیثیت و مرتبہ کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

> فانھم لیسوا بعبید فتکون من تحویلھم من بلد الی بلد فی سعة ولکنھم احرار اھل الذمة۔[2]
>
> یہ لوگ غلام نہیں کہ تو انہیں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف دربدر کرتا پھرے بلکہ وہ لوگ آزاد اور اھل الذمہ ہیں (جن کی حفاظت کا ذمہ ہم نے اٹھا رکھا ہے)۔

اسی طرح اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک نے رومی حملہ کے خوف سے قبرص کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا تو اس پر فقہاء اسلام اور عام مسلمان سخت ناراض ہوئے اور اسے گناہ عظیم سمجھا (استعظمه الفقهاء) پھر جب زید بن ولید بن عبد الملک نے انہیں دوبارہ قبرص میں لے جا کر آباد

---

[1] ۔دیکھیے: الجامع الصحیح (باب یقاتل عن اھل الذمۃ ولایسترقون)، ۱/۴۲۸

[2] ۔دیکھیے: ابو عبید، کتاب الاموال، (پیرہ نمبر ۴۶۶)، ص: ۲۵۵ تا ۲۵۷؛ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ از سید ابوالخیر مودودی)، نفیس اکیڈمی۔ کراچی، ص: ۲۴۰-۲۴۱

کر دیا۔ تو مسلمانوں نے اس فعل کو بنظر استحسان دیکھا اور اسے عدل و انصاف قرار دیا۔[1]

علیٰ ہذا القیاس بنو عباس نے ایک موقعہ پر جزیرہ قبرص کے غیر مسلم باشندوں کے باغیانہ طرز عمل کے باعث ان کا معاہدہ توڑنا اور ان کے خلاف ایکشن لینا چاہا تو اس وقت کے مشہور فقہاء امام مصر لیث بن سعد، امام مدینہ مالک بن انس، امام مکہ سفیان بن عیینہ کے علاوہ دیگر متعدد فقہاء نے اس معاہدہ کی پابندی کا فتویٰ دیا۔[2] پھر ہارون الرشید نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ان حقوق میں دست اندازی کا ارادہ کیا جو خلافت راشدہ کے زمانے میں اس قبیلہ کے عیسائیوں کو حاصل تھے۔ تو امام محمد بن الحسن شیبانی نے بڑے مدلل انداز میں اسے ایسا نہ کرنے کا فتویٰ دیا۔ جس پر ہارون نے کہا:

نجریه علی ماجروه ان شاء الله تعالیٰ۔

ان شاء اللہ ہم بھی ان کے ساتھ اسی طرز عمل کو جاری رکھیں گے جسے خلفاء راشدین نے ان کے ساتھ جاری رکھا۔[3]

اہل الذمہ کے بارے میں علماء اسلام کے درج بالا جذبات و احساسات اور نظریات کے باوجود بعض جذباتی عوام کے حوالے سے محترمہ Bat Ye'or کا یہ کہنا کہ Stirred by the Ulma[4] (جنہیں علماء نے بھڑکایا تھا) محض قیاس آرائی یا غلط فہمی ہے۔

1- بلاذری، فتوح البلدان، طبع مذکور، ص:۲۲۹؛ مولانا مناظر احسن گیلانی، مقالات گیلانی، ص:۲۵۷

2- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بلاذری، فتوح البلدان، ص:۲۳۰ تا ۲۳۳

3- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا مناظر احسن گیلانی، مقالات گیلانی، ص: ۲۵۹-۲۶۱

4- Bat Ye'or ,The Dhimmi, P:55

پانچویں فصل

کاروبار کی آزادی کا حق

(Right to Freedom of Trade)

اھل الذمہ کو ایک اسلامی ریاست میں سوائے ایک دو چیزوں کے جن کی وضاحت آگے آرہی ہے، اپنی مرضی اور پسند کا کاروبار کرنے، کارخانہ لگانے، کوئی بھی صنعت و حرفت اور پیشہ اختیار کرنے اور پسند کی خرید و فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ کاروباری تصرفات، معاملات اور تجارت میں سوائے ایک دو معاملات کے مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں۔ علامہ کاسانی نے ان کی کاروباری آزادی اور اس سلسلے میں بعض پابندیوں کو بیان کرتے ہوئے اپنے مخصوص حکمت و نکات بھرے اسلوب میں لکھا ہے:

ویترکون ان یسکنوا فی امصار المسلمین یبیعون ویشترون لان عقد الذمة شرع لیکون وسیلة لهم الی الاسلام وتمکینهم من المقام فی امصار المسلمین ابلغ الیٰ هذا المقصود وفیه ایضاً منفعة المسلمین بالبیع والشراء فیمکنون من ذالک ولا یمکنون من بیع الخمور و الخنازیر فیها ظاهراً لان حرمة الخمر والخنزیر ثابتة فی حقهم کما هی ثابتة فی حق المسلمین لانهم مخاطبون بالحرمات وهو الصحیح عند اهل الاصول علی ما عرف فی موضعه فکان اظهار بیع الخمر والخنزیر منهم اظهاراً للفسق فیمنعون من ذالک وعندهم ان ذالک مباح فکان اظهار شعائر الکفر فی مکان معد لاظهار شعائر الاسلام وهو امصار المسلمین فیمنعون من ذالک

وکذا یمنعون من ادخالها فی امصار المسلمین ظاہرا۔[1]

اور انہیں مسلمانوں کے شہروں میں سکونت اختیار کرنے دی جائے گی، جہاں وہ خرید و فروخت کر سکیں گے۔ کیونکہ عقد ذمہ اسی لیے مشروع ہوا ہے کہ یہ ان کے قبول اسلام کا وسیلہ وذریعہ بنے، اور انہیں مسلمانوں کے شہروں میں اقامت کا اختیار دینے سے یہ مقصد بہت اچھی طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس میں خرید و فروخت کے ذریعے مسلمانوں کی منفعت بھی موجود ہے، لہذا انہیں خرید و فروخت (کاروبار) کی اجازت ہو گی۔ البتہ امصار المسلمین (وہ شہر جنہیں مسلمانوں نے آباد کیا ہو اور جنہیں اسلامی شعائر جمعہ و عیدین اور حدود کے نفاذ کے لیے خاص کیا گیا ہو) میں انہیں کھلے عام شراب اور سور کی خرید و فروخت کی اجازت نہ ہو گی۔ کیونکہ شراب اور سور کا حرام ہونا ان کے حق میں بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے مسلمانوں کے حق میں۔ کیونکہ حرمت کے احکام کے وہ بھی مخاطب ہیں اور اہل اصول کے نزدیک یہی بات صحیح ہے جیسا کہ یہ اپنی جگہ پر معروف ہے۔ لہذا ان کی طرف سے شراب اور خنزیر کی کھلے عام تجارت فسق کا اظہار ہے اس لیے انہیں اس سے روکا جائے گا۔ اگرچہ یہ چیز ان کے نزدیک مباح ہے تاہم یہ کفر کے شعائر کا ایسی جگہ اظہار ہے، جو شعائر اسلامی کے لیے اختیار کی گئی ہے اور وہ ہیں مسلمانوں کے شہر۔ لہذا انہیں اس سے منع کیا جائے گا۔ اسی طرح انہیں اس بات سے بھی منع کی جائے گا کہ وہ ان چیزوں کو کھلے عام مسلمانوں کے شہروں میں لائیں۔

چند سطور کے بعد زیر بحث مسئلے میں علامہ کاسانی نے مزید یہ لکھا ہے کہ

جو بستیاں اور مقامات مسلمانوں کے شہروں (امصار المسلمین) میں سے نہیں ہیں ان

---

[1] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (طبع مذکور)، ۷/۱۱۳

میں ذمیوں کو کھلے عام شراب اور سور کی تجارت اور صلیب نکالنے اور ناقوس (گھنٹہ) بجانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد آباد ہو۔[1]

ہدایہ میں ہے:

واهل الذمة فی البیاعات کالمسلمین۔

اور اہل الذمہ خرید و فروخت / کاروبار میں مسلمانوں کی مانند ہیں۔

اور اس کے استدلال میں یہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ

ان لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین۔[2]

بے شک ان (اھل الذمہ) کے لیے وہ تمام حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان پر وہ پابندیاں بھی جو مسلمانوں پر ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اسلامی ریاست میں کوئی ایسا کاروبار نہیں کر سکتے جو شرعاً ممنوع ہو۔ البتہ خنزیر اور شراب کی ذمی لوگ آپس میں خرید و فروخت کر سکتے ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ جزیہ میں ذمیوں سے شراب اور خنزیر بھی لیے جاتے ہیں اور پھر انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے، تو آپ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر ذمی اسے (دوسرے ذمیوں کو) فروخت کریں اور اس کی قیمت سے جزیہ ادا کریں تو یہ قبول کیا جا سکتا ہے۔[3]

اھل الذمہ کو اپنی مخصوص آبادیوں میں شراب بیچنے کی اجازت

الغرض تجارت کے جو طریقے ہمارے لیے شرعاً ممنوع ہیں وہ ان کے لیے بھی ہیں۔ سود جس طرح ہمارے لیے حرام ہے اسی طرح ان کے لیے بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہجر کے مجوس کی طرف

---

[1] ۔بدائع الصنائع (طبع مذکور)، ۷/ ۱۱۳

[2] ۔مرغینانی، ہدایہ (کتاب البیوع)، اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۳/ ۱۰۸

[3] ۔دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج (فصل فیمن تجب علیه الجزیه)، ص: ۱۲۶

لکھا تھا۔ یا تو تم لوگ سود چھوڑ دو یا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ فرمایا تھا اس کے آخر میں لکھا تھا:

علی ان لا تاکلوا الربا فمن اکل الربا فذمتی منہ بریئة۔[1]

تم پر یہ بھی لازم ہے کہ تم سود نہیں کھاؤ گے۔ پس جس آدمی نے سود کھایا تو میں اس کے ذمہ سے بری ہوں۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی یہ انتہائی وعید سود کی انتہائی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ پس سود کی حرمت کے معاملے میں ذمی لوگ عام مسلمانوں کی مانند ہیں۔ البتہ ذمیوں کے لیے صرف شراب اور سور کا استثناء ہے۔ وہ اپنی آبادیوں میں شراب بنانے، پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں سور پالنے کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں۔[2]

شراب اور سور کی اسلام میں کوئی قیمت نہیں مگر اھل الذمہ کے نزدیک یہ چیزیں "قیمتی" ہیں۔ اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی شراب یا اس کے سور کو تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ چنانچہ فقہ کی انتہائی مستند کتب میں ہے۔

ویضمن المسلم قیمة خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ۔[3]

اور مسلمان آدمی اس کی شراب اور اس کے خنزیر کی قیمت کا ضامن ہو گا (ادا کرے گا) جبکہ وہ اسے ضائع کر دے۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ کافر شراب فروخت کر کے مسلمان کا قرض ادا کرتا ہے تو مسلمان کے لیے اس کا لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ شراب اس کے نزدیک قیمت رکھتی ہے، اس کی بیع اس کے لیے صحیح

1- جصاص، ابو بکر رازی، احکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲/ ۱۹۳

2- سرخسی، شمس الائمہ، المبسوط، باب بیوع اھل الذمہ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء، ۱۳/ ۱۳۷

3- حصکفی، درالمختار، ۳/ ۲۲۳؛ حموی، شرح الاشباہ والنظائر، ۳/ ۸۵؛ ابن عابدین، حاشیہ ردالمختار، ۳/ ۲۷۳-۲۷۴

ہے۔ اس کے برخلاف مسلمان اگر شراب فروخت کر کے کسی کا قرض ادا کرے تو یہ ناجائز ہوگا اس لیے کہ اس کے نقطہ نظر سے شراب مال متقوم نہیں ہے (اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔)[1]

کویت کے مشہور فقہی انسائیکلوپیڈیا "الموسوعۃ الفقہیۃ" میں اھل الذمہ کے مالی معاملات کے سلسلے میں تمام فقہاء کی تصریحات واقوال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ:

القاعدۃ العامۃ ان اھل الذمۃ فی المعاملات کالبیوع والاجارۃ وسائر التصرفات المالیۃ کالمسلمین (الاما استثنی من المعاملۃ بالخمر والخنزیر ونحوھما کما سیأتی) وذالک لان الذمی ملتزم احکام الاسلام فیما یرجع الی المعاملات المالیۃ. فیصح منھم البیع والاجارۃ والمضاربۃ والمزارعۃ ونحوھا من العقود والتصرفات التی تصح فی المسلمین، ولاتصح منھم عقود الربا والعقود الفاسدۃ والمحظورۃ التی لا تصح من المسلمین کما صرح بہ فقھاء المذاھب۔[2]

عام قاعدہ یہ ہے کہ اھل الذمہ خرید وفروخت، اجارہ اور دوسرے مالی تصرفات جیسے معاملات میں مسلمانوں کی مانند ہیں (سوائے شراب، خنزیر اور ان جیسی حرام چیزوں کے معاملہ کے جس کی تفصیل عنقریب آئے گی) اور اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ ذمی پر مالی معاملات میں اسلامی احکام کی پابندی لازم ہے۔ پس خرید وفروخت، اجارہ، مضاربت، مزارعت اور ان جیسے دوسرے مالی معاملات وتصرفات جو مسلمانوں سے جائز ہیں وہ اہل ذمہ سے بھی جائز ہوں گے۔ البتہ ان سے سودی معاملات اور دوسرے

---

[1] - مرغینانی، ہدایہ (کتاب الکراھیۃ)، اسلامی کتب خانہ، لاہور، ۴/ ۴۷۳

[2] - وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ، بالکویت، الموسوعۃ الفقہیۃ (تحت لفظ اھل الذمۃ)، ۷/ ۱۳۱

فاسد و ممنوع معاملات جو مسلمانوں سے صحیح نہیں وہ ان سے بھی صحیح نہیں۔ جیسا کہ فقہی مذاہب کے فقہاء نے اس چیز کی صراحت کی ہے۔

اس کے بعد مذکورہ "الموسوعۃ الفقہیۃ" میں مالی معاملات کے سلسلے میں اھل الذمہ کے بارے درج بالا نقطہ ء نظر کی دلیل کے طور پر ائمہ مجتہدین اور فقہاء اسلام کے اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ جن کا اندراج طوالت کا باعث ہو گا۔[1]

اسلامی ریاستوں میں غیر مسلم اھل الذمہ نے کئی پیشے اختیار کیے اور ان پیشوں کے ذریعے بڑا پیسہ، بڑی شہرت، بڑا نام اور بڑا مرتبہ و مقام حاصل کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مقالہ (بعنوان: مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام) میں مسلمان حکومتوں میں ایک غیر مسلم طبقہ جس نے طبابت اور علاج معالجہ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا، کا ذکر حسب معمول بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ غیر مسلم اطباء کا یہ تذکرہ کوئی ۶۵ - ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا گیلانی نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ عہد نبوی سے لے کر عباسیوں کے عہد حکومت تک غیر مسلم اطباء کو اپنے کاروبار کے معاملے میں کتنی آزادی حاصل رہی ہے۔ مسلمان خلفاء کس غیر معمولی انداز میں اور کس فراخدلی سے ان کی طبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے رہے ہیں، مسلمان خلفاء کے نزدیک ان کو کیا معاشرتی مرتبہ و مقام حاصل تھا۔ وہ ان خلفاء کے درباروں میں کتنا اثر ورسوخ رکھتے تھے، کس شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ کتنے دولت مند تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہو سکتی۔ تاہم ایک واقعہ کا اندراج ضروری ہے۔ اس واقعہ میں مولانا گیلانی نے سنن ابی داؤد کے حوالے سے مکہ میں موجود ایک غیر مسلم طبیب حارث بن کلدہ کے بارے لکھا ہے:

فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے تو آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور خود سعد کو مشورہ دیا:

---

[1] ۔دیکھیے: حوالہ سابق

ايت الحارث بن كلدة اخا ثقيف فانه رجل يتطب۔[1]

قبیلہ ثقیف کے حارث بن کلدہ کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ معالج آدمی ہے۔

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ: عالج سعدا اصابہ[2] (سعد جس مرض میں مبتلا ہیں تم اس کا علاج کرو) کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج معالجہ کا جو تعلق مسلمانوں نے آئندہ مسلسل قائم رکھا، اس میں خود ان کے پیغمبر ﷺ کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا جو حارث کے ساتھ قائم کر کے صحابہ کو آپ ﷺ نے دکھایا تھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر چاہتے تو مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے۔[3]

---

1 - ابو داود سلیمان بن اشعث، السنن (کتاب الطب باب فی تمرۃ العجوۃ)، ۲/۱۸۵، رقم ۳۸۷۹

2 - ابن حجر، الاصابہ، ۱/۲۸۸

3 - مقالات گیلانی (طبع مذکور)، ۳۷۰-۳۷۱

چھٹی فصل

شخصی آزادی اور پرائیویسی کا حق

(Right to Personal Liberty and Privacy)

اسلامی ریاست شرعی طور پر اپنے ہر شہری چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، کی شخصی آزادی (Personal Liberty) کا لحاظ کرنے کی پابند ہے۔ کسی بھی شہری کو حبس بے جا میں رکھنے کی اسلام میں اجازت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنی گنجائش ہے کہ کسی معاملے میں تفتیش و تحقیق کے لیے کچھ دیر کے واسطے اس کو زیر حراست رکھ لیا جائے۔ تفتیش کے دوران اگر الزام میں کوئی سچائی نظر آئے تو اس پر عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے گا۔ جہاں اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملے گا اور اگر الزام غلط ثابت ہوا تو اسے فوراً آزاد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ امام خطابی حدیث "ان النبی ﷺ حبس رجلا فی تہمۃ" (نبی اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو الزام میں قید فرمایا) کی تشریح میں فرماتے ہیں:

فیه دلیل علیٰ ان الحبس علیٰ ضربین حبس عقوبة وحبس استظهار فالعقوبة لاتکون الافی واجب واما ماکان فی تهمة فانما یستظهر بذالک لیستکشف به عما وراءه وروی انه حبس رجلا فی تهمة ساعة من نهار ثم خلی سبیله۔[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ بے شک حبس (قید) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سزا کے طور پر اور دوسری تفتیش کے لیے۔ جو قید سزا کے طور پر ہے وہ صرف اس حالت میں جائز ہے جب (جرم ثابت ہو اور) سزا ازروئے قانون واجب ہو۔ اور اگر کسی

[1] ۔معالم السنن، کتاب القضاء(باب الحبس فی الدین وغیرہ)، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۴/۱۶۵، رقم ۱۴۴۳

شخص پر محض کوئی الزام ہو تو پوچھ گچھ کے لیے اسے روک سکتے ہیں اور مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ کسی الزام میں ایک شخص کو کچھ دیر کے لیے قید فرمایا پھر اسے رہا فرمادیا۔

امام ابو یوسف اہل الجنایات پر حدود قائم کرنے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ولایحل ولایسع ان یحبس رجل بتهمة رجل له کان رسول الله ﷺ لا یأخذ الناس بالقرف ولکن ینبغی ان یجمع بین المدعی والمدعی علیه فان کان له بینة علی ما ادعی حکم بها والا اخذ من المدعی علیه کفیل وخلی عنه فان اوضح المدعی علیه بعد ذالک شیئا والا لم یتعرض له۔[1]

نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس بنا پر حوالات میں ڈال دیا جائے کہ ایک شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مجرد الزام کی بنیاد پر کسی شخص کو گرفتار نہیں فرماتے تھے، اگر ایسی صورت ہو تو کرنا یہ چاہیے کہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو حاضر ہونے کا موقع دیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس اپنے دعویٰ کا ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے ورنہ مدعا علیہ سے ضامن لے کر اس کو رہا کر دیا جائے پھر اس کے بعد مدعی کچھ ثبوت فراہم کرتا ہے تو فبہا ورنہ مدعیٰ علیہ سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

نجران کے عیسائیوں سے نبی اکرم ﷺ نے جو تحریری معاہدہ فرمایا تھا، اس میں بطور خاص یہ بات بھی درج تھی کہ:

---

[1] ۔ کتاب الخراج، دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص:۱۷۶

ولا یؤخذ منھم رجل بظلم آخر۔[1]

اوران میں کسی آدمی کو دوسرے کے ظلم / جرم کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔

اسلامی ریاست میں کسی شہری پر باقاعدہ مقدمہ چلائے اور اس کا جرم ثابت کیے بغیر اسے گرفتار نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ خود عہد نبوی کا ایک ذاتی واقعہ حضرت بہزبن حکیم اپنے دادا (معاویہ) کے حوالے سے یوں نقل کرتے ہیں کہ:

وہ (یعنی ان کے دادا) نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔ انہوں نے (خطبہ کے دوران ہی) سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے (خطبہ کے باعث) دومرتبہ توان کے سوال کا جواب دینے سے اعراض فرمایا۔ مگر انہوں (سائل) نے پھر کچھ کہا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: خلوا له عن جیرانه (اس کی خاطر اس کے پڑوسیوں کو چھوڑدو)۔[2]

گویانبی اکرم ﷺ نے سائل کی اس طرح موقعہ پر دادرسی کرکے اسلامی ریاست کے شہریوں کے اس دستوری حق پر ہمیشہ کے لیے مہر تصدیق ثبت فرمادی کہ محض شبہ یاالزام پر کسی شہری کو قید کر دینا جائز نہیں ہے۔ یا تو اس پر جرم ثابت کرکے قانون کے مطابق اسے سزادو ورنہ چھوڑ دو۔ اسی طرح عہد فاروقی میں ایک شہری (غالباً) یہ معلوم کرکے اس کے متعلق حکومت کو کچھ غلط صحیح رپورٹ پہنچ چکی ہے اور عجب نہیں کہ (سابق ایرانی حکمرانوں کی طرح) اسے یونہی گرفتار کرکے قید کر دیا جائے۔ بھاگا ہوا مدینہ پہنچا اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کرتا ہے:

امیر المؤمنین! میرے خلاف محض جھوٹی اطلاعات کی بناپر جن کی کوئی حقیقت نہیں،

---

[1] ابویوسف، کتاب الخراج، ص: ۷۲

[2] ابوداؤد، السنن، (کتاب القضاء، باب فی الدین ھل یحبس بہ)، ۲/۱۵۵، رقم ۳۶۳۱

ایک سازش کی گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کو بہانہ بنا کر مجھے گرفتار نہ کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ اس کی سرگزشت سن کر پہلے تو تعجب کا اظہار فرماتے ہیں، پھر اسے اطمینان دلاتے ہیں کہ تو پریشان نہ ہو "واللہ لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر العدول"، (اللہ کی قسم اسلامی دستور کی رو سے کوئی آدمی عدل کیے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا)۔[1]

اس واقعہ پر مولانا امین احسن اصلاحی کا تبصرہ قابل ملاحظہ ہے، لکھتے ہیں:

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس شخص کو اس بات کا اطمینان "قسم کھا کے" دلاتے ہیں اور ساتھ "فی الاسلام" کے الفاظ بھی استعمال فرماتے ہیں۔ "فی الاسلام" کے الفاظ سے آپ کا مقصود اس امر کو واضح فرمانا تھا کہ یہ ضمانت میں ذاتی و شخصی حیثیت میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ یہ ضمانت اسلامی دستور نے اپنے ہر شہری کو خود دے رکھی ہے اور اس کی اس ضمانت میں کوئی شخص کسی حالت میں سر مو مداخلت کا مجاز نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔[2]

مذکورہ تصریحات و روایات کے مطابق اسلام میں جس طرح کسی شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم، کو محض شک کی بنیاد پر گرفتار کیا جا سکتا ہے نہ حوالہ زنداں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح محض شک کی بنا پر کسی کے خلاف فرد جرم عائد کی جا سکتی ہے نہ اسے سزا دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس امر کی صراحت درج ذیل روایت جسے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ تمام اصحاب صحاح ستہ نے نقل کیا ہے،[3] موجود ہے۔ ہم یہ روایت سنن ابی داؤد سے نقل کر رہے ہیں۔

---

[1] - امام مالک، موطا، (کتاب الاقضیۃ باب فی الشھادات)، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ص: ۶۳۳، رقم: ۱۴۲۷

[2] - اسلامی ریاست، ص: ۱۱۱

[3] - دیکھیے: زیلعی، نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ (کتاب الجنایات)، مؤسسۃ الریان، بیروت، ۴/۳۸۹، رقم ۷۹۹۹

حضرت سہل بن ابی حثمہ اور رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ حضرت محیصہ بن مسعود اور عبد اللہ بن سہل (چچازاد بھائی) دونوں خیبر کی طرف گئے مگر وہاں اتفاق سے ایک باغ میں دونوں الگ الگ ہو گئے۔ اسی دوران عبد اللہ بن سہل کو کسی نامعلوم آدمی نے قتل کر دیا تو ورثاء نے اس قتل کا الزام یہود پر لگا دیا۔ چنانچہ مقتول کے بھائی عبد الرحمٰن بن سہل اپنے دو چچازاد بھائیوں حویصہ اور محیصہ کے ہمراہ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔ عبد الرحمن نے اپنے مقتول بھائی کے معاملے میں حضور اکرم ﷺ سے پہلے بات کرنا شروع کی حالانکہ وہ اپنے چچازاد بھائیوں سے عمر میں چھوٹے تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے (تعلیم ادب کے لیے) فرمایا: پہلے بڑوں کو بات کرنے دو۔ چنانچہ دونوں بڑوں نے جب مذکورہ معاملے میں آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے پچاس آدمی قسم اٹھا کر قاتل آدمی کا تعین کریں تاکہ اس کے خلاف فرد جرم عائد کی جاسکے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ ایسا معاملہ ہے کہ ہم موقعہ پر موجود نہیں تھے تو ہم کیسے قسم اٹھا کر قاتل کر تعین کر سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ پھر قانون کے مطابق یہود میں سے پچاس آدمی قسم اٹھا کر اس جرم (قتل) سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کافر لوگ ہیں (ان کی قسم کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے؟) راوی کہتے ہیں یہ صورت حال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے (سرکاری طور پر) مقتول کی دیت (خون بہا) ادا کر دی (اور محض شک کی بنا پر یہود کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی)۔[1]

الغرض اسلامی نظام میں جب تک کسی شخص کے بارے یہ بات پایہ ثبوت کو نہ پہنچ جائے کہ اس کی آزادی دوسروں کی آزادی اور ان کے حقوق کے لیے خطرہ ہے اور اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس وقت تک اس کی آزادی پر کوئی پابندی لگائی جا سکتی ہے نہ کسی نوعیت کی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ اسلام اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ محض شک و شبہ یا بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر کسی شخص کو اس کے سب سے بڑے

---

[1] - ابو داؤد، السنن (کتاب الدیات باب القسامۃ)، ۲/۲۷۵، رقم ۴۵۲۰؛ نیز ابن قیم، الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، (فصل نمبر ۳۲) المکتبۃ التجاریۃ مکۃ المکرمۃ، ص: ۱۲۰ (مختصراً)

فطری حق (شخصی آزادی) سے محروم کر دیا جائے۔

اہل الذمہ کی شخصی آزادی کا اسلام میں اس قدر خیال رکھا گیا ہے کہ ایک عام مسلمان آدمی بھی کسی ذمی کی شخصی آزادی متاثر ہوتے دیکھتا ہے تو وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً عامر بن عبد اللہ عنبری نامی ایک بزرگ نے دوران سفر ایک دفعہ دیکھا کہ بادشاہ کے ایک کارندے نے ایک ذمی آدمی کو پکڑ رکھا ہے اور اسے دارالامان کی طرف کھینچ رہا ہے اور ذمی اس سے فریاد کر رہا ہے۔ عامر نے جب دیکھا تو اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا، تمہارا کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا میں اس کو دارالامان میں جھاڑو دینے کے لیے لے جا رہا ہوں۔ اب عامر ذمی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: کیا تم رضاکانہ طور پر اس کے ساتھ جانے کے لے تیار ہو؟ اس نے کہا: نہیں، اس سے میرے کھیت کے کام کا حرج ہو گا۔ عامر نے پوچھا: کیا تو نے جزیہ ادا کر دیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں: اس پر عامر نے حکومتی کارندے سے کہا: دیکھو وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے جزیہ ادا کر دیا ہے اور تمہیں بھی اس سے انکار نہیں اور تم اس کو بلا معاوضہ خدمت اور بیگار پر لے جانا چاہتے ہو جس پر وہ راضی نہیں ہے، لہٰذا تم اسے چھوڑ دو۔ اس نے کہا میں نہیں چھوڑوں گا۔ عامر نے کہا: اللہ کی قسم میں اپنی موجودگی میں اللہ کے ذمہ پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ میں اپنی زندگی میں اپنے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذمہ ٹوٹنا برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے بعد ذمی کو اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔[1]

رہائش گاہ کی حرمت

انسان کی شخصی آزادی میں جس طرح علیحدگی اور خلوت شامل ہے جس میں کوئی دوسرا دخل انداز ہونے کا مجاز نہیں، اسی طرح جائے رہائش کی حرمت بھی داخل ہے۔ کسی آدمی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل ہو۔ کیونکہ گھر / جائے سکونت انسان کی اپنے اہل خانہ کے ساتھ نجی زندگی گزارنے اور ذاتی اسرار کی جگہ ہوتی ہے۔ جس میں اس کا مال بھی موجود ہوتا ہے۔ انسانی طبیعت اور فطرت کا تقاضا ہے کہ ایسی جگہ کو حرمت حاصل ہو۔ کوئی آدمی اس میں بلا اجازت

---

[1] - ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق، دارالفکر بیروت، لبنان (ترجمہ نمبر ۳۰۵۲) ۲۶/۱۴

داخل ہونہ اس پر زیادتی کا مجاز ہو۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے:

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کر لو۔ یہی چیز تمہارے لیے بہتر ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ پھر اگر تم ان گھروں میں کوئی آدمی نہ پاؤ تو بھی ان میں داخل مت ہو جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو یہی طریق کار تمہارے لیے پاکیزہ ترین ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب جاننے والا ہے۔[1]

اس آیت کریمہ کے عموم کے مطابق گھر کی حرمت اور تحفظ کا حق جس طرح مسلمانوں کو حاصل ہے اسی طرح اہل ذمہ کو بھی حاصل ہو گا۔ کوئی آدمی اس بات کا مجاز نہیں کہ ان کی اجازت اور رضامندی کے بغیر زبردستی ان کے گھر میں داخل ہو جائے۔ کیونکہ کسی آدمی کی جائے سکونت کی حرمت کو پامال کرنا شخصی زیادتی میں داخل ہے۔[2] علاوہ ازیں گزشتہ سطور میں اس امر کی وضاحت ہو چکی ہے کہ عام معاملات میں "حكمه حكم المسلمين" اس (ذمی) کا حکم وہی ہے جو دوسرے مسلمانوں کا ہے۔[3]

---

1 - سورۃ النور، ۲۴: ۲۷-۲۸

2 - زیدان، عبد الکریم، احکام الذمیین والمستامنین، ص: ۸۰

3 - ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ص: ۸۳

ساتویں فصل

آزادانہ نقل و حرکت اور اقامت کا حق

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / اہل الذمہ کو مسلمان شہریوں کی طرح قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ ملک بھر میں جہاں چاہیں آئیں جائیں، سفر کریں، گھومیں پھریں۔ دوران سفر ان کے جان و مال کا تحفظ اور ہر طرح سے بچاؤ اور سلامتی کو یقینی بنانا جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزرا، اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے ناطے ان کا حق ہے کہ وہ جزیرۃ العرب کے سوا جس حصے اور آبادی میں اپنی پسند کے مطابق قیام کرنا اور رہائش اختیار کرنا اور گھر بنانا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے کسی کو اس کے گھر سے نکالنا یا شرعی جواز کے بغیر جلاوطن کرنا حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی بدعہدیوں اور جرائم کی تفصیل کے ضمن میں ارشاد الٰہی ہے:

وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔[1]

اور تم اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے گھروں / وطن سے نکال بھی دیتے ہو۔ (اور) ان کے مقابلہ میں گناہ و ظلم کے ساتھ (ان کے مخالفین کی) مدد بھی کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمہارے تک قیدی بن کر پہنچ جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا (وطن سے) نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔

علامہ کاسانی نے مسلمانوں کے آباد کردہ شہروں میں غیر مسلم شہریوں کی کھلے عام سکونت کے حوالے سے

---

[1] - البقرہ، ۲:۸۵

لکھا ہے:

ویترکون ان یسکنوا فی امصار المسلمین یبیعون ویشترون لان عقد الذمة شرع لیکون وسیلة لهم الی الاسلام وتمکینهم من المقام فی امصار المسلمین ابلغ الی هذا المقصود وفیه ایضاً منفعة المسلمین بالبیع والشراء فیمکنون من ذالک۔[1]

اور انہیں مسلمانوں کے شہروں میں سکونت اختیار کرنے اور خرید و فروخت کی اجازت دی جائے گی۔ کیونکہ عقد ذمہ مشروع ہی اس لیے ہوا ہے کہ یہ ان کے قبول اسلام کا ذریعہ و وسیلہ بنے اور انہیں مسلمانوں کے شہروں میں ان کی سکونت ممکن بنانے سے یہ مقصد بہت اچھی طرح حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے ان کی خرید و فروخت اور کاروبار میں مسلمانوں کے لیے مالی منفعت بھی ہے لہذا شہروں میں انہیں اقامت و رہائش کی اجازت دی جائے گی۔

بالکل اسی رائے کا اظہار علامہ سرخسی نے بھی شرح السیر الکبیر میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

فان مصر الامام فی اراضیهم مصر اللمسلمین کما مصر عمر رضی الله عنه البصرة والکوفة فاشتری بها اهل الذمة دورا وسکنوا مع المسلمین لم یمنعوا من ذالک لانا انما قبلنا منهم عقد الذمة لیقفوا علی محاسن الدین فعسیٰ ان یؤمنوا واختلاطهم بالمسلمین فی السکنی معهم یحقق هذا المعنی۔[2]

پس اگر امام / خلیفہ ان (اہل الذمہ) کی اراضی میں کوئی شہر مسلمانوں کے لیے آباد

1- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ۷/ ۱۱۳

2- شرح السیر الکبیر، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدر آباد، ہند، ۳/ ۲۵۴

کرے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ اور کوفہ کے شہر آباد کیے، پھر اہل الذمہ اس شہر میں گھر خرید لیں اور مسلمانوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیں تو اس چیز سے انہیں منع نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ہم (اہل اسلام) نے ان کی طرف سے عقد ذمہ اس غرض سے قبول کیا ہے کہ وہ دین کے محاسن سے آگاہ ہوں اور شاید ایمان لے آئیں اور رہائش میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا مل جل کر رہنا اس معنی / مقصد کو بخوبی پورا کرتا ہے۔

اسی طرح علامہ ابن نجیمؒ شہر میں مسلمانوں کے درمیان اہل الذمہ کی رہائش و سکونت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

واختلفت الرواية فى سكناهم بين المسلمين فى المصر. والمعتمد الجواز فى محلة خاصة۔[1]

شہر میں مسلمانوں کے درمیان اہل ذمہ کی رہائش و سکونت کے معاملے میں اگرچہ روایات کے اندر اختلاف ہے تاہم معتمد قول یہی ہے کہ کسی مخصوص محلہ میں ان کی رہائش جائز ہے۔

ابن نجیمؒ کے اس قول کی شرح میں علامہ حموی "الذخیرہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

واذا تكارىٰ اهل الذمة دوراً فيما بين المسلمين يسكنوا فيها جاز. لانهم اذا سكنوا بين المسلمين رأوا معالم الاسلام ومحاسنه۔[2]

اور جب اہل الذمہ (غیر مسلم شہری) مسلمانوں کے درمیان گھر کرایہ پر حاصل کریں تاکہ ان میں رہائش اختیار کریں تو جائز ہے کیونکہ جب وہ مسلمانوں کے درمیان رہائش

1- الاشباہ والنظائر، ۳/ ۸٦

2- حموی، غمز عیون البصائر، ۳/ ۸٦

رکھیں گے تو وہ اسلام کی (حقانیت کی) نشانیوں اور اس کے محاسن پر آگاہ ہوں گے۔

علامہ حموی نے ابن نجیمؒ کے مذکورہ قول کی شرح اور تائید میں "المحیط" کی یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ:

یمکنون ان یسکنوا فی امصار المسلمین، ویبیعون ویشترون فی اسواقھم لان منفعة ذالک تعود علی المسلمین۔[1]

اھل الذمہ کو اس امر کی اجازت دی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کے شہروں میں رہائش رکھیں اور ان کے بازاروں میں خرید وفروخت (کاروبار) کریں کیونکہ اس کام کی منفعت لوٹ کر مسلمانوں کی طرف ہی آئے گی۔

مسلمانوں کے درمیان اہل الذمہ کی رہائش کے حوالے سے بعض فقہاء نے ایک شرط بھی لگائی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے درمیان اہل الذمہ کی رہائش اس صورت میں جائز ہے جبکہ ان کی رہائش کے سبب مسلمانوں کے جماعتیں اور گروہ بے کار نہ ہو جائیں اور نہ ان کی تعداد کم ہو۔ اگر ان کی سکونت کے باعث مسلمانوں کی جماعتیں بے کاری کا شکار ہوتی ہوں یا ان کی تعداد کم ہو جاتی ہو تو انہیں مسلمانوں کے درمیان رہائش رکھنے کی اجازت نہ دی جائے گی بلکہ انہیں کہا جائے گا کہ وہ شہر کے ایک کونے میں علیحدہ رہائش رکھیں جہاں مسلمانوں کی کوئی جماعت رہائش پذیر نہ ہو۔[2]

اسی طرح "الموسوعۃ الفقہیہ" (کویت) میں مختلف فقہاء کے اقوال کی روشنی میں یہ کہا گیا ہے کہ:

واذا لزم من سکناھم فی المصربین المسلمین تقلیل الجماعة امروابالسکنیٰ فی ناحیة خارج المصر۔ لیس فیھا جماعة

1۔ مرجع سابق

2۔ دیکھیے: حموی، شرح الاشباہ والنظائر، ۳/۸۶

المسلمين اذا ظهرت المصلحة فی ذالک۔[1]

اور جب شہر میں مسلمانوں کے درمیان ان کی رہائش سے جماعۃ المسلمین کا کم ہو جانا لازم آتا ہو تو انہیں شہر کے باہر کسی کونے میں رہنے کا حکم دیا جائے گا۔ جہاں مسلمانوں کی کوئی جماعت موجود نہ ہو۔ یہ حکم اس وقت ہے جب اس میں کوئی مصلحت اور بہتری پائی جاتی ہو۔

جزیرۃ العرب میں رہائش کی ممانعت اور اس کی وجہ

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری / اھل الذمہ ملک کے جس شہر دیہات اور علاقے میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا، آباد ہونا چاہیں، گھر بنانا چاہیں اور مستقل رہائش اختیار کرنا چاہیں تو ان کا قانونی حق ہے۔ اس میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی جائے گی۔ البتہ اس عام اجازت میں ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ انہیں جزیرۃ العرب اور حجاز کے مخصوص و محدود علاقے میں مستقل رہائش و سکونت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کی سب سے بڑی نقلی و شرعی وجہ تو یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور پیغمبر ﷺ کا ہر حکم اور ہر بات ازروئے قرآن وحی الٰہی ہوتی ہے۔[2] اور اسلامی ریاست کے دستور کی ساری بنیاد ہی اسی بات پر ہے کہ قرآن و سنت یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بلا تامل و تردد اور غیر مشروط طور پر تعمیل کی جائے۔[3] دوسرے ہر ریاست کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مخصوص عقائد و نظریات اور اپنی پالیسی کے مطابق ملک کے داخلی قوانین و ضوابط وضع کرے اور انہیں اپنی حدود مملکت

---

[1] - الموسوعۃ الفقہیۃ (لفظ اھل الذمہ)، ۷/۱۲۸

[2] - ارشاد الٰہی ہے: "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" (سورۃ النجم، ۵۳:۳-۴) اور وہ (پیغمبر اسلام) نہیں کلام کرتے خواہش نفس (اپنی طرف) سے۔ وہ جو بات کرتے ہیں وحی ہوتی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

[3] - سورۃ النساء، ۴:۵۹

کے اندر نافذ کرے۔ جس پر کسی دوسرے کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ عالمی منشور انسانی حقوق کے آرٹیکل نمبر ۲۹ کی دفعہ نمبر ۲ میں ہے:

اپنے حقوق اور آزادیوں کے سلسلے میں ہر شخص صرف قانون کی عائد کردہ ان پابندیوں کے دائرہ میں رہے گا جن کا مقصد دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کے احترام کو یقینی بنانا ہے۔[1]

بہر کیف زیر بحث مسئلے میں حضرت عمر بن خطاب ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ

لاخرجن الیهود و النصاریٰ من جزیرة العرب حتی لا ادع الا مسلماً۔[2]

میں ضرور بہ ضرور یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں گا یہاں تک کہ وہاں سوائے مسلمان کے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔

اسی طرح متعدد محدثین نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے واسطہ سے نبی اکرم ﷺ کے مرض الوفات میں آپ ﷺ کی یہ وصیت نقل کی ہے کہ:

اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب۔[3]

---

[1] ۔صلاح الدین، بنیادی حقوق، ص:۹۱

[2] ۔ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الجهاد والسیر، باب اجلاء الیهود من الحجاز)، ۲/ ۹۴، رقم: ۴۵۹۴؛ ابن قیم، احکام اهل الذمہ، ۱/ ۱۴۲

[3] ۔ دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجهاد باب هل یستشفع الی اهل الذمہ و معاملتهم) ۱/ ۴۲۹، رقم: ۳۰۵۳؛ بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجهاد باب اخراج الیهود من جزیرة العرب)، ۱/ ۴۴۹، رقم: ۳۱۶۸؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الوصیة باب ترک الوصیة لمن لیس له شیٔ یوصی فیه)، ۲/ ۴۳، رقم: ۴۲۳۲؛ ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیٔ والامارة باب فی

مشرکین اور ایک روایت کے مطابق یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مذکورہ وصیت یا ارشاد کی حکمت یوں بیان فرمائی: **لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب۔**[1] جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسری روایت میں "**لا یبقین دینان بجزیرۃ العرب**" (جزیرۃ العرب میں دو دین اکٹھے باقی نہیں رہ سکتے) کے الفاظ ہیں۔

امام محمد بن حسنؒ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے اسی ارشاد کے مد نظر حضرت عمرؓ نے یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا (اور دوسرے علاقوں میں آباد کیا) تھا۔[2]

جبکہ ایک دوسری حدیث میں اس چیز کی وضاحت یوں فرمائی:

لا تصلح قبلتان فی ارض واحدۃ و لیس علی المسلمین جزیۃ۔[3]

دو اہل قبلہ کا ایک ہی جگہ پر اکٹھے رہنا صحیح نہیں اور مسلمانوں پر کوئی جزیہ نہیں۔

اسلامی حکومت کی اسی پالیسی کی رو سے اور یہود کی عہد شکنی کے باعث نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے مشہور یہودی قبائل بنو نضیر اور بنو قریظہ کو پہلے تین مرتبہ اسلام لانے (اسلموا) کی دعوت دی۔ جب انہوں نے تینوں مرتبہ دعوت اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے انہیں مدینہ منورہ سے جلا

اخراج الیہود من جزیرۃ العرب)، ۲/۴۸، رقم: ۳۰۲۸؛ ابن قیم الجوزیہ، احکام اھل الذمۃ، ۱/۱۴۲؛ ابن تیمیہ، مجموع فتاوی شیخ الاسلام، ۲۸/۸۸، رقم: ۱۶۵۱

1 - امام مالک، موطا (کتاب الجامع باب ماجاء فی اجلاء الیہود من المدینۃ)، ص: ۶۹۸؛ کنز العمال، علی المتقی ۹۷۵ھ، کتاب الفضائل، باب فضائل الامکنۃ والازمنۃ، رقم: ۳۵۱۴۳، مکتبہ رحمانیہ، لاہور؛ سنن کبری للبیہقی، ۹/۲۰۸، رقم: ۱۸۵۳۱

2 - امام محمد، موطا (کتاب السیر باب نزول اھل الذمۃ مکۃ والمدینۃ وما یکرہ من ذالک) مکتبہ رحمانیہ س۔ن، ص: ۳۷۲-۳۷۳

3 - ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفئی والامارۃ باب فی اخراج الیہود من جزیرۃ العرب)، ۲/۷۹، رقم: ۳۰۳۱؛ ترمذی، جامع (ابواب الزکوۃ، باب ماجاء لیس علی المسلمین جزیۃ)، ۱/۲۵۵

وطنی کا حکم دیا۔[1]

مذکورہ بالا تمام احادیث میں جزیرۃ العرب یا حجاز کے اندر صرف مستقل سکونت سے ممانعت ہے نہ کہ تجارت یا کسی دوسری غرض سے آمدورفت سے بھی۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

ویجوزلھم دخول الحجاز للتجارۃ لان النصاریٰ کانوا یتجرون الی المدینۃ فی زمن عمر رضی اللہ عنہ[2]

اور ان (غیر مسلموں) کے لیے تجارت کی غرض سے حجاز میں داخل ہونا جائز ہے۔ کیونکہ عیسائی تجار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ تک تجارت کیا کرتے تھے۔

ابن قدامہ نے حجاز میں ان کی مدت قیام زیادہ سے زیادہ چار دن لکھی ہے۔ تاہم اگر کوئی غیر مسلم آدمی حجاز میں بیمار ہو جائے تو اس کو اس سے زیادہ عرصہ قیام کرنا بھی جائز ہے کیونکہ مریض کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا تکلیف کا باعث ہے اور جو آدمی اس کی تیمارداری پر مامور ہو اس کے لیے بھی مریض کے ساتھ زیادہ عرصہ رہنا جائز ہے کیونکہ مریض کا اس کے بغیر رہنا مشکل ہے۔ اسی طرح حجاز میں کسی آدمی پر اس کا دین ہو اور مدیون آدمی ٹال مٹول کر رہا ہو تو دین کی وصولی تک غیر مسلم آدمی کا حجاز میں قیام جائز ہو گا۔

ویٹی کن سٹی میں غیر کیتھولک کو رہائش کی اجازت نہیں

حضور اکرم ﷺ کی مذکورہ بالا وصیت "اخر جوالیھود والنصاریٰ من جزیرۃ

1- دیکھیے: مسلم، الجامع الصحیح، (کتاب الجہاد والسیر باب اجلاء الیہود من الحجاز)، ۲/۹۴، رقم: ۴۵۹۱؛ ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب فی اخراج الیہود من جزیرۃ العرب)، ۲/۷۳، رقم ۳۰۰۳ ابن قیم۔ احکام اھل الذمہ، ۱/۱۴۱-۱۴۲

2- المغنی، ۸/۵۳۰

3- حوالہ مذکورہ

العرب" (جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دینا) اصولی طور پر داخلی قانون سازی کی ایک مثال ہے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس ضمن میں مذکورہ بالا حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

چونکہ یہ علاقہ اب اسلام کا مرکز قرار دے دیا گیا ہے اور اب یہ علاقہ ہمیشہ کے لیے اسلام کا روحانی دارالحکومت ہو گا، لہٰذا اب یہاں صرف اور صرف نظریہ اسلام کو رہنے کی اجازت ہو گی اور باقی نظریات و مذہب کے ماننے والوں کے سامنے اب صرف دو پر امن راستے ہیں یا تو اپنی آزاد مرضی سے اسلام قبول کر لیں یا جزیرۂ عرب سے نکل کر کسی اور جگہ جا کر آباد ہو جائیں۔ان اسباب کی بناء پر یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ جزیرۂ عرب میں کوئی غیر اسلامی نظریاتی طاقت موجود نہ ہو۔بلکہ یہاں خالص اسلامی عقیدے کی پاسداری اور حکمرانی ہونا چاہیے۔اس لیے یہاں غیر مسلموں کے آباد ہونے کو روکا گیا۔ یہ خیال نہ فرمایئے کہ ایسا کسی تعصب یا غیر مسلموں سے نفرت کی بنیاد پر کیا گیا۔دنیا کے کئی نظاموں میں آج بھی اس طرح کا تصور موجود ہے۔اگر آپ روم تشریف لے گئے ہوں تو آپ نے وہاں شہر روما کا ایک بہت بڑا اور مشہور تاریخی محلہ ضرور دیکھا ہو گا جو "ویٹی کن" کے نام سے مشہور ہے۔جہاں رومن کیتھولک عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔یہاں پاپائے اعظم رہتا ہے۔وہاں غیر کیتھولک کو جائیداد خریدنے اور مستقل آباد ہونے کی اجازت نہیں ہے۔وہ اس کو اپنے دین کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔اس طرح کی اور مثالیں بھی موجود ہیں ماضی میں بھی موجود تھیں اور آج بھی موجود ہیں۔اسی نوعیت کی مثال یہ ہے کہ جزیرۂ عرب میں غیر مسلموں کو مستقل طور پر آباد ہونے سے سرکار دو عالم ﷺ نے روکا ہے۔یہ ایک داخلی قانون سازی کی مثال ہے جس کے بین الاقوامی تضمنات ہیں۔[1]

[1] -اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور)، ص:۸۷-۸۸

زیر بحث معاملہ کی یوں بھی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ ہر ملک بلکہ کئی شہروں میں بھی بعض علاقے ایسے ہوتے ہیں جہاں ہر شہری کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مثلاً فوجی چھاؤنیوں کے مخصوص علاقوں میں صرف فوجیوں یا ملکی دفاع سے متعلق افراد کو ہی داخلے کی اجازت ملتی ہے۔ اسی طرح اسلام اگرچہ پوری دنیا کے لیے آفاقی مذہب کا درجہ رکھتا ہے تاہم حجاز اور جزیرۃ العرب کا مخصوص علاقہ اس کے نزدیک "اسلامی چھاؤنی" کا درجہ رکھتا ہے۔ اب جس طرح ایک عام شہری کا یہ اعتراض بے وزن ہے کہ اسے فوجی چھاؤنی کے اندر داخلے کی اجازت کیوں نہیں اسی طرح غیر مسلموں کا یہ اعتراض بھی غیر منطقی اور بے معنی ہوگا کہ انہیں جزیرۃ العرب میں سکونت کی اجازت کیوں نہیں، اس علاقہ میں صرف انہی لوگوں کو رہنے کی اجازت ہے جو اسلام کے سپاہی یعنی مسلمان ہیں۔

جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو مستقل سکونت کی اجازت نہ ہونے کے معاملے کو اس پہلو سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی دوسرے ملک میں جانا چاہتا ہے تو اس ملک کے ویزا کے لیے درخواست دینا پڑتی ہے۔ ہر ملک کے اپنے قوانین اور ضابطے ہوتے ہیں جن کی ویزا لگوانے والے کو پابندی کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ ویزا جاری نہیں کیا جاتا۔ جو ممالک ویزا کے اجراء میں انتہائی احتیاط اور چھان پھٹک کا مظاہرہ کرتے ہیں ان میں امریکہ سمیت کئی مغربی اور یورپین ممالک شامل ہیں۔ جب تک کوئی مسافر اس ملک کے تمام قوانین اور ضابطوں پر عملدرآمد کے اقرار نامے پر دستخط نہیں کرتا اسے ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح جزیرۃ العرب میں مستقل داخلہ کے ویزا کی اولین شرط یہ ہے کہ وہ آدمی کلمہ گو یعنی کم از کم زبان سے اس بات کا اقرار کرتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔[1]

---

[1] ۔مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر ذاکر نائیک، اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اوران کے جوابات، بیکن بکس لاہور، ص: ۵۲-۵۳

باب ششم

غیر مسلموں کے مذہبی حقوق

پہلی فصل

اسلام اور عقیدہ ومذہب کی آزادی

عقیدہ ومذہب کا اختلاف — مشیت الٰہی

یہ بات ادنی تدبر سے معلوم کی جاسکتی ہے کہ جس طرح تمام انسان اپنی ظاہری شکل وصورت اور چال ڈھال میں ایک دوسرے سے قدرتی طور پر مختلف ہیں حتی کہ دو سگے بلکہ جڑواں بھائیوں کے بھی "انگلی کے نشانات" (Finger Prints) ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اسی طرح ہر انسان کی رائے فکر سوچ نظریہ اور عقیدہ و مذہب میں اختلاف کا پایا جانا بھی ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ جس میں کئی علمی، مذہبی اور معاشرتی مصالح پنہاں ہیں، جن کی تفصیل میں جانا یہاں ہمارے لیے ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کی متعدد نصوص اس چیز پر گواہ ہیں کہ خود خالق کائنات کی مشیت اور تکوینی مصلحت یہی ہے کہ لوگوں میں عقیدہ ومذہب اور رائے ومسلک کا اختلاف موجود رہے گا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ـ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ـ [1]

اور اگر تیرے پروردگار کو منظور ہوتا تو سب کے سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا (یعنی سب کو مؤمن بنا دیتا لیکن بعض حکمتوں سے ایسا منظور نہیں ہوا لہذا) وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز اس کے جس پر رب رحم فرمائے اور اسی لیے اس نے انہیں پیدا کیا ہے (ان کی خلقت ایسی بنائی گئی ہے کہ اہل حق کے

---

[1] ۔ ہود، ۱۱:۱۱۸-۱۱۹

مقابلے میں اہل ضلال برابر پیدا ہوتے رہیں) اور آپ کے پروردگار کی یہ بات پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو جنات اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ۔[1]

اور اگر اللہ (ان کا زبردستی اسلام) چاہتا تو وہ شرک کے مرتکب نہ ہوتے اور ہم نے تمہیں ان (کفار) کا نگہبان نہیں بنایا اور تم (ایمان کے معاملہ میں) ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

نبی اکرم ﷺ اپنی تمام امت کے ساتھ طبعی شفقت و رحمت، رحمۃ للعالمینی اور حد درجہ غمخواری کے باعث شدت سے اس بات کے متمنی تھے کہ سب اہل مکہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور یوں اخروی و دائمی عذاب سے بچ جائیں۔ ان کے ایمان کے غم میں آپ ﷺ کس قدر گھلے جا رہے تھے؟ اس کا اندازہ اللہ کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔[2]

شاید کہ آپ ان (کفار) کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے۔

حضور اکرم ﷺ اپنی اس خواہش کے مد نظر اس بات پر آمادہ تھے کہ ان کا منہ مانگا معجزہ دکھا دیا جائے تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فہمائش کی:

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي

---

[1] - الانعام، ۶:۱۰۷

[2] - الشعراء، ۲۶:۳ (سورۃ الکہف کی آیت ۶ میں بھی الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہی مضمون بیان ہوا ہے)

الْهُدٰي فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ 1

اور اگر آپ پر ان کا اعراض (ایمان نہ لے آنا) گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو استطاعت ہو کہ زمین میں (جانے کے لیے) کوئی سرنگ یا آسمان پر (جانے کے لیے) کوئی زینہ ڈھونڈ لیں تو ضرور کوئی نشانی (معجزہ) ان کے پاس لے آئیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان (سب) کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ 2

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے (مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے نہ چاہا اس لیے سب ایمان نہیں لائے) سو (جب یہ بات ہے تو) کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان ہی لے آئیں۔

علیٰ ہذا القیاس ایک اور جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ 3

(لوگو!) کہنا مان لو اپنے پروردگار کا قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی ٹلنا نہیں۔ تمہارے لیے کوئی پناہ نہ ہو گی اس دن اور نہ تمہارے بارہ

---

1 - الانعام، ۶:۳۵

2 - یونس، ۱۰:۹۹

3 - الشوریٰ، ۴۲:۴۷-۴۸

میں کوئی روک ٹوک کرنے والا ہوگا۔ پھر بھی اگر یہ لوگ (رب کی بات ماننے اور ایمان لانے سے) اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ نہیں ہے آپ کے ذمہ مگر (رب کا پیغام) پہنچا دینا۔

مطلب یہ ہے کہ اتنا سمجھانے بجھانے اور آپ کی اس قدر خیر خواہی کے بعد بھی اگر یہ لوگ بدستور ایمان لانے سے انکار و اعراض کریں تو آپ زیادہ فکر و تردد میں نہ پڑیے۔ آپ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور اپنا فرض پورا کر دیا۔ آپ سے ان کے اعمال کے بارے کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ آپ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ علاوہ ازیں بھی متعدد قرآنی آیات میں نبی اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ کا کام خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے اور بس۔ آپ کی حد درجہ خیر خواہی اور دلسوزی سے دی گئی دعوت توحید سے یہ لوگ اگر روگردانی کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے نہ کہ آپ پر۔ اس انکار کے جوابدہ وہ ہوں گے۔[1]

المختصر لوگوں میں عقیدہ و مذہب کا اختلاف پایا جانا۔ اللہ کی تکوینی مصلحت ہے۔ کوئی فرد، کوئی جماعت یا کوئی حکومت اختلاف کو مٹانا بھی چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔ مشہور مستشرق سر تھامس ارنلڈ (Sir Thomas Arnald) نے اپنی معروف کتاب The Preaching of Islam میں اس مضمون کی سترہ آیات قرآنی شمار کی ہیں۔[2]

اختیار مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ کی ممانعت

اس کے علاوہ اللہ کریم نے دیگر مخلوقات کے برعکس انسان کو عقل و فہم، شعور اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ودیعت فرماتے ہوئے اپنی آسمانی کتابوں اور رسولوں کے ذریعے حق، باطل اور ہدایت و گمراہی کی نشاندہی کر دی ہے۔ اب اس کے بعد انسان پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ایمان لے آئے یا کفر کا راستہ اختیار کرے۔ اور اسی اختیار پر اس کے ثواب یا عذاب کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

---

1 ۔دیکھیے: النساء، ۴: ۸۰؛ المائدہ، ۵: ۹۲؛ الانعام، ۶: ۱۰۷؛ الغاشیہ، ۸۸: ۲۱-۲۲

2 ۔دیکھیے: دعوت اسلام (اردو ترجمہ از محمد عنایت اللہ دہلوی) مدینہ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۴-۲۵

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ[1]

اور (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجیے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آگیا ہے۔ تو جو آدمی چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر (ناشکری / انکار) کرے۔

بعض انصاری صحابہ نے اپنے غیر مسلم بچوں کو اسلام لانے کے لیے مجبور کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ مستقل نوعیت کی ہدایت نازل فرمائی[2] ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ[3]

دین (اسلام کے قبول کرنے) میں کوئی زبردستی نہیں بلاشبہ ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو چکا ہے۔

الغرض قرآن وحدیث میں کوئی ایسی نص موجود ہے نہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اسوہ حسنہ سے کوئی ایسی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ اسلام میں کسی پر دین قبول کرنے کے معاملے میں کبھی کسی قسم کا جبر اور زیادتی کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کے زمانے میں متعدد علاقے اور ممالک فتح ہوئے جنہیں تلوار اور طاقت واختیار کے زور پر ایمان قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ وہاں کے باشندوں کو جزیہ کی معمولی ادائیگی کی شرط کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہنے اور اپنے عقیدہ کے مطابق اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے رہنے کی آزادی اور دیگر کئی حقوق و مراعات دی گئیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آجائے گی۔ مشہور مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سورۃ البقرہ کی درج بالا

---

[1] - الکہف، ۱۸:۲۹

[2] - دیکھیے: المحلی والسیوطی، تفسیر جلالین، تاج کمپنی، کراچی ت۔ن، ص:۴۳ (البقرۃ، آیت ۲۵۶)؛ جصاص، احکام القرآن، ۲/۱۶۸؛ اندلسی، تفسیر البحر المحیط، ۲/۴۵۱ (تحت آیت)؛ بیہقی، السنن الکبری، کتاب الجزیۃ باب من لحق باھل الکتاب قبل نزول الفرقان، ۱۴/۱۱، رقم الحدیث: ۱۹۱۵۱ - ۱۹۱۵۲

[3] - البقرہ، ۲:۲۵۶

آیت کے مذکورہ شان نزول کی روشنی میں اسلام کی تعلیم صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ:

ای لاتکرھوا احدا علی الدخول فی دین الاسلام فانه بین واضح جلی دلائله وبراهینه لایحتاج الیٰ ان یکرہ احد علی الدخول فیه بل من هداہ الله للاسلام وشرح صدرہ ونور بصیرتهٗ دخل فیه علی بینة ومن اعمی الله قلبه وختم علی سمعه وبصرہ فانه لا یفیدہ الدخول فی الدین مکرها ومقسوراً۔[1]

یعنی کسی شخص کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو کیونکہ وہ اس قدر بین و واضح ہے اور اس کے دلائل و براہین اس قدر روشن ہیں کہ کسی شخص کو اس میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ نے جس شخص کو ہدایت دی ہو اور جس کا سینہ قبول حق کے لیے کھول دیا ہو اور جس کو بصیرت کا نور عطا کیا ہو وہ دلیل واضح کی بنا پر اسے خود اختیار کرے گا اور جس کی سماعت و بینائی پر مہر کر دی ہو اس کا مجبور ہو کر (زبردستی) دین میں داخل ہونا بیکار ہے۔

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بھی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس قول کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

لم یجز الله امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکین والاختیار ونحوہ قوله تعالیٰ "ولو شاء ربک لاٰمن من فی الارض کلهم جمیعا افأنت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین" ای لوشاء لقسرهم علی الایمان ولکنه لم یفعل وبنی الامر علی الاختیار۔[2]

اللہ نے ایمان کے معاملہ میں جبر و زبردستی کو جائز قرار نہیں دیا ہے بلکہ اسے قدرت و

[1] ۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/۴۰۶

[2] ۔ الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، مرکز اهل السنة گجرات، ہند، ۱/۲۹۹

اختیار پر چھوڑ دیا ہے، اسی مضمون کو یہ ارشاد الٰہی بھی واضح کرتا ہے کہ "ولو شاء ربک لامن الخ" اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام روئے زمین کے باشندے ایمان لے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لائیں؟ اگر اللہ کی مصلحت یہی ہوتی کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے تو وہ خود ہی لوگوں کو ایمان پر مجبور کر دیتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور سارا معاملہ لوگوں کے اختیار پر ہی رکھا۔

غیر مسلم اقوام کو مذہبی آزادی دینے میں اسلام نے کبھی تعصب کو آڑے نہیں آنے دیا۔ مذاہب عالم کی تاریخ میں اسلام نے جس طرح غیر متعصب ہونے کا عملی ثبوت دیا اور کمال رواداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور سیرت نگار قاضی سلیمان منصور پوری جیسا کہ پیچھے بھی گزر چکا ہے، اس چیز کو اسلام کی خصوصیات میں شمار کیا ہے اور "اسلام ہی غیر متعصب دین ہے" کی سرخی قائم کر کے لکھتے ہیں:

> اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اغیار نے بہت سے جھوٹے الزام اس پر لگائے ہیں اور بعض الزام تو وہ ہیں جو الزام لگانے والوں ہی میں موجود اور ثابت تھے مگر انہوں نے ہوشیاری اور عیاری یہ کی کہ اپنے کرتوت چھپانے کے لیے انہی باتوں کو مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔ اور پھر نااہل مسلمانوں کے افعال کو تعلیم اسلام کا نتیجہ قرار دے کر مذہب اسلام کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

(أ) تعصب کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ عطاء حقوق کے وقت کسی کو حق سے زائد دیا جائے اور کسی کو حق سے کم۔

(ب) اس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی آزادی عقلی اور حریت مذہبی پر ناجائز بندشوں کا بار ڈالا جائے۔

(ج) اس کے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی حمایت میں دیگر مذاہب کو حق حفاظت سے محروم کر دیا جائے۔

(د) اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اپنے مذہب کی برکات وانوار کا مستحق خود اپنے ہی آپ کو سمجھا جائے اور دوسروں کو ان برکات وانوار سے بالکل دور رکھا جائے۔

بحمد اللہ کہ اسلام کی تعلیم ان جملہ نقائص سے پاک ہے۔ قرآن عظیم اور رسول کریم ﷺ نے ہمیشہ تعصب کی ان جملہ اقسام کو برا بتایا اور اپنے دامن تعلیم کو اس خارزار سے ہمیشہ بلند تر رکھا۔[1]

غیر مسلموں کو قبول اسلام کی دعوت دینا اگرچہ اہل اسلام اور اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے مگر وہ کسی آدمی کو اپنی طاقت اختیار اور حکومت واقتدار کے بل بوتے پر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے اسلام کی دعوت دینا اور چیز ہے اور اسلام کے لیے مجبور کرنا دوسری چیز ہے۔ اسلام کی دعوت تو شرعاً جائز ہے جبکہ اکراہ فی الدین ممنوع۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی کو اسلام کی طرف دعوت دینا ہے یا غیر مذاہب کے عقائد ونظریات پر کوئی تنقید کرنی ہے تو انتہائی عمدہ پیرائے اور نرمی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔[2]

(اے مخاطب!) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیجئے حکمت سے (عملی دلائل کے ساتھ) اور اچھی نصیحت سے (یعنی ترغیب وترہیب سے اور ان کے قلبی جذبات ابھار کر) اور ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کیجیے پسندیدہ طریقہ سے (یعنی دعوت میں نوبت اگر بحث ومباحثہ تک آجائے تو بڑے شائستہ عنوان سے گفتگو کرو)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے دعوت وتبلیغ دین کے جو آداب اور اصول بتائے ہیں ان

---

[1] رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۳/۴۲۹

[2] النحل، ۱۶:۱۲۵

کی تفصیل میں جانا ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں۔ اسلام میں عقیدہ و مذہب کے معاملے میں کسی قسم کے جبر و اکراہ نہ ہونے یا اس معاملے میں اسلام کی رواداری، برداشت اور صلح کل پالیسی کے حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ نے رسول اکرم ﷺ کے دوسرے مذاہب کے ساتھ عمومی رویہ سے استنباط کرتے ہوئے "دیگر مذاہب کی تصدیق، تصحیح" کے عنوان کے تحت ایک قابل توجہ بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

رسول عربی ﷺ نے یہ کبھی نہیں کہا کہ دنیا کے دیگر مذاہب جھوٹے اور ان کے ماننے والے جہنمی ہیں۔ لا مذہبی اور خود پرستی کو چھوڑ کر (جس میں اپنی دستکاری اور اپنے ہی مصنوعات کو اپنا خدا مان لینا شامل ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کا ہر مذہب سچا اور خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ بشرطیکہ اس مذہب کی ابتدائی اصلیت میں غلط رسم و رواج سے حذف و اضافے نہ ہو گئے ہوں اور یہ کہ دنیا کا کوئی ملک اور کوئی امت ایسی نہیں جہاں خدا کے پیغمبر نہ آئے ہوں اور سچا مذہب نہ پھیلا چکے ہوں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا: اے محمد! ہم نے اپنے بعض پیغمبروں کا تجھ سے تذکرہ کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا ہے۔ نیز کوئی امت ایسی نہیں جہاں کوئی خدا سے ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ ۷ھ میں وفات سے تین سال پہلے آنحضرت ﷺ نے قسطنطنیہ، مصر اور حبش کے عیسائی حکمرانوں کے نام جو تبلیغی خطوط لکھے اس میں یہ نہیں لکھا گیا تھا کہ عیسائیت غلط ہے اسے چھوڑ دو بلکہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت لکھی گئی تھی:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝[1]

آپ کہہ دیں! اے الہامی کتاب کے ماننے والو! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پوجیں اور اس کا کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی میں سے کسی کو رب نہ بنالیں۔ اگر یہ لوگ منہ

---

[1] - آل عمران، ۳:۶۴

موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو اس پر سر تسلیم خم کر چکے۔

ایک اور آیت قرآن مجید میں دو جگہ بہت خفیف لفظی فرق سے دہرائی گئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝[1]

یعنی جو لوگ ایمان لائے (پیغمبر اسلام پر) اور جو لوگ یہودی ہیں نیز عیسائی اور صابی مذہب والے غرض جو بھی اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ایسوں کو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ملے گا اور نہ ان پر کوئی خوف کی وجہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

صلح کل، رواداری اور انتہائی وسعت قلبی کی اس عجیب وغریب تعلیم میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ یہودی، عیسائی اور صابی اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کو ترک کریں بلکہ اپنے اپنے الہامی مذہب ہی کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی امور پر عمل کریں یعنی اللہ اور رسول ﷺ کو ماننا، مرنے کے بعد حساب کتاب کا یقین کرنا اور زندگی بھر عمل صالح کرنا یہ اجر ملنے اور خوف سے بچنے کے لیے کافی ہے۔ حقیقت میں یہ ایک طرح سے ایک بنیادی مذہب مرتب کرنا تھا اور اسی بنیادی مذہب کو۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ۔[2] (بے شک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو اس کی تابعداری کا نام ہے)۔ اور وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ۔[3] (اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہر گز قبول نہ ہوگا) کہا گیا۔

1۔ البقرہ، ۲:۶۲؛ المائدہ، ۵:۶۹

2۔ آل عمران، ۳:۱۹

3۔ آل عمران، ۳:۸۵

ان آیات میں اسلام نے مذاہب عالم کو دعوت دی اور آج بھی وہ دعوت باقی ہے کہ اپنے ہاں کے اصلی مذاہب پر رجوع کرو۔ بعد کے زمانہ کے حذف و اضافہ سے باز آ جاؤ اور توحید' قیامت اور عمل صالح کے مابہ الاشتراک امر پر انضمام نہیں تو وفاق کر لو۔ ہر مذہب کی اصلی تعلیم کو مانیں تو پھر اصول کی حد تک اختلاف ہے ہی نہیں، اور چونکہ بلا استثناء ہر جگہ اور ہر مذہب و ملت میں ایک آخری تسکین دہندہ کی بشارت و پیشین گوئی موجود ہے، اس لیے اپنے مذاہب کی کامل تعمیل میں اس کی اطاعت بھی آ جاتی ہے۔ یوں بھی نجات کے اس طریقہ سے، استدلال کے لیے نبی عربی ﷺ کو گواہی میں پیش کرنا انہی کے لیے ضروری ہو گا۔ اس طرح مذہبی تعصب کی مصیبت سے انسان و نجات مل جاتی ہے اور "لا اکراہ فی الدین" (قرآن) یعنی دین میں جبر نہیں۔ ایک ایسا سنہری اصول تھا جو اس سے پہلے کہنا چاہیے کہ سنا ہی نہیں گیا تھا۔[1]

عقیدہ و مذہب کے معاملے میں اسلام کے زیر بحث نقطہء نظر یا سوچ پر رئیس احمد جعفری کا یہ تجزیہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ:

> ہر نیا مذہب یہ چاہتا ہے کہ دوسرے ادیان ختم ہو جائیں اور وہ ان سب کی جگہ لے لے۔ ہر داعی مذہب یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی دعوت پھیلے اور روئے زمین پر چھا جائے لیکن اس خواہش اور کوشش میں بہت جلد جبر اور جور کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ روم وغیرہ میں عیسائیت جس طرح پھیلی وہ ایسی داستان ہے جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ اور اگر حالات کی نامساعدت کمزوری اور بے بسی کے باعث جبر و جور ممکن نہیں ہوتا تو تند اور سخت الفاظ کی یورش شروع ہو جاتی ہے، لیکن اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دامن ان دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ داعی اسلام ﷺ کی جدوجہد کا مرکز صرف یہ خیال ہے کہ دوسرے اس دعوت حق کو سنیں، سمجھیں، مانیں اور گردن جھکا دیں لیکن بایں ہمہ وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ جبر و جور سب و شتم

[1] ۔رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ص:۲۸۵ تا ۲۸۷

سے کام لیا جائے، وہ صاف اور واضح الفاظ میں فرماتا ہے: "اے پیغمبر! کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان معبودوں کی پرستش نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو اور جس کی میں پرستش کرتا ہوں اس کی پرستش تم نہیں کرتے نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو اور نہ تم اس کی پرستش کرو گے جس کی میں پرستش کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین" (سورۃ الکافرون)۔ یہ چند آیتیں رواداری کا ایک ایسا میثاق ہیں جو اپنی نوعیت میں فرد ہے جس کی مثال صفحہ ارض پر کہیں نہیں ملتی۔ یہ میثاق صاف اور غیر مشکوک الفاظ میں کافروں اور مشرکوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ اپنی روایات، معاملات اور مسائل پر قائم رہیں۔ "لکم دینکم ولی دین" یہ دو الفاظ رواداری اور وسعت قلب کا ایسا چارٹر ہیں جس پر آج بھی دنیا کی کسی قوم کا عمل نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ عمل نہیں نظری اور اصولی طور پر جسے دنیا نے یا دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں اور ملتوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔[1]

اسلام پر مجبور نہ کرنے کے چند نظائر

اسلامی تاریخ میں عہد نبوی سے لے کر عثمانی ترکوں اور ہندوستان میں مغلوں کے عہد حکومت تک بے شمار ایسے مواقع آئے (جس کی سب سے بڑی نظیر فتح مکہ کا موقع ہے) جن پر غیر مسلموں کو ان کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجتماعی یا انفرادی طور پر اسلام لانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ کبھی ایسا نہیں کیا گیا۔ جس آدمی نے بھی اسلام قبول کیا اسلام کی تعلیمات یا پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر کیا۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے الفاظ ہیں "اگر ہم جبر کرتے تو سپین، اٹلی، سسلی اور ہندوستان میں آج ایک بھی غیر مسلم نظر نہ آتا۔ ہماری تلوار صرف تسخیر

---

[1] - اسلام اور رواداری، ۱/۵۱-۵۲

ممالک کے لیے تھی۔ دلوں کو ہم پاکیزگی، بلند اخلاق، نرمی، انصاف اور ایک عدیم المثال نظریہ حیات کی تلوار سے فتح کرتے تھے۔"[1] اس قسم کی نظیروں کا احاطہ یہاں مقصود ہے نہ ممکن۔ تاہم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند نظائر ملاحظہ ہوں۔

ا۔ عرب کے مشہور قبیلہ بنی حنیفہ اور نجد کے سردار ثمامہ بن اثال کو عہد نبوی میں ایک لڑائی کے دوران گرفتار کر کے مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا جاتا اور اس کی "پیٹو طبیعت" کے مطابق وافر اور حسب خواہش کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ نماز کے وقت نبی رحمت ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو پوچھا: ثمامہ! میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے حقیقت پر مبنی جواب دیتے ہوئے کہا: "عندی خیر یا محمد! ان تقتل تقتل ذادم وان تنعم، تنعم علی شاکر وان کنت ترید المال فاسئل منه ماشئت" (اے محمد میرے پاس خیر ہی ہے۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو واقعی ایک خونی آدمی کو قتل کریں گے اور اگر انعام کرتے ہوئے معاف فرما دیں گے تو ایک شکر گزار آدمی پر انعام فرمائیں گے اور اگر مال درکار ہے تو جتنا چاہیں حاضر کر دوں گا)۔

حضور اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن اس سے پھر وہی سوال کیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اگر آپ رحم و کرم فرمائیں گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہو گا۔ تیسرے دن بھی یہی سوال جواب ہوا۔ اب حضور اکرم ﷺ نے کمال کرم کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا: "قد عفوت عنک یا ثمامة واعتقتک" (اے ثمامہ میں نے تجھے معاف کیا اور آزاد کیا)۔

نبی رحمت ﷺ نے ثمامہ پر اسلام قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالا نہ کسی قسم کا لالچ دے کر اسے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا بلکہ بغیر کسی شرط کے اسے معاف کر دیا اور اس کے بندھن کھلوا دیے۔ ثمامہ پر آپ کے اس حسن سلوک اور درگزر کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مسجد نبوی کے قریب ایک باغ میں گیا وہاں نہا دھو کر

---

[1] ۔یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص: ۱۲۸

بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام قبول کر لیا۔[1]

۲۔ اہل علم سے مخفی نہیں کہ ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ بنو قریظہ کی جنگ میں گرفتار ہوئیں اور جنگی قانون کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کی ملک میں آئیں۔ جس وقت گرفتار ہوئیں تو صرف یہی نہیں کہ وہ یہودیہ تھیں بلکہ انہیں اسلام سے نفرت بھی تھی۔ نبی رحمت ﷺ نے اس کا آقا اور سربراہ حکومت ہونے کے باوجود انہیں اسلام لانے پر مجبور کیا نہ دباؤ ڈالا بلکہ انہوں نے بعد میں اخلاق نبوی سے متاثر ہو کر از خود اسلام قبول کر لیا۔ جس سے حضور کو بڑی مسرت ہوئی۔ مشہور قدیم سیرت نگار ابن ہشام اور مؤرخ طبری وغیرہ نے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ لکھا ہے:

> رسول اللہ ﷺ نے جس وقت انہیں قیدی بنایا تو اسلام کے ساتھ ان کو مذہبی تعصب اور بڑی نفرت تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہودی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نبی رحمت ﷺ نے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ حضور ﷺ کو ان کے اسلام قبول نہ کرنے کا بہر کیف قلق تھا۔ ایک دن آپ ﷺ صحابہ کے ہمراہ جا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اپنے پیچھے جوتوں کی آواز سنی۔ آپ نے پیچھے آنے والے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بتا دیا کہ یہ ثعلبہ بن سعیہ ہیں جو مجھے ریحانہ کے اسلام لانے کی خوشخبری دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ آئے تو انہوں نے عرض کیا یا

[1] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: بخاری الجامع الصحیح (کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ وحدیث ثمامہ بن اثال)، ۲/۶۲۸ رقم: ۴۳۷۲؛ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الجهاد باب ربط الاسیر وحبسہ وجواز المن علیہ)، ۲/۹۳-۹۴ رقم: ۴۵۸۹؛ ولی الدین، مشکوۃ المصابیح، (باب حکم الاسراء)؛ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح البخاری، ۸/۶۸؛ ابن عبد البر، الاستیعاب، ۱/۲۱۵؛ حلبی، سیرت حلبیہ (غزوات النبی اردو ترجمہ)، ص: ۷۷۹؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، ص: ۲۰۷، ۲۰۸ (خطبہ نمبر ۸: نظام دفاع اور غزوات)

رسول اللہ! ریحانہ نے اسلام قبول کر لیا ہے جس سے آنجناب کو بہت مسرت ہوئی۔[1]

۳۔ ابو عبید نے "لا اکراہ فی الدین" کی تفسیر میں درج ذیل ایمان افروز اور سبق آموز واقعہ درج کیا ہے:

> وسق رومی کہتے ہیں میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کا غلام تھا وہ مجھ سے کہا کرتے تھے: مسلمان ہو جا اگر تو اسلام قبول کر لے گا تو میں تجھے مسلمانوں کی امانت کا کوئی کام سونپ دوں گا۔ کیونکہ میرے لیے یہ روا نہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی امانت کے کام پر متعین کروں۔ مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس پر وہ کہا کرتے: "عربی خط" (دین اختیار کرنے میں کوئی اکراہ نہیں ہے) پھر جب ان کی وفات کا وقت آن پہنچا تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا: تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔[2]

۴۔ اسی طرح زید بن اسلم اپنے باپ (حضرت عمرؓ کے غلام اسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو ایک بوڑھی نصرانی عورت سے یہ کہتے سنا کہ اے ماں اسلام قبول کر کے سلامتی میں آ جا۔ بے شک اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ وہ کہنے لگی۔ اس وقت میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں اور موت بالکل میرے قریب ہے۔ اس لیے ایسے وقت میں اسلام قبول نہیں کر سکتی۔

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، السیرہ النبویہ، دارالمعرفہ، بیروت۔ لبنان، القسم الثانی، ص:۲۴۵ (غزوۃ بنی قریظہ ۵ھ)؛ طبری، تاریخ الطبری، روائع التراث العربی، بیروت، ۲/ ۵۹۲؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ؛ دارالمعرفہ بیروت، ۴/ ۱۱۹؛ مقریزی؛ امتاع الاسماع، ۱/ ۲۵۲؛

نوٹ: ریحانہ کے حضور اکرم ﷺ کی باندی یا آزادی کے بعد آنجناب کی منکوحہ ہونے یا واپس اپنے خاندان میں چلے جانے کے بارے میں مورخین کا اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ دیکھیے: شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، ۱/ ۲۶۳-۲۶۴

[2] ۔ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص:۲۲ (پیرہ نمبر ۸۷)

حضرت عمرؓ نے کہا: اے اللہ گواہ رہنا اور پھر یہ آیت کریمہ (لا اکراہ فی الدین) تلاوت فرمائی۔[1]

اسلام وہ واحد مذہب ہے جو دنیا کو قبولیت کی دعوت دیتا ہے اور اعلانیہ مملکت کی حدود میں بسنے والے ہر فرد کو اجازت دیتا ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد جب وہ مطمئن ہو جائے تو اسے قبول کرے۔ دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کرے اور اگر کسی کا دل نہ مانے تو ذمی کی حیثیت سے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے زندگی گزار دے۔ انہوں نے کبھی کسی مذہب کے عقائد میں دخل نہیں دیا، کبھی مذہبی دارو گیر نہیں کی۔ اسلام کی تاریخ میں غیر مذہب والوں پر مقدمات اور احتساب کا کوئی ادارہ، کسی دور میں کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

اس معاملے میں قرآن مجید کے چار مذکورہ الفاظ "لا اکراہ فی الدین" نے عالم اسلام کی ہر اقلیت کو سپر مہیا کر دی ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی جراءت کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتی اور اگر کسی نے خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تو فقہاء اسلام اس کے راستے میں آڑے آ گئے اور اسے یہ غیر اسلامی فعل نہیں کرنے دیا گیا۔ چنانچہ مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ عثمانی ترکوں کے زمانے میں جب مشرقی یورپ کا بڑا حصہ ترکوں کے قبضے میں آ چکا تھا تو نہ صرف اس علاقہ کے عیسائیوں بلکہ ترکی علاقے کے ہر عیسائی کے متعلق سلطان سلیم عثمانی نے ارادہ کیا کہ "عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا ان کو پھر حکم دیا جائے کہ ہمارے علاقے سے دور نکل جائیں۔" سلیم اپنے ارادہ اور عزم میں جتنا پختہ تھا، اس سے سلاطین ترکی کے حالات جاننے والے واقف ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ سلطان سلیم کا یہ ارادہ اگر نافذ ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتا تو سلطنت ترکی ہی میں نہیں بلکہ بلقانی ریاستوں کے اکثر حصوں میں آج عیسائیت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا مگر اس وقت بھی مسلمانوں کے اس حکمران کو جس قوت نے ا ودسے آگے بڑھنے نہ دیا وہ لا مذہبیت اور بے دینی کی قوت نہ تھی بلکہ دینی طاقت کے ایک نمائندہ عالم جن کا نام مفتی جمالی تھا۔ وہ سلیم کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اس غضبناک خونی بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر صاف لفظوں میں اعلان

---

[1] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۳/ ۱۸۲

کرتے ہیں۔

لا يحل لک ذلک

تمہارے لیے یہ اقدام مذہباً کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

مفتی جمالی نے اس قوت کے ساتھ اسلام کے اس فتویٰ کو سلیم کے سامنے پیش کیا کہ اس کا آہنی ارادہ بھی موم بن کر رہ گیا۔[1]

آیت قتال یا آیت جزیہ (قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ---------- حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ)[2] میں قتال (جنگ) کی غرض وغایت یہ بتائی گئی ہے کہ کفار کا ادائے جزیہ پر رضامند ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ چنانچہ "حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ" فرمایا گیا ہے نہ کہ "حتى يسلموا" (یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں)۔ جب وہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو اس کے بعد ان کی جان ومال محفوظ ہو جاتے ہیں چاہے وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔ اس حکم کی وضاحت علامہ کاسانیؒ نے یوں کی ہے:

نهى سبحانه وتعالى اباحة القتال الى غاية قبول الجزية واذا انتهت الاباحة تثبت العصمة ضرورة۔[3]

اللہ تعالیٰ نے قبول جزیہ کو اباحت قتال کی حد مقرر کیا ہے، پس جب اس غایت کے حصول پر اباحت ختم ہو گئی تو لازمی طور پر ذمیوں کے جان ومال کا تحفظ بھی ثابت ہو گیا۔

عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدین تو خیر القرون اور اسلامی حکومت کا زریں اور مثالی دور ہے۔ اس

---

[1] - مقالات گیلانی (مقالہ: اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جا شکایت)، ص: ۳۶۳؛ (بحوالہ شکیب ارسلان، تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، المکتبۃ التجاریۃ، مصر، ۱۹۳۶ء، ۲/۱۷۷

[2] - التوبۃ، ۹:۲۹

[3] - بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱

ے بعد کے ادوار حکومت میں بھی کبھی کسی مسلمان حکمران نے کسی غیر مسلم ذمی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ ماضی قریب کے وسیع النظر عالم اور مؤرخ اسلام مولانا مناظر احسن گیلانی نے "چیلنج" کے انداز میں لکھا ہے:

میں دنیا کے مؤرخوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ ہزار سال سے زیادہ طویل مدت جس میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اس لیے قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کر دے۔[1]

داعی اسلام ﷺ سے لے کر آج تک اسلام کسی پر بالجبر مسلط نہیں کیا گیا۔ اس معاملے میں اصولی بات یہ ہے کہ دلوں کو تلوار سے مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ کردار کی تعمیر جبر سے نہیں ہوتی۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبلیغ دین کی ابتداء فرمائی تو تن تنہا تھے۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ تلوار کے زور پر ایک ایک فرد کو اپنا تابع و پیروکار بنا رہے تھے۔ اس کے برعکس معاشرے کی تلواریں اور ظلم و ستم کے دروازے ان پر اور ان کے متبعین پر کھول دیے گئے۔ قریش مکہ نے انہیں مٹا ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہ رکھی۔ ظلم کا کوئی حربہ نہیں تھا جو آزمایا نہ گیا ہو۔ ان مظالم (جن کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں) کے باوجود ایک بھی صاحب ایمان ایسا نہیں تھا جس نے ان شدائد سے تنگ آ کر اسلام کو ترک کر دیا ہو۔ آخر ان السابقون الاولون کو اسلام سے وابستہ رکھنے میں کون سی طاقت، کون سا جبر اور کونسی تلوار کارفرما تھی؟ کیا یہ قوت محض اسلامی تعلیمات و افکار کی کشش نہ تھی؟ اسلام بذات خود ایک قوت ہے جو ہر بیرونی قوت و طاقت سے مدافعت کرنے اور ٹکرا جانے کا ولولہ عطا کرتا ہے۔

زیر بحث مسئلہ پر انڈیا کے معروف مذہبی سکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک کے درج ذیل توضیحی و جوابی

---

[1] ۔مقالات گیلانی (مقالہ: مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام)، شیخ زاید اسلامک سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۳۵۷

اشارات لائق توجہ ہیں۔ وہ کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

مسلمانوں نے سپین پر آٹھ سو برس تک حکومت کی مگر کبھی لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا جبکہ اسلامی دورِ حکومت کے خاتمے کے بعد جب صلیبی جنگجو عیسائیوں نے سپین پر قبضہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان اس سرزمین سے مٹا ڈالا یہاں تک کہ کوئی ایک مسلمان باقی نہ رہا جو اذان ہی دیتا۔ مسلمان پورے عالمِ عرب پر چودہ سو سال سے حاکم چلے آرہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے حصے پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مختصر دورِ حکومت کے سوا اس وسیع خطے پر مسلمانوں ہی کی حکومت رہی ہے لیکن اس کے باوجود ایک کروڑ چالیس لاکھ عرب اب بھی مسیحی مذہب پر قائم ہیں اور یہ قبطی عیسائی ہیں یعنی نسل در نسل عیسائی مذہب کے پیروکار ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اسلام پھیلانے کے لیے تلوار چلائی ہوتی تو اتنی بڑی تعداد میں عیسائی کیونکر مسلمان ہونے یا پھر ختم ہونے سے محفوظ رہتے؟

مسلمانوں نے ہندوستان پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی۔ اگر وہ چاہتے تو ان کے پاس اتنی طاقت تھی کہ ہندوستان کے ہر باشندے کو کلمہ پڑھوا دیتے۔ اس وقت بھی ہندوستان کی ۸۰ فیصد آبادی غیر مسلم ہے جو اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلایا گیا۔ انڈونیشیا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اسی طرح ملائیشیا میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں کون سی مسلح فوج نے فتوحات کی تھیں۔ اسی طرح افریقہ کے مشرقی ساحلی علاقوں میں اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ یہاں کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ اس علاقے میں کون سی مسلم فوج نے حملہ کیا تھا اور کب؟

معروف امریکی ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ۱۹۸۶ء میں ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۸۴ء کے درمیان کے پچاس سال میں دنیا میں مذاہب کی اشاعت کے اعداد و شمار دیے گئے۔ یہ مضمون بعد ازاں "پلین ٹرتھ" نامی میگزین میں بھی شائع ہوا۔ اس کے مطابق اسلام تمام مذاہب کے مقابلے میں تیزی سے پھیلا اور اس دوران اس کے ماننے والوں میں ۲۳۵ فیصد اضافہ ہوا جبکہ مسیحیت کے ماننے والوں میں صرف ۴۷ فیصد اضافہ ہوا۔ یہ سوال پوچھا جانا چاہیے کہ ان پچاس برسوں میں کون سی

جنگیں ہوئیں جو مسلمانوں نے اسلام پھیلانے کے لیے لڑیں۔ دورِ حاضر میں امریکہ اور یورپ میں جو بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، وہ اسلام ہے۔ اب تو سب دیکھ رہے ہیں کہ کون سی تلوار ہے جو اسلام کے لیے چلائی جا رہی ہے۔"[1]

اس مقام پر ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن پرشاد کا درج ذیل حقیقت پسندانہ تجزیہ و تبصرہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ وہ ابتدائے اسلام میں اہلِ مکہ کے مسلمانوں پر تشدد کا ذکر کرنے کے بعد "اسلام کی اشاعت اور تشدد" کے عنوان سے الزامی اور ادبی انداز میں لکھتے ہیں:

"میرے ملک کے آتشکدے میں ان جبر و ستم اور متعصب مصنفوں کی تنگ نظری اور تعصب کو جلا کر خاک سیاہ کر دینے کے لیے بے پناہ شعلے بھڑکنے لگتے ہیں جو کفار کے اس جبر و تشدد اور زہرہ گداز ستم کے روح فرسا مناظر کو دیکھتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت تلوار اور تشدد کے زور سے ہوئی۔ ان کے اس غلط نظریے کو تھوڑے سے الٹ پھیر کے بعد صحیح بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ تشدد جس نے اسلام کی اشاعت میں غیر معمولی مدد دی، مسلمانوں کی طرف سے نہیں تھا بلکہ کفار کی طرف سے تھا۔ کفار ظالم تھے، مسلمان مظلوم۔ کفار کی خون آشام تلواریں نیام سے باہر تھیں۔ مسلمانوں نے ان کو زنگ آلود ہونے کے لیے کسی کونے میں پھینک رکھا تھا۔ ان کے پاس اگر کوئی تلوار تھی تو وہ صداقت کی تلوار تھی۔ وہ اسلام کی حریت نواز اور عدم تشدد کی تلوار تھی جو اسلام کے اصول کی اشاعت کے لیے ظالم کے ظلم کی پوری طاقت سے مدافعت کرتی تھی اور خود وار نہ کرتی تھی مگر جس نے کفار کی فولادی تلواروں کے منہ پھیر دیے تھے۔"[2]

1۔ اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات، بیکن بکس لاہور، ص: ۳۲ تا ۳۵

2۔ عرب کا چاند، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، (طبع سوم) ص: ۱۵۸-۱۵۹

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جبراً کسی کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنا کیا اس سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ ہو گا یا کفر کی بدترین قسم نفاق پر مجبور کرنے کی عملی تدبیر ہو گی۔ ظاہر ہے یہ مسلمان کی بجائے منافق بنانے کی ایک شکل ہو گی جس کی اسلام نے خود سختی سے مذمت اور تردید کی ہے۔ اسلام صرف زبان سے اقرار کا نام نہیں بلکہ اس میں دل سے اس کی تصدیق، اعتقاد جازم اور یقین تام بھی داخل ہے، بلکہ اس کی عین حقیقت ہے جو کسی جبر واکراہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ تیغ و تیر اور خنجر و بندوق سے کوئی عقیدہ قلب میں نہیں اتارا جا سکتا۔

دنیا میں اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ اور ابتدائی غزوات و جہاد کو دیکھ کر بعض عیسائی مبلغین کا یہ فیصلہ کر دینا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، قطعاً حقیقت سے دور ہے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کے جہاد یا قانون جہاد سے اگر یہ غلط نتیجہ نکالا ہے تو باعث تعجب نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے ہاں جنگ و جدال اور جبر واستعمار کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کے مقدسین، پوپ اور راہب قسم کے لوگوں نے بھی عیسائیت کی تبلیغ میں اور غیر عیسائی لوگوں کو عیسائی بنانے میں وہ ظلم و ستم ڈھائے ہیں جن کے سامنے مغلوں اور تاتاریوں کے مظالم ہیچ نظر آتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اسلام میں مذہبی جبر کا نہ ہونا۔ مستشرقین کا اعتراف

مشہور مستشرق سر تھامس واکر آرنلڈ (Sir Thomas walker Arnold) نے مغربی ایشیاء کی عیسائی قوموں میں اسلام کی اشاعت کی تفصیل اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام میں کبھی کسی کو جبری طور پر مسلمان بنانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ آرنلڈ کی مشہور کتاب "The Preaching of Islam" اشاعت اسلام کی تاریخ سے متعلق ہے۔ جس دور میں یہ کتاب مرتب کی گئی، اس وقت مغرب میں عموماً یہ پروپیگنڈا زوروں پر تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ آرنلڈ نے پہلی مرتبہ ان اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا جن کے تحت اسلام کی اشاعت دنیا بھر میں برق رفتاری سے عمل میں آئی۔ اس نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ دنیا میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ

اپنی انسانی خیر خواہی اور ہمدردی پر مشتمل تعلیمات اور غیر اقوام سے مسلمانوں کے حسن برتاؤ کی وجہ سے پھیلا ہے۔ بہر کیف وہ مغربی ایشیاء کی عیسائی قوموں میں اشاعتِ اسلام کے حوالے سے لکھتا ہے:

> ایک اور سبب یہ تھا کہ عیسائی غلاموں کو ان کے مہربان آقاؤں سے ہمیشہ اس بات کی ترغیب ہوتی تھی کہ اسلام قبول کر کے آزاد ہو جائیں۔ مگر کوئی باقاعدہ کوشش اس بات کی کہ لوگوں کو بجبر مسلمان کیا جائے یا کوئی ظلم و تعدی کا ایسا مستقل محکمہ دریافت نہیں ہوتا جو عیسوی مذہب کے استیصال کے لیے ہوتا۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بات کو بھی خلفاء اسلام ہی ٹھان لیتے تو اپنی قلمرو سے مسیحی دین کو اس طرح ملیامیٹ کر دیتے جیسے بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابلہ نے اسلام کو ہسپانیہ سے نکالا تھا یا لوئی چہاردھم بادشاہ فرانس نے پروٹسٹنٹ مذہب کو اپنے ملک میں قانونی جرم قرار دیا تھا یا جس طرح ساڑھے تین سو برس تک سلطنت انگلستان نے یہودیوں کو اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ مشرقی کلیسا جس قدر ایشیاء میں تھے ان کو باقی مسیحی دنیا سے بالکل قطع تعلق ہو گیا تھا اور اس میں کوئی شخص ایسا نہ ملتا جو ان کی طرفداری میں انگلی تک اٹھاتا کیونکہ مشرقی کلیساؤں کو اصل دین سے منحرف سمجھا جاتا تھا۔ پس ان کلیساؤں کا آج کے دن تک زندہ رہنا ہی پکا ثبوت اس بات کا ہے کہ اسلامی حکومتوں نے عموماً مذہبی آزادی کا طریق ان سے برتا۔[1]

اسی طرح مستشرق مذکور نے ایک دوسری جگہ اسلام میں مذہبی آزادی اور عدم اکراہ کو ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> غرض مسلمانوں کی سلطنتوں میں عیسائی قوموں اور فرقوں کا صدہا برس سے آباد رہنا ہی اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ ان کو مذہبی آزادی اور سلامتی حاصل رہی اور ظاہر ہوتا

---

[1] ۔ دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص: ۸۴

قتاً متعصب مسلمانوں کی طرف سے جو ظلم

کہا ہے کہ وقتاً فوقتاً متعصب مسلمانوں کی طرف سے جو ظلم عیسائیوں کو اٹھانے پڑے ان کا باعث خاص خاص مقامی حالات ہوتے تھے نہ کہ مذہبی آزادی کے خلاف کوئی مقررہ اصول مسلمانوں میں ایسا تھا جن کی وجہ سے ظلم ہوئے ہوں۔[1]

آرنلڈ نے درج بالا عبارت میں متعصب مسلمانوں کی طرف سے مخصوص مقامی حالات کے پیش نظر عیسائیوں پر کیے جانے والے جس ظلم کی طرف اشارہ کیا ہے، اپنی کتاب میں اس نے خود بڑی تفصیل سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ ایسے تشدد کا سبب اکثر خود غیر مقامی یا مقامی عیسائی بنتے تھے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

> اکثر ظلم جو عیسائیوں پر اسلامی ملکوں میں ہوئے ہیں ان کا سبب اکثر یہ دریافت ہوتا ہے کہ غیر ملکوں کے عیسائی اور اسلام کے دشمن رخنے ڈال کر اور سازشیں پھیلا کر یا تو عیسائیوں کی خیر خواہی کی طرف سے بے اعتباری پیدا کر دیتے یا مسلمانوں کے ساتھ دغابازی کر کے اور اپنی جلادی دکھا کر عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے دل میں دشمنی ڈال دیتے تھے۔[2]

پھر اس امر کی مزید وضاحت اور تفصیل بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

> بعض دفعہ ان ظلموں کے ہنگاموں کی اس وجہ سے اشتعالک ہوتی تھی کہ سلطنت اسلامیہ میں جو عیسائی جلیل القدر مناصب پر فائز ہوتے تھے وہ جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا تھا، اپنے اختیارات کا ناروا استعمال کرتے تھے اور مسلمانوں پر ظلم کر کے سخت مخاصمانہ خیالات اپنی طرف کر لیتے تھے۔[3]

آرنلڈ ہی نے اسلام میں مذہبی آزادی کے حوالے سے ایک دوسرے مستشرق "دی گونیو" کا یہ اعتراف

---

[1] - حوالہ مذکور، ص:۳۲۳-۳۲۴

[2] - دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص:۸۲

[3] - حوالہ مذکور، ص:۸۳

نقل کیا ہے کہ:

اگر ہم اصول مذہب سے پولیٹیکل ضروریات کو دور کر دیں جنہوں نے مذہب کا بھیس لے کر اکثر زبان چلائی اور ہاتھ اٹھایا ہے تو اسلام کی مثل کوئی دوسرا مذہب نہیں جو ایسا صلح کل ہو اور جو غیروں کو اس قدر مذہبی آزادی دینے والا بلکہ ان کے ایمان سے مطلق بحث نہ رکھنے والا ہو۔ سوائے ایسی صورتوں کے کہ کسی سلطنت نے ملکی مصلحت سمجھ کر اپنی رعایا میں ہر طریقہ سے اسلام پھیلانا چاہا ہو۔ غیر مذہب کے لوگوں سے بحث نہ رکھنا مسلمانوں کی طبیعت کا ایسا خاصہ رہا کہ اسلام نے بدرجہ کمال مذہبی آزادی کے اصول کو ہمیشہ اپنا دستور العمل رکھا۔ ہم کو یہ نہیں چاہیے کہ محض ان ظلموں اور سختیوں پر اپنی توجہ کو محدود رکھیں جو کہیں کہیں پیش آئیں کیونکہ اگر ہم غور اور تجسس کی نظر سے دیکھیں گے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ صرف پولیٹیکل ضروریات یا محض کسی بادشاہ یا قوم کی خاص طبیعت اور مزاج کی وجہ سے یہ سختیاں ہوئیں۔ مذہب کو ایسے موقعوں پر صرف حیلہ بنایا گیا۔ مذہب کے احاطہ سے یہ ظلم بالکل خارج تھے۔[1]

عیسائیت کا مذہبی جبر و تشدد—ایک جھلک

مشہور مؤرخ سید امیر علی نے مذہب کے معاملے میں اسلام کی "عدم اکراہ" کی پالیسی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے تقابلی مطالعہ کے طور پر عیسائیت کی تعصب و تشدد پر مبنی پالیسی کی بھی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اور ایسے ایسے تشدد سے پردہ اٹھایا ہے جسے پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

اسلام نے صرف اپنے تحفظ کی خاطر تلوار نیام سے نکالی اور اپنے تحفظ ہی کی خاطر اسے اپنے ہاتھ میں رکھا، اور وہ ہمیشہ ایسا کرے گا۔ لیکن اسلام نے کبھی کسی مبنی بر اخلاق

---

[1] حوالہ سابق، ص:۳۲۴ (حاشیہ)

مذہب نے اعتقادات ویقینیات میں دخل اندازی نہیں کی، اس نے کبھی تشدد سے کام نہیں لیا، اس نے کبھی کوئی مجلس مواخذہ (Inquisition) قائم نہیں کی۔ اس نے اختلاف رائے کو دبانے، انسانی ضمیر کا گلا گھونٹنے یا بدعت کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی تعذیبی شکنجہ ایجاد نہیں کیا، نہ اس نے لوگوں کو کھونٹوں سے باندھ کر آگ میں زندہ جلایا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ عیسوی کلیسا نے دعویٰ تو کیا مطلق معصومیت کا لیکن تاریخ انسانی کے کسی اور ادارے سے بڑھ کر خون معصوماں بہایا۔ جس مرد یا عورت نے کلیسا سے انحراف کیا یا کسی اور مذہب کو عیسائیت پر ترجیح دی اسے ایسی سزا ملی جو اگر موت نہ تھی تو موت سے بہتر بھی نہ تھی۔ ۱۵۲۱ء میں چارلس پنجم نے تمام اہل بدعت کے لیے موت اور قرقی املاک کا فرمان جاری کیا۔ شرکت عشائے ربانی سے انکار کی عمومی سزا تھی آگ میں زندہ جلانا، پھانسی پر لٹکانا، زبان کا گدی سے نکال دینا۔ جب انگلستان نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا تو یکے بعد دیگرے متعدد حکمرانوں کے عہد میں پریسبٹرینوں (Presbyterians) کو قید کیا گیا۔ گرم لوہے سے داغا گیا۔ سکاٹ لینڈ میں وہ فراری مجرموں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑے گئے۔ ان کے کان جڑ سے کھینچ نکالے گئے۔ انہیں گرم لوہوں سے داغا گیا۔ انگلیاں مروڑنے کے آلے سے بھینچ کر ان کی انگلیاں توڑ دی گئیں، کالبوتوں کے اندر جکڑ کر ان کی ٹانگوں کی ہڈیاں چور چور کر دی گئیں۔ عورتوں کو سر بازار کوڑے لگائے جاتے تھے۔ کیتھولکوں کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اینبپٹیوں (Anabiptists) اور ایرینیوں (Arians) کو زندہ نذر آتش کیا گیا۔[1]

---

[1] ۔روح اسلام (اردو، ترجمہ)، ص: ۳۵۳-۳۵۴

سسلی (صقلیہ) میں مسلمانوں کی حکومت ۸۴۲ء سے لے کر ۱۰۷۲ء تک کوئی سو، دو سو سال تک قائم رہی۔ اس دوران مسلمانوں نے سسلی کو جس طرح سنوارا۔ معاشرتی و معاشی اعتبارات سے ترقی دی، اس کے تمدن کو جس طرح عروج پر پہنچایا، جس کمال عدل و انصاف سے حکومت کی اور جس مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے سید صباح الدین عبد الرحمن نے اسی سسلی میں ایک انگریز مؤرخ کے حوالے سے عیسائیوں کے مسلمانوں پر مذہبی تشدد، مذہبی عدم رواداری اور مذہبی عدم برداشت و تنگ ظرفی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> صقلیہ میں عربوں کی حکومت دو سو برس تک رہی۔ مگر عربوں میں جب آپس میں نفاق اور اختلاف پیدا ہوا تو نارمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ان سے جنگ کی۔ ۱۰۷۲ء میں عرب پلرموں کی لڑائی میں شکست کھا گئے، ان کو جس طرح تباہ کیا گیا وہ بھی ایک عیسائی مؤرخ کی زبانی سنیے۔ پلرموں میں پانچ سو مسجدیں تھیں، ان کو منہدم کر کے گرجا گھر میں تبدیل کر دیا۔ وہاں علماء، صوفیہ اور حکماء کی جتنی قبریں تھیں سب نیست و نابود کر دی گئیں، چارلس دوم کے زمانہ میں سسلی کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائیوں کا بپتسمہ دے دیا گیا۔ نوسیرا اور ایوسیرا کے مسلمانوں کی تعداد اسی ہزار تھی، ان کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا، ساری جگہیں مسلمانوں سے خالی کرا لی گئیں۔[1]

مسلمانوں نے اندلس میں جس شاندار اور مشفقانہ انداز میں حکومت کی۔ جس طرح خوبصورت شہروں کو بسایا۔ اندلس کو جس طرح صنعت و حرفت، علوم و فنون کا مرکز بنایا۔ جس طرح بڑی بڑی عجوبہ روزگار عمارتیں کھڑی کیں، تہذیب و تمدن کو جس معراج پر پہنچایا۔ کس طرح وہاں سڑکوں، پلوں، مسافر خانوں، شفاخانوں، مساجد، رصد گاہوں اور تعلیمی درسگاہوں کا جال بچھایا، اس کے برعکس عیسائیوں نے اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر کے جس طرح اندلس کو برباد کیا اور ہنستے بستے شہروں کو اجاڑ دیا اور وہاں کو

---

[1] اسلام میں مذہبی رواداری، دار الشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۳۳

مسلمانوں پر جو حد درجہ مظالم کیے ان کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں صرف ان کے مذہبی تعصب اور مذہبی عدم رواداری اور عدم برداشت کی ایک جھلک دکھانا مقصود ہے۔ چنانچہ صباح الدین موصوف ایک انگریز مؤرخ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

غرناطہ کے سقوط کے معنی ان تمام عربوں کی موت تھی جنہوں نے اسپین پر سات سو اکیاسی سال (۷۱۱ - ۱۴۹۲ء) تک حکومت کی، فرڈی ننڈ سے معاہدہ تو ضرور ہو گیا لیکن اس پر عمل کرنے کا اس کا مطلق ارادہ نہ تھا، اس نے غرناطہ پر قبضہ کر لیا، یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا، وہ اپنی سیاسی زندگی میں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہر چیز کو قربان کر سکتا تھا، اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ عربوں کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے مذہب اور طرز زندگی کو ترک کر کے یہاں کے باشندوں میں ضم ہو جائیں، وہ اپنے مذہبی قوانین میں تبدیلی اس طرح کرتا رہا کہ سارے مسلمان کیتھولک بن کر رہیں، پہلے اس نے یہودیوں کی خبر لی، انہوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تو ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، ان کو سولی پر چڑھایا گیا، یہ اس لیے بھی کیا گیا کہ عرب اس سے سبق سیکھیں کہ انہوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا تو ان کے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا جائے گا، مسلمانوں پر عبادت کرنے پر پابندی عائد کی گئی پھر وہ کھل کر اس اعلان کے ساتھ سامنے آ گیا کہ وہ مسلمان جو عیسائیت قبول نہ کریں وہ دربدر کر دیئے جائیں، غرناطہ میں کہرام مچ گیا مگر کوئی سماعت نہیں ہوئی، مسلمان گرجا جاتے، عیسائیوں کی عبادت کرتے مگر گھر آ کر توبہ استغفار کرتے، الپوزارس کے پہاڑی قبیلہ والے مسلمان عیسائی ہونے سے انکار کر کے بغاوت پر آمادہ ہوئے تو فرڈی ننڈ ایک بڑے لشکر کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا، اس کی سرزمین کو تباہ و برباد کر دیا، اس کی ساری چیزیں

ضبط کرلیں اوران کو جلاوطن ہونے کا حکم دیا۔[1]

عقیدہ ومذہب کی آزادی اور مرتد کو قتل کیے جانے کا اشکال

اگر کوئی عاقل آدمی اپنی مرضی اور اختیار سے کسی قسم کے جبر واکراہ کے بغیر جیسا کہ اوپر گزرا، جب ایک مرتبہ اسلام قبول کرلے پھر اپنے اختیار سے نہ کہ جبر سے احکام اسلام سے آگاہ ہونے کے باوجود اعتقادی، قولی یا عملی طور پر ارتداد (اسلام سے رجوع کرنے) کا مرتکب ہو اور قانونی طور پر اس پر یہ جرم ثابت ہو جائے اور حکومت کی طرف سے اس کے شکوک وشبہات دور کیے جانے اور موقعہ اور مہلت دیے جانے کے باوجود ارتداد سے توبہ نہ کرے (جس کی تفصیلات کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں) تو اسلام میں ایسے آدمی جسے اصطلاح میں مرتد کہا جاتا ہے، کی سزا قتل ہے۔[2] دوسرے غیر مسلم شہریوں/ذمیوں کی طرح اس سے جزیہ وصول کرکے اس کے جان ومال کا تحفظ (جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزرچکی ہے) دے کر اسے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جائے گا۔ اس کے لیے ایک ہی حکم ہے۔ ارتداد سے توبہ کرکے دوبارہ اسلام قبول کرلینا یا قتل ہونے کے لیے تیار ہو جانا۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ مرتد سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کیا ہے لہذا اس کی طرف سے اسلام یا تلوار کے علاوہ کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔[3] پیغمبر اسلام ﷺ کا صریح ارشاد ہے:

1۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، اسلام میں مذہبی رواداری، ص: ۱۴۸-۱۴۹

2۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرغینانی، ہدایہ، (کتاب السیر باب احکام المرتدین)، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ۲/۵۸۴؛ کاسانی، بدائع الصنائع (اردو ترجمہ)، ۷/۲۹۰-۲۹۲؛ ابن عابدین، حاشیہ ردالمحتار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۲۲۵/۴ ومابعد؛ الجزیری، عبدالرحمن، کتاب الفقہ (اردو ترجمہ از منظور احسن عباسی) علماء اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ۵/۵۳۱؛ حصکفی، علاؤالدین، الدر المختار شرح تنویر الابصار، المطبعۃ العامرۃ الملیجیۃ مصر، ت۔ن، ۲/۱۱۳-۱۱۴

3۔ ابن عابدین، حاشیہ ردالمحتار، طبع مذکور، ۴/۲۴۷؛ کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/۱۲۳-۱۲۵؛ فتاوی عالمگیری، ۲/۲۵۷؛ مرغینانی، ہدایہ، ۲/۵۸۵؛ عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستامنین، ص: ۱۵-۱۶

من بدل دینه فاقتلوه۔[1]

جو آدمی (مسلمان) اپنا دین تبدیل کرے تو اسے قتل کر دو۔

جبکہ موطا امام مالک میں یہ حکم ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ:

من غیر دینه فاضر بوا عنقه۔[2]

جو (مسلمان) آدمی اپنے دین کو تبدیل کرے تو اس کی گردن مار دو۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اسلام دین اور مذہب و عقیدہ کے معاملے میں گزشتہ تصریحات کے مطابق، جبر و اکراہ کا قائل نہیں اور دوسری طرف مرتد آدمی کو آزادی مذہب کا حق دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" سے مراد دین اسلام قبول کرنے میں عدم اکراہ ہے نہ یہ کہ قبول اسلام کے بعد بھی جو چاہے اسلام میں رہے اور جو چاہے اسلام چھوڑ دے اور اس پر اسے کوئی سزا نہ دی جائے۔ اس چیز کی تائید مذکورہ آیت کے شان نزول سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مفسرین نے آیت ہذا کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ حصین نامی انصار کے قبیلہ بنی سالم کا ایک شخص خود مسلمان ہو گیا لیکن اس کے دو نصرانی بیٹوں نے اسلام قبول نہ کیا تو اس نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

الا استکرههما فانهما قد ابیا الا النصرانیة فانزل الله تعالیٰ فیه ذالک۔[3]

کیا میں انہیں اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ نصرانیت پر مصر ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

---

[1] - ابن ماجہ، السنن، (ابواب الحدود باب المرتد عن دینہ) نور محمد کراچی، ص:۱۸۲، رقم: ۲۵۳۵

[2] - مالک، امام، موطا، (کتاب الاقضیہ باب القضاء فیمن ارتد عن الاسلام) میر محمد کتب خانہ کراچی، ص:۶۳۹

[3] - آلوسی، بغدادی، روح المعانی، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ت۔ن، ۱۳/۳

جبکہ ایک روایت کے مطابق انصار کے بعض بچے نصرانی اور بعض یہودی تھے۔ ان کے والدین نے انہیں اسلام لانے پر مجبور کرنا چاہا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔[1] شاید یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے ایمان لانے کے بعد زبان پر کلمہ کفر کے جاری ہونے کو ارتداد کا رکن قرار دیا ہے۔[2] اگر کوئی غیر مسلم یہودی یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لے تو وہ اصطلاح میں مرتد نہیں کہلائے گا اور نہ اس کے لیے شریعت میں کوئی حد مقرر ہے۔ علاوہ ازیں اگر لوگوں کو دین حق اسلام قبول کر لینے کے بعد اگر اس بات کی چھٹی دے دی جائے کہ جب ان کا جی چاہے وہ اس واحد دین حق کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے باطل دین کو اختیار کر سکتے ہیں تو مفاد پرست فتنہ پرور اور شر پسند لوگ دین کو مذاق بنا لیں۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

> ارتداد کی سزا قتل مقرر کرنے کا مقصد دین کی ہتک کا دروازہ بند کرنا اسلام کا اجتماعی نظام قائم رکھنا اور مرتد کے شر سے دوسرے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا ہے۔[3]

زیر بحث مسئلے میں بعض لوگوں کو درپیش الجھن یا اشکال کی وجوہ اور ان کا جواب بیان کرتے ہوئے مولانا سید مودودی نے لکھا ہے:

> سوم یہ کہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ مسلم سوسائٹی ہی وہ چٹان ہے جس پر اسلامی ریاست کا قصر تعمیر ہوتا ہے اور اسی چٹان کے استحکام پر ریاست کے استحکام کا پورا انحصار ہے۔ آخر دنیا میں وہ کونسی ریاست ہے جو اپنے اندر خود اپنی تخریب کے اسباب ووسائل کو پرورش کرنا یا گوارا ہی کرنا پسند کرتی ہو؟ ہم اپنی حد تک اپنی ریاست

1- اندلسی، ابن حیان، تفسیر البحر المحیط، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، ۲ / ۳۵۱؛ جصاص، احکام القرآن، ۲ / ۱۶۸

2- کاسانی، بدائع الصنائع، ۷ / ۳۴۰

3- حجۃ اللہ البالغہ، نور محمد کراچی، ت۔ن، ۲ / ۳۶۷

کی بنیادی چٹان کے ہر ذرے کو چٹان سے بدل و جان وابستہ رکھنے کی پوری کوشش کریں گے پھر بھی اگر کوئی ذرہ ایسا نکل آئے جو علیحدگی کو ہی ترجیح دیتا ہو تم ہم اس سے کہیں گے کہ تمہیں علیحدہ ہونا ہے تو ہمارے حدود سے باہر نکل جاؤ ورنہ یہاں ہم تمہیں دوسرے ذروں کی پراگندگی کا سبب بننے کے لیے آزاد نہ چھوڑیں گے۔[1]

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک "لا اکراہ فی الدین" میں "جبر فطری" کی نفی ہے۔ "جبر قانونی" کی نہیں۔ اس چیز کی وضاحت میں موصوف لکھتے ہیں:

اس امر میں شبہ نہیں کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو۔ بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود و قیود کی پابندی کرے۔۔۔۔ ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا اسلام میں دی جاتی ہے وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔[2]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ارتداد کو "سیاسی غداری" قرار دیتے ہوئے مرتد کے قتل کو سیاسی غداری کی سزا سے تعبیر کیا ہے۔ خطبات بہاولپور میں ایک سوال (غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا؟ "لا اکراہ فی الدین" (۲:۲۵۶) کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟) کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] - اسلامی ریاست، ص: ۴۸۸

[2] - تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱/ ۵۹۳-۵۹۴

اس بارے میں میرا شخصی ردعمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں، اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور Islamic Community کے اندر آنے پر جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔[1]

مرتد کی سزا "قتل" کے عقلی طور پر جائز ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر القادری نے لکھا ہے:

وہ مسلمان جو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے اس کا معاملہ اقلیتوں سے مختلف ہو گا۔ اگر کوئی مسلمان احکام اسلام کا پابند ہونے اور اس کے عقیدہ پر ایمان لانے کے بعد اگر اس سے پلٹتا ہے تو وہ گویا اس ارتداد سے فتنہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور مملکت سے بغاوت کرتا ہے جو موجب سزا ہے، اس لیے کہ وفائے عہد سے برگشتگی ملکی قانون سے بغاوت اور بہت بڑا جرم ہے اور یہ امر دور جدید کے قانون میں بھی معروف و متعین ہے جس کی سزا اکثر ریاستی قوانین میں موت مقرر کی گئی ہے۔[2]

---

[1] - خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ص:۳۱۷، (خطبہ نمبر ۱۲)

[2] - اسلام میں انسانی حقوق، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۵۳۷

دوسری فصل

غیر مسلموں کے لیے عقیدہ ومذہب کی آزادی-چند تاریخی نظائر

ہر آدمی کے لیے عقیدہ و مذہب کی آزادی جیسا کہ اس باب کی پہلی فصل میں گزرا، اسلام کے بنیادی اور امتیازی اصولوں میں سے ہے۔ فطرت انسانی اس حق کو تسلیم کرتی ہے اور جابر معاشروں میں بھی سلیم الفطرت لوگ اس مسلمہ انسانی حق کو ثابت مانتے آئے ہیں۔ صدر اسلام میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے غیر مسلم معاشرے میں اسی فطری حق کی بنیاد پر آزادی اختیار مذہب کا مطالبہ کیا تھا اور قرآن مجید نے کفار مکہ کے مذہبی جبر اور فتنہ کو ہی وہ عظیم ظلم بتایا تھا جس کی بنیاد پر ان سے جنگ کی جارہی تھی۔ اسی بنیاد پر اسلام ہر زمانے میں دنیا کے ہر معاشرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فطری انسانی حق بہر حال محفوظ رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو دوسرے تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے اور انہیں باطل ادیان و افکار اور گمراہی پر مبنی طریق زندگی سے روکنے کی کھلی آزادی ہونی چاہیے۔ جب مسلمان دوسری ملتوں اور معاشروں سے اس آزادی کے طلبگار ہیں تو یقیناً انصاف کا تقاضا تھا کہ ان کا دین خود سب سے پہلے اعلان کرتا:

"لا اکراہ فی الدین" (دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں)۔[1]

اسی اصول کے پیش نظر اسلام نے اپنی حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلم / اہل الذمہ شہریوں کی جان ومال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے علاوہ مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی ہے۔ ان کو اپنے مذہب کے مطابق عقائد رکھنے، عبادت کرنے، مذہبی رسومات بجالانے اور اپنے عقیدہ کے مطابق بود و باش کے طریقے اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہم آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے

---

[1] - مولانا یحیٰ نعمانی، مقالہ "اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری-ذمی" سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علیگڑھ انڈیا، شمارہ جنوری-مارچ ۲۰۱۱ء، ص:۵۸-۵۹

پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے حقوق میں مذہبی آزادی کا حق بڑی اہم اور معرکۃ الآراء بحث ہے۔ مغرب کے متعصب مفکرین و مستشرقین جن مسائل میں اسلام کو مطعون اور ہدف تنقید بناتے ہیں، ان میں ایک مسئلہ اسلامی ریاست کے اندر ذمیوں کی مذہبی آزادی کا بھی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

> یورپ میں جس گروہ نے اسلام کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنا رکھا ہے، ان کی حوصلہ آزمائی کا بڑا جولانگاہ یہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی بالکل نہیں ہے اور قدیم اسلامی حکومتوں نے غیر قوموں کے مذہبی حقوق بالکل پامال کر دیے تھے۔ لیکن ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے تمام دنیا کی قوموں کو جس حد تک مذہبی آزادی دی کبھی کسی قوم نے نہیں دی، نہ اب دینے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یورپ دو سو برس پہلے تو مذہبی آزادی کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔ آج بے شبہ اس کو یہ دعویٰ ہے مگر کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کو خود مذہب کی پروا نہیں رہی۔ بے شبہ یورپ گرجا اور مسجد کے جھگڑے میں انصاف کا پلہ برابر رکھتا ہے۔ لیکن اگر ایک سڑک اور مسجد کا معاملہ پیش آ جائے تو مسجد بے تکلف برباد کر دی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس فیاضی پر ناز ہے وہ مذہبی آزادی کا نہیں بلکہ مذہبی بے پروائی کا اثر ہے۔[1]

مذاہب کی تاریخ میں اسلام کے خلاف اہل یورپ کا مذکورہ دعویٰ محض تعصب پر مبنی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی حکومتوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو جس حد تک مذہبی آزادی عطا کی کسی قوم و مذہب نے نہیں دی۔ آج کا لبرل ذہن اور مذہب دشمن عناصر کی براجمانی کے سبب مذہب کے تحفظ کو بنیادی حقوق (Fundamental Rights) میں شامل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ آزادی اظہا

1۔ مقالات شبلی (مذہبی)، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۳۴۹ھ، ص: ۲۰۱

رراۓ (The freedom of press) کے نام پر مذہب کا خون کرنے اور اس کا جنازہ نکالنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، لیکن اہل اسلام کو جس طرح ہر چیز سے زیادہ اپنے مذہب کا تحفظ عزیز ہے اسی طرح وہ اپنی ریاست میں آباد غیر مسلم شہریوں سے ہمدردی کے طور پر ان کے مذہب کا تحفظ بھی اپنا شرعی اور اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اس دعویٰ کا ثبوت آئندہ سطور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / اہل الذمہ کی مذہبی آزادی کے حوالے سے اسلام کا مستقل قاعدہ یہ ہے کہ "نترکھم و مایدینون"[1] (ہم انہیں اور وہ جو بھی دین و مذہب رکھتے ہیں، اسے چھوڑ دیں گے) یعنی ان کے مذہبی عقائد و افکار کے معاملے میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اصولی طور پر عقد ذمہ میں یہ بات داخل ہے اور اسلامی ریاست نے اس بات کو تسلیم کیا اور اس کی ضمانت دی ہے کہ غیر مسلم جزیہ کی ادائیگی اور انتظامی معاملات میں اسلامی قوانین کی پابندی کے عہد کے بدلے اپنے کفریہ عقائد اور اپنے دین و مذہب پر قائم رہیں گے۔ عقد ذمہ کے ذریعے اسلام نے انہیں اپنے عقیدہ و مذہب پر قائم رہنے کی کیوں اجازت دی؟ اس کے اندر شرعاً کیا مصلحت ہے؟ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔[2] اسلام نے مذہبی آزادی کا یہاں تک خیال رکھا ہے کہ غیر مسلموں کی مذہبی دل آزاری سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔[3]

یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ

---

[1] ۔مرغینانی، ہدایہ (کتاب الوصایا باب وصیۃ الذمی) ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۸/ ۳۱۴؛ حصکفی، الدر المختار (مع حاشیہ رد المختار) مطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق، مصر، ۱۳۲۴ھ، ۳/ ۲۸۰

[2] ۔دیکھیے: سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۳/ ۲۴۹۔۲۵۰؛ کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/ ۱۱۱

[3] ۔الانعام، ۶: ۱۰۸

عداوت میں بغیر علم کے اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

اسی طرح کبھی مذہبی بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ان کے مذہبی جذبات مجروح کرنے سے منع فرمایا گیا۔ ارشاد ہوا:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔[1]

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن (مہذب) طریقہ سے۔

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / ذمیوں کو اسلام نے کس قدر مذہبی آزادی دی ہے۔ اس کا اندازہ عہد نبوی کے درج ذیل چند نظائر یا معاہدوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

میثاق مدینہ اور یہود کے لیے مذہبی آزادی کا اعلان

نبی اکرم ﷺ اہل مکہ مکرمہ کے حد درجہ مذہبی تعصب و تشدد سے مجبور ہو کر (اس کی تفصیل کا یہ مقام متحمل ہے نہ موضوع سے متعلق ہے) ہجرت فرما کر مدینہ منورہ پہنچے تو یہاں مشرکین مکہ سے زیادہ مجرم اور اسلام مخالف دشمن یہودی موجود تھے، جن کی اسلام دشمنی پر قرآن مجید جیسی الہامی کتاب گواہ ہے۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ اور داعی امن نے ان کی طرف بھی صلح کا ہاتھ بڑھایا اور اسلامی ریاست کے باضابطہ اور باقاعدہ قیام سے قبل آپ ﷺ نے کمال سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہود مدینہ اور دیگر قبائل سے ایک تحریری معاہدہ فرمایا جو کتب سیرت میں "میثاق مدینہ" (Madina Pact) کے عنوان سے درج ہے۔[2]

---

1 العنکبوت، ۲۹:۴۶

2 اس معاہدہ کا تذکرہ سیرت طیبہ اور تاریخ کی مستند کتابوں مثلاً سیرۃ النبی لابن ہشام، البدایہ والنہایہ لابن کثیر، تاریخ طبری اور کتاب الاموال وغیرہ میں موجود ہے۔ مگر اس پر انتہائی تحقیقی انداز میں بڑی گہرائی اور باریک بینی سے روشنی نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی معروف کتاب "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" میں "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" کی جلی سرخی قائم کرتے ہوئے اس معاہدہ کی تاریخی اہمیت، قانونی حیثیت، سیاسی

اس معاہدہ میں اختلاف عقائد کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی امن و آشتی سے ساتھ مل جل کر رہنے اور باہمی تعاون و اعتماد کی فضا پیدا کرنے کو دی گئی ہے۔ معاہدہ میں درج دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اپنے مخالفوں اور شدید دشمنوں تک سے باہمی صلح کرنے کو تیار ہوتا ہے بشرطیکہ اصولوں پر حرف نہ آتا ہو۔ بہر کیف اس معاہدہ میں یہودیوں کو جہاں بعض سیاسی معاشی، دفاعی شرائط اور دیت وتاوان وغیرہ کے معاملے میں پابند بنایا گیا جس کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ہو گی، وہاں انہیں دیگر حقوق کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ زیر بحث مذہبی آزادی کا حق بھی دیا گیا۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ ہیں:

للیہود دینھم وللمسلمین دینھم۔[1] (یہود کے لیے ان (یہود) کا دین اور مسلمانوں کے لیے ان (مسلمانوں) کا دین ہو گا۔)

یہ معاہدہ رسول اللہ ﷺ کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی وہ مثال ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ اس تاریخی معاہدہ پر مشہور عرب مؤرخ و ادیب محمد حسین ہیکل کا تبصرہ قابل ملاحظہ

ضرورت اور معاشرتی پس منظر کی تفصیلات بتائی ہیں۔ اس کی تمام دفعات کا تجزیہ کیا ہے۔ حدیث سیرت اور تاریخ کے علاوہ یورپی زبانوں میں اس معاہدے کے مستند مآخذ کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ معاہدہ کل باون دفعات پر مشتمل تھا جن کی تفصیل یہاں مطلوب نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، نگارشات پبلشرز لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۶۷تا۸۹

نوٹ: ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی دوسری تصنیفات مثلاً مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، خطبات بہاولپور اور The first written constitution in the world وغیرہ میں بھی اس معاہدہ پر عمدہ بحث کی ہے۔

[1] - اس دفعہ اور معاہدہ کی دیگر دفعات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ (کتابہ ﷺ بین المھاجرین والانصار وموادعۃ یہود) دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ت۔ن، القسم الاول، ص: ۵۰۱ تا ۵۰۴؛ ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال، مؤسسۃ ناصر للثقافۃ، ۱۹۸۱ء، ص: ۹۱ (پیرہ نمبر ۵۱۸)؛ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۲ء، ۳/۲۳۹؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۱۴۰۱ (اشاعت اول)، ص: ۱۷۸؛ ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات، (وثیقہ نمبر ۱)، ص: ۱۹-۲۴

ہے۔ فرماتے ہیں:

هذه هي الوثيقة السياسية التي وضعها محمد منذ الف وثلاثمأة وخمسين سنة. والتي تقرر حرية العقيدة وحرية الرأي وحرمة المدينة وحرمة الحياة وحرمة المال وتحريم الجريمة۔[1]

یہ وہ سیاسی معاہدہ ہے جس کی بدولت حضرت محمد ﷺ نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل یک ایسا ضابطہ انسانی معاشرہ میں قائم کیا جس سے شرکاء معاہدہ میں ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے عقیدہ و رائے کی آزادی ملی، مدینہ منورہ، زندگی اور مال کی حرمت قائم ہوئی اور جرم کا حرام ہونا ثابت ہوا۔

اسی طرح مولانا حامد انصاری اس معاہدہ میں دی گئی مذہبی آزادی کی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہودیوں کے ساتھ مذہبی رواداری، آزادی اور ان کے حقوق کے تحفظ کی یہ تاریخ ساز دستاویز اور اس کی دفعات اپنی حقیقت پر آپ گواہ ہیں۔ مذہبی رواداری، امن و سلامتی، آزادی اور انصاف کا ہر جوہر اس میں موجود ہے۔[2]

جبکہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی اس معاہدہ میں غیر مسلموں کو دیے گئے حقوق پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

As this was the first political agreement between Muslims and non Muslims, which would clearly give an idea of the rights of non-Muslims in an Islamic State.[3]

یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پہلا سیاسی معاہدہ تھا جو ایک اسلامی ریاست میں واضح

---

[1] - حیاۃ محمد، مطبعۃ النہضۃ المصریۃ، القاہرہ، ص: ۲۲۷

[2] - اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۶۳

[3] - The Life of Muhammad, Islamic Publications, Lahore, 1997, P:141

طور پر غیر مسلموں کے حقوق کا نظریہ دیتا ہے۔

کوئی باون دفعات پر مشتمل اس دستور مملکت میں ایک مستقل سیاسی جماعت یا "امۃ" (امة واحدة من دون الناس) کے قیام کا ذکر ہے جو مسلم و غیر مسلم رعایا پر مشتمل تھی۔ پھر راعی اور رعایا کے حقوق و فرائض، عدل گستری، ظلم کے خاتمہ، مذہبی آزادی، بیرونی علاقوں سے صلح و جنگ اور غیر مسلم رعایا کے حقوق و فرائض اور ان تمام دیگر سیاسی و معاشرتی مسائل کا حل بتایا گیا ہے جن کی اس وقت ریاست مدینہ کو ضرورت تھی۔

شاہانِ حمیر کو مذہبی آزادی کی یقین دہانی

شاہان حمیر (یمن) الحارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور النعمان کی طرف سے ان کے اسلام قبول کر لینے کی اطلاع پر نبی رحمت ﷺ نے انکی طرف ایک طویل مکتوب ارسال فرمایا جس میں انہیں اسلام کے بنیادی ارکان اور احکام و فرائض سے مطلع کیا گیا۔ اس میں مذہبی آزادی کے حوالے سے آنجناب ﷺ نے یہ بھی تحریر فرمایا:

وانه من اسلم من يهودي او نصراني فانه من المؤمنين له ما لهم وعليه ما عليهم ومن كان على يهوديته او نصرانيته فانه لا يرد عنها وعليه الجزية۔۔۔۔ فان له ذمة الله وذمة رسوله۔[1]

بے شک جو یہودی یا نصرانی اسلام قبول کر لے تو بلاشبہ وہ مؤمنین میں سے ہے۔ اس کے لیے وہی حقوق و مراعات ہیں جو تمام مؤمنوں کے لیے ہیں اور اس پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو دوسرے مؤمنوں پر عائد ہیں اور جو آدمی اپنی یہودیت (یہودی مذہب) یا اپنی نصرانیت (نصرانی مذہب) پر قائم رہنا چاہے تو اسے جبر کے ذریعے

[1] ۔ دیکھیے: ابن اسحاق، السیرۃ النبویۃ، ۲/۶۵۸-۶۵۹؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبہ الحقانیہ، پشاور، ۵/۸۰-۸۱

اپنے مذہب سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ البتہ اس پر (اس کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے) جزیہ عائد ہو گا۔۔۔۔۔۔بے شک اس کے لیے اللہ اوراس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے۔

نجران کے عیسائیوں کے لیے مذہبی آزادی کی تحریر

یہود مدینہ سے مذکورہ معاہدہ (میثاق مدینہ) اس وقت ہوا جب مسلمان سیاسی اعتبار سے کمزور تھے مگر نجران کے عیسائیوں سے جو زیر نظر معاہدہ آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس وقت ہوا جب مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار تھا اور فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے ہی مواقع پر ظلم کا دروازہ کھلتا ہے۔ طاقتور کمزور کو صرف اپنا باجگزار ہی نہیں بناتا بلکہ ہر طرح سے اس کا استحصال اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام ﷺ نے اس معاہدہ کے ذریعے اہل نجران کو جو حقوق دیے اور جس نرمی و رعایت کا مظاہرہ کیا، اس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہر کیف زیر بحث موضوع کے حوالے سے عہد نبوی میں اہل الذمہ کو حاصل مذہبی آزادی کا ایک ثبوت نجران کے عیسائیوں کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ تاریخی معاہدہ ہے۔ جسے الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ امام ابو یوسف، ابو عبید قاسم بن سلام، ابن قیم، ابن سعد اور بلاذری جیسے کبار فقہاء و مورخین رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔

اس معاہدہ میں عیسائیوں کو دی گئی مذہبی آزادی کی دفعات کے اندراج سے قبل زیر بحث موضوع کے حوالے سے مذہبی رواداری کا یہ ایمان افروز واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ نجران کے بڑے بڑے عیسائی راہبوں پر مشتمل وفد جو بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے ۹ھ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے آیا تھا آپ ﷺ نے انہیں مسجد نبوی میں اتارا۔ کچھ دیر بعد ان کی نماز عصر کا وقت ہوا تو وہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ موجود صحابہ کرام نے انہیں روکنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دعوھم (انہیں چھوڑ دو۔ یعنی نماز پڑھنے دو) چنانچہ انہوں نے مشرق کی طرف رخ کیا اور اپنے طریقے

کے مطابق نماز ادا کی۔[1]

بہر کیف نبی رحمت ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو جو تحریری معاہدہ لکھ کر دیا۔ وہ مسلمان حکمرانوں کے لیے غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک کے بارے میں ایک ہدایت نامہ ہے۔ اگر کسی فرمانروا نے اس سے انحراف کیا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ فرمانروا ہے نہ کہ اسلام۔ بہر کیف اس معاہدہ میں نجران کے عیسائیوں کو بالکل معمولی جزیہ (سالانہ دو ہزار یمنی حلے وہ بھی دو قسطوں میں) کے عوض جان و مال کے تحفظ کی تحریری یقین دہانی اور دیگر ضروری حقوق کے ساتھ مذہبی آزادی کی ضمانت درج ذیل الفاظ میں دی گئی۔

وان لا يغيروا مما كانوا عليه ولا يغير حق من حقوقهم ولا ملتهم ولا يغير اسقف من اسقفيته ولا راهب من رهبانيته الخ۔[2]

اس وقت ان کی جو حیثیت ہے وہ برقرار رکھی جائے گی۔ نہ ان کے کسی حق میں تغیر کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب میں دخل اندازی کی جائے گی۔ (مؤرخ بلاذری نے یہاں مزید واضح الفاظ لکھے ہیں: وان لا يفتنوا عن دينهم۔ انہیں اپنے دین سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا) نہ ان کے کسی پادری کو اس

---

[1] - دیکھیے: ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱/ ۱۷۲؛ ابن قیم الجوزیہ، زادالمعاد فی ہدی خیر العباد، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، لبنان، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء، ۳/۶۲۹؛ ابن کثیر، سیرۃ النبی (اردو ترجمہ از مولانا ہدایت اللہ ندوی) مکتبہ قدوسیہ اردو بازار، لاہور، ۲/ ۵۶۲؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دارلمعرفۃ، بیروت، ۵/ ۶۰-۶۱؛ السبکی، فتاوی السبکی، دارالمعرفۃ بیروت، ۲/ ۳۷۸

[2] - ان دفعات اور معاہدہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: امام ابو یوسف، کتاب الخراج (مشمولہ در کتاب موسوعۃ الخراج) دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص:۷۱؛ بلاذری، احمد بن یحییٰ، فتوح البلدان، دارالکتب العلمیہ بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء، ص:۷۵-۷۶؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱/ ۱۷۲؛ ابو عبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال (اردو ترجمہ) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص:۲۸۶ (پیرہ نمبر ۵۰۲)؛ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، طبع مذکور، ۳/ ۶۳۴-۶۳۵؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، طبع مذکور، ۵/ ۶۰؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (وثیقہ نمبر ۹۴) ص ۹۶-۹۸

کے مقام سے ہٹایا جائے گا اور نہ کسی راہب سے اس کی رہبانیت کے معاملے میں تعرض کیا جائے گا۔

امام بیہقی نے معاہدہ نجران کی جو تفصیل بیان کی ہے۔ اس میں مذہبی آزادی کے حوالے سے یہ دفعات بھی شامل تھیں کہ

ان لا تهدم لهم بيعة ولا يخرج لهم قس ولا يفتنون عن دينهم ما لم يحدثوا احدثا او يأكلوا الربا۔[1]

ان کا کوئی گرجا نہیں گرایا جائے گا نہ ان کے کسی عالم و مذہبی پیشوا کو نکالا جائے گا اور نہ انہیں ان کے دین سے برگشتہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے معاہدہ ٹوٹ جائے یا وہ سود کھانا شروع کر دیں۔ نجران کے وفد کو مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی اجازت دینے کی درج بالا روایت کے تحت ابن قیم نے یہ استنباط کیا ہے کہ:

فيه جواز دخول اهل الكتاب مساجد المسلمين۔۔۔ وتمكين اهل الكتاب من صلاتهم بحضرة المسلمين وفي مساجدهم ايضاً اذا كان عارضاً ولا يمكنون من اعتياد ذالك۔[2]

اس واقعہ میں اہل کتاب کے مسلمانوں کی مساجد میں داخل ہونے کا جواز پایا جاتا ہے۔۔۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی موجودگی میں ان کی مساجد کے اندر اہل کتاب کا اپنی نماز پڑھنا بھی جائز ہے جبکہ یہ چیز عارضی اور وقتی طور پر ہو۔ البتہ انہیں اس چیز کو عادت بنا لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اہل یمن کے لیے مذہبی آزادی کا پروانہ

مشہور صحابی حضرت عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں:

1۔ بیہقی، السنن الکبری، دار الفکر، بیروت۔ لبنان، ۱۴/ ۴۳؛ السبکی، فتاوی السبکی، دار المعرفۃ، بیروت، ۲/ ۳۷۷

2۔ ابن قیم، زاد المعاد، طبع مذکور، ۳/ ۶۲۹

كتب رسول اللهﷺ الىٰ اهل اليمن انه من كان علىٰ يهودية او نصرانية فأنه لا يفتن عنها وعليه الجزية۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو لکھا کہ بے شک جو آدمی یہودیت یا نصرانیت پر حسب سابق قائم رہنا چاہتا ہے تو وہ بے شک اپنے دین پر قائم رہے۔ اسے اپنے دین کے معاملے میں آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔ البتہ اسے جزیہ ادا کرنا ہو گا۔

سینٹ کیتھرائن کے راہبوں کے لیے مذہبی آزادی کی سند

مشہور مؤرخ سید امیر علی نے کسی متعین حوالہ و ماخذ کے بغیر صرف مؤرخین اسلام (Annalists of Islam) کے حوالے سے پیغمبر اسلام ﷺ کے عیسائی راہبوں سے کیے گئے ایک معاہدہ کا ذکر کیا ہے۔ جو اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی اور دیگر حقوق کے لیے ایک مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ چنانچہ سید موصوف نے اپنی مشہور کتاب "The Spirit of Islam" کے چھٹے باب کے شروع شروع میں مضافات مدینہ میں بنی فزارہ کی ڈاکہ زنی کے واقعہ کے بعد لکھا ہے:

> اسی زمانہ کے لگ بھگ آنحضرت ﷺ نے سنائی کے قریب واقع راہب خانہ سینٹ کیتھرائن (St. Catherine) کے راہبوں کو، بلکہ سارے عیسائیوں کو ایک سند نامہ حقوق (Charter) عطا فرمایا۔ جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ دنیا کی تاریخ روشن خیالی اور رواداری کی جو اشرف ترین یادگاریں پیش کر سکتی ہے، یہ ان سب میں سے ایک ہے۔ یہ دستاویز جسے مؤرخین اسلام نے حرف بحرف قلمبند کیا، وسعت نظر اور آزادی خیال کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس دستاویز کی رو سے عیسائیوں کو چند ایسی استثنائی مراعات حاصل ہوئیں جو انہیں اپنے ہم مذہب حکمرانوں

---

[1] ۔ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص: ۱۹ (پیرہ نمبر ۶۶) نیز بیہقی، السنن الکبریٰ (کتاب الجزیہ) ۱۴/۲۷، رقم الحدیث: ۱۹۱۸۷ - ۱۹۱۸۸

کے تحت بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان کر دیا کہ اس دستاویز میں جو احکام مندرج ہیں اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا یا ان سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا تو اسے معاہدہ الٰہی سے روگردانی کرنے والا، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا اور اس کے دین کی تذلیل کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے عیسائیوں کی حفاظت، ان کے گرجاؤں اور ان کے پادریوں کے مکانوں کی پاسبانی اور انہیں ہر طرح کے گزند سے بچانے کی ذمہ داری اپنی ذات پر بھی اور اپنے متبعین پر بھی عائد کی۔ عیسائیوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ان پر کوئی ناجائز ٹیکس نہ لگائے جائیں گے۔ ان کا کوئی پادری اپنے علاقہ سے نہ نکالا جائے گا۔ کسی عیسائی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہ کیا جائے گا اور کسی زائر کو سفر زیارت سے نہ روکا جائے گا۔ ان کو اس بات کی بھی ضمانت دی گئی کہ مسجدیں یا مسلمانوں کے رہنے کے مکان بنانے کے لیے کوئی گرجا مسمار نہ کیا جائے گا۔ جن عیسائی عورتوں نے مسلمانوں سے شادی کر رکھی تھی، انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کی مجاز ہوں گی اور اس بارہ میں ان پر کوئی جبر واکراہ نہ کیا جائے گا۔ اگر عیسائیوں کو اپنے گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے یا اپنے مذہب کے کسی اور امر کے بارے میں امداد کی ضرورت ہو گی تو مسلمان انہیں امداد دیں گے۔ اس امداد کو ان کے مذہب میں شریک ہونے سے تعبیر نہ کیا جائے گا بلکہ اسے حاجت مندوں کی حاجت براری اور خدا اور رسول ﷺ کے ان احکام کی اطاعت سمجھا جائے گا جو عیسائیوں کے حق میں صادر کیے گئے تھے۔ اگر مسلمان کسی بیرونی عیسائی طاقت سے برسر جنگ ہوں گے تو مسلمانوں کی حدود کے اندر رہنے والے

کسی عیسائی سے اس کے مذہب کی بنا پر حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی سے ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ رسول ﷺ کی نافرمانی کا مرتکب ہو گا۔[1]

اس سند نامہ میں عیسائیوں کو جتنی مذہبی آزادی اور جتنے حقوق دیے گئے ہیں اور جس رواداری اور وسعت ظرفی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ بلا مبالغہ دنیا کا کوئی بھی مذہب اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

عہد فاروقی میں معاہدہ ایلیاء اور مذہبی آزادی

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے اہل ایلیاء (فلسطین) سے جو تاریخی معاہدہ فرمایا۔ اس سے بھی ذمیوں کی مذہبی آزادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس معاہدہ کے الفاظ ہیں:

هذا ما اعطى عبدالله عمر امير المؤمنين اهل ايلياء من الامان اعطاهم امانا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريئها وسائر ملتها انه لا تسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من حيزها ولا من صليبهم ولا من شئ من اموالهم ولا يكرهون على دينهم ولا يضار احد منهم ولا يسكن بايلياء معهم احد من اليهود وعلى اهل ايلياء ان يعطوا الجزية كما يعطى اهل المدائن۔ ومن احب من اهل ايلياء ان يسير بنفسه وماله مع الروم ويخلى بيعهم وصليبهم فانهم امنون على انفسهم وعلى بيعهم وصليبهم حتى يبلغوا مامنهم۔[2]

---

[1] - Syed Ameer Ali, The Spirit of Islam, P:68-69؛ روح اسلام (اردو ترجمہ از محمد ہادی حسین)، ص:۱۷۹-۱۸۰؛ نیز دیکھیے: رئیس احمد جعفری ندوی، اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۲۲۳ تا ۲۲۵

[2] - دیکھیے: طبری، تاریخ الامم والملوک، (تاریخ الطبری)، (ذکر فتح بیت المقدس)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۷ء، ۲/۴۴۹؛ نیز مقریزی، الخطط المقریزیۃ، دار صادر بیروت، ۲/۴۹۲ (مختصراً)؛ بلاذری فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، ص:۲۰۸

یہ وہ امان نامہ ہے جو اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر نے ایلیاء (بیت المقدس) کے باشندوں کو لکھ کر دیا: ان کے جان ومال کو امان دی جاتی ہے۔ ان کے گرجے ان کی صلیبیں ان کے بیمار ان کے تندرست اور ان کی ساری قوم کو امان دی گئی۔ ان کے گرجوں میں سکونت اختیار نہیں کی جائے گی اور نہ وہ گرائے جائیں گے اور نہ اس کے اندر ان کی صلیبوں وغیرہ میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے مال و جائیداد وغیرہ میں کوئی دخل دیا جائے گا ان کے اپنے دین پر رہنے میں کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی اور ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی اور ان کے ساتھ ایلیا میں کوئی یہودی رہائش نہیں رکھے گا۔ البتہ اسلامی ریاست کی اس ذمہ داری کے عوض اہل ایلیاء پر لازم ہو گا کہ وہ اسی طرح جزیہ ادا کریں جس طرح اہل مدائن جزیہ دے رہے ہیں۔۔۔۔ اور ایلیاء سے جو لوگ نکل کر رومیوں کے ساتھ ان کے علاقہ میں رہنا چاہیں اور اپنے گرجوں اور صلیبوں کو چھوڑ دیں تو ان کی جان اور ان کے گرجے اور صلیبیں سب محفوظ رہیں گی یہاں تک کہ یہ اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائیں۔

مشہور غیر مسلم مفکر و مؤرخ گستاؤلی بان نے بھی حضرت عمرؓ کے اس معاہدہ کی تحسین اور تعریف و توصیف کی ہے۔[1]

اہل مصر کے لیے مذہبی آزادی

عہد فاروقی میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر فتح کیا تو ان کے لیے جو امان نامہ لکھا گیا، اس میں مذہبی آزادی کی بھی یقین دہانی بلکہ ضمانت دی گئی۔ اس امان نامہ کا متن کچھ یوں ہے:

یہ وہ تحریر ہے جو عمرو بن العاص نے مصر والوں کو امان کے طور پر دی ہے۔ اہل مصر کی جانیں، ان کا مذہب، ان کا مال، ان کی عبادت گاہیں، ان کی صلیبیں، ان کی زمینیں، ا

---

[1] - دیکھیے: تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، ص: ۱۸۱

ن کے سمندر سب محفوظ رہیں گے۔ نہ ان کی املاک میں دخل اندازی کی جائے گی نہ ان میں کمی کی جائے گی۔۔۔۔ الخ[1]

عہد فاروقی کے چند دیگر معاہدات میں مذہبی آزادی کی یقین دہانی

مذکورہ معاہدہ ایلیاء اور مصر کے علاوہ عہد فاروقی میں اہل الذمہ کو کس قدر مذہبی آزادی حاصل تھی؟ اور دیگر معاہدوں میں آپ نے ذمیوں کو کس طرح مذہبی آزادی کی تحریری یقین دہانی دلائی۔ اس کا اندازہ درج ذیل چند معاہدات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مذہبی امور میں ذمیوں کو پوری آزادی تھی وہ ہر قسم کی مذہبی رسوم ادا کرتے تھے، علانیہ ناقوس بجاتے تھے، صلیب نکالتے تھے، ہر قسم کے میلے ٹھیلے کرتے تھے، ان کے پیشوایان مذہبی کو جو مذہبی اختیارات حاصل تھے بالکل برقرار رکھے گئے تھے۔ مصر میں اسکندریہ کا پیٹریارک بنیامین تیرہ برس تک رومیوں کے ڈر سے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا تو سنہ ۲۰ ہجری میں اس کو تحریری امان لکھ کر بھیجی۔ وہ نہایت ممنون ہو کر آیا اور پیٹریارک کی کرسی دوبارہ اس کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ علامہ مقریزی نے اپنی کتاب الخطط المقریزیۃ میں اس واقعہ کی پوری تفصیل لکھی ہے۔[2] معاہدات میں اور امور کے ساتھ مذہبی آزادی کا بھی حق التزام کے ساتھ درج کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض معاہدات کے اصلی الفاظ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ حذیفہ بن الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھی تھی اس میں یہ الفاظ تھے:

لا یغیرون عن ملة ولا یحال بینهم وبین شرائعهم۔[3]

"ان کا مذہب نہ بدلا جائے گا اور ان کے مذہبی امور میں کچھ دست اندازی نہ کی جائے گی۔

---

[1] ۔ دیکھیے: ابن خلدون، تاریخ (الکتاب الثانی۔ فتح مصر)، ۲/۵۵۴؛ طبری، تاریخ الطبری، طبع مذکور، ۲/۵۱۴-۵۱۵؛ شبلی نعمانی، الفاروق، ۲/۲۶۰؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۰/۳۲

[2] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ المقریزی، الخطط المقریزیۃ، دار صادر، بیروت، ت۔ن، ۳/۴۹۲

[3] ۔ شبلی نعمانی، الفاروق، المیزان، لاہور، ۲/۲۶۴

جرجان کی فتح کے وقت سپہ سالار سوید بن مقرن نے اہل جرجان کے ساتھ معاہدہ میں یہ ضمانت دی کہ

لهم الامان على انفسهم واموالهم وملكهم وشرآئعهم ولا يغير شئ من ذلك هو اليهم ما ادوا وارشدوا ابن السبيل ونصحوا وقروا المسلمين۔[1]

ان کے جان و مال اور مذہب و شریعت کو امان ہے اور اس میں سے کسی شے میں تغیر نہ کیا جائے گا۔ جس پر وہ اس وقت قائم ہیں جب تک کہ وہ حسب معاہدہ جزیہ ادا کرتے رہیں، راہ راست پر رہیں اور مسلمانوں کی خیر خواہی کرتے رہیں گے۔

حضرت عتبہ بن فرقد نے اہل آذربائیجان کے ساتھ جو معاہدہ کیا اس میں یہ صراحت تھی:

كلهم الا مان على انفسهم واموالهم و مللهم وشرائعهم على ان يؤدوا الجزية على قدر طاقتهم۔[2]

آذربائیجان میں مقیم تمام لوگوں کی جان، مال، مذہب اور شریعت کو امان ہو گی۔ اس شرط پر کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق جزیہ ادا کرتے رہیں۔

بکیر بن عبداللہ کی معرفت اہل موقان سے جو معاہدہ طے پایا اس کے الفاظ تھے۔

كلهم الامان على اموالهم وانفسهم وملتهم و شرائعهم على الجزاء۔[3]

تمام اہل موقان کے مالوں، جانوں اور ان کی ملت و شریعت سب کے لیے جزیہ کے بدلے امان ہے۔

---

[1] ۔طبری، تاریخ الطبری، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۲/۵۳۸ (۲۲ھ۔ فتح جرجان)

[2] ۔حوالہ مذکور، ۲/۵۳۹-۵۴۰ (۲۲ھ فتح آذربائیجان)

[3] ۔طبری، تاریخ، ردائع التراث العربی بیروت، ۴/۱۵۷ (۲۲ھ۔ فتح الباب)

تیسری فصل

مذہبی عبادات ورسوم کی آزادی-چند تاریخی نظائر

اسلام نے جیسا کہ گزشتہ فصل میں گزرا، اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا/ اہل الذمہ کو عقیدہ و مذاہب کے معاملے میں مکمل آزادی دی ہے۔ اس آزادی کا بنیادی اور فطری تقاضا ہے کہ انہیں اپنے طریقے کے مطابق اپنی مذہبی عبادات بجالانے اور اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے، تو اسلام نے ان کے اس حق کو کھلے دل سے تسلیم کیا اور انہیں اپنی مذہبی عبادات ورسوم ادا کرنے کی اجازت دی ہے۔ البتہ اس معاملے میں احتیاطاً اور حفظ ماتقدم کے طور پر یہ قدغن لگائی ہے کہ ان کی مذہبی رسوم کی کھلے عام ادائیگی سے اگر نقض امن، خون خرابہ اور فرقہ وارانہ فسادات کا اندیشہ ہو یا اس سے اسلامی شعائر کی توہین ہوتی ہو تو پھر انہیں اپنی مذہبی عبادات ورسوم کھلے عام ادا کرنے میں احتیاط برتنی ہوگی ورنہ اپنی عبادتگاہوں کی چاردیواری کے اندر ان رسوم کی ادائیگی کے لیے ان پر کوئی قدغن ہے نہ پابندی۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن غنم نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کی اجازت سے اہل الجزیرۃ (شام) کے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ فرمایا اس میں خود انہوں نے زیر بحث معاملے کے حوالے سے متعدد دیگر شرائط کے علاوہ یہ شرائط بھی منظور کیں کہ

وان لا نظهر صلبنا وكتبنا في شئ من طريق المسلمين ولا اسواقهم وان لانظهر الصليب على كنائسنا وان لا نضرب بناقوس في كنائسنا بين حضرة المسلمين۔[1]

---

[1] - اس معاہدہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بیہقی، السنن الکبری، دارالفکر بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶ء (الطبعۃ الاولی)، ۱۴/ ۴۳-۴۴؛ ابن قدامہ المغنی، ۸/ ۵۲۴؛ ابن قیم، احکام اہل الذمہ، ۲/ ۱۱۳-۱۱۵۔

نوٹ: اس معاہدہ کی صحت وعدم صحت کا جائزہ باب ہشتم میں لیا جائے گا۔

اور ہم اپنی صلیبیں اور کتابیں نہ مسلمانوں کے کسی رستے میں نکالیں گے اور نہ ان کے بازاروں میں اور ہم اپنے گرجا گھروں پر بھی صلیب کو نمایاں نہیں کریں گے اور مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے گرجا گھروں کے اندر بھی ناقوس نہیں بجائیں گے (چہ جائیکہ کھلے عام اور بر سر عام بجائیں)۔

مشہور فقیہ ابن قدامہ حنبلی نے حضرت عبدالرحمن بن غنم کے ساتھ اہل الجزیرہ (شام) کے مذکورہ معاہدہ کی جو تفصیل درج کی ہے، اس کے مطابق دیگر شرائط کے علاوہ مذہبی عبادات و رسوم بر سر عام بجا نہ لانے کے حوالے سے اہل الجزیرہ نے جو شرائط خود اپنے اوپر عائد کیں ان میں مزید وضاحت ہے کہ:

۔۔۔۔ وان لا نضرب نواقیسنا الا ضربا خفیا فی جوف کنائسنا ولا نظهر علیها صلیبا ولا نرفع اصواتنا فی الصلوٰة ولا القراءة فی کنائسنا فیما یحضره المسلمون ولا نخرج صلیبنا ولا کتابنا فی سوق المسلمین وان لا نخرج باعوثا ولا شعانین ولا نرفع اصواتنا مع امواتنا ولانظهر النیران معهم فی سوق المسلمین وان لا نجاورهم بالخنازیر ولا نبیع الخمور ولا نظهر شرکا۔[1]

اور ہم اپنے ناقوس بلند آواز کی بجائے اپنے گرجا گھروں کی چار دیواری میں آہستہ آواز کے ساتھ بجائیں گے۔ ہم اپنی عبادتگاہوں پر صلیب کا نشان ظاہر نہیں کریں گے نہ ہم نماز میں اپنی آوازیں بلند کریں گے نہ مسلمانوں کی حاضری کے موقعہ پر اپنے گرجا گھروں میں بلند آواز سے قراءت کریں گے، نہ مسلمانوں کے بازاروں میں اپنی صلیب اور اپنی کتاب نکالیں گے، کھلے عام اپنی نماز استسقاء پڑھیں گے نہ اپنا تہوار منائیں گے، نہ اپنے مردوں کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کریں گے، نہ ان کے ہمراہ

---

[1] - دیکھیے: المغنی، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، ریاض سعودی عرب، ت۔ن، ۸/ ۵۲۴

مسلمانوں کے بازار میں آگ ظاہر کریں گے، نہ ہم ان کے قریب خنزیر لے جائیں گے نہ کھلے عام شراب بیچیں گے اور نہ شرک ظاہر (بر سر عام شرکیہ رسوم ادا) کریں گے۔

بہر کیف معاہدہ نجران جس کا گزشتہ سطور میں بھی ذکر ہو چکا ہے، میں نبی اکرم ﷺ نے عیسائی اہل معاہدہ کو جہاں دیگر سماجی و معاشرتی اور مذہبی حقوق کی ضمانت دی وہاں آنجناب نے اصولی طور پر ان کا مذہبی عبادات و رسوم کی ادائیگی کا حق بھی تسلیم فرمایا۔ چنانچہ معاہدہ ہذا کی درج ذیل دفعات میں اصولی طور پر ان ان کے اس حق کا اعتراف کیا گیا ہے۔

ولا یغیر اسقف من اسقفیته ولا راهب من رهبانیته ولا وقهة من وقهته۔[1]

اور نہ ان کے کسی پادری کو اس کی پادریت (عہدے) سے ہٹایا جائے گا، نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے منع کیا جائے گا اور نہ کسی صلیب خانے کے کلید بردار کو اس کے مقام سے ہٹایا جائے گا۔

اھل الذمہ کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کے مذکورہ شفقت بھرے عمومی رویے اور مذہبی آزادی کے معاملے میں آپ ﷺ کے طرز عمل کو دیکھنے کے بعد کیسے ممکن تھا کہ خلفاء راشدین اس سے سر مو بھی انحراف کرتے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں اسلامی حکومت کے زیر نگین آنے والی اقوام و قبائل کے ساتھ بیسیوں معاہدے کتب تاریخ میں اپنے اصل الفاظ میں منقول ہیں۔ ان میں اہل الذمہ یا غیر مسلم رعایا کو جہاں دیگر حقوق بڑے کھلے دل سے اور کمال انصاف سے دینے کا عہد کیا گیا ہے وہاں انہیں مذہبی عبادات و رسوم کی آزادی کا حق بھی دیا گیا ہے۔ چند نظائر ملاحظہ ہوں:

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں سپہ سالار اعظم حضرت خالدؓ بن ولید فتوحات کرتے ہوئے جب حیرہ (شام) پہنچے تو اہل حیرہ کے نمائندوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ:

---

[1] ۔ابن قیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، طبع مذکور، ۳/۶۳۵

میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اگر تم یہ دعوت قبول کر لو تو تمہارے لیے وہی حقوق ہیں جو دیگر مسلمانوں کے ہیں اور تمہارے ذمہ فرائض بھی وہی ہوں گے جو ان کے ذمہ ہیں اور اگر تم اس بات سے انکار کرتے ہو تو پھر جزیہ دے کر اسلامی ریاست کے ماتحت آجاؤ اور اگر اس چیز سے بھی انکار ہے تو میں تمہارے پاس ایسے لوگ لایا ہوں جو موت کے اتنے حریص ہیں جتنے تم لوگ زندگی کے بھی نہیں۔[1]

اس کے جواب میں والی حیرہ ایاس بن قبیصہ نے کہا:

مالنا فی حربک من حاجة وما نرید ان ندخل معک فی دینک نقیم علی دیننا ونعطیک الجزیة۔[2]

ہمیں تمہارے ساتھ لڑائی کی حاجت نہیں اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ تمہارے دین میں داخل ہو جائیں۔ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور تمہیں جزیہ دیتے رہیں گے۔

اس جواب پر حضرت خالدؓ بن ولید نے اہل حیرہ سے جن شرائط پر ان سے مصالحت فرمائی۔ ان میں سر فہرست مذہبی آزادی کے حوالے سے یہ بات بھی تھی کہ

ان لا یهدم لهم بیعة ولا کنیسة ولا قصر من قصورهم التی کانوا یتحصنون فیها اذا نزل بهم عدولهم ولا یمنعون من ضرب النواقیس ولا من اخراج الصلبان فی یوم عیدهم۔[3]

ان کی کوئی عبادت گاہ اور گرجا نہیں گرایا جائے گا اور ان کے قلعوں میں سے کوئی ایسا

---

[1] - امام ابو یوسف، کتاب الخراج، (طبع مذکور)، ص: ۱۴۳۔

[2] - حوالہ مذکور

[3] - امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۴۳

قلعہ بھی نہیں گرایا جائے گا جس میں وہ اپنے دشمن کے حملہ کے وقت قلعہ بند ہوتے تھے۔ انہیں ناقوس بجانے سے اور اپنی عید کے دن صلیبیں نکالنے سے منع نہیں کیا جائے گا۔

یہ معاہدہ نہایت طویل ہے۔ یہاں صرف وہی جملے نقل کیے گئے ہیں جن سے مسلمانوں کی غیر معمولی مذہبی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی طرح حضرت خالدؓ بن ولید مختلف علاقہ جات کے لوگوں سے صلح کے معاہدے کرتے ہوئے "عانات" کے علاقے سے گزرے تو وہاں کا پادری آپ کے پاس حاضر ہوا اور آپ سے صلح کا طالب ہوا۔ آپ نے اس سے جو صلح نامہ کیا اس میں یہ شرائط منظور کیں کہ:

ان لا یھدم بیعة ولا کنیسة وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعة شاؤا من لیل اونھار الا فی اوقات الصلوٰة وعلی ان یخرجوا الصلبان فی عیدھم۔[1]

ان کا کوئی عبادت خانہ اور گرجا نہیں گرایا جائے گا۔ وہ نماز کے اوقات کے سوا دن رات میں جس وقت بھی چاہیں اپنے ناقوس (سنکھ) بجا سکیں گے اور انہیں اپنی عید کے دن صلیبیں نکالنے کی اجازت ہو گی۔

مذہبی رسوم کی اجازت اور فقہاء اسلام

عہد نبوی اور خلفاء راشدین میں اہل الذمہ کو دی گئی اس مذہبی آزادی کے مد نظر علامہ شبلی نے لکھا ہے:

یہی وجہ ہے کہ زمانہ مابعد میں جب کبھی کسی متعصب فرمانروا نے اس کے خلاف کرنا چاہا

---

[1] ۔ حوالہ سابق، ص:۱۴۶

تو مذہبی پیشواؤں نے فوراً مخالفت کی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے جرأت نہ کر سکے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی تلافی کر دی گئی۔ ہارون الرشید جب نائس فورس قیصر روم کی بار بار بغاوت سے نہایت برہم ہوا تو عیسائیوں کی طرف سے اس کے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ اس نے قاضی ابو یوسف صاحبؒ سے جو مذہبی صیغہ کے افسر کل تھے، پوچھا کہ عیسائیوں کے گرجے اسلام میں کیوں محفوظ رہے اور آج ان کو کیوں یہ اجازت ہے کہ وہ اعلانیہ صلیب نکالتے ہیں۔[1] قاضی صاحب نے خلیفہ کے اس استفسار کے جواب میں لکھا:

فانما کان الصلح جری بین المسلمین واھل الذمة فی اداء الجزیة وفتحت المدن علی ان لاتھدم بیعھم ولا کنائسھم داخل المدینة ولا خارجھا وعلیٰ ان یحقنوالھم دماءھم وعلی ان یقاتلوا من ناواھم من عدوھم ویذبوا عنھم وعلیٰ ان یخرجوا الصلبان فی اعیادھم فادوا الجزیة الیھم علیٰ ھذا الشرط وجری الصلح بینھم علیه وکتبوا بینھم الکتاب علیٰ ھذا الشرط علیٰ ان لا یحدثو ا بناء بیعة ولا کنیسة فافتتحت الشام کلھا والحیرة الاقلھا علیٰ ھذا فلذالک ترکت البیع والکنائس ولم تھدم۔[2]

بے شک مسلمانوں اور اہل الذمہ کے درمیان جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی تھی اور سارے شہروں کی فتح کے وقت یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ان کے عبادت خانے اور کنیسے شہر کے اندر ہوں یا بیرون شہر، نہیں گرائے جائیں گے ان کے خونوں / جانوں کی

[1] ۔ مقالات شبلی (مذہبی)، ص: ۲۰۲-۲۰۳

[2] ۔ کتاب الخراج، ص: ۱۳۸

حفاظت کی جائے گی اور اگر کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہو گا تو ان کی طرف سے جنگ کی جائے گی اور ان کا دفاع کیا جائے گا اور یہ کہ وہ اپنی عیدوں کے موقعہ پر صلیب نکالنے کے مجاز ہوں گے۔ اسی شرط پر انہوں نے مسلمانوں کو جزیہ دیا البتہ ان کے درمیان صلح اور معاہدہ کی تحریر کے وقت یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ وہ کوئی نیا عبادت خانہ تعمیر کر سکیں گے نہ گرجا۔ چنانچہ شام کا پورا علاقہ اور بعض مواضع کے سوا حیرہ کا علاقہ انہی شرائط پر فتح ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عبادت خانے (خانقاہیں) اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیے گئے اور انہیں گرایا نہ گیا۔

مذکورہ تصریحات کے پیش نظر اسلامی ریاست غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کو یقینی بنائے گی۔ انہیں اپنے مذہبی مراسم اور قومی شعائر (جیسا کہ اہل نجران، اہل حیرہ اور اہل ایلیاء کے معاہدوں میں گزرا) کو ادا کرنے کی اجازت ہو گی۔ البتہ فقہاء کے مطابق بربنائے احتیاط اس میں اتنی تفصیل ضرور ہے کہ وہ اپنی بستیوں میں پوری آزادی کے ساتھ اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کر سکیں گے جبکہ خالص اسلامی آبادیوں (امصار المسلمین) میں ادا کرنے کے لیے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہو گا مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:

لا یمنعون من اظھار شئ مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریة او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیه عدد کثیر من اھل الاسلام وانما یکرہ ذالک فی امصار المسلمین وھی التی یقام فیھا الجمع والاعیاد والحدود الخ۔[1]

---

[1] ۔بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مطبع مذکور، ۷/ ۱۱۳-۱۱۴

نوٹ: ساری عربی عبارت اختصار کے لیے چھوڑ دی گئی اور صرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔

جو بستی اور موضع امصار مسلمین میں سے نہ ہو اس میں اہل الذمہ کو کھلے عام شراب اور خنزیر بیچنے، صلیب نکالنے اور ناقوس (سنکھ) بجانے سے منع نہیں کیا جائے گا۔ خواہ اس مقام پر اہل اسلام کی کثیر تعداد ہی آباد کیوں نہ ہو۔ البتہ مذکورہ افعال کا کھلے عام ارتکاب امصار المسلمین میں مکروہ (ناپسندیدہ) ہے جہاں جمعہ و عیدین ادا ہوتے ہیں اور شرعی حدود نافذ کی جاتی ہیں۔ ان چیزوں کو کھلے عام کرنے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ یہ فعل ایسی جگہ پر شعائر کفر کا کھلے عام مظاہرہ ہے جو شعائر اسلامی کے کھلے عام مظاہرہ کے لیے مخصوص ہے۔ لہذا یہ ممانعت صرف اس جگہ کے لیے مخصوص ہے جو شعائر اسلامی کے مظاہرے کے لیے مخصوص ہو اور وہ مصر جامع ہے۔ جہاں تک اس فسق (اللہ کی نافرمانی) کا تعلق ہے جس کی حرمت کے وہ خود بھی قائل ہیں مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے ارتکاب سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا۔ خواہ مسلمانوں کے شہروں میں ہوں یا ان (ذمیوں) کے اپنے شہروں قصبوں یا دیہات میں۔ اسی طرح موسیقی کے آلات، بانسری، عود، ڈھولک، حمام میں لہو و لعب اور ایسی دوسری تمام چیزوں سے انہیں شہروں اور دیہاتوں میں منع کیا جائے گا کیونکہ ان افعال کی حرمت کے وہ بھی ایسے ہی قائل ہیں جیسے ہم۔ لہذا یہ عقد ذمہ سے مستثنیٰ نہیں کہ وہ ان پر برقرار رہیں۔"

مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی جو علامہ کاسانی سے تقریباً سو سال پہلے کی شخصیت ہیں، نے زیر بحث موضوع پر "شرح السیر الکبیر" کے اندر خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ امصار المسلمین میں اہل الذمہ کے معابد کی نئی تعمیر اور پرانے معابد کی بقاء کے مسئلہ کی تفصیلات کے ضمن میں زیر نظر مسئلہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اور اسی طرح اگر وہ (اہل الذمہ) ان مواضع (امصارالمسلمین) میں شراب اور خنزیروں کی کھلے عام خرید و فروخت کرتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے سے منع کیا جائے گا۔ حضرت عمر اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما سے اسی طرح منقول ہے کیونکہ یہ چیز "فسق" (اعلانیہ شریعت کی خلاف ورزی) کے زمرے میں آتی ہے اور امصار المسلمین میں فسق کا اظہار دین اسلام کو ہلکا سمجھنے (تضحیک) کے مترادف ہے اور ہم نے

ان کے ساتھ اس پر صلح نہیں کی کہ وہ مسلمانوں کو کم وقعت سمجھیں۔ اسی طرح اگر ان کی عید کا تہوار آ جائے تو وہ اپنے قدیم گرجا گھروں کے اندر اپنی صلیب نکال سکتے ہیں اور اگر وہ گرجا گھروں سے باہر شہر میں سرعام صلیب نکالنا چاہیں تو انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ اس میں تو "معارضہ" کا اندیشہ ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی تضحیک ہے۔ ہاں اگر خفیہ طور پر مسلمانوں کے شہر سے صلیب نکال کر دوسرے شہر میں لے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ علی ہذا القیاس جب وہ گرجا گھروں کے اندر ناقوس بجائیں تو انہیں نہیں روکا جائے گا۔ البتہ گرجا گھروں سے باہر ناقوس بجانا چاہیں تو انہیں ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا کیونکہ یہ مسلمانوں کی اذان کے ساتھ معارضہ کی ایک صورت ہے۔ البتہ ہر وہ دیہات اور ہر وہ جگہ جو امصار المسلمین (جہاں جمعہ و عیدین کے اجتماع ہوتے اور شرعی حدود قائم کی جاتی ہیں) کے زمرے میں نہیں آتی تو وہاں وہ اعلانیہ اور کھلے عام اپنی تمام مذہبی رسوم ادا کر سکتے ہیں اگرچہ وہاں مسلمان بھی قیام پذیر ہوں کیونکہ یہ وہ مقام نہیں جہاں نماز جمعہ و عیدین کا قیام وغیرہ جیسے شعائر اسلام کا اجراء کیا جاتا ہو۔[1]

امصار المسلمین میں مذہبی رسوم کی کھلے عام ممانعت اور اس کی وجہ

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی کھلے عام مذہبی رسوم کی ادائیگی کے معاملے میں علامہ سرخسی اور علامہ کاسانی کے "امصار المسلمین" اور دیگر دیہاتوں میں فرق کرنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امصار المسلمین (مسلمان شہروں / اسلامی مراکز) میں مذہبی رسوم کی کھلے عام ادائیگی سے ممانعت محض نقص امن کے اندیشہ کے تحت ہے۔ اگر یہ چیز (مذہبی رسوم کی ادائیگی) فی نفسہ ممنوع یا مذہبی تعصب کی بنا پر ناجائز ہوتی تو دیہاتوں میں بھی اس کی اجازت نہ دی جاتی۔ چنانچہ علامہ سرخسی نے اس ممانعت کا بنیادی

[1] ۔ ملاحظہ ہو: شرح السیر الکبیر، دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدر آباد، ہندوستان، ۳/۲۵۱-۲۵۲

سبب بیان کرتے ہوئے لکھا:

لکیلا یؤدی الی صورۃ المعارضۃ۔[1]

تاکہ یہ چیز (مذہبی رسوم کی کھلے عام ادائیگی) مسلمانوں اور اہل الذمہ کے درمیان معارضہ (باہمی جھگڑے) کی طرف نہ لے جائے۔

گزشتہ تفصیل کے مطابق اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو مذہبی رسوم کی ادائیگی کی قانونی طور پر اجازت ہے لیکن یہ شرط بہر کیف ہے کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کچھ اس انداز سے ہو کہ ریاست کی اکثریت کے دل اور ؟ ؟ ا جذبات مجروح نہ ہونے پائیں۔ اس لیے غیر مسلم شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ چند مناسب حدود اور ضابطہ کار کا پابند ضرور کیا جاتا ہے بندی کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو دیوار سے لگائے رکھنا چاہتی ہے یا کمتری کے احساس سے مبتلا رکھنا چاہتی ہے بلکہ درحقیقت یہ پابندی غیر مسلموں کے مفاد میں جاتی ہے۔ کیونکہ بے نکیل آزادی کے سبب اکثریت اور حکمران جماعت سے تعلق رکھنے والا کوئی جذباتی مسلمان اشتعال اور جذبات میں آکر غیر ں پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے یا ان کی عبادت میں خلل ڈال سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل الذمہ پر اپنی مذہبی عبادات اور رسوم کی کھلے عام اور برسرعام ادائیگی پر پابندی ابتدائی صدیوں میں رہی۔ بعد میں جب نقص امن اور فرقہ وارانہ فسادات کا اندیشہ نہ رہا تو اسلامی حکومتوں نے کمال رواداری وسعت ظرفی اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غیر مسلم رعایا کو کھلے عام مذہبی رسوم کی ادائیگی سے بھی نہ کا چنانچہ مشہور مستشرق A.S. Tritton مختلف اسلامی ادوار اور اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کی مذہبی رسوم (Religious Practices) کی ادائیگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Even in the time of Kalkashandi, who died in 821,

---

[1] رح السیر الکبیر، مذکور، ۳، ۲۵۰

some festivals were still celebrated more or less in public. The jews placed lighted lamps at their doors at the feast of dedication. At Christmas, The christians decorated the churches and illuminated them. At the feast of Baptism they immers their children in the river, in spite of cold. After it the heat begins, so that the proverb runs, you baptize and begin the sumer, you keep the Nawruj and begin the winter. On the feast of cross they lighter fires and threw water about; low class Muslims joined with them in this game.[1]

حتیٰ کہ قلقشندی کے زمانے میں جس کی وفات ۸۲۱ھ میں ہوئی، کچھ تہوار بڑے پیمانے پر یا چھوٹے پیمانے پر بر سر عام منائے جاتے تھے۔ یہودی کسی عمارت کو عبادت کے لیے وقف کرنے کے تہوار کے موقعہ پر اپنے دروازوں پر لیمپ روشن کر کے رکھتے (یعنی چراغاں کرتے)۔ کرسمس کے تہوار پر عیسائی چرچوں کو سجاتے اور آراستہ کرتے تھے۔ بپتسمہ دینے (بچوں کو عیسائی بنانے) کے تہوار کے موقعہ پر وہ اپنے بچوں کو سردی کے باوجود دریا میں ڈبکیاں دیتے تھے۔ اس تہوار کے بعد گرمی کا موسم شروع ہو جاتا۔ اس لیے یہ ضرب المثل بن گئی کہ تم بپتسمہ دو گرمی شروع ہو جائے گی تم نوروز مناؤ ادھر سردی شروع ہو جائے گی۔ صلیب کے تہوار پر وہ آگ روشن کرتے اور ایک دوسرے پر پانی پھینکتے۔ اس کھیل میں عوامی درجے کے مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے۔

1 - The Caliphs and their Non-Muslim Sujbect, P:113

چوتھی فصل

معابد کی بقاو تعمیر کا حق

غیر مسلم معابد: اسلامی نقطہ نظر

گزشتہ تصریحات کے مطابق اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / ذمیوں کو اسلام نے جب اپنے عقیدہ مذہب پر قائم رہنے اور مذہبی عبادات و رسوم کی ادائیگی کے معاملے میں آزادی دی ہے تو اس آزادی کا عقلی و فطری تقاضا ہے کہ انہیں اپنی عبادتگاہیں قائم کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ اسلامی قانون کے اولین مأخذ "قرآن مجید" کے اندر اس حوالے سے اگرچہ کوئی صریح نص موجود نہیں تاہم سورۃ الحج کی درج ذیل آیت

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا-[1]

اور اگر اللہ تعالیٰ ایک دوسرے کے ذریعے لوگوں کے دفاع کا بندوبست نہ فرماتا تو یقیناً نصاریٰ کے صوامع (خانقاہیں) اور گرجے اور (یہود کے) عبادت خانے اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، گرادی جاتیں۔

میں اس امر کا اشارہ ضرور موجود ہے کہ اسلام میں صرف مساجد کا تحفظ ہی مقصود نہیں، غیر مسلم اقوام خصوصاً یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ ابن قیم نے اس آیت کریمہ کی تشریح میں حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

---

[1] - الحج، ۲۲:۴۰

يدفع عن مصليات اهل الذمة بالمؤمنين۔[1]

اہل ایمان کے ذریعے اہل الذمہ کی عبادتگاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔

اس آیت مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یعنی صوامع، بیع اور صلوات۔ صوامع سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے، مجوسیوں کے معابد اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں۔ بیع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں۔ یہ جامع الفاظ استعمال کرنے کے بعد پھر صلوات کا ایک وسیع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق ہر موضع عبادت الٰہی پر ہوتا ہے اور ان سب کے آخر میں مساجد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ عادل انسانوں کے ذریعہ سے ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد ہوتا کہ عبادت گاہیں تک بربادی سے نہ بچتیں جن سے ضرر کا کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔

دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں سے متعلق اسلام اور قرآن مجید کے اس نقطہ نظر کی اجمالی وضاحت (جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے) کے بعد اس معاملے میں عیسائیت کے نقطہ نظر پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ مشہور ہے: "تعرف الاشياء باضدادها" (اشیاء کی قدر و قیمت اور پہچان ان کی متضاد چیزوں سے ہوتی ہے) چنانچہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اسلامی ریاست اور مسلمان معاشرے میں غیر مسلموں کے تمام حقوق کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ایک مستقل فصل "مقارنات" (تقابلی جائزہ) میں دوسرے اصحاب ادیان خصوصاً عیسائیوں کے مذہبی تشدد، عدم رواداری اور دوسرے مذاہب کو برداشت نہ کرنے اور ان کے ماننے والوں پر ظلم و تشدد کے متعدد واقعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> عیسائیوں نے دوسروں کے خلاف جن مظالم اور سفاکیوں کا ارتکاب کیا، اس کی سند انہیں تورات میں ملی تھی جو ان مخالفوں کے متعلق کہتی ہے: "ان کی عبادت گاہوں کو

---

[1] - احکام اہل الذمہ، ۲/ ۱۱۷

منہدم کر دو۔ ان کے ستون آگ میں جھونک دو اور تمام بتوں کو آگ لگا دو" تورات یہ ہدایت بھی کرتی ہے کہ شہروں کو فتح کرنے کے بعد آگ لگا دینی چاہیے اور اس میں موجود ہر مرد، عورت اور بچے کو قتل کر دینا چاہیے۔[1]

تمام عبادت گاہوں کے تحفظ کا مذکورہ قرآنی عندیہ سیاق و سباق کے مطابق اہل ایمان کو کفار اور ظالموں کے خلاف جہاد کی اجازت کے ضمن میں دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے مشہور سیرت نگار قاضی سلیمان منصور پوری فرماتے ہیں:

آیت بالا ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لیے دی گئی کہ وہ جملہ مذاہب کی آزادی کو قائم کر دیں، بدامنی دور کر دیں۔ پارسیوں، عیسائیوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں کو اور مسلمانوں کی مسجدوں کو کوئی شخص نہ گرا سکے۔ تاریخ کا ادنی واقف بھی جانتا ہے کہ ایرانیوں نے بعہد پرویز ایشیاء کوچک پر قابض ہونے کے بعد عیسائیوں کے گرجاؤں کو گرا دیا تھا اور دس سال کے بعد عیسائیوں نے مکرر غلبہ کے بعد پارسیوں کی پرستش گاہوں کو فنا کر دیا تھا۔ یہودیوں کے عبادت خانے تو سب کے سب شاہان روما کے ظلم و تعصب کی وجہ سے زمین کے برابر کر دیے گئے تھے۔ حتی کہ یروشلم کی زمین کو بھی جس کی عمارت ۸۰ء میں نیرو شاہ روما نے گرا دی تھی۔ قسطنطین (اولین عیسائی بادشاہ) کی والدہ کے حکم سے کوڑا کرکٹ گرانے کی جگہ بنایا گیا تھا۔ مسلمانوں کی مساجد تو بالکل ہی غیر محفوظ تھیں کیونکہ پارسی و ترسائی و نصرانی مسلمانوں کے خلاف بالاتفاق عداوت پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اٹھایا اور انہی کے دوش پر معابد عالم کی حفاظت کا بار رکھا اور انہوں نے اس بار کو خوش گوار

---

[1] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۸۵

فرض کے طور پر اٹھایا۔[1]

عبادت گاہوں کے حوالے سے یہاں عیسائیت کے طرز عمل پر بھی ایک نگاہ ڈالتے جایئے۔ گستاؤلی بان نے مصر پر عربوں کی حکومت سے پہلے کی صورت حال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

جب مذہب عیسوی قسطنطنیہ کا دولتی مذہب ہو گیا تو اس وقت شہنشاہ تھیوڈوسیس نے ۳۸۹ء میں مصر کی کل عبادت گاہوں اور دیوتاؤں کی مورتیوں کو توڑ ڈالا اور قدیم عبادت کی کل نشانیوں کو مٹا دیا۔ ان عمارتوں کو جو اس قدر مستحکم تھیں کہ ان کا بآسانی منہدم کرنا ممکن نہ تھا، کتبے اور مورتیں کھود کر نکال لی گئیں۔[2]

زیر نظر آیت میں مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کے ذکر میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان میں مساجد کا ذکر سب سے آخر میں ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں غیر مسلم معابد کے دفاع و تحفظ کی کتنی اہمیت ہے۔ غیر مسلم معابد کے تحفظ اور احترام کے ضمن میں یہاں اس تاریخی یادگار اور مثالی واقعہ کا اندراج بھی بے جا نہ ہو گا کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ جب ایلیاء (فلسطین) کے یہود سے صلح کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے ان کے ہیکل یعنی عبادت گاہ کو دیکھا کہ اس کے ہر طرف گرد اٹی ہوئی ہے۔ آپ نے کمال وسعت ظرفی اور مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے رومال سے گرد جھاڑنا شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تمام مسلمان بھی ہیکل کی دیواروں سے گرد جھاڑنا شروع ہو گئے اور آن کی آن میں گرد صاف ہو گئی۔ اس دوران نماز کا وقت ہو گیا تو آپ نے "صفرد ینوس" نامی بطریرک کی اجازت کے باوجود کنیسہ القیامۃ سے باہر نکل کر نماز پڑھی۔ لوگوں نے پوچھا: کیا ہیکل میں نماز جائز نہ تھی؟ فرمایا:

خشیت ان اصلی فیھا فیزیلھا المسلمون من بعدی ویتخدونھا

---

[1] ۔رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ت۔ن، ۳/ ۴۳۴

[2] ۔تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی) مقبول اکیڈمی، لاہور، ت۔ن، ص: ۴۳۴

مسجدا۔[1]

میں اس بات سے ڈر گیا کہ اگر میں اس ہیکل میں نماز پڑھوں تو میرے بعد مسلمان اسے گرا دیں گے اور اسے مسجد بنالیں گے۔

حضرت عمرؓ کا اس گرجا میں نماز نہ پڑھنا مذکورہ خدشہ کے پیش نظر تھا ورنہ اسلام میں گرجا کی جگہ ناپاک نہیں وہاں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے بعض فقہاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: "وتجوز الصلوٰۃ فی الکنیسۃ" (گرجا میں نماز جائز ہے)۔[2]

مشہور مستشرق سر تھامس ارنلڈ نے اس واقعہ کے ذکر اور اعتراف کے بعد عیسائیوں سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ایسی دور اندیشی کی مثال جیسی حضرت عمرؓ سے ظاہر ہوئی عیسائیوں کی تاریخ میں جو اسلامی دور حکومت میں گزری، دریافت ہونی مشکل ہے۔[3]

غیر مسلم معابد کے بارے میں اسلام کے درج بالا نقطہ نظر اور طرز عمل کے باوجود سوئٹزرلینڈ کی مصر نژاد فاضلہ Bat Ye'or کا مطلقاً یہ کہنا خلاف واقعہ اور تعصب پر مبنی ہے کہ۔

> Dhimmi placed of wership were not inviolable. They could be ransackea, burned, or demolished as acts of reprisal against the community on the pretext that some of their members had exceeded their rights.[4]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، المکتبۃ الحقانیہ، پشاور، ؛ المقریزی، الخطط المقریزیۃ، دار صادر بیروت، ت۔ن، ۲/ ۴۹۲

[2] - ابن تیمیہ، مختصر الفتاوی المصریۃ، دار ابن قیم دمام سعودی عرب، ۱/ ۵۷

[3] دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص: ۶۸

[4] – Bat Ye'or, The Dhimmi, Fairleigh Dickinson University Press, London, 1985, P:58

ذمی عبادت گاہیں محفوظ نہ تھیں۔ اہل الذمہ میں سے اگر کسی آدمی نے اپنے حقوق سے تجاوز کیا ہے تو اس کے خلاف کارروائی کے بہانے وہ عبادت گاہیں لوٹی، جلائی یا گرائی جاسکتی تھیں۔

مذکورہ فاضلہ کی تحقیق کے مطابق کسی اسلامی ملک میں کسی غیر مسلم عبادتگاہ کے ساتھ ایسی غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور جذباتی حرکت کی گئی ہے تو اس پر اسلام کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

امصار المسلمین کی اقسام اور ان میں معابد کی تعمیر کا حکم

قرآن مجید کے بعد اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / اھل الذمہ کے ساتھ نبی اکرم ﷺ اور پھر خلفاء راشدین نے جو طرز عمل اختیار فرمایا اور جس طرح ان سے معاملات طے کیے ان کو مدنظر رکھتے یا ان سے استنباط کرتے ہوئے فقہاء اسلام نے زیر بحث (غیر مسلم معابد کی تعمیر کے) معاملے میں اسلامی آبادی کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کا الگ حکم بتایا ہے۔ فقہاء (ابن قیم، ابن عابدین، ابن قدامہ، سرخسی، ابن سحنون وغیرہ) کی ان تصریحات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

فقہاء نے کہا ہے کہ امصار المسلمین (مسلمان آبادیاں یا مسلمان شہروں) کی تین اقسام ہیں۔

پہلی: وہ شہر جنہیں مسلمانوں نے آباد کیا اور بسایا ہے مثلاً کوفہ، بصرہ اور بغداد تو ایسے شہروں میں کسی یہودی عبادت خانہ (بیعہ) اور گرجا کی تعمیر جائز نہیں۔ البتہ زیدیہ کا خیال ہے کہ اگر امام کسی مصلحت کے تحت انہیں اجازت دے دے تو پھر ان معابد کا بنانا جائز ہے۔

دوسری: وہ شہر یا علاقے جنہیں مسلمان بزور قوت فتح کریں ان میں بھی غیر مسلموں کے لیے کلیسوں اور گرجوں کی تعمیر جائز نہیں جبکہ ابن القاسم مالکی (عبدالرحمن ابن القاسم) کے نزدیک اگر حکومت انہیں ایسا کرنے کی اجازت دے دے تو پھر ان کے لیے جائز ہے۔

تیسری: وہ علاقے جو صلح کے ساتھ اسلامی ریاست کے زیر نگیں آئے ہوں تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر صلح اس شرط پر ہوئی ہو کہ وہ (غیر مسلم) اپنی زمینوں کے بدستور مالک رہیں گے اور اسلامی حکومت کو خراج دیا کریں گے تو ان کے لیے کلیسوں اور گرجوں کی تعمیر جائز ہے۔ اور اگر صلح اس شرط پر ہوئی ہو کہ

زمین بھی اسلامی حکومت کی ملکیت ہوئی اور وہ جزیہ بھی دیں گے تو معابد کے معاملے میں وہی حکم ہو گا جس پر ان کی صلح ہوئی ہو گی۔[1]

جبکہ "الموسوعۃ الفقہیۃ" (الکویت) میں دوسری قسم کے علاقوں (جو بزور شمشیر فتح ہوئے ہوں) میں پہلے سے موجود غیر مسلم معابد کے بارے میں تمام فقہی مسالک کی امہات الکتب کے حوالے سے یہ تفصیل بھی درج ہے کہ:

> اور جو معابد فتح سے پہلے کے موجود ہوں تو کیا ان کا گرا دینا واجب ہے؟ تو اس معاملے میں مالکیہ کا کہنا ہے اور یہ حنابلہ کا بھی ایک قول ہے کہ ان کا گرانا واجب نہیں کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت سے علاقے بزور شمشیر فتح کیے تھے مگر ان میں پہلے سے موجود گرجوں کو گرایا نہیں تھا۔ اور ان بزور قوت مفتوحہ علاقوں میں گرجوں اور کلیسوں کا وجود اس دعوی کی صحت کی دلیل ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان علاقوں کے عمال (گورنروں) کو یہ لکھا تھا کہ کوئی گرجا گرایا جائے نہ کلیسہ نہ آگ پوجا کا گھر۔ جبکہ شوافع کے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے اور یہ حنابلہ کا بھی ایک قول ہے کہ ان کا گرا دینا واجب ہے۔ ان علاقوں میں جو بھی گرجا موجود ہو گا اس کو برقرار نہیں رہنے دیا جائے گا کیونکہ یہ علاقے اب مسلمانوں کی ملک ہیں اور مسلمانوں کے مملوکہ علاقوں میں کسی گرجا کا وجود جائز نہیں جیسا کہ ان شہروں میں جائز نہیں جنہیں مسلمانوں نے خود آباد کیا ہو اور حنفیہ کا نقطہء نظر بھی یہی ہے کہ انہیں گرایا نہیں جائے گا۔ البتہ وہ معابد رہائش گاہوں کے طور پر ذمیوں کے قبضے میں رہیں گے مگر ان میں عبادت ان کے لیے ممنوع ہو گی۔[2]

---

[1] - دیکھیے: احکام الذمیین والمستامنین فی دار الاسلام، ص:۸۲

[2] - ملاحظہ ہو: الموسوعۃ الفقہیۃ، الکویت، (اھل الذمہ)، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵ء، ۷/۱۲۹

زیر بحث مسئلہ کی مزید توضیح و تشریح کے لیے فقہاء کی چند اور تصریحات کا مطالعہ بھی بے سود نہ ہو گا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا عجمیوں / اھل الذمہ کو یہ حق ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص یا مسلمانوں کے تعمیر کردہ شہروں میں اپنی عبادت گاہ یا گرجا تعمیر کر لیں؟ تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

اما مصر مصرته العرب [1] فليس لهم ان يحدثوا فيه بناء بيعة ولا كنيسة ولا يضربوا فيه بنا قوس ولا يظهروا فيه خمرا ولا يتخذوا فيه خنزيرا وكل مصر كانت العجم مصرته ففتحه الله على العرب فنزلوا على حكمهم فللعجم ما في عهدهم وعلى العرب ان يوفوا لهم بذالك۔ [2]

ایسا شہر جسے عربوں (مسلمانوں) نے بسایا ہے تو ان (اہل الذمہ) کو یہ حق نہیں کہ وہ اس میں کوئی عبادت خانہ تعمیر کریں اور نہ انہیں گرجا بنانے کا حق ہے۔ اسی طرح وہ

---

[1] - امام ابو عبید کے مطابق یہ جملہ کہ "مصر مصرته العرب" (ایسا شہر جسے عرب آباد کریں) کئی پہلو رکھتا ہے۔ اس میں وہ علاقے آجاتے ہیں جہاں کے باشندے اسلام قبول کر لیں مثلاً مدینہ منورہ، طائف، یمن نیز اس میں وہ شہر بھی آجاتے ہیں جن کا پہلے وجود نہ تھا بلکہ مسلمانوں نے وہاں کی زمینوں کو تقسیم کر کے وہاں اقامت اختیار کی مثلاً کوفہ، بصرہ، اور اسی ضمن میں سرحدی علاقے بھی آجاتے ہیں۔ اس تعریف میں وہ علاقے بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں کی فوج بذریعہ قوت حاصل کر لے اور فتح کے بعد ان علاقوں کو اصل باشندوں کے حوالہ کر دینا مناسب خیال نہ کرے بلکہ فاتحین میں اس علاقہ کو تقسیم کر دے جیسے کہ حضور اکرم ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ (کتاب الاموال (پیرہ نمبر ۲۶۹)، ص: ۱۴۶

[2] - امام ابو یوسف، کتاب الخراج، (فصل فی الکنائس والبیع والصلبان)، ص: ۱۴۹؛ ابو عبید، کتاب الاموال (پیرہ نمبر ۲۶۹)، ص: ۱۴۶؛ بیہقی، السنن الکبری، دار الفکر، بیروت۔ لبنان، ۱۴/ ۴۲

اس میں ناقوس نہیں بجا سکتے۔ اعلانیہ شراب پی سکتے ہیں نہ خنزیر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہر وہ شہر جسے عجم (اہل الذمہ) نے آباد کیا ہو پھر اللہ نے اسے عرب (مسلمانوں) کے ہاتھ پر فتح کر دیا ہو اور وہ (اھل الذمہ) ان (مسلمانوں) کی اطاعت قبول کر لیں تو عجم / اھل الذمہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ان کے معاہدہ میں طے پا جائیں اور مسلمانوں کے لیے لازم ہو گا کہ وہ اس عہد کو پورا کریں۔

جبکہ علامہ کاسانی نے زیر بحث مسئلہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

واما الکنائس والبیع القدیمة فلا یتعرض لها ولا یهدم شئ منها واما احداث کنیسة أخری فیمنعون عنه فیما صار مصرا من امصار المسلمین لقوله علیه السلام لا کنیسة فی الاسلام الا فی دارالاسلام ولا انهدمت کنیسة فلهم ان یبنوها کما کانت لان لهذا البناء حکم البقاء ولهم ان یستبقوها فلهم ان یبنوها ولیس لهم ان یحولوها من موضع الی موضع آخر لان التحویل من موضع الی موضع آخر فی حکم احداث کنیسة اخری۔ واما فی القری اوفی موضع لیس من امصار المسلمین فلا یمنعون من احداث الکنائس والبیع کما لا یمنعون من اظهار بیع الخمور والخنازیر لما بینا۔[1]

باقی رہا معاملہ ان کے قدیم گرجوں اور معابد کا تو ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو منہدم کیا جائے گا۔ البتہ اس شہر میں جو مسلمانوں کے شہروں میں

---

[1] ۔بدائع الصنائع فی ترتیب شرائع، ۷/ ۱۱۴

سے ایک شہر بن چکا ہو، نیا کنیسہ بنانے سے منع کیا جائے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اسلام میں کوئی کنیسہ نہیں بجز دارالاسلام میں کنیسہ کے۔ اگر ان کا کوئی کنیسہ (گرجا) منہدم ہو جائے تو انہیں حق ہو گا کہ وہ اسے ویسے ہی دوبارہ تعمیر کر لیں جیسا کہ وہ پہلے تھا کیونکہ اس عمارت کے لیے بقاء کا حکم ہے تو انہیں حق ہے کہ اسے باقی رکھیں۔ لہذا انہیں اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا حق ہے لیکن انہیں اس کی جگہ تبدیل کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اس کی جگہ تبدیل کر کے اسے کسی دوسری جگہ تعمیر کرنا ایک نیا کنیسہ تعمیر کرنے کے حکم میں آتا ہے (جبکہ نیا کنیسہ انہیں مسلمانوں کے شہر میں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں) باقی رہے دیہات یا ایسے مقامات جو مسلمانوں کے شہروں میں سے نہیں ہیں تو وہاں انہیں نئے کنیسے اور معابد تعمیر کرنے سے نہیں روکا جائے گا جیسے انہیں ان مقامات پر بدلیل مذکور شراب اور سور کی اعلانیہ خرید و فروخت سے نہیں روکا جاتا۔

زیر بحث مسئلے میں صاحب ہدایہ مرغینانی نے یہ لکھا ہے کہ:

ولایجوزا احداث بیعة ولا کنیسة فی دارالاسلام لقوله علیه السلام لاخصاء فی الاسلام ولا کنیسة والمراد احداثها وان اہدمت البیع والکنائس القدیمة اعادوها لان الابنیة لاتبقی دائمة ولما اقرهم الامام فقد عهد الیهم الاعادة الا انهم لا یمکنون من نقلها لانه احداث فی الحقیقة والصومعة للتخلی فیها بمنزلة البیعة بخلاف موضع الصلوٰة فی البیت لانه تبع للسکنی وہذا فی الامصار دون القری لان الامصار هی التی تقام فیها الشعائر فلا تعارض فی

اظہار مایخالفھا۔[1]

اور یہ بات جائز نہیں ہے کہ دارالاسلام میں جدید بیعہ یا کنیسہ بنایا جائے کیونکہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: اسلام میں خصی ہونا نہیں ہے اور کنیسہ (گرجا) نہیں ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ جدید کنیسہ بنانا جائز نہیں ہے۔ اور اگر پرانی بیعۃ (عبادت گاہ) یا گرجا منہدم ہو جائے تو وہ (اہل الذمہ) انہیں دوبارہ بنا سکتے ہیں، کیونکہ عمارت ہمیشہ باقی نہیں رہتی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جب امام نے ذمیوں کو باقی رکھا تو گویا دوبارہ بنانے کا عہد دے دیا، لیکن ذمیوں کو یہ اختیار نہیں دیا جائے گا کہ اسکو شہر میں دوسری جگہ منتقل کر لیں کیونکہ یہ چیز درحقیقت نئے سرے سے بنانے میں داخل ہے، اور انہیں تنہائی کا عبادت خانہ جسے "صومعہ" کہا جاتا ہے۔ بنانے کی اجازت بھی نہ دی جائے گی۔ کیونکہ وہ بمنزلہ بیعہ کے ہے۔ بخلاف اس کے گھر میں عبادت کے لیے کوئی جگہ بنانا جائز ہے کیونکہ وہ رہائش کے تابع ہے اور یہ سب حکم جو مذکور ہوا، شہروں کے واسطے ہے دیہاتوں کے واسطے نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی شعائر شہروں میں ہی قائم کیے جاتے ہیں تو ان میں ان کے مخالف چیزوں سے معارضہ نہیں کیا جائے گا۔

امصار المسلمین میں معابد کی تعمیر کا عدم جواز اور اس کی بنیادی وجہ

فقہاء کے ان اقوال اور فتاوی سے مترشح ہوتا ہے کہ امصار المسلمین میں اھل الذمہ کو اپنی عبادت گاہوں اور نئے گرجوں کی تعمیر سے ممانعت اس لیے نہیں کہ ان کی تعمیر فی نفسہ ناجائز ہے۔ اگر ان کی تعمیر فی نفسہ شرعاً ناجائز ہوتی تو اسے ہر جگہ ناجائز ہونا چاہیے۔ یہ بات اصول شریعت کے خلاف ہے کہ ایک چیز شہروں میں ناجائز ہو مگر دیہاتوں میں جائز ہو۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ امصار المسلمین میں اہل

[1] - ہدایہ (کتاب السیر مع اردو ترجمہ احسن الہدایہ)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۷/ ۱۴۱

الذمہ کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر اور مذہبی رسوم کی ادائیگی سے ممانعت محض مذہبی فساد سے بچنے اور نقص امن کے اندیشہ کے ماتحت ہے اور جس شہر میں نقص امن یا کسی قسم کے فساد و تصادم کا اندیشہ نہ ہو وہاں نئے گرجا کی تعمیر اور مذہبی رسوم کی ادائیگی ممنوع نہ ہوگی۔

اسلامی ریاست اور مسلمان شہروں میں نئے گرجوں کی تعمیر کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے:

> یورپین مصنفوں کی طرف سے بڑا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بت خانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی، لیکن یہ ان کی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے۔ یہ بحث خود صحابہؓ کے زمانہ میں پیش آچکی تھی اور اس کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ جو شہر مسلمانوں کے خاص آباد کردہ ہیں وہاں غیر مذہب والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ گرجا اور بت خانہ بنائیں، باقی جو قدیم شہر ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے۔ مسلمانوں کو اس کا پورا کرنا ضرور ہوگا۔[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ فتویٰ بھی اس لحاظ سے تھا کہ اس وقت تک مسلمان اور دوسری قومیں اچھی طرح ملے جلے نہیں تھے لیکن جب یہ حالت نہیں رہی تو وہ فیصلہ بھی نہیں رہا۔ چنانچہ خالص اسلامی شہروں میں اس کثرت سے گرجے، بت خانے، آتشکدے بنے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا، بغداد خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے، وہاں کے گرجوں کے نام معجم البلدان میں کثرت سے ملتے ہیں۔ قاہرہ میں جو گرجے بنے وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے۔ یوٹکنیس نے جو ۳۲۳ھ میں اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا، اپنی کتاب میں جو عربی زبان میں ہے، اور جس کو پروفیسر پوکاک نے لاطینی ترجمہ کے ساتھ چھاپا ہے، اس قسم کے بہت

---

[1] ۔امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۴۹

سے گرجوں کا نام اور ان کے حالات لکھے ہیں۔ [1]

یر بحث مسئلے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے مزید لکھا ہے:

مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ پرانے معبد قائم رکھے یا نئے معبدوں کی تعمیر کی اجازت دی بلکہ انہوں نے نہایت انصاف سے معبدوں کے متعلق تمام عہدے اور تمام وہ جائیدادیں بحال رہنے دیں جو ان معبدوں پر وقف تھیں۔ یہاں تک کہ پجاریوں اور مجاوروں کے جو روزینے پہلے سے مقرر تھے وہ بھی اپنے خزانے سے جاری رکھے۔ حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں اسی طرح بحال رہنے دیں۔ [2]

گرجا کی تعمیر کے بارے اسلام میں اہل الذمہ کے مذہبی جذبات واحساسات کا کس قدر خیال رکھا یا ہے اس کا اندازہ فقہ کے اس مسئلہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی عیسائی ایک گرجا بنانے کی وصیت کر بائے تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کرے گی۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے "باب وصیۃ الذمی" میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب نقل کر کے ان کی طرف سے یہ دلیل پیش کی ہے کہ:

نحن امرنا بان نترکهم وما یدینون۔ [3]

ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم اہل الذمہ کو ان کے دین پر چھوڑ دیں۔

صحابہ کرام نے مفتوحہ علاقوں میں پرانے گرجوں کو کس طرح باقی رکھا۔ اس کی ایک مثال ذیل میں ملاحظہ ہو۔

متقدمین اور نامور مؤرخین میں شامل علامہ واقدی نے اپنی معروف تالیف "فتوح الشام" میں فتح

---

[1] - مقالات شبلی (مذہبی)، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۳۴۹ھ، ۱/۲۰۶

[2] - حوالہ مذکور، ۱/۲۰۷

[3] - ہدایہ، (کتاب الوصایا باب وصیۃ الذمی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۸/۳۱۴

دمشق کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

اہل دمشق کے ایک سوروسا اور کبار علماء پر مشتمل وفد جب صلح کی غرض سے امیر لشکر حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس پہنچا تو آپ نے انہیں مرحبا کہتے ہوئے اعزاز و اکرام کے ساتھ بٹھایا اور کہا کہ ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے: "اذا اتاکم عزیز قوم فاکرموہ" (جب تمہارے پاس کسی قوم کا کوئی معزز آدمی آئے تو تم اس کی تعظیم و تکریم کرو) اب اس وفد نے صلح کے معاملے میں بات کی اور کہا: "انا نرید منکم ان تترکوا کنائسنا ولا تنقضوا علینا منھا کنیسۃ وھی الجامع الآن بدمشق" (ہم آپ لوگوں سے یہ چاہتے (مطالبہ کرتے) ہیں کہ آپ لوگ ہمارے تمام گرجوں کو صحیح سلامت چھوڑ دو اور اس وقت دمشق میں جتنے گرجے موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ گراؤ) اس کے جواب میں حضرت ابو عبیدہ نے ان سے (وعدہ) فرمایا۔ "جمیع الکنائس لا یومر بھدمھا" (تمام گرجے جوں کے توں موجود رہیں گے اور انہیں گرانے کا حکم نہیں دیا جائے گا)۔[1]

"امصار المسلمین" جیسا کہ پیچھے گزرا، فقہاء نے عموماً مسلمانوں کے شعائر کے ساتھ مخصوص شہروں یا حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں "مصر مصرتہ العرب" (وہ شہر جسے عربوں / مسلمانوں نے بسایا ہو)[2] کو قرار دیا ہے۔ مگر بعض علماء نے اس کا معنی "فوجی چھاؤنیاں اور انتظامی مراکز" بھی بتایا ہے۔ انڈیا کے مشہور فاضل مولانا یحییٰ نعمانی زیر بحث مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امصار المسلمین" اس زمانے میں مفتوح ملک کی وہ نئی آبادیاں کہلاتی تھیں جنہیں مسلمان اپنی فوجی چھاؤنیوں اور انتظامی مراکز کے طور پر بناتے تھے۔ کوفہ و بصرہ اور

---

1 ۔ فتوح الشام، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء، ۱/ ۷۲

2 ۔ دیکھیے: ابویوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۴۹؛ بیہقی، السنن الکبری، ۱۴/ ۴۲

مصر میں فسطاط ایسے ہی شہر تھے۔ واضح رہے کہ پورے کے پورے مفتوح علاقے (یعنی عراق سے لے کر شام و مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے) غیر مسلموں کے ہی تھے۔ انہوں نے ایک عرصے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ یہ سارے علاقے وہ تھے جہاں غیر مسلموں کو عبادت گاہوں کی تعمیر اور شعائر دین کے اظہار کی عام اجازت تھی۔ افسوس کہ لوگوں نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ "امصار المسلمین" کا مطلب مسلمانوں کے شہر سمجھا۔ حالانکہ یہ خالصۃً ایک اصطلاح تھی۔ جس کا مطلب صرف وہ شہر تھے جو فتح کے بعد مسلمانوں نے نئے بسائے تھے اور جن کو سیکورٹی اور دیگر وجوہ سے اپنے لیے خاص کر لیا تھا۔ باقی علاقوں کے بارے میں یہ حکم نہیں تھا۔ دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ ضعیف روایات میں آنے والے اس خالص انتظامی فیصلہ کو شرعی حکم سمجھ لیا گیا۔ ان روایات کے بموجب اہل ذمہ کے حق میں یہ فیصلہ صرف ایک انتظامی فیصلہ تھا۔ اس کی کسی شرعی بنیاد کا تذکرہ اور حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ یہ غلطی صرف اسی مسئلہ میں نہیں ہوئی بلکہ ذمیوں کے سلسلے کے بہت سے احکام سیکورٹی کے مقصد سے اور حکومت اور مسلمانوں کو کسی دھوکے سے بچانے کے لیے دیے گئے تھے مگر انہوں نے ان کو شرعی احکام سمجھ لیا۔ اگر مسلمانوں کے زیر اقتدار اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ شرک کے مراکز کا وجود جائز نہ ہوتا اور یہ چیز ایک اسلامی حکومت کے مقصد وجود کے منافی اور اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تو اس میں "امصار المسلمین" اور دیگر آبادیوں میں کیا فرق ہے؟ اس بنیادی اور اہم سوال پر غور کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ یہ احکام صرف امن عام اور کسی فساد و بدامنی سے بچنے کے مقصد سے دیے گئے تھے۔[1]

---

[1] - "اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری-ذمی" مجلہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ انڈیا، شمارہ، جنوری-مارچ ۲۰۱۱ء، ص:۶۰-۶۲

زیر بحث مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا موصوف مزید "الزامی انداز" میں لکھتے ہیں:

یہ خوب لطیفہ ہے کہ آپ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں اپنی عبادت گاہیں تک بنانے کی اجازت نہ دیں اور پھر یہ دعوی کریں کہ ہم ان کو مذہبی آزادی دیتے ہیں۔ کیا پوری کی پوری قوم کو ایسے دباؤ میں رکھنا "اکراہ" نہیں ہے؟ عالم عرب کے بعض مفکرین اور غلو کا شکار لوگوں نے باقاعدہ یہ مہم چھیڑی ہے کہ عرب ممالک خصوصاً مصر و شام کی عیسائی آبادی کی عبادت گاہیں ڈھانا (بلکہ اور ناگفتہ بہ اہانت آمیز اقدامات) مسلمانوں کا دینی فریضہ ہیں۔ کس قدر زیادتی اور خود غرضی کی بات ہے کہ یورپ میں جانے والے مسلمان وہاں اپنے لیے عبادت گاہیں قائم کریں، گرجے مسجدوں میں تبدیل کرنے کی اجازت مانگیں اور ان کے قیام میں حکومت سے مراعاتیں لیں اور اپنے ملکوں میں مطالبہ کریں کہ گرجے اور عبادتگاہیں ہر گز نہ قائم کی جائیں۔ [1]

غیر مسلم معابد کا تحفظ اور فقہاء اسلام

غیر مسلم اهل الذمہ کی عبادت گاہوں کے تحفظ کے معاملے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ درج ہو چکا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں میں جب کبھی کسی متعصب فرماں روا نے اس کے خلاف کیا یا کرنا چاہا تو علماء و فقہاء اسلام نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی اور بغیر کسی خوف و طمع کے اس معاملے میں اسلامی تعلیمات کی نشاندہی کی۔ مثلاً

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں ۱۶۹ ھ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا، تو حضرت مریم کے گرجا اور چند گرجوں کو منہدم کرا دیا، ہادی نے ایک سال کی خلافت کے بعد وفات پائی اور ہارون الرشید تخت نشین ہوا، اس نے علی کو معزول کر کے ۱۷۱ء میں

---

[1] ۔ حوالہ مذکور، ص:۶۳

موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ موسیٰ نے گرجوں کے معاملہ میں علما سے استفسار کیا۔ اس وقت مصر کے تمام علماء کے پیشوا لیث بن سعد تھے، جو بہت بڑے محدث اور نہایت مقدس اور بزرگ تھے۔ انہوں نے علانیہ فتویٰ دیا کہ منہدم شدہ گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دیئے جائیں اور دلیل یہ پیش کی کہ مصر میں جس قدر گرجے ہیں خود صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تعمیر ہوئے تھے۔ چنانچہ تمام گرجے سرکاری خزانہ سے تعمیر کرا دیئے گئے۔[1]

سیرۃ النعمان میں ذمیوں کے حقوق کے معاملے میں فقہ حنفی کی فیاضی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے زیر بحث اشکال کے بارے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

۔۔۔۔البتہ امام ابو حنیفہؒ نے یہ حکم دیا ہے کہ اہل ذمہ اسلامی شہروں میں اپنی عبادت گاہیں نہ بنائیں لیکن ان کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ امن و امان میں خلل نہ ہو اور مسلمان رعایا جو اکثر عرب نسل سے تھی اور ناقوس کی صداؤں سے ان کے کان آشنا نہ تھے، فساد پر آمادہ نہ ہوں۔ اس حکم نے ذمیوں کے حق میں چنداں دقت بھی پیدا نہیں کی۔ مسلمانوں نے جو شہر آباد کیے وہ دو چار شہر سے زیادہ نہ تھے۔ باقی تمام ملک انہی شہروں سے معمور تھا جو غیر قوموں کے آباد کیے ہوئے تھے اور جہاں ذمیوں کو عموماً عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت تھی۔ اسلامی شہروں میں بھی یہ قید اس وقت تک قائم رہی جب تک فتنہ کا احتمال رہا۔ جب یہ خوف جاتا رہا تو ذمیوں کو عام اجازت مل گئی۔ چنانچہ بغداد میں جو خاص اسلامی شہر تھا سینکڑوں ہزاروں چرچ اور گرجے تعمیر ہوئے۔[2]

---

[1] - یوسف بن تغری، النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ (سنۃ ۱۷۱ھ)، المؤسسۃ المصریۃ، ۲/۶۲

[2] - سیرۃ النعمان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ت۔ن، ۲/۲۱۵

مشہور مستشرق سر تھامس آرنلڈ نے اموی عہد حکومت اور عباسی عہد حکومت میں اسلامی ریاست کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں جو بڑے بڑے اور عظیم الشان نئے گرجے تعمیر ہوئے ان کی تعداد دو درجن کے قریب بتائی ہے۔ ان نئے تعمیر شدہ گرجوں میں کئی ایک ایسے گرجا تھے جنہیں خود خلفاء اسلام نے تعمیر کرایا تھا۔[1]

علی ہذا القیاس دمشق کی جامع مسجد ایک گرجے کے متصل تھی جس کا نام یوحنا کا گرجا تھا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے عہد خلافت میں ضرورت کی وجہ سے چاہا کہ گرجا کو مسجد میں شامل کر لیں۔ لیکن عیسائیوں نے انکار کیا۔ امیر معاویہؓ مجبور رہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں عیسائیوں سے درخواست کی اور معاوضہ پیش کیا۔ عیسائی پھر راضی نہ ہوئے اور عبد الملک کو باز رہنا پڑا، ولید نے اپنے زمانہ خلافت میں عیسائیوں کے آگے ایک بڑی رقم پیش کی۔ وہ اسی طرح انکار کرتے رہے۔ ولید نے غصہ میں آ کر کہا کہ تم خوشی سے نہیں دیتے تو میں جبراً لے لوں گا۔ عیسائیوں نے کہا کہ جو شخص کسی گرجے کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ پاگل یا کوڑھی ہو جاتا ہے، ولید کو اس پر زیادہ غصہ آیا، خود اپنے ہاتھ میں کدال لے کر گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی۔ اور بالآخر گرجا مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں عیسائیوں نے اس تعدی کی شکایت کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دمشق کے عامل کو لکھ بھیجا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے وہ عیسائیوں کو واپس کر دیا جائے اس پر مسلمانوں کو نہایت رنج ہوا کہ ہم جس مسجد میں نماز پڑھ چکے اور اذانیں دے چکے، اس کو کیونکر ڈھائیں۔ آخر عیسائیوں کے پاس جا کر خوشامد کی اور کہا کہ آغاز فتح میں غوطہ دمشق کے جس قدر گرجے مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، اور اب تک ہیں، وہ سب واپس کر دیے جائیں گے اگر تم اس مسجد کو ڈھا دینے سے باز آؤ۔ عیسائی اس پر راضی ہوئے اور عمر بن عبد العزیزؒ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ انہوں نے عیسائیوں کی خواہش کے موافق مسجد کا منہدم کرنا روک دیا،

---

[1] ۔دیکھیے: دعوت اسلام، (باب سوم۔اردو ترجمہ)؛ ص: ۷۵-۷۶

اور ان کو غوطہ دمشق کے تمام گرجے دلا دیئے۔[1]

یوحنا کے مذکورہ گرجا کے حوالے سے سر تھامس آرنلڈ نے مسلمانوں کی کمال مذہبی رواداری کے حوالے سے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے مسلمان اور عیسائی اپنے اپنے طریقے کے مطابق اسی سال تک ساتھ ساتھ عبادت کرتے رہے۔ اس اجمال کی تفصیل آرنلڈ نے یوں لکھی ہے:

> دمشق کی نسبت لکھا ہے کہ ایک حصہ اس کا حملہ کر کے فتح ہوا اور دوسرے حصہ نے خود اپنے تئیں مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔ یعنی ایک اسلامی سردار تو شہر کے مشرقی دروازہ سے بزور شمشیر داخل ہوا اور دوسرا سردار مغربی دروازہ سے شہر میں گیا کہ حاکم دمشق اس کے سامنے اقبال اطاعت کرے۔ چونکہ دمشق پر ان دو طریقوں سے قبضہ ہوا۔ اس لیے جس قدر گرجا شہر میں تھے وہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں برابر تقسیم ہو گئے۔ سینٹ یوحنا کا کنیسہ بھی آدھا آدھا تقسیم ہوا اور اسی برس تک عیسائیوں اور مسلمانوں نے ایک چھت کے نیچے خدا کی عبادت کی۔ خلیفہ عبد الملک نے چاہا کہ کل گرجا کو مسجد بنا لے لیکن عہد نامہ کے شرائط کو دیکھ کر اس قصہ سے باز رہا۔ چونکہ گرجا میں عیسائی بلند آواز سے گایا کرتے تھے جس سے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوتی تھی اس لیے اور خلفاء نے بھی کثیر رقوم معاوضہ میں پیش کر کے کل گرجا پر قبضہ کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی مگر سنہ ۹۰ھ میں خلیفہ ولید نے وہ بات جبر سے حاصل کر لی جس کو اور خلفاء راستی سے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چند سال کے بعد ہی خلیفہ عمر ثانی نے عیسائیوں کی فریاد سن کر کہ ان کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ دمشق کے تمام گرجاؤں کو جو لڑائی کے زمانہ میں ضبط ہوئے تھے عیسائیوں کے لیے

---

[1] ۔دیکھیے: بلاذری، فتوح البلدان، (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، کراچی، ص: ۱۹۰

واگذاشت کر دیا۔[1]

جزیرۃ العرب اور غیر مسلم معابد

پانچویں باب میں یہ بحث تفصیل اور مکمل حوالہ جات کے ساتھ درج ہو چکی ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم اہل الذمہ کو ہر جگہ، ہر شہر، ہر قریہ اور ہر بستی میں رہائش و سکونت رکھنے کی اجازت ہے مگر وہ جزیرۃ العرب اور حجاز کے مخصوص علاقے اور حدود اربعہ میں مستقل رہائش نہیں رکھ سکتے۔ اس حکم کی بنیادی وجہ کی بھی وہاں وضاحت ہو چکی ہے۔ اب غیر مسلم ذمیوں کو جب جزیرۃ العرب میں مستقل رہنے کی ہی اجازت نہیں تو انہیں معابد تعمیر کرنے کی اجازت کہاں سے ہو گی۔ اس لیے علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

> جزیرۃ العرب کے کسی شہر یا دیہات میں کوئی گرجا، یہودی عبادت گاہ یا آگ پوجا کی جگہ باقی نہیں رہنے دی جائے گی۔ اسی طرح کسی حال میں بھی شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت بھی جائز نہ ہو گی کیونکہ ان سب چیزوں کی بنیاد اھل الذمہ کی مستقل سکونت ہے اور انہیں جزیرۃ العرب میں مستقل سکونت کی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کا بنیادی تقاضا ہے کیونکہ وہ آنجناب علیہ السلام کی ولادت اور آپ ﷺ کی پرورش کی جگہ ہے اور اس چیز کی طرف رسول اللہ ﷺ نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ ارض عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔[2]

---

[1] ۔دعوت اسلام، (اردو ترجمہ از محمد عنایت اللہ دہلوی) ص:٦٨

[2] ۔دیکھیے: شرح السیر الکبیر، ٣/ ٢٥٧؛ نیز مرغینانی، الہدایہ (مع الدرایۃ۔ کتاب السیر)، ٢/ ٥٨٢

پانچویں فصل

شخصی وعائلی معاملات میں آزادی

مذہبی رواداری — اسلام کی شاندار روایت

اسلام نے اپنے غیر مسلم شہریوں / ذمیوں کو جو مذہبی آزادی دی ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے شخصی و عائلی معاملات (نکاح طلاق، مہر، عدت، حیض و نفاس، میراث، ھبہ، وقف، نسب، حضانت، حق پرورش، نفقہ اور وصیت وغیرہ) چاہے اسلامی اور شرعی نقطہء نظر سے ناجائز بلکہ حرام ہی کیوں نہ ہوں، اپنے مذہبی عقیدہ و قانون کے مطابق سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ریاست و حکومت ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔ اسلام کی اس وسیع الظرفی، کمال برداشت اور حد درجہ رواداری کے حوالے سے فقیہ العصر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے ایک قابل ذکر نکتہ بیان کیا ہے۔ اپنی معروف کتاب "غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی" کی تیسری فصل میں "تسامح فرید" (منفرد درگزر، رواداری) کا عنوان قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دینی و فکری رواداری / نرمی کے کئی درجے اور مراتب ہیں۔ اس معاملے میں رواداری کا ادنیٰ ترین درجہ و مرتبہ یہ ہے کہ آپ اپنے مخالف کو اس کے دین اور عقیدہ کی آزادی دے دیں اور اسے اپنے دین میں زبردستی داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔۔۔ درمیانے درجے کی رواداری یہ ہے کہ آپ اپنے مذہبی مخالف کو اس کے اختیار کردہ دین و مذہب میں اعتقاد رکھنے دیں اور پھر اسے نہ تو کوئی ایسا کام چھوڑنے پر مجبور کریں جسے وہ ضروری سمجھتا ہے اور نہ کوئی ایسا کام کرنے پر مجبور کریں جسے وہ حرام اور ناجائز سمجھتا ہے۔۔۔ رواداری کا اس سے بھی بلند تر درجہ یہ ہے کہ آپ اپنے مخالفین پر ان امور

میں بھی سختی نہ کریں جنہیں وہ تو اپنے دین و مذہب میں حلال سمجھتے ہیں مگر آپ کے عقیدہ کے مطابق وہ آپ کے دین و مذہب میں حرام ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے ذریعے مسلمان اہل الذمہ مخالفین کے معاملے میں درگزر اور رواداری کے بلند ترین درجے پر فائز ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے ہر اس چیز کا احترام کیا جس کو غیر مسلم اپنے دین کے مطابق حلال سمجھتے تھے۔۔۔۔ حالانکہ ریاستی قانون و مذہب کا خیال کرتے ہوئے وہ ان چیزوں کو اس طرح حرام قرار دے سکتے تھے کہ ان پر تعصب کی کوئی تہمت بھی نہ لگتی۔ کیونکہ جس چیز کو کوئی دین" حلال" قرار دیتا ہے اس کا استعمال اس کے ماننے والوں پر "فرض" نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی مجوسی کا مذہب اگر اسے اپنی ماں یا بہن کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہے تو اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی مشقت میں پڑے بغیر کسی اور خاتون سے شادی کر لے۔ اسی طرح اگر ایک عیسائی کا مذہب سوَر کھانا حلال قرار دیتا ہے تو وہ شخص ساری زندگی سوَر کھائے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ کیونکہ گائے، بکریوں اور پرندوں کے گوشت کی صورت میں اس کے لیے وسیع گنجائش موجود ہے۔ یہی معاملہ شراب کا ہے۔ لہذا اسلام اگر اہل الذمہ سے یہ مطالبہ بھی کرتا کہ وہ مسلمان بھائیوں کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے محرم عورتوں سے شادی نہ کریں، شراب نہ پیئیں اور سوَر کھانا ترک کر دیں تو اس میں ان لوگوں پر کوئی تنگی نہ ہوتی۔ کیونکہ ان اشیاء سے ان کا احتراز نہ تو کسی دینی منکر کا ارتکاب ہوتا اور نہ ہی کسی مقدس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی۔ اس کے باوجود اسلام نے ایسا نہیں کیا اور غیر مسلم جن چیزوں کی حلت کا اعتقاد رکھتے تھے ان کے متعلق انہیں تنگ کرنا پسند نہیں کیا اور اس نے مسلمانوں سے کہہ دیا "اترکوھم ومایدینون" (انہیں اور وہ جو بھی

دین رکھتے ہیں، اسے چھوڑ دو)[1]

جبکہ مفتی محمد شفیعؒ اس بات کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں کہ:

ازدواجی و عائلی قوانین ہر قوم و ملت کے خالص مذہبی قوانین ہوتے ہیں جن کی تقدیس کو وہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہیں، اسی لیے جو حکومتیں کسی قوم کے مذہب میں مداخلت پسند نہیں کرتیں وہ ہر جگہ ہر قوم کے پرسنل لاء کی حفاظت کی ضمانت دیتی ہیں۔ شریعت نے اول دن سے اس معاملے میں ہر قوم و ملت کو پوری آزادی دی ہے کہ ازدواجی و عائلی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں اور ان کے اس عمل کا یہاں تک تحفظ کیا ہے کہ اگر نکاح کے بعد زوجین مسلمان ہو جائیں تو ان کا بحالت کفر کیا ہوا نکاح برقرار اور اسلام میں بھی جائز سمجھا جائے گا۔[2]

مفتی صاحب کے درج بالا اقتباس میں جو یہ مذکور ہے کہ "اگر نکاح کے بعد زوجین۔جائز سمجھا جائے گا" تو یہ مسئلہ فقہ حنفی میں یوں منقول ہے:

واذا تزوج الکافر بغیر شھود اوفی عدۃ کافر وذالک فی دینھم جائز ثم اسلما اقرا علیٰ ذالک۔[3]

اور جب ایک کافر بغیر گواہوں کے یا کسی دوسرے کافر کی طرف سے عدت کے دوران ہی کسی کافر عورت سے شادی کر لے اور یہ بات (بغیر گواہوں کے یا عدت کے دوران نکاح) ان کے دین میں جائز ہو پھر وہ دونوں میاں بیوی اسلام قبول کر لیں تو ان

1۔ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، مکتبہ وھبہ، القاہرہ، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء، ص:۴۷-۴۸

2۔ جواہر الفقہ، ۲/ ۲۳

3۔ دیکھیے: مرغینانی، ہدایہ (کتاب النکاح باب نکاح اھل الشرک) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/ ۳۵۴؛ ابن ھمام حنفی کمال الدین (م ۶۸۱ھ) فتح القدیر، دار عالم الکتب، ریاض، سعودی عرب، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء، ۲/ ۵۰۲

کا سابقہ نکاح بر قرار رکھا جائے گا۔

صاحب ہدایہ نے زیر بحث معاملے میں امام ابو حنیفہؒ کی دلیل نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

ان اهل الذمة لا يلتزمون احكامنا فى الديانات وفيما يعتقدون خلافه فى المعاملات وولاية الالزام بالسيف وبالمحاجة وكل ذالك منقطع عنهم باعتبار عقد الذمة۔[1]

بے شک دینی معاملات میں اھل الذمہ ہمارے احکام (شریعت) کی پابندی نہیں کریں گے۔ اسی طرح جن معاملات میں ان کا عقیدہ اسلام کے خلاف ہے ان میں بھی شریعت کے پابند نہیں۔ اور تلوار یا مناظرہ اور بحث مباحثہ کے زور پر ان سے ان مسائل کی پابندی کرانا عقد ذمہ کی رو سے جائز نہیں۔

شخصی معاملات میں آزادی کی چند مثالیں

بہر کیف اھل الذمہ کے شخصی معاملات شادی بیاہ نکاح طلاق وغیرہ ان کے اپنے مذہبی قانون (Personal Law) کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ کیونکہ اس معاملے میں حکم یہ ہے کہ "نحن امرنا بان نترکہم ومایدینون"[2] ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم انہیں اور ان کے اس دین (طرز زندگی) کو چھوڑ دیں گے جسے وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ شخصی معاملات میں اسلام کا حکم ان پر لاگو نہیں ہو گا۔ ان معاملات میں اسلامی عدالت انہیں کے مذہبی قوانین کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح بلامہر کے نکاح یا زمانہ عدت کے اندر نکاح ثانی یا محرمات کے ساتھ نکاح اگر ان کی شریعت و مذہب میں جائز ہے تو جائز رکھا جائے گا۔ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک مرتبہ اس معاملے میں مشہور

---

[1] ۔ہدایہ (کتاب النکاح) مع شرح فتح القدیر، دار عالم الکتب، ریاض، ۲/ ۴۸۳

[2] ۔ حصکفی، الدر المختار، مطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق، مصر، ۱۳۲۴ھ، ۳/ ۲۸۰؛ مرغینانی، ہدایہ، (کتاب الوصایا باب وصیۃ الذمی)، ۸/ ۳۱۴

فقیہ، محدث، صوفی حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا تھا:

ما بال الخلفاء الراشدین ترکوا اهل الذمه وما هم علیه من نکاح المحارم واقتناء الخمور والخنازیر؟[1]

کیا بات ہے کہ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اهل الذمہ کو محرمات (شریعت میں حرام رشتوں) کے ساتھ نکاح اور شراب وسور رکھنے کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا تھا؟ اس کے جواب میں حضرت حسن بصری نے فرمایا:

انما بذلوا الجزیة لیترکوا وما یعتقدون وانما انت متبع ولست مبتدع والسلام۔[2]

بے شک انہوں نے جزیہ دینا اسی لیے قبول کیا تھا کہ انہیں ان کے اعتقاد کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی دی جائے گی۔ آپ کا کام شریعت اور خلفاء راشدین کی پیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ (بدعت) ایجاد کرنا۔ اسی طرح مجوسیوں کے شخصی معاملات سے متعلق حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کے ذریعے حضرت حسن بصریؒ سے ایک اور استفسار امام ابو یوسفؒ نے یوں نقل کیا ہے:

ما منع من قبلنا من الائمة ان یحولوا بین المجوس و بین ما یجمعون من النساء اللاتی لم یجمعهن احد من اهل الملل غیرهم؟

ہم سے پہلے خلفاء کو اس بات سے کس چیز نے روک دیا کہ وہ مجوسیوں کو ان خواتین کے ساتھ جماع و مباشرت سے روک دیتے جن کے ساتھ جماع کرنا ان کے سوا کسی بھی قوم وملت میں جائز نہیں؟ مذکورہ عامل نے حضرت حسن بصری سے جب یہ استفسار کیا تو آپ نے اسے بتایا کہ

ان رسول اللہ ﷺ قد قبل من مجوس اهل البحرین الجزیة

---

[1] ۔ سرخسی، المبسوط، دار الفکر بیروت، ۲۰۰۰ء، ۶۹/۵

[2] ۔ ابن ہمام حنفی، شرح فتح القدیر، (باب نکاح اهل الشرک)، دار عالم الکتب، ریاض، ۳۲۹/۷

واقرهم على مجوسيتهم وعامل رسول الله ﷺ العلاء بن الحضرمی، ثم اقرهم ابو بکر رضی اللہ عنہ ثم اقرهم عمر رضی اللہ عنہ بعد ابی بکر رضی اللہ عنہ واقرهم عثمان رضی اللہ عنہ بعد عمر رضی اللہ عنہ۔[1]

بے شک رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے مجوسیوں سے جزیہ لینا قبول فرمایا اور انہیں اپنے دین مجوسیت پر برقرار رکھا اور بحرین میں رسول اللہ ﷺ کے عامل حضرت علاء بن الحضرمی تھے۔ پھر انہیں حضرت ابو بکرؓ نے مجوسیت پر برقرار رکھا۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ نے اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے انہیں بدستور اپنے مجوسی دین (مجوسیت) پر قائم رہنے دیا۔

البتہ اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فریق مسلمان ہو تو پھر فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ مثلاً کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان آدمی کے نکاح میں تھی اور اس کا شوہر مر گیا تو اس عورت کو شریعت کے مطابق پوری عدت وفات گزارنی ہو گی۔ اگر عدت کے اندر وہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے گی تو ایسا نکاح باطل ہو گا۔[2]

علامہ ابن نجیم "احکام الذمی" کی تفصیل میں زیر بحث موضوع کے حوالے سے فرماتے ہیں:

ولا يتعرض لهم لو تناكحوا فاسداً۔

اگر اهل الذمہ فاسد نکاح بھی کریں تو ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

اس جملہ کی شرح میں علامہ حموی لکھتے ہیں:

كما لو طلق الذمي زوجته ثلاثا ثم تزوجها قبل ان تتزوج بآخر۔[3]

---

[1] ۔ کتاب الخراج (فصل فی المجوس وعبدة الاوثان واهل الردة)، ص: ۱۳۰-۱۳۱

[2] ۔ سرخسی، شمس الائمہ، المبسوط، ۵/۳۸-۴۱؛ بحوالہ مولانا مودودی، اسلامی ریاست، ص: ۵۸۷

[3] ۔ شرح الحموی مع الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۳/۸۵

مثلاً کوئی ذمی آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کے کسی دوسرے آدمی سے شادی کرنے (تحلیل) سے قبل ہی اس سے شادی کرے۔

جبکہ سید مودودی زیر بحث معاملے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لاء کا تعلق ہے تو وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جزء ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح و طلاق اور قوانین وراثت و تبنیت کو اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے نہ ٹکرتے ہوں، ان پر جاری کرے گی اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لاء کے نفاذ کو برداشت نہیں کرے گی جن میں ان کا براثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تو ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے۔ کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے کیونکہ یہ اخلاق انسانی کی مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (Criminal Law) سے بھی ٹکراتی ہے، جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون بھی ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے امور قیاس کر سکتے ہیں۔[1]

شخصی معاملات اور تنازعات میں فیصلے کا معاملہ

زیر بحث معاملے کے حوالے سے اس بات کی صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر اہل الذمہ اپنے شخصی معاملات و تنازعات میں اسلامی عدالت کی طرف رجوع کریں تو اسلامی عدالتیں ان کے تنازعہ میں اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کریں گی۔ چنانچہ ارشاد الہٰی ہے:

---

[1] ۔اسلامی ریاست، ص:۵۲۴

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔[1]

اور (اے نبی!) آپ ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

درج ذیل آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ کوئی معاملہ اسلامی عدالت میں لے آئیں تو قاضی کو اختیار ہے کہ چاہے تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دے اور اگر چاہے تو مقدمہ سننے سے انکار کر دے۔ فرمایا:

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔[2]

پس اگر یہ لوگ (اپنے مقدمات کے فیصلہ کے لیے) آپ کے پاس آئیں تو (آپ کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ یا ان سے اعراض فرمائیں اور اگر آپ ان سے اعراض کرتے (منہ پھیر لیتے) ہیں تو یہ ہرگز آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر آپ فیصلہ کرتے ہیں تو پھر ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کیجئے بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[3]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے مطابق اھل الذمہ کے شخصی معالات و تنازعات کے لیے الگ سے عدالتیں موجود تھیں۔ جن میں پادری حضرات جج ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلے

---

[1] - المائدہ، ۵:۴۹

[2] - المائدہ، ۵:۴۲

[3] - مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: بدائع الصنائع، ۲/۳۱۲؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/۵۳۵؛ الموسوعۃ الفقہیۃ (الکویت)، ۷/۱۳۷

کرتے تھے۔ چنانچہ موصوف نے اپنے ایک حاشیہ (Foot Note) میں لکھا ہے:

اسی بنیاد پر ذمیوں کے لیے الگ عدالتیں موجود تھیں کہ چاہیں تو ان سے رجوع کریں ورنہ اسلامی عدالتوں سے۔ مغربی مؤرخ آدم متز اپنی کتاب "الحضارة الاسلامیہ فی القرن الرابع الهجری" میں لکھتا ہے: چونکہ شریعتُ اسلامی صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص تھی اس لیے اسلامی ریاست غیر مسلموں اور ان کی مخصوص عدالتوں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ ان عدالتوں کے بارے میں ہمیں فقط اس قدر معلوم ہے کہ یہ کلیسائی عدالتیں تھیں جن کے سربراہ پادری حضرات ہی ہوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے قانونی موضوعات پر کئی کتابیں بھی تحریر کیں۔ جو نہ صرف شادی بیاہ اور میراث وغیرہ کے امور بلکہ عیسائیوں کے ساتھ خاص ایسے بے شمار قانونی معاملات کو زیر بحث لاتیں جن کا اسلامی ریاست سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ چونکہ ذمی کو اسلامی عدالتوں سے رجوع کرنے کی بھی اجازت تھی لیکن کلیسا اسے ناپسند کرتا تھا اس لیے ٹیموتیوس نے ۲۰۰ھ / ۸۰۰ء کے لگ بھگ مسیحی عدالتی احکام کے بارے ایک کتاب مرتب کی تاکہ کسی عیسائی کے لیے اسلامی عدالت سے رجوع کرنے کے لیے مسیحی قوانین کے فقدان کا عذر باقی نہ رہے۔[1]

غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کے برتاؤ کی وضاحت کرتے ہوئے زیر بحث مسئلے میں ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں:

قرآن میں یہ عجیب وغریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خود مختاری دی جائے حتی کہ نہ صرف عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون، اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ کرائیں۔ کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی

---

[1] - غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۴۴ (حاشیہ)

کئی آیتوں میں ذکر ہے۔ جن میں سے ایک آیت بہت ہی واضح ہے "ولیحکم اهل الانجیل بما انزل الله فیه"(۵ : ۴۷) یعنی انجیل والوں کو چاہیے کہ اس پر عمل کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبوی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات، قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے۔ اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی آزادی تھی۔[1]

مغربی مصنفہ Bat Ye'or اپنی کتاب The Dhimmi میں یکطرفہ عینک سے دیکھنے کے باوجود ریاست مدینہ کا ابتدائی اور مختصر تعارف کرواتے ہوئے اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ

> The Islamic power granted the subjected jewish and Christian peoples the right to collect taxes for their own communal institution, the right to administer justice in maters of personal law, freedom of religious education and worship and recognized the official status of the head of each community.[2]

اسلامی ریاست نے اپنی رعایا کے یہودی اور عیسائیوں لوگوں کو اس بات کا حق دیا کہ وہ اپنے مذہبی اداروں کے لیے فنڈز جمع کریں۔ شخصی قانون کے معاملات میں خود انصاف کا نظام قائم کریں۔ نیز انہیں مذہبی تعلیم اور عبادت کی آزادی دی اور ہر جماعت کے سربراہ کا سرکاری مرتبہ تسلیم کیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ دور خلفاء راشدین سے لے کر خلافت عثمانیہ اور مغل دور کے اقتدار کے زوال تک مسلمانان عالم اپنے غیر مسلم شہریوں کے لیے اپنے انہی اصولوں پر کاربند رہے۔ خلافت عثمانیہ کی زیر

---

[1] ۔ خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ص: ۳۱۲ (خطبہ نمبر ۱۲)

[2] - The Dhimmi, P:49

ولایت غیر مسلم شہریوں کے قانونی حقوق کے تحفظ کی بابت مفتی نذیر احمد ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کے اپنے ادارہ اسلامیہ کے علاوہ سلطنت میں مختلف ملتوں کا بھی جداگانہ نظام تھا۔ یہ ملتیں کلیسائی فرائض کے علاوہ پیدائش، اموات، نکاح، طلاق اور وصیت ناموں کا اندراج کرتیں، اپنے مذہب والوں کے شخصی قانون کے معاملات خود اپنی عدالتوں میں فیصل کرتیں اور اگر فریقین مقدمہ ایک ملت کے ہوتے تو ان کے دیوانی مقدمات کا فیصلہ بھی ان ہی عدالتوں میں ہوتا۔۔۔ سلطنت عثمانیہ نے صراحت کے ساتھ ملتوں کو تقسیم کر دیا تھا اور ان کی انجام دہی میں خود اپنی فوجوں سے ملتوں کی مدد کرتی تھی، ان میں سب سے اہم ملت روم تھی جس کے حلقہ میں وہ تمام عیسائی رعایا شامل تھی جو مشرقی یا یونانی کلیسا کی پیرو تھی، خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں آباد ہو اور اس کی مادری زبان کچھ بھی ہو۔ اس ملت کا قائد اعظم بطریق قسطنطنیہ تھا۔ جس کو سلطنت عثمانیہ کے عروج کے زمانہ میں زیادہ اقتدار حاصل تھا جتنا وہ سلطنت بازنطینی کے ایک عہدہ دار کی حیثیت سے رکھتا تھا۔ ملت روم کے علاوہ چند اور ملتیں بھی تھیں۔ مثلاً ملت ارمنی جو قسطنطنیہ کے گریگوری بطریق کے ماتحت تھی۔ ملت یہود جس کا افسر ربی اعظم تھا، اور رومن کیتھولک کا فرقہ جو یورپ کے ایک نمائندہ کے ماتحت تھا۔ سلطنت میں ایسے بہت سے رومن جو سلطان کی رعایا نہ تھے بلکہ مغربی طاقتوں مثلاً وینس، فرانس، ہالینڈ اور انگلستان کی رعایا تھے۔ یہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور یہیں مقیم ہو گئے تھے۔ انہیں بھی حکومت عثمانیہ کی طرف سے ان کے سفیروں اور قونصلوں کے ماتحت اسی قسم کے اختیارات دیئے گئے تھے، جس قسم کے دیگر ملتوں کو حاصل تھے اور یہ غیر ملکی باشندے بھی عیسائی رعایا کی طرح اپنے معاملات کا انتظام خود ہی کرتے تھے۔[1]

---

[1] توہین رسالت، اقلیتیں اور قانون تحفظ مذاہب، ص:۱۶۵

دیوانی، فوجداری اور مالی معاملات میں اسلامی قانون کی پابندی

یہاں اس امر کی صراحت بھی بے جا نہ ہو گی کہ مذکورہ بالا شخصی امور کے علاوہ دیوانی فوجداری اور مالی معاملات میں غیر مسلم شہری اہل اسلام کی مانند احکام شریعت اور اسلامی قانون کے پابند ہیں۔[1] اس معاملے میں فقہاء نے ایک عمومی قاعدہ کے طور پر کہا ہے:

لهم مالنا وعليهم ما علينا۔[2]

ان کے لیے بھی اجمالاً وہی حقوق ہیں جو ہمارے لیے ہیں۔ اور ان پر بھی وہی فرائض عائد ہوتے ہیں جو ہمارے اوپر ہیں۔

ابن نجیم نے "احکام الذمی" کی بحث میں اس عمومی قاعدہ کو "حكمه حكم المسلمين" (اس کا حکم مسلمانوں کے حکم کی مانند ہے)[3] کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم شہری چوری کرتا ہے تو اس پر چوری کی حد اسی طرح جاری ہو گی جس طرح کہ کسی مسلمان پر کی جاتی ہے۔ اسی طرح جس ذمی نے جرم قتل کا ارتکاب کیا۔ راہزنی کی واردات کی یا کسی سے مال چھینا، کسی عورت سے زنا کیا۔ کسی پاکباز عورت پر تہمت لگائی یا اسی طرح کا کوئی اور جرم کیا تو اسے گرفتار کر کے وہی سزا دی جائے گی جو ایک مسلمان کے واسطے مقرر ہے۔ یہی مثال مالی اور دیوانی معاملات جیسا کہ خرید و فروخت، اجارہ، شراکت، رہن، شفعہ، مزارعت، احیاء اموات، حوالہ، کفالہ اور اسی طرح کے معاہدات و تصرفات کی ہے جن کے ذریعے لوگ مال اور منافع کا تبادلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ تمام معاہدات جو مسلمانوں کے لیے جائز ہیں ذمیوں کے لیے بھی

---

1 - دیکھیے: ابن قدامہ، المغنی، ۸/۵۰۱؛ الموسوعۃ الفقہیہ کویت، ۷/۱۳۱؛ یوسف القرضاوی، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۴۳

2 - دیکھیے: کاسانی، بدائع الصنائع، ۶/۱۱۱؛ یوسف القرضاوی، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۴۴؛ الموسوعۃ الفقہیہ کویت، ۷/۱۲۷

3 - ابن نجیم، الاشباہ والنظائر (مع شرح حموی)، ۳/۸۳

جائز ہیں اور جو مسلمانوں کے لیے فاسد ہیں وہ ان کے لیے بھی فاسد ہیں۔ البتہ عیسائیوں کے ہاں سؤر اور شراب کو بہت سے فقہاء نے مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ چیزیں حلال ہیں تاہم ان پر پابندی ہے کہ وہ ان کا کھلے عام اظہار نہ کریں۔ علاوہ ازیں سود ان کے ہاں بھی حرام ہے لہٰذا اس کی انہیں اجازت نہیں دی جائے گی۔[1]

پوری دنیا میں یہ ایک مسلمہ قانونی اصول ہے کہ ہر ملک میں آباد مختلف مذاہب کے لوگوں کے شخصی نوعیت کے مسائل و معاملات تو ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصل کیے جاتے ہیں لیکن دوسرے تمام ملکی قوانین جو امن عام بر قرار رکھنے، معیشت کو مستحکم کرنے اور جرائم کی روک تھام کے سلسلہ میں ریاست وضع کرتی ہے، ان قوانین کی وضع میں ہر ملک اکثریتی آبادی کے رواجات کی پابندی کرتا ہے نہ کہ اقلیتوں (Minorities) کے رواجات کی۔ جبکہ رہائش پذیر اقلیتوں کو وضع شدہ فوجداری اور دیوانی نوعیت کے قوانین کا ایسا ہی احترام کرنا پڑتا ہے جیسا کہ ان ممالک کی اکثریتی آبادی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر قتل کے مقدمہ (Murder Case) میں امریکہ یا انگلینڈ میں رہائش پذیر یا وہاں کے مسلمان شہری یہ اصرار نہیں کرسکتے ہیں کہ وہاں قتل کے مقدمات (Murder Caes) ان کے مذہب کے مطابق قصاص اور دیت کے اسلامی قوانین کے مطابق فیصل کیے جائیں۔ اس قسم کا مطالبہ آج تک مغربی ممالک سے مسلمانوں نے اس لیے نہیں کیا ہے کیونکہ اس قسم کے مطالبات بین الاقوامی مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں۔

اس اصول کے تحت اسلامی ریاست میں عقود و معاملات اور دیوانی نوعیت کے احکام کی قانون سازی تو شریعت کے اصولوں اور قرآن وسنت کے مطابق ہوگی۔ البتہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہر نجی طور پر باہم معاملات اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق کرنا چاہیں بشرطیکہ وہ معاملہ یا کاروبار مفاد عامہ (Public Interest) کے خلاف نہ ہو (مثلاً سود) تو اسلامی قانون انہیں اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ

[1] ۔ملاحظہ ہو: کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/۱۱۳؛ الموسوعۃ الفقہیۃ (کویت) ۷/۱۳۱؛ سرخسی، شرح السیر الکبیر، ۲۶۰-۲۶۱/۳ ۲۵۱؛ یوسف القرضاوی، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۴۴-۴۵

علامہ ابن ھمام زیر بحث مسئلہ میں فرماتے ہیں:

بل لیسوا ملتزمین بعقد الذمة ما یعتقدون خلافه منها الا ماشرط علیهم ولذا لا نمنعهم من بیع الخمر والخنزیر ونکاح المحارم۔ [1]

بلکہ کفار (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں سے) عقد ذمہ کے بسبب ان کے مذہب سے متصادم احکام کا التزام نہیں کرایا جا سکتا۔ الا یہ کہ معاہدہ کے وقت ان پر یہ شرط لاگو کر دی جائے۔ اسی لیے ہم شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت اور محارم کے ساتھ نکاح سے انہیں منع نہیں کر سکتے۔

البتہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری نجی طور پر آپس میں وہ معاملات کر سکتے ہیں جو ان کے مذہب میں جائز ہیں۔ لیکن وہ امور جو ان کے مذہب میں بھی ممنوع ہوں یا مفاد عامہ (Public Interest) کے خلاف ہوں جیسے سودی کاروبار، شراب کی اعلانیہ خرید و فروخت تو ایسے معاملات کی انہیں اجازت نہیں دی جائے گی۔ صاحب ہدایہ نے زیر بحث معاملے میں امام ابو حنیفہؒ کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

فانا امرنا بان نترکهم وما یدینون فصاروا کاهل الحرب بخلاف الزناء لانه حرام فی الادیان کلها والرباء مستثنیٰ عن عقودهم لقوله علیه السلام الا من اربی فلیس بیننا وبینه عهد۔ [2]

ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم انہیں اور جو چیزیں ان کے دین میں داخل ہیں، ان کو چھوڑ دیں۔ پس وہ اپنے مذہب پر عمل کرنے میں ایسے ہی آزاد ہوں گے جیسے اھل الحرب آزاد ہیں۔ بخلاف زنا کے کیونکہ یہ تمام ادیان میں حرام ہے اور جہاں تک سودی لین دین کا تعلق ہے تو وہ ان کے عقود و معاملات سے نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے مستثنیٰ

---

1 - ابن ھمام حنفی، شرح فتح القدیر، (فصل تزویج النصرانی نصرانیۃ علی میتۃ)، مکتبہ شاملہ، ۷/ ۲۵۳

2 - مرغینانی، ہدایہ (کتاب النکاح "فصل فی الوکالۃ بالنکاح وغیرھا" سے متصل بلا عنوان فصل) المکتبۃ الاسلامیۃ، ۱/ ۲۱۴

ہے کہ جس نے سودی کاروبار کیا تو ہمارے اور اس کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔

اسی طرح حدود و تعزیرات کا نفاذ شخصی قوانین کی طرح شہریوں کے مذہب اور عقیدہ کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی تنفیذ کی بنیاد شخصی قوانین سے بالکل مختلف ہے۔ حدود و تعزیرات کے نفاذ کا دارومدار ریاست کی ولایت (Jurisdiction) پر ہوتا ہے۔ ریاست کے زیر ولایت جتنے افراد اور جتنے علاقے آتے ہیں ان سب پر یکساں حدود و تعزیرات کے قانون کا نفاذ ہو گا۔ اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ کیا عقیدہ اور کیا مذہب رکھتے ہیں۔ اس بنیاد پر اسلامی ریاست کے تمام شہری مسلمان ہوں یا غیر مسلم سب اس قانون کے احاطہ کار میں شامل ہوتے ہیں۔ فوجداری معاملات میں رسول اللہ ﷺ نے کس طرح ان کے درمیان فیصلہ فرمایا۔ اس کی ایک نظیر امام بخاریؒ نے یوں نقل کی ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ بے شک یہود (کے کچھ آدمی) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے بیان کیا کہ ان کے ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: تم لوگ رجم (سنگساری) کے بارے میں توراۃ کے اندر کیا حکم پاتے ہو؟ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ہم زانی لوگوں کی تذلیل کرتے ہیں اور انہیں جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام بولے: تم نے جھوٹ بولا بے شک توراۃ میں رجم کا حکم ہے۔ تو وہ توراۃ لائے اور اسے (حضور ﷺ کے سامنے) کھولا مگر ایک آدمی نے ان میں سے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ لیا اور اس آیت کے ماقبل اور مابعد عبارت پڑھ دی۔ اس پر عبداللہ بن سلام نے کہا: اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس کے نیچے رجم کی آیت موجود تھی۔ اب بولے اے محمد (ﷺ) اس نے سچ کہا واقعی اس میں رجم کی آیت (حکم) موجود ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے رجم (سنگسار) کرنے کا حکم فرمایا اور وہ دونوں (زانی اور زانیہ) رجم کر دیے گئے۔ (حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں) میں نے دیکھا کہ وہ آدمی اس عورت کو پتھروں سے بچانے کے لیے ڈھانپ رہا ہے۔[1]

---

[1] ۔ الجامع الصحیح (کتاب المحاربین من اھل الکتاب والردۃ باب احکام اھل الذمۃ الخ)، ۲/۱۰۱۱، رقم: ۶۸۴۱

باب ہفتم

غیر مسلموں کے سیاسی و انتظامی حقوق

....

سیاسی حقوق کی تعریف

سیاست کی تعریف ہے:

السیاسۃ القیام علی الشئ بما یصلحہٗ۔1

سیاست کسی چیز کی اصلاح و درستگی کے لیے درکار تمام وسائل کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔

اس تعریف کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء قانون نے سیاسی حقوق کی تعریف یوں کی ہے:

ھی الحقوق التی یکتسبھا الشخص باعتبارہ عضوا فی ھیئۃ سیاسیۃ کحق تولی الوظائف العامۃ وحق الانتخاب وحق الترشیح۔2

وہ حقوق جنہیں ایک شخص کسی سیاسی ھیئت و نظم کا فرد ہونے کے اعتبار سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے عام سرکاری عہدوں پر تعینات ہونے کا حق، انتخاب (میں حصہ لینے) کا حق اور ترقی پانے کا حق۔

سیاسی حقوق کی ایک تعریف یوں بھی کی گئی ہے:

---

[1] ۔ابن منظور، لسان العرب (مادہ سوس) دار صادر بیروت، ۱۰۸/۶؛ ابن الاثیر، النہایہ (مادہ سوس)، ۱۹۲/۲؛ ملا علی قاری۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ت۔ن، ۲۰۶/۷

[2] ۔عبد الکریم زیدان، احکام الذمیین والمستامنین، ص:۶۷

هی الحقوق التی یساهم الفرد بواسطتها فی ادارة شؤن البلاد او فی حکمها۔[1]

وہ حقوق جن کے واسطہ سے آدمی ملکی معاملات چلانے اور اس کی حکومت میں حصہ دار بنتا ہے۔

آسان لفظوں میں ہم سیاسی حقوق کی یہ تعبیر بھی کر سکتے ہیں کہ وہ حقوق جن کی بدولت ملک میں رہنے والا ہر عاقل بالغ شہری ملک کے نظم ونسق میں حصہ لے سکتا ہے۔ ملکی سیاست میں حصہ لے سکتا ہے۔ سیاسی جماعت بنا سکتا ہے اپنے کسی لیڈر کا انتخاب کر سکتا ہے۔ حکومت پر تنقید کر سکتا ہے اور اس کا احتساب کر سکتا ہے۔ پروفیسر اے کے حمید رائے اپنی کتاب Principles of political Science میں سیاسی حقوق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> Political rights, accordingly are the means by which an adult citizen is entitled by the constitution and laws of the state to participate in the government of his country.[2]

> سیاسی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی بدولت ایک بالغ شہری ریاست کے آئین اور قانون کی رُو سے اس بات کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی گورنمنٹ (حکومتی نظم ونسق) میں حصہ لے سکے۔

ان سیاسی حقوق کے حوالے سے اسلام کا نقطہء نظر کیا ہے؟ غیر مسلم شہریوں کو وہ کس حد تک اور کتنے حقوق دیتا ہے؟ ان حقوق کے بارے اسلام کی بنیادی پالیسی کیا ہے؟ زیر نظر باب میں اسی قسم کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

1 - حوالہ مذکور

2 – Principles of Political Science, Aziz Publishers Lahore, 1982, P:269

پہلی فصل

غیر مسلموں کا مسلمانوں کے مساوی الحیثیت بننے سے خود انکار

اسلامی ریاست جیسا کہ تیسرے باب میں تفصیل سے گزرا، ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہوتی ہے۔ اس میں حاکم اعلیٰ اور مقتدر مطلق اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے ذریعے اپنی حاکمیت کا ایک عملی نمونہ بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ایسی ریاست کے تمام شہریوں / عوام کی دو حیثیتیں ہیں۔ پہلی حیثیت انسان ہونے کی اور دوسری حیثیت مسلمان یا غیر مسلم ہونے کی۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے تو یہ خالق کائنات کی عطا کردہ اور متعین کردہ ہے۔ جبکہ دوسری حیثیت انسان کی اپنے ارادہ و شعور اور مرضی سے اختیار کردہ ہے۔ پہلی حیثیت کے حوالے سے مسلم اور غیر مسلم تمام شہریوں میں کامل مساوات ہو گی۔ رنگ، نسل، قبیلہ، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر ان کے حقوق میں کوئی امتیاز و تفریق نہ ہو گی۔ اسلام کے نزدیک مذکورہ بالا چیزوں کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق بالکل غلط اور بے اصل چیز ہے۔ قرآن مجید کی رو سے[1] تمام انسانی برادری امت واحدہ اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے۔ اللہ کریم چونکہ کافر و مسلمان سب کا خالق اور رب العالمین ہے اس لیے اس نے اپنی انسانی مخلوق کے لیے جو حقوق مقرر کیے ہیں ان میں مسلم و غیر مسلم سب "مساوی الحیثیت" ہیں۔ اس نے جس طرح مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو اور دیگر بنیادی حقوق کے تحفظ کا حکم دیا ہے اسی طرح غیر مسلموں کے جان و مال، عزت و آبرو اور دیگر تمام بنیادی و انسانی حقوق کا تحفظ بھی لازم ٹھہرایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل گزشتہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا کو جس قدر حقوق دیے ہیں، وہ ان کو خود اپنی قومی اور ہم مذہب

---

[1] ۔ دیکھیے: سورۃ النساء: ۴:۱؛ سورۃ الانبیاء ۲۱:۹۲؛ سورۃ الزمر ۳۹:۴ وغیرہ

حکومت میں بھی حاصل نہ تھے۔ اسلام سے پہلے دنیا میں جتنی حکومتیں تھیں ان میں ان کی ہم قوم محکوموں کے حقوق بھی نہ تھے۔ ان کی حیثیت غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ ان کا کام اپنا خون پسینہ بہا کر حاکموں اور جاگیرداروں کے لیے سامان عیش فراہم کرنا تھا۔ ان کو ادنیٰ ادنیٰ قصور پر نہایت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اچھوتوں کا طبقہ اب تک اس کی یادگار باقی ہے۔ یہی حال ایران وروم کی مہذب دنیا کا تھا۔ جس کی تفصیل زیر بحث موضوع سے متعلق نہیں۔[1]

جہاں تک انسانوں کی دوسری حیثیت یعنی مسلمان یا غیر مسلم ہونے کا تعلق ہے، تو یہ ان کی عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر اپنی اختیار کردہ ہے۔ یہ تقسیم انہوں نے خود کی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے تو سب انسانوں کو امت واحدہ بنایا تھا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔[2]

لوگ (اعتقادی طور پر پہلے) ایک امت تھے۔ (پھر اختلاف کے باعث گروہوں میں بٹ گئے) تو اللہ نے (ان کی طرف) انبیاء کو بھیجا جو (اہل ایمان کو) خوشخبری سنانے والے اور (کفار کو عذاب آخرت سے) ڈرانے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ اس نے کتب حق بھی نازل فرمائیں۔ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان (دوسرا باب: قرون وسطی میں یورپ کی اخلاقی ومعاشی حالت)، ص ۷۹ تا ۸۱

[2] - البقرہ، ۲:۲۱۳

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۔[1]

اور تمام انسان (دینی اعتبار سے) ایک ہی امت تھے پھر انہوں نے اختلاف کیا (اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے)

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ اعتقادی و مذہبی اعتبار سے انسانی برادری کی تقسیم خود انسان کی سرکشی اور بغاوت (بغیاً بینهم) کے باعث ہوئی۔ اللہ کریم نے انسان کو وحدت کے رشتے میں پرونے کے لیے مختلف اوقات میں اپنے برگزیدہ نمائندے (انبیاء کرام) بھی پیغام ہدایت دے کر بھیجے مگر انسان اپنی بدبختی اور ہٹ دھرمی کی بنا پر دوبارہ "امت واحدہ" نہ بن سکے۔ اللہ کریم کا یہ پیغام آج بھی قرآن مجید کی صورت میں تمام لوگوں کو اتحاد و یکجہتی اور امت واحدہ بننے کی دعوت دے رہا ہے۔ قرآن مجید کسی خاص قوم اور مخصوص علاقے کی ہدایت وراہنمائی کے لیے نہیں بلکہ "هدی للعالمین" بن کر اترا ہے۔ اسی طرح اللہ کے آخری رسول "رحمة للمسلمین" بن کر نہیں بلکہ "رحمة للعالمین" بن کر تشریف لائے ہیں۔ اسلام نے اہل ایمان کے لیے جو حقوق متعین کیے ہیں وہ دراصل پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ قرآن مجید کی آج بھی دعوت یہ ہے کہ ہر انسان ایمان لاکر اور اسلام قبول کر کے ان حقوق کا مستحق بن جائے۔ مسلمان ہنود و یہود کی طرح کسی نسل یا خاص قوم کا نام نہیں، ایمان لانے والوں کا نام ہے۔ اس لیے کسی بھی خطے، رنگ و نسل اور زبان سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی انسان جوں ہی توحید و رسالت کا اقرار کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر پشتینی مسلمانوں کی طرح ان تمام حقوق کا مستحق بن جاتا ہے جو خدا نے اہل ایمان کے لیے مقرر کیے ہیں۔

۹ھ میں شاہان حمیر نے جب اپنے اسلام قبول کرنے کی اطلاع بھجوائی تو جواب میں نبی رحمت ﷺ نے جہاں انہیں بنیادی ارکان اسلام (نماز زکوۃ وغیرہ) کی تعلیم و تفصیل سے آگاہ فرمایا وہاں یہ صراحت بھی فرمائی کہ:

[1] ۔یونس، ۱۰:۱۹

ومن ادى ذالك واشهد على اسلامه وظاہر المؤمنين على المشركين فانه من المؤمنين له مالهم وعليه ماعليهم وله ذمة الله وذمة رسوله وانه من اسلم من يهودى او نصرانى فانه من المؤمنين له مالهم وعليه ماعليهم۔[1]

اور جس آدمی نے ان ارکان کو بجا لا کر اپنے اسلام کی گواہی دی اور مشرکین کے مقابلے میں اہل ایمان کی مدد کی تو بے شک وہ مؤمنین میں سے ہے۔ اس کے وہی حقوق ہیں جو اہل ایمان کے ہیں اور اس پر لازم بھی وہی چیزیں ہوں گی جو ان اہل ایمان پر ہوتی ہیں اور اس کے لیے اللہ کا ذمہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے۔ اور کوئی یہودی یا نصرانی اسلام قبول کرے گا تو وہ بھی مؤمنین کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کے بھی وہی حقوق اور فرائض ہوں گے جو مؤمنوں کے ہیں۔

منذر بن ساوی کو بھی حضور اکرم ﷺ نے یہی بات لکھی تھی کہ جو آدمی اسلام قبول کرلے "**له مالنا وعليه ماعلينا**"[2] (تو اس کے وہی حقوق و فرائض ہوں گے جو ہمارے ہیں)۔ اسلام کی زیر بحث سوچ اور طرز عمل کے بارے میں صلاح الدین لکھتے ہیں:

اسلام کا یہ پہلو تو مطعون کیے جانے کے بجائے سراہے جانے کے قابل ہے کہ وہ اپنی حدود ریاست میں اللہ کے باغیوں اور غداروں کو نہ صرف امن و سکون سے رہنے کی اجازت دیتا بلکہ انہیں انسانی حقوق کے معاملے میں مسلمانوں کے مساوی حیثیت بھی دیتا ہے۔ ان کے درمیان فرق ہے تو صرف اتنا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی سیاسی حاکمیت کو تسلیم کرنے کی بناء پر اس کے نفاذ کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں جب کہ غیر مسلم اس

---

1 - ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۵/ ۸۱-۸۰؛ ابن اسحاق، السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۶۵۸-۶۵۹

2 - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۳۱

حاکمیت کو تسلیم نہ کر کے خود اپنے انکار کی بنا پر اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے گئے۔ وہ اگر اللہ پر ایمان لے آئیں تو خود بخود اس ذمہ داری کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہونے کے مستحق بن جائیں گے لیکن جب تک وہ اپنے انکار پر قائم ہیں انہیں مقتدر اعلیٰ اپنے احکام وہدایات کے عملی نفاذ کی ذمہ داری میں کیسے شریک کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا"[1] بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مؤمن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہے۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔[2]

مولانا امین احسن اصلاحی نے قومیت کے عمومی عناصر ترکیب اور عوامل (رنگ نسل وطن وغیرہ) کی تغلیط وتردید اور اسلام کے واحد بنائے قومیت ہونے کی بحث کے آخر میں نتیجہ کے طور پر جو کچھ لکھا ہے وہ زیر بحث موضوع سے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں:

اب تفصیل سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ غیر مسلم، اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں بن سکتے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس تفریق کا باعث کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قومیت کے ان وسیع تصورات کو جو اسلام پیش کرتا ہے اپنانے کی بجائے ایسے محدود تصورات پر اصرار کرتے ہیں جن سے امن وسلامتی کی بجائے زمین میں ہمیشہ فساد برپا رہے۔ اسلام ان کو نسل و نسب اور ملک وطن کی تنگ نالیوں سے نکال کر وحدت الٰہیہ، وحدت آدم اور وحدت فطرت انسانی کے عالمگیر اصولوں پر لانا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنی تنگ نظریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ بجائے اس کے کہ ان کی خاطر اپنے آپ کو ان تنگ نظریوں میں گرفتار کر دے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔[3]

---

[1] - حم السجدہ: ۳۲:۱۸

[2] - بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص: ۱۴۵

[3] - اسلامی ریاست، ص: ۹۹

سید مودودی نے بھی اسلامی ریاست کے شہریوں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

اسلام چونکہ ایک نظام فکر و عمل ہے اور اسی نظام کی بنیاد پر وہ ایک ریاست قائم کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی ریاست میں شہریت کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ پھر چونکہ راست بازی و حق گوئی اسلام کی اصل روح ہے، اس لیے وہ بغیر کسی مکر و فریب کے صاف صاف شہریت کی اس تقسیم کو بیان بھی کر دیتا ہے، دنیا کو دھوکا دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ زبان سے اپنے سب شہریوں کو یکساں قرار دے اور عمل میں ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرے بلکہ ان کے ایک عنصر کو انسانی حقوق تک دینے میں بے انصافی سے کام لے، جیسا کہ امریکہ میں حبشیوں کا اور روس میں غیر اشتراکیوں کا اور تمام دنیا کی لادینی جمہوریتوں میں قومی اقلیتوں کا حال ہے۔ شہریت کی دو قسمیں جو اسلام نے کی ہیں یہ ہیں: ایک مسلم اور دوسرے ذمی۔[1]

پھر ہر دو قسم کے شہریوں کے حقوق و فرائض کی مختصر وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ان دو قسم کی شہریتوں پر اور ان کی الگ الگ حیثیتوں پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ پہلے اس سلوک پر ایک نگاہ ڈال لے جو دنیا کی دوسری اصولی ریاستیں اپنے اصول کے نہ ماننے والوں سے، اور قومی ریاستیں اپنے حدود میں رہنے والی قومی اقلیتوں سے کر رہی ہیں۔ درحقیقت یہ بات پورے چیلنج کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک ریاست کے اندر اس کی بنیادوں سے مختلف بنیاد پر وجود رکھنے والوں کی موجودگی جو پیچیدگی پیدا کرتی ہے اس کو اسلام سے زیادہ انصاف، رواداری اور فیاضی کے ساتھ کسی دوسرے نظام نے حل نہیں کیا ہے۔ دوسروں نے اس پیچیدگی کو زیادہ تر دو ہی طریقوں سے حل کیا ہے یا تو انہیں مٹا دینے کی کوشش کی ہے یا شودر بنا کر رکھا ہے۔ اسلام اس کے بجائے یہ

[1] - اسلامی ریاست، ص:۳۵۱

طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انصاف کے ساتھ اپنے اصول کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک حد قائم کر دیتا ہے۔ جو ماننے والے ہیں ان کو پوری طرح اپنے اصولوں کا پابند کرتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان پر ڈال دیتا ہے اور جو ان اصولوں کو قبول نہیں کرتے ان کو صرف اسی حد تک پابند کرتا ہے جو ملک کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے اور انہیں ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنے کے بعد ان کے تمام تمدنی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔[1]

مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سورۃ القصص کی آیت نمبر ۴ "اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا" (واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اسکے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا) کے تفسیری نوٹ میں بھی زیر بحث اشتباہ کا ازالہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہاں کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اسلامی حکومت بھی تو مسلم اور ذمی کے درمیان تفریق کرتی ہے اور ان کے حقوق و اختیارات ہر حیثیت سے یکساں نہیں رکھتی۔ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ اس فرق و امتیاز کی بنیاد فرعونی تفریق کے برعکس نسل، رنگ، زبان، یا طبقاتی امتیاز پر نہیں ہے بلکہ اصول اور مسلک کے اختلاف پر ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان قانونی حقوق میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام تر فرق صرف سیاسی حقوق میں ہے۔ اور اس فرق کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اصولی حکومت میں حکمران جماعت صرف وہی ہو سکتی ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کی حامی ہو۔ اس جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جو حکومت کے بنیادی اصولوں کو مان لے اور ہر وہ شخص اس سے خارج ہو جاتا ہے جو ان اصولوں کا

[1] ۔حوالہ مذکور، ص: ۳۵۳-۳۵۴

منکر ہو جائے۔ آخر اس تفریق میں اور اس فرعونی طرزِ تفریق میں کیا وجہ مشابہت ہے جس کی بنا پر محکوم گروہ کا کوئی فرد کبھی حکمران گروہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس میں محکوم گروہ کو سیاسی اور قانونی حقوق تو درکنار بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ زندہ رہنے کا حق بھی ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ جس میں محکوموں کے لیے کسی حق کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ تمام فوائد و منافع اور حسنات و درجات صرف حکمران قوم کے لیے مختص ہوتے ہیں اور یہ مخصوص حقوق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو حکمران قوم میں پیدا ہو جائے۔[1]

جناب صلاح الدین صاحب زیر بحث معاملے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ بات عقل اور منطق کے صریح منافی ہے کہ خدا کو اپنا مقتدر اعلیٰ اور قرآن کو اپنا ضابطہ حیات اور دستور مملکت ماننے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں کو بالکل یکساں حیثیت دے دی جائے۔ کیا امریکہ برطانیہ روس یا کسی اور ملک میں دستور سے وفاداری کا حلف اٹھانے اور اس سے اعلانیہ انکار کرنے والوں کو یکساں پوزیشن حاصل ہو گی؟ اس طرح کا انکار کرنے والوں کو تو ان ملکوں میں رہنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی اور غدار قرار دے کر پھانسی پر لٹکایا جائے گا یا جلا وطن کر دیا جائے گا۔ پھر اسلامی ریاست سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ جو لوگ اس کے مقتدر اعلیٰ کو مقتدر اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے اور اس کے دستور کو دستور نہیں مانتے، انہیں ماننے والوں کی صف میں شامل کر کے مساوی حیثیت دے دی جائے۔ آخر دنیا کا کون سا قانون یا اخلاقی ضابطہ اقراری اور انکاری کو مساوی الحیثیت قرار دیتا ہے۔[2]

---

[1] تفہیم القرآن، ۳/ ۶۱۳-۶۱۴

[2] بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ص: ۱۴۴

دوسری فصل

سیاسی یا سرکاری عہدے حق نہیں امانت ہیں

آج کل عمومی مشاہدہ یہی ہے کہ اہم سرکاری عہدے اور بڑے مناصب عزت و جاہ کے حصول اور کسب دنیا کا بڑا آسان اور انتہائی کامیاب ذریعہ سمجھے جاتے ہیں اور اس حوالے سے یہ تصور بھی عام ہے کہ ان کا حصول اہل ملک یا شہریوں کا حق ہے۔ اس وجہ سے ان کو حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال اور سر توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ ان مناصب سے چونکہ معاشرتی عزت اور مال و دولت دونوں کے حاصل ہونے کی یقین کی حد تک توقع ہوتی ہے اسی وجہ سے لوگ جواریوں کی طرح ان کے لیے بازی کھیلتے ہیں اور دین دنیا کی جو پونجی بھی پاس ہوتی ہے بسا اوقات ساری کی ساری اس داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اسلامی نقطہء نظر سے یہ سرکاری عہدے اور مناصب کسی بھی شہری کا چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، حق نہیں بلکہ امانت ہیں اور یہ انہی لوگوں کے سپرد کیے جائیں گے جو ان مناصب کے اہل اور اس منصب کے لیے درکار و مطلوب تمام شرائط کے حامل ہوں گے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔[1]

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان لوگوں کو لوٹاؤ جو ان کے اہل ہیں۔

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی اور بعض دیگر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

نزلت فی الامراء ان یؤدوا الامانة فیما ائتمنهم الله من امر

[1] ۔النساء،۴:۵۸

رعیتہ۔[1]

(یہ آیت امراء / حکمرانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے معاملے میں جس میں اللہ نے انہیں امین بنایا ہے، امانت، امانت والوں کے سپرد کریں)

اسی آیت کریمہ کی توضیح و تفسیر میں ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

فیجب علی ولی الامر ان یولی علی کل عمل من اعمال المسلمین اصلح من یجدہ لذالک العمال۔[2]

پس امیر / حاکم پر واجب ہے کہ وہ مسلمانوں کے کاموں (عہدوں) میں سے ہر کام (عہدے) پر اس کام کے لیے دستیاب افراد میں سے اہل ترین آدمی کو تعینات کرے۔

گویا سرکاری عہدے اور مناصب اہل لوگوں کو دینا ان کی امانت ان کے سپرد کرنا ہے، محض سیاسی، نسلی، وطنی، پارٹی، قرابت داری، دوستی، خاندانی یا کوٹہ سسٹم کی بنیاد پر کسی کو کوئی عہدہ و منصب دینا اس آیت کے منشاء کے خلاف ہے۔ مولانا مودودی کے بقول:

بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے رتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار

---

[1] ۔دیکھیے: تفسیر البحر المحیط، داراحیاء التراث العربی، بیروت-لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، ۳/ ۳۹۳؛ جصاص، احکام القرآن، ۳/ ۱۷۲؛ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۵/ ۱۶۷؛ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ص:۴

[2] ۔مجموع فتاوی شیخ الاسلام، حکومۃ سعودی عرب، ۱۳۹۸ھ، ۲۸/ ۲۴۶

تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کر دینا جو ان کے اہل ہوں یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت موجود ہو۔[1]

سرکاری عہدے کس طرح قومی امانت اور کتنی نازک ذمہ داری کا کام ہیں۔ جو ہر آدمی کے بس کا روگ نہیں، اس کا اندازہ درج ذیل احادیث سے لگایا جا سکتا ہے:

عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ الا تستعملنی؟ قال فضرب بیدہ علی منکبی ثم قال یا ابا ذر انک ضعیف وانها امانة وانها یوم القیامة خزی وندامة الا من اخذها بحقها وادی الذی علیه فیها۔[2]

حضرت ابو ذرؓ (غفاری) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا آپ ﷺ مجھے کسی علاقے کا عامل (یا کسی سرکاری عہدے پر) فائز نہیں فرمائیں گے؟ حضرت ابو ذر کہتے ہیں اس پر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر مارا پھر فرمایا۔ اے ابو ذر تو کمزور آدمی ہے اور یہ (امارۃ، سرکاری عہدہ) ایک امانت ہے اور بے شک یہ (امارۃ و عہدہ) قیامت کے دن رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہو گا۔ سوائے اس آدمی کے جس نے اسے اس کے حق کے ساتھ قبول کیا اور اس معاملے میں جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی، اسے کما حقہ ادا کیا۔

---

[1] - اسلامی ریاست، ص: ۶۴۷-۶۴۸

[2] - مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الامارۃ باب کراھیۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ)، ۲/۱۲۱، رقم: ۴۷۱۹؛ ابو عوانہ، مسند (کتاب الامراء)، ۴/۳۷۹، رقم: ۷۰۲۰ (باختلاف الفاظ) خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح (کتاب الامارۃ والقضاء۔ الفصل الاول)، ص: ۳۲۰، رقم: ۳۶۸۲

مشہور صحابی حضرت مقدام بن معد یکربؓ کو بھی نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح کندھے پر ہاتھ مار کر امارت قبول نہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔[1] اسی طرح حضرت ابو ہریرہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آنجناب ﷺ نے (پیشین گوئی کے طور پر) فرمایا:

انکم ستحرصون علی الامارة وستکون ندامة یوم القیامة فنعم المرضعة وبئست الفاطمة۔[2]

بے شک تم عنقریب امارۃ (گورنری، سرکاری عہدوں) کی حرص کرو گے حالانکہ یہ امارۃ قیامت کے روز سراپا ندامت کا باعث ہو گی۔ پس یہ امارت کس قدر بہترین دودھ پلانے والی اور کتنی بُری دودھ چھڑانے والی ہے۔ (یعنی اس کی بنیاد تو بڑی دلکش مگر اختتام اور انجام بڑا خطرناک ہے)۔

حضرت ابو ذرؓ سے مروی درج بالا حدیث کی شرح میں علامہ نووی لکھتے ہیں:

هذا الحديث اصل عظيم فی اجتناب الولايات لا سيما لمن كان فيه ضعف عن القيام بوظائف تلك الولاية واما الخزی والندامة فهو فی حق من لم يكن اهلا لها اوكان اهلا ولم يعدل فيها فيخزيه الله تعالیٰ يوم القيامة ويفضحه، ويندم علی ما فرط۔[3]

سرکاری عہدوں سے بچنے کے معاملے میں یہ حدیث بہت بڑی بنیاد ہے خصوصاً اس آدمی کے لیے جو اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو پوری طرح نہ نباہ سکتا ہو۔ اور قیامت کے

---

[1] - ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب فی العرافۃ)، ۲/۵۸، رقم ۲۹۳۳

[2] - بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الاحکام باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ)، ۲/۱۰۵۸، رقم: ۷۱۴۸؛ مشکوۃ المصابیح (کتاب الامارۃ والقضاء۔ الفصل الاول)، ص: ۳۲۰، رقم: ۳۶۸۱

[3] - نووی، شرح صحیح مسلم (مع الصحیح)، ۲/۱۲۱

دن یہ عہدہ اس آدمی کے لیے رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہو گا جو اس کا اہل نہ ہو یا اہل تو ہو مگر اپنے عہدہ سے انصاف نہ کرے تو قیامت کے دن اللہ اسے رسوا فرمائے گا اور اپنے عہدے کا حق ادا نہ کرنے پر وہ شرمندہ ہو گا۔

سرکاری عہدہ کتنی ذمہ داری کا کام ہے؟ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس مکتوب سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو آپ نے اپنے عامل حضرت ابوہریرۃؓ کو تحریر فرمایا۔ اس میں انہیں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو مستعدی سے بجالانے کی تاکید اور ہدایت فرماتے ہوئے آخر میں لکھا:

فانما انت رجل منهم غير ان الله تعالىٰ جعلك حاملا لاثقالهم۔[1]

بے شک تو عوام میں سے ایک فرد ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے تجھے ان کے بوجھ اٹھانے والا بنا دیا ہے۔

درج بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ تمام سرکاری عہدے اور مناصب ایک قومی امانت ہیں نہ کہ کسی شہری کا حق اور انہیں بلا امتیاز اہل لوگوں کے ہی سپرد کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس آدمی نے کسی شخص کو مسلمانوں کا عامل بنایا حالانکہ وہ شخص جانتا تھا کہ اس سے بہتر شخص موجود ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا زیادہ جاننے والا (زیادہ اہل) ہے تو اس آدمی نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی۔[2]

عہدے کی طلب کا شرعاً ممنوع ہونا

درج بالا سطور میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ سرکاری عہدے کسی شہری خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، کا حق نہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ

[1] ۔ ابن قیم، احکام اھل الذمہ، ۱/۱۶۶

[2] ۔ علی متقی ہندی، کنز العمال، ۶/۷۹

عن ابي موسیٰ قال دخلت علی النبی ﷺ انا ورجلان من بنی عمّی فقال احدهما یارسول الله امرنا علی بعض ما ولاک الله وقال الآخر مثل ذالک فقال انا والله لا نولی علیٰ هذا العمل احداً سأله ولا احداً حرص علیه وفی روایة قال لا نستعمل علی عملنا من ارادہ۔[1]

حضرت ابو موسیٰ (اشعریؓ) کہتے ہیں کہ میں اور میرے دو چچازاد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا: یارسول اللہ! اللہ نے آنجناب کو جن امور پر ولایت و حکومت عنایت فرمائی ہے، ان میں سے کسی معاملے پر مجھے بھی امیر (عامل- عہدیدار) مقرر فرمادیں اور دوسرے نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا! قسم بخدا ہم اس کام (سرکاری عہدے) پر کسی ایسے آدمی کو تعینات نہیں کرتے جو اس کا خود سوال کرے اور نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے۔ جبکہ ایک دوسری روایت کے مطابق مذکورہ مطالبہ کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ہم ایسے آدمی کو کسی سرکاری کام پر نہیں لگائیں گے جو خود اس کا ارادہ (خواہش ظاہر) کرے۔

سنن ابی داؤد میں یہ اضافہ ہے کہ جب انہوں نے سرکاری عہدوں کا مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ان اخونکم عندنا من طلبه" بے شک ہمارے نزدیک تم میں سے سب سے بڑا خائن وہ ہے جو کوئی عہدہ طلب کرے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں: "فلم یستعن بهما علی شیئ حتی

---

[1] ۔ مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الامارۃ باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا)، ۲/۱۲۰، رقم: ۴۷۱۷؛ ابوعوانہ، مسند (کتاب الامراء)، ۴/۳۷۸، رقم: ۷۰۱۶ - ۷۰۱۷؛ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الامارۃ والقضاء- الفصل الاول)، ص: ۳۲۰، رقم: ۳۶۸۳

مات" آنحضرت ﷺ نے ان میں سے کسی کو بھی کوئی عہدہ سپرد نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔[1]

یہ حدیث نبوی اس بات کی دلیل ہے کہ تمام سرکاری عہدوں پر تعیناتی حکومت کے لیے کسی بھی آدمی کا حق نہیں۔ کیونکہ اگر یہ حق ہوتا تو ان کے حصول کا مطالبہ مذکورہ حدیث کے مطابق رکاوٹ کا سبب نہ بنتا کیونکہ کسی صاحب حق کو جب وہ اپنے حق کا مطالبہ کرے یا اس کی حرص کرے تو اسے اپنے حق کے حصول سے منع نہیں کیا جا سکتا۔[2]

عہدہ کی طلب اور حرص کی معنوی بے برکتی بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبدالرحمنؓ بن سمرہ سے فرمایا:

لا تسئل الامارۃ فانک ان اعطیتها عن مسئلة وكلت فيها الى نفسك وان اعطيتها عن غير مسئلة اعنت عليها۔[3]

کبھی امارت کا سوال نہ کرنا کیونکہ اگر یہ عہدہ تیری طلب پر تجھے دیا گیا تو تو (اللہ کی طرف سے) اس معاملے میں اپنی ذات کے سپرد کر دیا جائے گا اور اگر تجھے یہ عہدہ بن مانگے دیا گیا تو اس پر (من جانب اللہ) تیری مدد کی جائے گی۔

سرکاری عہدوں کی طلب اور حرص پر نبی اکرم ﷺ نے کوئی عہدہ سائل کو کیوں نہیں عطا فرمایا، اس کی نفسیاتی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

جو لوگ عہدوں اور مناصب کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں اسلامی ماحول کے اندر وہ

---

[1] -ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب ماجاء فی طلب الامارۃ)، ۲/۵۸، رقم ۲۹۳۰

[2] -عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستامنین، ص: ۶۷

[3] -بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الاحکام باب من سال الامارۃ وکل الیہا)، ۲/۱۰۵۸، رقم: ۷۱۴۷؛ ابو عوانہ، مسند (کتاب الامراء)، ۴/۳۷۶ - ۳۷۸، رقم: ۷۰۰۶ - ۷۰۱۵ (مختلف طرق سے ۱۰ عدد روایات)

متہم اور خائن خیال کیے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا یہ فعل ہی ان کو اس عہدے کے لیے نااہل قرار دینے کے واسطے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اتنی بڑی آزمائش میں پڑنے کے لیے جو شخص اپنے آپ کو خود پیش کر رہا ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ اپنی ذمہ داری اور اس کے دوررس نتائج سے بالکل ناواقف ہے یا اس کی نیت میں فتور ہے اور وہ اپنی خواہش سے بے بس ہو گیا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو ایسا شخص امتحان میں پڑنے کے بعد ناممکن ہے کہ اپنے آپ کو ترغیبات کے فتنوں سے بچا سکے، جب کوئی آزمائش سامنے آ جائے گی اس کے قدم ضرور لڑکھڑا جائیں گے۔ اور اگر دوسری شکل ہے تو ایسا شخص پہلے مرحلہ ہی میں خائن اور بددیانت ہے، اس کو کوئی ذمہ داری سونپنا گویا چور کو کوتوال بنانا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں عہدہ کی طلب کو ایک مستقل دلیل نااہلیت قرار دے دیا گیا ہے۔[1]

---

[1] ۔اسلامی ریاست، ص: ۲۷۳

تیسری فصل

پالیسی ساز کلیدی عہدے اور غیر مسلم۔ شرعی نقطۂ نظر

گزشتہ تصریحات کے مطابق تمام سرکاری عہدے ایک خدائی امانت ہیں اور کسی بھی عہدیدار کا ان کے لیے اہل ہونا اور اس میں تمام مطلوبہ صفات کا پایا جانا شرط ہے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس پر تمام دنیا میں عملدرآمد ہوتا ہے کہ کوئی بھی اہم سیاسی یا سرکاری عہدہ عدل وانصاف کی رو سے صرف اسی آدمی کو دیا جاتا ہے جو اس کا اہل اور مطلوبہ شرائط کا حامل بھی ہوتا ہے۔ اب اسلامی ریاست میں بعض کلیدی عہدے ایسے ہیں جو شریعت کی تبلیغ وترویج اور پالیسی سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کے لیے عہدیدار کا صاحب ایمان اور مسلمان ہونا اولین شرط ہوتا ہے۔ تو اس قسم کے عہدے کا کسی غیر مسلم کے سپرد کردینا جہاں عقلی ونقلی اعتبار سے اس عہدے کے ساتھ ناانصافی ہے وہاں غیر مسلم عہدیدار کے ساتھ بھی ایک طرح کی زیادتی ہے کہ آپ اس سے وہ کام کرانا چاہتے ہیں جو اسکے عقیدہ ونظریہ کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ اسلام میں مذہب، حکومت اور سیاست جدا جدا نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے جسم وروح کی طرح وابستہ ہیں۔ اسلامی حکومت کا سب سے بڑا مقصد اسلامی نظام کا قیام اور اس کے احکام کا نفاذ ہے۔ اس لیے حکومت کے بہت سے شعبوں میں اسلامی احکام سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ مثلاً عدالت یا قضا کا محکمہ، دوسرے اسلام کے ابتدائی دور میں انتظامی اور فوجی شعبے مستقلاً الگ الگ نہیں تھے بلکہ اکثر صوبے کا حاکم اس صوبہ کی فوج کا افسر بھی ہوتا تھا یا کم سے کم اس کو فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ اس کو بعض مذہبی فرائض بھی ادا کرنا پڑتے تھے اس لیے غیر مسلم ان شعبوں میں کام نہیں دے سکتے تھے۔ فوجی خدمات سے وہ مستثنیٰ تھے اس کے بدلہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ لیکن جن شعبوں میں مذہبی احکام سے واقفیت ضروری نہیں تھی مثلاً دفاتر (سیکرٹریٹ)، ریونیو، پولیس وغیرہ تو ایسے شعبہ جات میں ابتداء ہی سے متعلقہ عہدہ کی صلاحیت واہلیت رکھنے والے غیر مسلم لوگ موجود تھے۔ جس کی

تفصیل آگے آرہی ہے۔

اسلامی ریاست ایک نظریاتی مملکت ہوتی ہے اور کسی بھی نظریاتی مملکت میں کلیدی قسم کے مناصب صرف انہی لوگوں یا شہریوں کو دیے جاسکتے ہیں جو اس کے بنیادی نظریے کو مانتے ہیں۔ نظریاتی مملکت میں قابلیت محض علمی قابلیت و اہلیت کا نام نہیں بلکہ اس میں اس نظریے کو جس پر مملکت قائم ہوتی ہے، جاننا اور اس کی اسپرٹ کو سمجھنا اور ایمانداری کے ساتھ اس کو عمل میں لانا بھی قابلیت ہی کا ایک لازمی جزو قرار دیا جاتا ہے۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو بتایا جائے کہ انگلستان میں کیا کوئی رومن کیتھولک بادشاہ ہو سکتا ہے؟ یا امریکہ میں کسی کمیونسٹ کو صدارت کا عہدہ دیا جاسکتا ہے؟ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر اسلامی ریاست کو بھی اس سلسلے میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔

اسلامی نظام حکومت میں بعض مناصب ایسے ہیں جن پر فائز آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ مثال کے طور پر اسلامی ریاست کے سربراہ یعنی خلیفۃ المسلمین کے لیے فقہاء اسلام نے جو شرائط وصفات بیان کی ہیں ان میں سب سے مقدم شرط وصفت اس کا مسلمان ہونا ہے۔ اب ظاہر ہے جس شہری میں یہ شرط موجود نہیں ہوگی وہ خلافت کا اہل بھی نہیں ہوگا۔ اسلامی ریاست اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ اس لیے شرعی و عقلی طور پر ضروری ہے کہ اس کا سربراہ اسلام کا عملی نمونہ ہو اور اپنے دینی فکر اور کردار کے لحاظ سے نمایاں اور ممتاز فرد ہو یا کم از کم ایک مؤمن صالح کی بنیادی شرائط پر تو پورا اترتا ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ۔[1]

اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول کی اور اپنے میں سے اہل اختیار کی۔

فقہاء مفسرین کے نزدیک "اولوالامر" سے مراد امراء و حکام ہیں۔[1] اور آیت میں "منکم" کے

---

[1] - النساء، ۴:۵۹

لفظ نے اس بات کی صراحت کر دی کی "اولوالامر" کا اہل ایمان میں سے ہونا شرط لازم ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیات کی رو سے [2] غیر مسلموں کو عام قومی معاملات میں شریک راز اور دوست بنانا جائز نہیں تو کسی غیر مسلم کو قائد اور خلیفہ بنانا کیسے جائز ہو گا۔ اسلامی حکومت کا سب سے بڑا مقصد دین اسلام کا نفاذ ہے تو جو شخص اس دین پر ایمان ہی نہ رکھتا ہو وہ اس کو نافذ اور رائج کیسے کرے گا۔ دنیا کی کوئی قوم ریاست کے بنیادی نظریے اور اس کے دستور اساسی سے انکار کرنے والوں کو ذمہ داری کے منصب پر نہیں بٹھا سکتی۔ یہی معاملہ مجلس شوریٰ یا آج کی اصطلاح میں قومی اسمبلی کا رکن بننے کا ہے۔ اس میں بھی مجلس شوریٰ کے ممبر کا ازروئے قرآنی آیت "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ "[3] (اور اے پیغمبر اہم امور میں ان سے مشورہ کیجیے)" وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ "[4] (اور ان کا ہر اہم کام باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے) مسلمان ہونا لازمی ہے۔

اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ کے فرائض میں اسلامی قوانین کی تشریح و تعبیر کے نئے مسائل میں اجتہاد سے کام لینا اور نفاذ اسلام کی عملی تدابیر پر غور و خوض کرنا بھی ہے تو جو شخص سرے سے مسلمان ہی نہ ہو تو اسے یہ اہم ترین ذمہ داری کیسے دی جا سکتی ہے؟ ہر نظریاتی ریاست کے ذمہ داروں کے لیے ریاست کے بنیادی نظریے پر یقین رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کے نمائندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ توحید و رسالت ختم نبوت اور قرآن و سنت کے قطعی احکام پر غیر متزلزل اعتقاد رکھتا ہو۔

اسی طرح وزیر تفویض (آج کی اصطلاح میں وزیر اعظم) کے لیے بھی مسلمان ہونا شرط ہے۔

علامہ ماوردی وزیر تفویض (وزیر اعظم) کے لیے درکار اوصاف و شرائط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] - دیکھیے: جصاص، احکام القرآن، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲/ ۲۶۴

[2] - مثلاً سورۃ آل عمران آیت نمبر ۲۸ اور آیت نمبر ۱۲۱؛ النساء آیت نمبر ۱۴۴؛ التوبہ آیت نمبر ۲۳ وغیرہ

[3] - آل عمران، ۳:۱۵۹

[4] - الشوریٰ، ۴۲:۳۸

ویعتبر فی تقلید هذه الوزارة شروط الامامة۔[1]

وزارت تفویض کے منصب پر تقرر کے لیے وہی شرائط اہلیت ہیں جو امام و خلیفہ کے لیے ہیں۔

الغرض وہ تمام کلیدی عہدے اور مناصب جن کی اہلیت کے لیے اسلام شرط ہے یا وہ عہدے نفاذ اسلام اور پالیسی سے متعلق ہیں تو وہ غیر مسلم شہریوں کے سپرد نہیں کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں فقہاء اسلام نے قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ

اما الاشغال والوظائف العامة فما يشترط فيه الاسلام كالخلافة، والامارة على الجهاد والوزارة وامثالهما فلا يجوزان يعهد بذالك الذمي ومالا يشترط فيه الاسلام كتعليم الصغار الكتابه وتنفيذ مايأمر به الامام اولاميريجوزان يمارسه الذميون۔[2]

جہاں تک عام سرکاری مناصب اور کاموں کا تعلق ہے تو جن میں اسلام شرط ہے مثلاً خلافت جہاد پر امارت، وزارۃ اور ان جیسے کلیدے عہدے تو اس قسم کا عہدہ کسی ذمی کے سپرد کرنا جائز نہیں اور جن مناصب اور عہدوں میں اسلام شرط نہیں مثلاً چھوٹے بچوں کو کتابت کی تعلیم اور امام یا امیر کے کسی حکم کو نافذ کرنا تو ایسے کاموں پر ذمیوں کو لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی غیر مسلموں کو سرکاری عہدوں کی تفویض کے حوالے سے فرماتے ہیں:

ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح ہر سرکاری عہدہ سنبھالنے کا حق حاصل ہے، باستثناء ایسے عہدوں کے جن پر دینی رنگ غالب ہو مثلاً امامت، سربراہی سلطنت، سپہ سالاری،

---

1 ۔ دیکھیے: الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص:۲۲؛ ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء، ص:۱۳

2 ۔ الموسوعۃ الفقہیہ (الکویت) ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۵ء، الطبعۃ الاولی، ۷/۱۳۱

مسلمانوں کے درمیان قضاء اور صدقات کی تقسیم وغیرہ۔ پس امامت یا خلافت دین و دنیا میں عمومی سربراہی اور رسول اللہ ﷺ کی خلافت ونیابت کا نام ہے لہذا مسلمان کے سوا کسی دوسرے آدمی کا اس معاملے میں نبی اکرم ﷺ کا خلیفہ ونائب بننا جائز نہیں۔ نہ ہی مسلمان کے سوا کسی غیر مسلم کے لیے اسلامی احکام کا نفاذ اور ان کی رعایت ممکن ہے۔ اسی طرح فوج کی قیادت بھی محض کوئی شہری و ملکی کام نہیں بلکہ اسلام میں عبادت کے اعمال میں سے ہے اس لیے کہ جہاد کا شمار افضل ترین اسلامی عبادات میں ہوتا ہے اور (علیٰ ہذا القیاس) قضاء سے مراد شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے کرنا ہے اور ایک غیر مسلم سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک ایسی چیز کے مطابق فیصلہ کرے جس پر اس کا سرے سے ایمان ہی نہیں۔ یہی مثال صدقات کی وصولی پر تقرر اور دیگر دینی امور کی ہے۔[1]

غیر مسلموں کو کلیدی اور تنفیذی قسم کے عہدے نہ دیے جاسکنے کے پیچھے اسلامی ریاست کے دستور قرآن و سنت کی تصریحات ہیں اور دنیا کی کوئی ریاست اپنے دستور و آئین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔ ان تصریحات کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔[2] انہی تصریحات کے مدنظر خلیفہ راشد امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عمال کو یہ خط لکھا تھا کہ:

اما بعد. فانه من كان قبله كاتب من المشركين فلا يعاشره ولا يوازره ولا يجالسه ولا يعتضد برأيه فان رسول الله ﷺ لم يأمر باستعمالهم ولا خليفته من بعده۔[1]

---

[1] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۲۳-۲۴

[2] ۔تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن قیم، احکام اہل الذمۃ، ۱/ ۱۶۴-۱۶۵

[1] ۔حوالہ سابق، ۱/ ۱۶۵

حمد و صلوٰۃ کے بعد، جس عامل کے ہاں پہلے سے مشرکین میں سے کوئی کاتب (سیکرٹری) ہو تو وہ اسے (حکومتی امور میں) اپنے ساتھ نہ رکھے نہ اسے وزیر (تفویض) بنائے اور نہ اسے اپنے پاس بٹھائے (یعنی بہت قرب نہ بخشے) اور نہ اس کی رائے پر (اندھا) اعتماد کرے بے شک رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں کیا تھا اور نہ آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلیفہ (حضرت ابو بکرؓ) نے۔

غیر مسلموں کو اہم سرکاری عہدے نہ دینے کے بارے میں حضرت عمر فاروقؓ کا طرز عمل عموماً کیا رہا۔ اس کا اندازہ درج ذیل روایات / واقعات سے لگایا جا سکتا ہے:

1) وسق رومی کہتے ہیں: میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کا غلام تھا، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے: مسلمان ہو جا۔ اگر تو اسلام قبول کرے گا تو میں تجھے مسلمانوں کی امانت کا کوئی کام سونپ دوں گا۔ کیونکہ میرے لیے یہ روا نہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی امانت کے کام پر متعین کروں۔ مگر میں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس پر وہ فرمایا کرتے "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ"[1] دین اختیار کرنے میں کوئی اکراہ نہیں ہے۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت آن پہنچا تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا: تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔[2]

2) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ حیرہ کا ایک عیسائی آدمی بڑا اچھا کاتب (حساب کتاب جاننے والا) اور خوشخط ہے۔ اگر آپ اسے اپنا میر منشی (سیکرٹری) رکھ لیں تو بہتر ہو گا۔ اس پر فرمایا "لا اخذ بطانة من دون المؤمن"[1] (میں اہل ایمان کو چھوڑ کر کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کے امور میں بھیدی نہیں بناؤں گا)

---

[1] - البقرہ، ۲۵۶:۲

[2] - ابو عبید، کتاب الاموال (عربی)، ص:۲۲ (پیرہ نمبر ۸۷) ؛ ابن قیم، احکام اھل الذمہ، ۱۶۵-۱۶۶

[1] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۷۹/۴

3) ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بارگاہ فاروقی میں ایک عریضہ بھیجا جس میں لکھا کہ بصرہ میں ایک نصرانی آدمی ہے جس کے سوا کوئی آدمی خراج / محصولات کا حساب کتاب صحیح طور پر لکھ نہیں سکتا۔ اور اس ضرورت کے تحت اس نصرانی کو محصولات کا نگران مقرر کرنے کی اجازت چاہیے۔ تو حضرت عمرؓ نے جوابی خط میں انہیں ایسا کرنے سے روکتے ہوئے لکھا "مات النصرانی والسلام" (وہ نصرانی فوت ہوگیا۔ والسلام) یعنی یہ فرض کرلو کہ وہ نصرانی مر گیا ہے۔ اس کی موت کی صورت میں جو انتظام تم کروگے وہ اب کرلو۔[1]

ابن قیم نے یہ عریضہ امیر معاویہؓ کی طرف منسوب کیا ہے جس کا جواب حضرت عمرؓ نے مذکورہ الفاظ میں دیا۔[2]

ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے مذکورہ جواب دیا تو حضرت ابو موسیٰؓ نے کہا: "یا امیر المؤمنین لی کتابتہ ولہ دینہ" اے امیر المؤمنین میرے لیے اس کی کتابت (سے کام لینا) ہے اور اس کے لیے اس کا دین ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا "لا اکرمھم اذا ھانھم اللہ ولا اعزھم اذا ذلھم اللہ ولا ادنیھم اذا قصاھم اللہ" جب اللہ نے انہیں (ان کے کفر کے) باعث قابل اہانت ٹھہرایا تو میں ان کی تکریم نہیں کروں گا اور جب اللہ نے انہیں ذلیل قرار دیا ہے تو میں ان کی عزت نہیں کروں گا اور جب اللہ نے انہیں (اپنی رحمت سے) دور کردیا ہے تو میں انہیں اپنے قریب نہیں کروں گا۔[1]

حضرت عمر فاروقؓ نے دین کے معاملے میں اپنے طبعی مزاج اور مخصوص سوچ و فکر کے پیش نظر اگرچہ زیر بحث معاملے میں عموماً سخت پالیسی اختیار کی تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انہوں نے حکومتی معاملات اور انتظامی مسائل میں غیر مسلم رعایا کو کبھی نزدیک بھی نہیں آنے دیا۔ حکومتی و انتظامی مسائل

---

[1] - قرانی، الفروق، ۳/ ۳۲

[2] - احکام اھل الذمۃ، ۱/ ۱۶۵

[1] - حوالہ مذکور

خصوصاً غیر مسلموں سے متعلقہ معاملات میں ان سے مشورہ بھی فرمایا کرتے تھے اور انہیں متعلقہ عہدے بھی دیے گئے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق میں "ذمی رعایا کے حقوق" کی بحث میں "ذمیوں سے ملکی انتظامات میں مشورہ" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے:

> ایک بڑا حق جو رعایا کو حاصل ہو سکتا ہے کہ انتظامات ملکی میں ان کو حصہ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ ہمیشہ ان انتظامات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا ذمیوں کے مشورے، استصواب کے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ عراق کا بندوبست جب پیش آیا تو عجمی رئیسوں کو بلا کر مال گزاری کے حالات دریافت کیے۔ مصر میں جو انتظام کیا اس میں مقوقس سے اکثر رائے لی۔[1]

حضرت عمرؓ اہل الذمہ سے صرف مشورہ ہی نہیں بلکہ لائق لوگوں کی قدردانی بھی کرتے تھے۔ چنانچہ کوفہ شہر میں بیت المال اور ایوان حکومت وغیرہ کی تعمیر کے بعد جب بیت المال میں چوری ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ ایوان حکومت مسجد سے ملا دیا جائے۔ چنانچہ روزبہ نامی ایک پارسی معمار نے جو تعمیرات کے کام پر مامور تھا نہایت خوبی اور موزونی سے ایوان حکومت کی عمارت کو بڑھا کر مسجد میں ملا دیا۔ سعد نے روزبہ کو انعام کے صلے میں دربار خلافت کو روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی بڑی قدردانی کی اور ہمیشہ کے لیے روزینہ مقرر کر دیا۔[1]

اسی طرح عہد فاروقی میں فوج میں بھی غیر مسلم رعایا کو داخل کیا گیا۔ علامہ موصوف نے حضرت عمرؓ کے "صیغہ فوج" کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کی فوج میں عجمی رومی ہندوستانی اور یہودی بھی داخل تھے۔ پھر بعض غیر مسلم فوجی افسروں کے نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی باقاعدہ تنخواہ مقرر تھیں۔ مزید لکھتے ہیں:

---

[1] -الفاروق، ۲/ ۲۶۳؛ ایک دوسرے مقام پر مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے: حوالہ مذکور ۲/ ۱۹۳-۱۹۴

[1] -حوالہ سابق، ۲/ ۲۱۶

یونانی اور رومی بہادر بھی فوج میں شامل تھے۔ چنانچہ فتح مصر میں ان میں سے پانچ سو آدمی شریک جنگ تھے اور جب عمرو بن العاصؓ نے فسطاط آباد کیا تو یہ جداگانہ محلے میں آباد کیے گئے۔ یہودیوں سے بھی یہ سلسلہ خالی نہ تھا۔ چنانچہ مصر کی فتح میں ان میں سے ایک ہزار آدمی اسلامی فوج میں شریک تھے۔ غرض حضرت عمرؓ نے صیغہ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لیے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی یہاں تک کہ مذہب وملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیئر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے، جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے۔[1]

غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائزنہ کرنے کی پالیسی اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور کسی حد تک کئی دوسرے عباسی خلفاء مثلاً منصور، رشید، مہدی، مامون متوکل اور مقتدر وغیرہ نے بھی اختیار کیے رکھی۔ تفصیل یہاں طوالت کا باعث ہو گی۔[2] چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ:

> اما بعد، مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تیرے سٹاف میں ایک نصرانی کاتب (سیکرٹری) بھی ہے جو اسلام کے مصالح میں تصرف کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ "اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی، ان میں سے جنھوں نے تمہارے دین (اسلام) کو کھیل ومذاق بنایا (اس کی توہین کی) انہیں اور کافروں کو دوست نہ بناؤ اور اگر تم سچے ایمان والے ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو (سورۃ المائدہ ۵:۵۷) جب میرا یہ مراسلہ تمہارے پاس پہنچے تو اس کاتب (حسان بن زید) کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو وہ ہمارا اور ہم اس کے ہیں، اور اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر

---

[1] ۔حوالہ مذکور، ۲/ ۲۲۹-۲۳۰

[2] ۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابن قیم، احکام اھل الذمہ، ۱/ ۱۶۲-۱۸۲

دے تو اسے عہدے سے ہٹا دیجیے اور کبھی کسی ایسے آدمی کو مسلمانوں کے مصالح سے متعلق عہدے پر تعینات نہ کرنا جو غیر مسلم ہو۔ اسی مراسلہ کے جواب میں مذکور کاتب (حسان) اسلام لے آیا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔[1]

علامہ شبلی نعمانی نے غیر مسلموں کو کلیدی عہدے نہ دیے جانے کی ایک انتظامی توجیہ اور ضرورت لکھی ہے اور اس سے پہلے مختصراً سیاسی و ملکی حقوق کے معاملے میں یورپ کے نظام سلطنت سے موازنہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ملکی حقوق کی نسبت یورپ کی مہذب حکومتوں نے فاتح و مفتوح میں جو حد فاصل قائم کی ہے، وہ اسلامی حکومتوں نے کبھی نہیں کی۔ اسلام نے یا اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زا (ملکی نژاد) نہ ہو اس کو فلاں قسم کے حقوق نہیں مل سکتے۔ یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں۔

پھر لکھتے ہیں:

اسلام کے آغاز میں ملکی اور فوجی عہدے مختلف نہ تھے۔ جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا تھا وہی سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ مناصب قضاء پر ہوتے تھے وہی ضرورت کے وقت فوج کے جرنیل مقرر ہو کر بھیج دیے جاتے تھے۔ تہذیب اور شائستگی کے تاریخ دان اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ سلطنت جب اول اول قائم ہوتی ہے تو اس کے مختلف صیغے مدت تک باہم مختلط رہتے ہیں۔ جس قدر تمدن زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر تقسیم عمل کا اصول زیادہ عمل میں آتا جاتا ہے اور ہر صیغہ جدا جدا صورت پکڑتا جاتا ہے۔ اسی کلیہ کے موافق اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی اس قسم کا

---

[1] ۔ مقالات (مذہبی)، ۱/ ۲۲۳۔

اختلاط و التباس رہا اور اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مفتوح قومیں ملکی انتظامات میں کم شامل ہو سکیں کیونکہ اس وقت جس قدر ملکی عہدے تھے ان میں فوجی مہمات بھی شامل تھیں اور اس وجہ سے غیر قومیں خود ان پر خطر خدمات کو گوارا نہیں کرتی تھیں۔[1]

عصر حاضر کے مفکرین میں سے سید مودودیؒ نے زیر بحث مسئلہ پر تفصیل سے اور کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ زیر نظر معاملے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہم ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہے وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں کو دی جاسکتی ہیں، جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان خدمات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی تمام نظم و نسق میں بڑے بڑے عہدوں پر بھی اہل الذمہ اپنی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کیے جاسکتے ہیں مثلاً کوئی چیز ان میں سے کسی شخص کے اکاؤنٹنٹ جنرل یا چیف انجنیئر یا پوسٹ ماسٹر جنرل بنائے جانے میں مانع نہیں ہے۔ اسی طرح فوج میں بھی صرف جنگی خدمات محفوظ ملازمتوں میں شمار ہوں گی باقی دوسرے فوجی شعبے جن کا تعلق براہ راست حرب و ضرب سے نہیں ہے ذمیوں کے لیے کھلے ہوں گے۔[1]

اسی طرح سید مودودیؒ اسلامی ریاست میں ذمیوں کی حیثیت کی بحث میں انہیں کلیدی مناصب کے نہ دیے جاسکنے کی عقلی وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسلامی حکومت میں کوئی غیر مسلم صدر ریاست، وزیر، سپہ سالار، قاضی اور ایسے کلیدی مناصب کا حامل نہیں بن سکتا جہاں وہ حکومت کی پالیسی میں حصہ دار ہو سکے۔

---

[1] - مقالات (مذہبی)، ۱/ ۲۲۳

[1] - اسلامی ریاست، ص: ۲۰۱

اس کی وجہ کوئی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایک نظریئے پر مبنی ہے اور اس میں یہ مناصب ایسے ہی شخص کو دیے جاسکتے ہیں جو اس نظریے کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور اس کی صحت وصداقت پر ایمان رکھتا ہو۔ اسلامی حکومت چونکہ خلوص اور ایمان داری پر قائم ہوتی ہے اس لیے وہ اپنی غیر مسلم رعایا میں بھاڑے کے ٹٹوؤں کی ذہنیت (Mercenary Spirit) پیدا کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس کے برعکس وہ ان سے کہتی ہے کہ اگر تم ہمارے نظریے اور اصولوں کو صحیح سمجھتے ہو تو ان کی صداقت کا اعلانیہ اقرار کرو، تمہارے لیے حکمران جماعت میں شامل ہونے کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور اگر تم ان کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو محض پیٹ اور جاہ طلبی کی خاطر اس نظام کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے نہ آؤ جسے عقیدۃً تم غلط سمجھتے ہو۔[1]

علی ہذا القیاس سید موصوف نے "ذمیوں کے حقوق" کی تفصیل میں فوجی خدمت سے استثناء کے زیر عنوان لکھا ہے:

ذمی فوجی خدمت سے مستثنٰی ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اصول پر جو ریاست قائم ہو اس کی حفاظت کے لیے وہی لوگ لڑ سکتے ہیں اور انہی کو اس کے لیے لڑنا چاہیے جو اس اصول کو حق مانتے ہوں۔ پھر لڑائی میں اپنے اصول اور حدود کی پابندی بھی وہی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ اگر ریاست کی حفاظت کے لیے لڑیں گے تو محض کرایہ کے سپاہیوں (Mercenaries) کی حیثیت سے لڑیں گے اور اسلام کے مقرر کیے ہوئے اخلاقی حدود کی پابندی نہ کر سکیں گے۔ اسی لیے اسلام نے ذمیوں کو فوجی خدمت سے

[1] - اسلامی ریاست، ص: ۴۸۶-۴۸۷

مستثنیٰ کر کے ان پر صرف یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ ملکی حفاظت کے مصارف میں اپنا حصہ ادا کر دیں۔ جزیہ کی اصل حیثیت یہی ہے۔ وہ نہ صرف اطاعت کا نشان ہے، بلکہ فوجی خدمت سے استثناء کا بدل اور ملکی حفاظت کا معاوضہ بھی ہے۔ چنانچہ جزیہ صرف قابل جنگ مردوں ہی پر لگایا جاتا ہے، اور اگر مسلمان کسی وقت ذمیوں کی حفاظت سے قاصر ہوں تو جزیہ واپس کر دیا جاتا ہے۔[1]

ایک اور مقام پر مولانا موصوف نے غیر مسلموں کو کلیدی عہدے نہ دیے جانے کے اشتباہ کا جواب یوں دیا ہے:

دوسری بات جو اسلامی ریاست کے دستور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ریاست کو صرف وہ لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس ریاست کو چلانے کے لیے بنائی گئی ہے اور جو اسے قبول نہ کرے اسے ریاست کے کام میں دخیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ریاست کے حدود میں ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود

[1] ۔حوالہ مذکور، ص: ۵۹۴

ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی لیکن بہر حال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی کیونکہ یہ ایک اصولی ریاست ہے جس کے نظم و نسق کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔[1]

ایک دوسرے مقام پر اسی اصول کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا موصوف نے لکھا ہے:

اس قاعدے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ میں ایک مثال بھی اس امر کی نہیں مل سکتی کہ کسی ذمی کو مجلس شوریٰ کا رکن یا کسی علاقے کا گورنر یا کہیں کا قاضی یا کسی شعبہ حکومت کا وزیر یا ناظم یا فوج کا کمانڈر بنایا گیا ہو یا خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا موقعہ دیا گیا ہو۔ حالانکہ ذمی خود نبی ﷺ کے عہد میں موجود تھے اور خلافت راشدہ کے دور میں تو ان کی آبادی کروڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اگر فی الواقع ان امور میں حصہ لینا ان کا حق ہوتا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ کا نبی ان کی حق تلفی کیسے کر سکتا تھا اور نبی کے براہ راست تربیت یافتہ لوگ مسلسل ۳۰ برس اس حق کو ادا کرنے سے کس طرح باز رہ سکتے تھے۔[2]

مولانا امین احسن اصلاحی نے زیر بحث مسئلہ کی یوں وضاحت کی ہے:

اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت (Idiological State) ہے اس وجہ سے وہ اپنی کلیدی اسامیاں جن کا تعلق "پالیسی تعین" (Initial Formation of Policy) سے ہے، انہی لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو ان اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس طرح روس کی اشتراکی حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی وزارت خارجہ کا قلمدان کسی ایسے شخص کے سپرد کر دے

---

[1] - اسلامی ریاست، ص: ۱۳۶-۱۳۷

[2] - حوالہ سابق، ص: ۳۵۳

جو اشتراکیت کے مخالف ہو یا اس پر ایمان نہ رکھتا ہو، اسی طرح اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے کسی ایسے عہدے کو جس کا تعلق حکومت کی پالیسی کے تعین سے ہے، کسی ایسے شخص کے حوالے کردے جو اسلام کا مخالف ہے یا اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت جو کسی خاص اصول اور نظریہ پر مبنی ہو، ایسا نہیں کر سکتی اور نہ اس سے یہ مطالبہ کرنا جائز اور صحیح ہو سکتا ہے۔ اس حد سے باہر ایک مسلم اور غیر مسلم میں جو فرق بھی ہو گا وہ صرف قابلیت، حسن کارکردگی اور اعتماد کی بنا پر ہو گا نہ کہ مجرد مسلم اور غیر مسلم ہونے کی بنا پر۔[1]

جبکہ ایک دوسرے مقام پر مولانا اصلاحی موصوف زیر بحث مسئلہ کی تفصیل میں لکھا ہے:

بجز کلیدی مناصب (Key Posts) کے جن کا تعلق پالیسی کے تعین سے ہے یا وہ پالیسی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں یا جن سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لیے اسلام اور اسلامی قوانین کے علم و تفقہ کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کے ہر شعبہ میں غیر مسلموں کو ملازمتیں دی جا سکتی ہیں اور ہر درجہ کی ملازمتیں دی جا سکتی ہیں۔ ان مناصب کے علاوہ باقی ہر عہدہ اور ہر چھوٹی بڑی ملازمت کے لیے صرف قابلیت، وفاداری، امانت و دیانت اور حسن کارکردگی کے اوصاف ہی فیصلہ کن شرائط کی حیثیت رکھیں گے۔[1]

ذمیوں کے حقوق کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے انہیں کلیدی عہدے نہ دیے جانے کے حوالے سے مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے اپنا نقطہ نظر یوں بیان کیا ہے:

ذمیوں کو حکومت کی مشینری میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہ ہو گا یعنی وہ کسی ایسے

---

[1] -اسلامی ریاست، ص:۲۱۶-۲۱۷

[1] -حوالہ مذکور، ص: ۲۲۶-۲۲۷

عہدے پر نہیں مقرر کئے جاسکتے جو براہ راست اسلامی نظام حیات کے کسی شعبہ کے متعلق ہو، مثلاً انکو سول سروس، فوج، پولیس وغیرہ محکموں میں جگہ نہیں دی جاسکتی، اس کی وجہ اہل نظر پر ادنی تامل سے واضح ہو جاتی ہے، وہ شخص جو اسلامی نظام حیات کو سرے سے اعتقاداً قبول ہی نہیں کرتا وہ اس کے چلانے میں صحیح حصہ کس طرح لے سکتا ہے۔ اسلامی نظام کی فطرت اور اس کی ساخت پر غور کرنے سے یہ چیز صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اسے کوئی غیر مسلم نافذ نہیں کرسکتا۔ اسلامی نظام مغربی نظاموں کی طرح حیوانی نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی مکمل ترین تفسیر ہے۔ اس کے ہر عہدیدار کے لیے شرط تعین تقویٰ اور اخلاق کی وہ بلندی ہے جو اسلامی معیار پر پوری اترے، یہ چیز کسی غیر مسلم کو کبھی نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس لئے کہ اسلام نے جو اخلاقی معیار پیش کیا ہے وہ بے نظیر ہے اور غیر اسلامی اعتقادات کے ساتھ اس کا جمع ہونا ناممکن ہے، اس صورت میں کسی ذمی غیر مسلم کو ایسے عہدے پر مقرر کرنا اجتماع نقیضین کا قائل ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام ایک خاص طرز فکر کی تعلیم دیتا ہے جو غیر اسلامی طرز فکر سے بالکل جداگانہ شے ہے، کوئی شخص غیر اسلامی طرز فکر اختیار کرکے اسلامی احکام کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکتا ہے، نہ ان کا صحیح استعمال کرسکتا ہے۔[1]

عصر حاضر کے ایک دوسرے مفکر اسلام محمد اسد نے بھی غیر مسلم شہریوں کو سربراہ مملکت جیسے کلیدی عہدوں شرعاً فائز نہ کیے جاسکنے کے معاملہ میں درج بالا قسم کی رائے اختیار کی ہے۔ وہ زیر نظر مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگرچہ اس بدیہی حقیقت کو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم شہری اوصاف دیانتداری سے متصف ہو سکتا ہے اور وہ مملکت اسلامیہ سے وفاداری بھی بدرجہ کمال

---

[1] - اسلام کا سیاسی نظام، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص:۲۲۸-۲۲۹

نبھا سکتا ہے مگر نفسیاتی اسباب کی بنا پر اس سے اس امر کی توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ اسلام کے نظریاتی مقاصد کے لیے صمیم قلب سے کام سرانجام دے سکے گا اور نہ اصولی پر اس سے ایسی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ کسی بھی نظریاتی تنظیم خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اس کا انتظام کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جو ان نظریات سے متفق نہ ہو۔ کیا اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ کسی غیر اشتراکی کو سوویت روس میں کسی نوع کا سیاسی یا کلیدی منصب تفویض کیا جائے گا۔[1]

[1] - اسلامی ریاست اور مسلم طرز حکومت (ترجمہ از محمد شبیر قمر)، بیت الحکمۃ لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۷۵-۷۶

چوتھی فصل

انتظامی عہدے اور غیر مسلم - اسلامی نقطۂ نگاہ

جہاں تک حکومت کے ان عہدوں اور مناصب کا تعلق ہے جو انتظامی امور سے متعلق ہیں یا جن کا کام صدر مملکت، وزیر اعظم اور حکومت کے احکام پر عملدرآمد یقینی بنانا ہوتا ہے، تو وہ تمام عہدے غیر مسلموں کو بشرطیکہ ان کی مطلوبہ اہلیت پر پورا اترتے ہوں، دیے جاسکتے ہیں۔ اس میں فقہاء اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ

وما لا يشترط فيه الاسلام كتعليم الصغار الكتابة وتنفيذ ما يأمر به الامام او الامير يجوز ان يمارسه الذميون۔[1]

وہ تمام عہدے اور مناصب جن میں عہدیدار کا مسلمان ہونا شرط نہیں مثلاً چھوٹے بچوں کو کتابت (کمپیوٹر وغیرہ) کی تعلیم دینا اور امام و خلیفہ یا امیر و گورنر جن کاموں کا حکم دیتا ہے انہیں نافذ کرنا (ان پر عملدرآمد کرانا) تو ایسے عہدوں پر ذمیوں کو تعینات کیا جاسکتا ہے۔

غزوہ بدر کے وہ غیر مسلم قیدی جو مقررہ فدیہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کا نبی اکرم ﷺ نے یہی فدیہ مقرر فرمایا تھا کہ وہ دس دس مسلمان بچوں کو کتابت کی تعلیم دے دیں۔ حضرت زید بن ثابت انصاریؓ نے انہی بچوں میں کتابت کی تعلیم حاصل کی تھی۔[2] انتظامی معاملات غیر مسلموں کے سپرد کیے جانے کے معاملے میں "الموسوعۃ الفقہیہ (کویت) کے مرتبین نے

---

[1] - الموسوعۃ الفقہیہ (کویت) طبع مذکور، ۷/ ۱۳۱

[2] - دیکھیے: المقریزی، امتاع الاسماع، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء، ۱/ ۱۱۹

"استعانة" کے عنوان پر یہ فتویٰ دیا ہے کہ

تجوز الاستعانة فی الجملة بغیر المسلم، سواء أکان من اھل الکتاب ام من غیرھم فی غیر القربات کتعلیم الخط والحساب والشعر المباح وبناء القناطر والمساکن والمساجد وغیر ھما فیما لا یمنع من مزاولته شرعاً ولا تجوزالا ستعانة به فی القربات کالأذان والحج و تعلیم القرآن وفی الامور التی یمنع من مزاولتھا شرعاً کاتخاذہ فی ولایة علی المسلمین او علیٰ اولادھم۔[1]

مجموعی طور پر غیر مسلم سے استعانت (کسی کام میں مدد طلب کرنا) خواہ اہل کتاب سے ہو یا ان کے غیر (مشرکین وغیرہ) سے، عبادات و طاعات کے علاوہ دوسرے کاموں میں جائز ہے۔ مثلاً خط وکتابت، حساب کتاب، مباح شعر وشاعری کی تعلیم اور پلوں، مکانات اور مساجد کی تعمیر وغیرہ جن میں شرعی طور پر اس سے کام لینا ممنوع نہیں ہے۔ جبکہ عبادات مثلاً اذان، حج، تعلیم قرآن وغیرہ میں اس سے استعانت ناجائز ہے۔ اسی طرح ان امور میں بھی اس سے مدد لینا جائز نہیں جن میں شریعت نے اس سے کام لینے سے منع کیا ہے جیسے مسلمانوں یا ان کی اولاد پر اسے والی وحکمران بنانا۔

علامہ ماوردی نے "وزارة تنفیذ" کی بحث میں لکھا ہے کہ وزیر تنفیذ (جسے آج کی اصطلاح میں سیکرٹری کہا جاسکتا ہے) امام اور اس کی رعایا اور والیوں کے درمیان محض ایک ذریعہ یا واسطہ ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ امام جو ہدایات اور احکام دے انہیں وہ نافذ وجاری کر دے۔ دوسرے عہدہ داروں کے تقرر، فوجوں کی تیاری واقعات حاضرہ اور حادثات فاجعہ سے امام کو مطلع کرتا ہے اور ان کے متعلق امام سے

---

[1] - الموسوعة الفقھیہ (کویت)، ۴/۱۸

احکام حاصل کر کے انہیں جاری کرے اس کا بنیادی کام ہدایاتِ امام کی تعمیل ہے نہ کہ خود ہدایت دینا۔[1]

علامہ موصوف اس منصب کی اہلیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ذمی وزیر تنفیذ ہو سکتا ہے مگر وزیر تفویض نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ان دونوں عہدوں کے اختیارات میں فرق ہے اسی طرح ان کے شرائط میں بھی فرق ہے۔ یہ فرق ان چار صورتوں سے نمایاں ہوتا ہے۔

پہلے یہ کہ وزیر تفویض خود ہی احکام نافذ کر سکتا ہے اور فوجداری مقدمات کا تصفیہ کر سکتا ہے یہ اختیارات وزیر تنفیذ کو حاصل نہیں۔

دوسرے یہ کہ وزیر تفویض کو سرکاری عہدہ دار مقرر کرنے کا حق ہے مگر وزیر تنفیذ کو یہ حق حاصل نہیں۔

تیسرے یہ کہ وزیر تفویض تمام فوجی اور جنگی انتظامات خود کر سکتا ہے وزیر تنفیذ کو اس کا حق حاصل نہیں۔

چوتھے یہ کہ وزیر تفویض کو خزانے پر اقتدار حاصل ہے وہ سرکاری مطالبہ وصول کر سکتا ہے اور سرکار پر جو واجب الادا ہے، اسے ادا کر سکتا ہے۔ یہ حق بھی وزیر تنفیذ کو حاصل نہیں ہے۔

ان چار شرطوں کے علاوہ کوئی اور بات ایسی نہیں ہے جو ذمیوں کو اس منصب پر فائز ہونے سے روک سکے۔ البتہ اگر وہ سرکاری کارروائیوں میں (بدنیتی سے) طول دیں تو اس وجہ سے وہ اس منصب سے روکے جاسکتے ہیں۔[2]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے سرکاری عہدوں میں ان عہدہ جات کو غیر مسلموں کے لیے مستثنیٰ کیا

[1] ۔۔۔ماوردی، الاحکام السلطانیہ (الباب الثانی فی تقلید الوزارۃ)، ص: ۲۵-۲۶

[2] ۔ حوالہ مذکور، ص: ۲۷

ہے جن پر دینی رنگ غالب ہوتا ہے اور باقی عہدوں کے لیے جواز لکھا ہے: فرماتے ہیں:

ذمیوں کو مسلمانوں کی مانند ہر سرکاری عہدہ سنبھالنے کا حق ہے باستثناء ایسے عہدوں کے جن پر دینی رنگ غالب ہو مثلاً امامت، سربراہی سلطنت، سپہ سالاری، مسلمانوں کے درمیان قضاء اور صدقات کی تقسیم وغیرہ۔۔۔۔ان مستثنیات کے علاوہ دوسرے سرکاری مناصب ذمیوں کے سپرد کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ قابلیت، امانت داری اور ریاست سے وفاداری جیسی ضروری شرائط پر پورا اترتے ہوں اور ان کینہ پرور لوگوں میں سے نہ ہوں جن کی مسلمانوں سے پکی دشمنی ثابت ہو چکی ہو اور جو درج ذیل فرمان باری تعالیٰ کے مصداق ہوتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔[1]

اے ایمان والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقعہ سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ہم نے تمہارے لیے احکام کو کھول کر بیان کر دیا ہے اگر تم عقل رکھتے ہو(تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے۔)[2]

درج بالا آیت کریمہ سے یہ بات بھی مفہوم ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے معاملات میں رازدار بنانے کی ممانعت مطلق نہیں بلکہ ان کی عداوت و بغض کے ساتھ مقید ہے۔اگر کوئی غیر مسلم اس قسم کی عداوت کا مظاہرہ نہیں کرتا تو اس پر اعتماد کیا جا سکتا اور اسے سرکاری عہدہ دیا جا سکتا ہے۔صاحب تفسیر المنار

---

[1] ۔آل عمران، ۳:۱۱۸

[2] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۲۴

نے اس موضوع پر بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے: "وہ فرماتے ہیں کہ آیت میں غیر مسلموں کو رازدار اور دوست نہ بنانے کا حکم مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ اور استدلال میں سورۃ الممتحنۃ کی آیت نمبر ۸ اور آیت نمبر ۹ پیش کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ درج بالا آیت کا نزول بطور خاص یہود کے حق میں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ، خلفاء بنی امیہ، خلفاء بنی عباس اور عثمانی ترکوں نے اپنی غیر مسلم رعایا میں اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت نہ دیکھی تو ان سے سرکاری کام لیتے حتی کہ انہیں بیرون ملک سفیر اور اسلامی ریاست کا وکیل بنا کر بھیجتے رہے۔[1]

غیر مسلموں کے لیے بڑے بڑے انتظامی عہدے (تاریخ اسلام سے چند نظائر)

غیر مسلموں کو سرکاری عہدے دیے جانے کے حوالے سے شریعت کی واضح ہدایات جن کا حوالہ اوپر آ چکا ہے، کے باوجود مسلمان خلفاء نے اس معاملے میں جس فیاضی رواداری بلکہ دریا دلی کا مظاہرہ کیا، اس کی طرف ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے یوں اشارہ کیا ہے:

> عباسیوں کے زمانے میں بعض عیسائی متعدد بار عہدہ وزارت پر براجمان ہوئے مثلاً نصر بن ہارون ۳۶۹ھ اور عیسیٰ بن نسطورس ۳۸۰ھ میں وزیر بنا۔ اس سے پہلے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کا ایک عیسائی کاتب تھا، جس کا نام سرجون تھا۔ اس بارے مسلمانوں کی رواداری بعض اوقات دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی کی حدود کو چھونے لگتی اور مسلمان عوام کبھی کبھار یہود و نصاری کے خود پر بلاجواز تسلط سے شاکی بھی ہوئے۔ مغربی مؤرخ آدم متز نے اپنی کتاب "الحضارۃ الاسلامیہ فی القرن الرابع الہجری" میں لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم عہدیداروں اور ذمہ دار افراد کی اکثریت سے تعجب ہوتا ہے چنانچہ اسلامی ممالک میں عیسائی مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہیں جبکہ اہل ذمہ کی تحکیم کے خلاف مسلمانوں

---

[1] دیکھیے: رشید رضا (م ۱۹۳۵) تفسیر المنار، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۴/۶۶-۷۲

کی شکایت بہت پرانی بات ہے-----

یہ سب جہالت، انحراف اور گراوٹ کے زمانے میں اسلامی معاشرے کو لاحق ہو جانے والے زوال کا اثر تھا کہ نوبت یہودیوں کی تعظیم اور فقہاء کی تذلیل تک جا پہنچی۔ تاریخ میں ایسی آخری مثال ہمیں خلافت عثمانیہ کے آخری ادوار میں ملتی ہے کہ جب سلطنت نے اپنی اکثر اہم اور حساس ذمہ داریاں غیر مسلم افراد / رعایا کے سپرد کر رکھی تھیں بلکہ غیر ممالک میں اپنے اکثر سفیر اور نمائندے تک عیسائیوں میں سے مقرر کیے تھے۔[1]

اسلام کی ابتدائی حکومتوں میں غیر مسلموں کو کلیدی عہدے نہ دیے جانے کا ایک سبب ان پر اعتماد کا فقدان بھی تھا۔ مگر جب مسلمان خلفاء کو غیر مسلم ذمیوں کی ریاست کے ساتھ وفاداری کا یقین آگیا اور ان پر اعتماد قائم ہو گیا تو پھر مسلمان حکمرانوں نے ان میں سے باصلاحیت اور اہل لوگوں کو کلیدی عہدے دینے میں کبھی مذہبی تعصب کو آڑے نہیں آنے دیا۔ اس سلسلے میں مشہور مؤرخ شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

> ابتداء میں بڑے عہدوں پر غیر مسلموں کے نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان میں اور مسلمانوں میں پورا اعتماد نہ پیدا ہوا تھا اور وہ عربی زبان سے بھی ناواقف تھے اور اعتماد کے بغیر کوئی حکومت بھی کسی غیر قوم کو کلیدی عہدوں پر مامور نہیں کر سکتی۔ انگریزی دور میں ایک مدت تک ہندوستانیوں کا کام صرف کلرکی تھا، بڑے عہدے بعد میں ملنے لگے۔ یہی صورت حال اسلامی عہد میں بھی تھی، ورنہ آگے چل کر مذہبی عہدوں کو چھوڑ کر کوئی عہدہ ایسا نہ تھا جو غیر مسلموں کو نہ ملا ہو۔ بنی امیہ کی عربی عصبیت مشہور ہے لیکن اموی دور میں جب شام کے عیسائیوں اور رومیوں سے ربط و

---

[1] ۔غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۲۴-۲۵

ضبط بڑھا تو حضرت امیر معاویہؓ نے ابن اثال کو جو عیسائی تھا، حمص کا کلکٹر مقرر کیا اور سرجون اور منصور رومی کو مالیات کے ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا۔[1]

اسی طرح فاطمی عہد حکومت (مصر) میں معزالدین نے یعقوب بن کلس یہودی کو جنگی اور مدنی امور میں اپنا مشیر مقرر کیا۔ اس کے علاوہ اسے "وزیر تنفیذ" کے اہم عہدے پر بھی فائز کیا گیا۔[2]

ابتدائے اسلام میں غیر مسلم شہریوں کو کلیدی عہدے کیوں نہ دیے گئے؟ اس کی جو توجیہ علامہ شبلی نعمانی نے بیان کی ہے، اس کا ذکر پچھلی فصل میں ہو چکا ہے۔ اس مخصوص انتظامی مجبوری کے زائل ہو جانے کے بعد اسلامی حکومتوں نے کس دریا دلی سے اپنے غیر مسلم شہریوں کو بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز کیا، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

> بہر حال اسلام کے ابتدائی زمانے میں وہ خدمتیں اور عہدے جن میں فوجی حیثیت بھی شامل تھی ذمیوں کو کم ملے لیکن جس صیغے میں اس حیثیت کا لگاؤ نہ تھا وہ ذمیوں کے لیے کھلا رہا، بلکہ حق یہ ہے کہ خاص انہیں کے قبضہ اختیار میں رہا، خراج اور مال گذاری کے محکموں اور دفتر پر عموماً عیسائی اور آتش پرست قابض تھے، یہاں تک کہ اس دفتر کی زبان بھی لاطینی اور فارسی و قبطی رہی، شام میں ۸۷ھ تک دفتر خراج لاطینی زبان میں تھا، اور اس وقت اتنسناش نام کا ایک عیسائی اس محکمہ کا افسر تھا، عراق کا دفتر حجاج بن یوسف کے زمانے میں، فارسی سے عربی زبان میں منتقل ہوا، وہ بھی اس وجہ سے کہ دفتر خراج کے میر منشی نے جو آتش پرست تھا اور جس کا نام فرخ زاد تھا، مغرورانہ یہ دعویٰ

---

[1] ۔ دین رحمت، معارف اعظم گڑھ، ص: ۲۶۲؛

فاطمیوں نے زیر بحث معاملے میں جس فراخدلی بلکہ دریا دلی کا مظاہرہ کی، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: زاہد علی، ڈاکٹر، تاریخ فاطمیین مصر، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۳ء، ۲/ ۹۳-۹۵

[2] : ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن، النظم الاسلامیہ (اردو ترجمہ)، دارالاشاعت کراچی، ص: ۱۵۳-۱۵۴

کیا تھا کہ عربی زبان اس قابل نہیں کہ حساب کے تمام جزئیات کو ادا کر سکے۔ رفتہ رفتہ جب تمدن نے زیادہ ترقی کی اور ملکی اور فوجی صیغے میں فی الجملہ امتیاز ہوا تو ذمیوں کو ملکی صیغے میں بار ہونے لگا سب سے پہلے اس کی ابتدا امیر معاویہؓ کے عہد میں ہوئی، یعنی ابن آثال ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب اور عہدہ ایسا نہیں رہا جو غیر مذہب والوں کی دسترس سے باہر رہا ہو، مذہبی صیغہ کو چھوڑ کر دربار میں سب سے بڑے عہدے دو تھے، وزارت اور کتابت، کتابت آج کل کی اصطلاح میں چیف سیکرٹری کے عہدے کے برابر تھی یعنی ہر قسم کے فرامین سلطنت اور سلطنت غیر سے مراسلت کا کام اسی سے متعلق ہوتا تھا، اور اسی وجہ سے وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں جہاں اس عہدے کا ذکر کیا، لکھا ہے کہ ان صاحب هذه الخطه لابدان يتخير من ارفع طبقات الناس۔ غرض یہ دونوں منصب جو اعلیٰ ترین مناصب تھے ذمیوں کو عطا کئے گئے، عبدالملک بن مروان جو سلطنت بنو امیہ کا دوسرا تاجدار تھا، اس کا کاتب ابن سرجون ایک عیسائی تھا۔ دولت عباسیہ کے عہد میں ابو اسحاق صابی جو اس منصب پر ممتاز تھا، بڑے رتبے کا شخص گزرا ہے اور ابن خلکان وغیرہ نے اس کے فضل و کمال کی بڑی تعریف کی ہے۔ سلطنت دیلم کا سر تاج عضد الدولہ جو شہنشاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اس کا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام خلفاء و سلاطین دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ مذہبی شان بھی رکھتے تھے، یورپ کو اس قسم کی بے تعصبی اور فیاضی تک پہنچنے کے لیے بھی کئی سو برس درکار ہیں۔[1]

[1] ۔ مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/ ۲۲۴-۲۲۵؛ نیز دیکھیے: شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص: ۱۶۲-۱۶۳

اسی طرح عباسی عہد حکومت میں غیر مسلم رعایا کو جس فیاضی اور پوری ذمہ داری سے جو تمام بنیادی حقوق دیے گئے، جس طرح انہیں بڑے بڑے سرکاری عہدے دیے گئے اور اسلام کے نزدیک انہیں جو عزت اور رتبہ و مقام حاصل تھا، اس کی تفصیل کے ضمن میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

مامون کے عہد میں دوسری قوموں کو جو حقوق حاصل تھے، مہذب سے مہذب حکومت میں بھی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتے تھے۔ یہود، مجوس، عیسائی اور لامذہب اس کی وسیع حکومت میں نہایت آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ خاص دارالخلافت بغداد میں بہت سے گرجے اور چرچ جو نئے تعمیر ہوئے، موجود تھے جن میں رات دن ناقوس کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ دربار میں ہر مذہب و ملت کے علماء و فضلاء حاضر ہوتے تھے اور مامون ان کے ساتھ نہایت عزت و توقیر سے پیش آتا تھا۔ جبرائیل بن بخت یشوع جو ایک عیسائی فاضل تھا، اس کی اس قدر توقیر کرتا تھا کہ عام حکم دے دیا تھا کہ جو شخص کسی ملکی عہدے پر مقرر کیا جائے پہلے جبرئیل کی خدمت میں حاضر ہو۔ اسی طرح مامون نے خراسان میں جو کالج بنوایا تھا۔ اس کا پرنسپل یعنی مہتمم اعظم ایک عیسائی کو مقرر کیا جس کا نام میسوع تھا۔[1]

مامون کی مذہبی رواداری کے بارے میں سید امیر علی نے لکھا ہے:

خلیفہ مامون کے عہد میں مملکت اسلامیہ میں عیسائیوں کے گیارہ سو کلیساؤں کے علاوہ یہودیوں کے سینکڑوں صوامع اور زردشتیوں کے بے شمار آتشکدے تھے۔ اس روشن خیال حکمران نے جسے عیسائیوں کا جانی دشمن کہا گیا ہے، اپنی مجلس شوریٰ میں اپنی تمام محکوم جماعتوں کے نمائندے شامل کیے تھے۔ مسلمان، یہودی، عیسائی، زردشتی اور صابی، اور اس نے عیسوی کلیسا کے منصب داروں کے تمام حقوق و مراعات کا باحتیاط

---

[1] - المامون، دارالاشاعت، کراچی، ۲/۱۱۷-۱۱۸؛ نیز شاہ معین الدین، دین رحمت، ص: ۲۶۵-۲۶۶

تحفظ کیا۔[1]

غیر مسلم اہل علم کی خلفاء اسلام کے نزدیک کتنی قدر و منزلت تھی سرکاری طور پر ان کا کیا مقام تھا اور خلفاء ان کی کس طرح قدر دانی کرتے اور دل کھول کر داد دیتے تھے، اس کا اندازہ عہد عباسی کے ایک عیسائی طبیب جبرئیل بن بخت یشوع کی سالانہ آمدنی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے سلاطین اسلام کی علم نوازی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے تاریخ الحکماء، القفطی (باب الجیم) کے حوالے سے لکھا ہے:

جبرئیل بن بخت یشوع، ہارون الرشید کا طبیب خاص اور چند کتابوں کا مصنف تھا، اس کی سالانہ آمدنی یہ تھی:

1.	سرکاری مشاہرہ	ایک لاکھ بیس ہزار درہم سالانہ
2.	یحیی بن خالد (ہارون کے وزیر) کی طرف سے	چھ لاکھ درہم سالانہ
3.	جائیداد (ذاتی) سے آمدنی	پندرہ لاکھ درہم سالانہ
4.	عطیات	ایک لاکھ درہم سالانہ
5.	جعفر بن یحیی کی طرف سے	بارہ لاکھ درہم سالانہ
6.	فضل بن یحیی کی طرف سے	چھ لاکھ درہم سالانہ
7.	دیگر امراء کی طرف سے	دو لاکھ درہم سالانہ
	میزان	تینتالیس لاکھ بیس ہزار درہم سالانہ[2]

پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے کہ خلفاء راشدین اور بعد کے بعض خلفاء اسلام کے عہد حکومت میں

---

[1] ۔روح اسلام (اردو ترجمہ)، ص:۴۲۵-۴۲۶

[2] ۔یورپ پر اسلام کے احسان، ص: ۱۳۹-۱۴۰؛ نوٹ: جرجی زیدان نے ہارون الرشید کے اس عیسائی طبیب خاص کو مختلف مدات سے ہونے والی سالانہ آمدنی انچاس لاکھ درہم بتائی ہے اور ہر مد سے ہونے والی آمدن کے اعداد و شمار لکھے ہیں: دیکھیے: تاریخ تمدن اسلام (ترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری) شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص: ۲۰۹-۲۱۰

غیر مسلم رعایا کو کلیدی عہدے نہ دیے جانے کا ایک معقول سبب ان پر عدم اعتماد تھا مگر جب خلفاء اسلام کا ان پر اعتماد قائم ہو گیا اور غیر مسلموں نے اسلامی ریاست اور اہل اسلام سے اپنی وفاداری ثابت کر دی تو ان کو فوج سمیت حکومت میں بڑے بڑے عہدے دیے جاتے رہے۔ جس کی کچھ تفصیل گزشتہ سطور میں آگئی ہے۔

سرکاری محکموں یا ملازمتوں میں فوج کا محکمہ اور ملازمت کسی بھی حکومت کے لیے بڑا نازک معاملہ ہے۔ کسی بھی فوجی کی بد دیانتی اور غداری سے پوری فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس لیے بعض علماء کے خیال میں جیسا کہ اوپر گزرا، انہیں فوج میں کسی ذمہ دار منصب پر فائز کرنا جائز نہیں مگر جہاں اس عدم جواز کی بنیادی علت نہ پائی جائے وہاں جواز کا فتویٰ دیا جائے گا۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں دیگر اہم انتظامی عہدوں کے علاوہ فوج میں انہیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا جاتا رہا۔ چنانچہ ہندوستان میں ہندو رعایا کو مسلمان بادشاہوں نے جس طرح بڑے بڑے فوجی عہدے دیے اسکی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ پنج ہزاری اور چار ہزاری وغیرہ درجہ کے فوجی مناصب پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد قریب قریب برابر تھی اور پھر علامہ موصوف نے ہندو فوجی سپہ سالاروں اور جرنیلوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔[1]

سید صباح الدین عبد الرحمن نے ہندوستان کے عہد وسطی کے فوجی نظام کی تفصیلات و جزئیات بیان کرتے ہوئے مغلیہ عہد حکومت میں ان درجنوں ہندو سرداروں کے نام گنوائے ہیں جنہیں فوجی خدمات کے بدلے میں بڑے بڑے فوجی خطابات اور اعزاز دیے گئے۔[2] سید موصوف نے فوجی مناصب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:

> منصب داری نظام کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ منصب دیتے وقت مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں کیا جاتا تھا بلکہ صلاحیت اور کارکردگی کا لحاظ کر کے مناصب دیے جاتے۔ اسی

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/۲۲۶

[2] ۔ دیکھیے: ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، دار المصنفین اعظم گڑھ، انڈیا، ۱۹۶۰ء، ص: ۱۷ تا ۱۹

لیے مسلمان منصب داروں کے علاوہ اکبری عہد میں ہندو منصبدار ۲۵، جہانگیر کے زمانے میں ۴۶، شاہجہاں کے دور میں ۱۱۲، اور عالمگیر کے عہد میں ۶۷ رہے۔ ان میں پانصدی اور اس کے نیچے کے منصبداروں کی تعداد شامل نہیں ہے۔ اکبر کے عہد میں ہفت ہزاری سب سے بڑا منصب تھا جو سب سے پہلے راجہ مان سنگھ ہی کو حاصل ہوا۔ ہندوؤں میں ہفت ہزاری منصب دار جہانگیری عہد میں ایک شاہجہانی دور میں دو اور عالمگیری عہد میں تین رہے۔[1]

پھر یہ نہیں کہ یہ مناصب صرف نمائش اور غیر مسلموں کو مطمئن کرنے کے لیے تھے۔ بلکہ ہندو منصب داروں پر جنگوں میں اسی طرح اعتماد کیا جاتا تھا جس طرح مسلمان منصب داروں پر ہوتا تھا۔ سید صباح الدین مذکور نے سلاطین دہلی کے اس اعتماد کی متعدد مثالیں بیان کی ہیں۔[2] اسی طرح مشہور مؤرخ شاہ معین الدین ندوی مختلف اسلامی ادوار میں غیر مسلموں کو دیے جانے والے بڑے بڑے عہدوں کی تفصیل اور اس سلسلے میں خلفاء اسلام کی وسعت ظرفی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہندوستان کی مثال تو سب کی نگاہ کے سامنے ہے یہاں کم و بیش پورے اسلامی دور خصوصاً مغلوں کے زمانہ میں ہندو بڑے بڑے خطاب یافتہ، منصب دار اور نہ صرف انتظامی بلکہ فوجی عہدوں پر مامور رہے۔ ہندو نواز اکبر کا ذکر نہیں "متعصب" اورنگ زیب کے عہد کے خطاب یافتہ اور منصب دار ہندوؤں کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔[3]

اس کے بعد مؤرخ مذکور نے درجہ بدرجہ فوجی مناصب کے سامنے درجنوں ہندو سرداروں اور

---

[1] -حوالہ سابق، ص۲۵-۲۶

[2] -دیکھیے: حوالہ مذکور، ص:۳۲تا۳۳

[3] -دین رحمت، معارف اعظم گڑھ، ص:۲۶۳

سپہ سالاروں کے نام لکھے ہیں جو ان فوجی مناصب پر فائز رہے اور مغل حکمران جنگوں میں ان پر اعتماد کرتے رہے۔[1] اسی طرح ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے خلافت راشدہ سمیت اسلامی حکومتوں کے مختلف ادوار میں غیر مسلم رعایا کو عہدے دیے جاتے رہنے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمان خلفاء کی اس رواداری اور وسعت ظرفی کا اعتراف خود مغربی مؤرخین کو بھی ہے چنانچہ مشہور مغربی مؤرخ آدم متھ نے کہا ہے:

من الامور التی نعجب بھا کثرۃ عددالعمال والمتصرفین غیر المسلمین فی الدولۃ الاسلامیۃ۔[2]

(اسلامی حکومت میں غیر مسلم عمال اور ملازمین کی کثرت باعث حیرت امور میں سے ہے)۔

اس کے بعد ڈاکٹر مذکور لکھتے ہیں کہ دولت عثمانیہ آخری اسلامی حکومت ہے، اس نے بھی بہت سے عہدے اپنی غیر مسلم رعایا کو دے رکھے تھے حتی کہ دوسرے ممالک میں ان کے سفیروں اور نمائندوں کی اکثریت عیسائیوں میں سے تھی۔[3] زیر بحث معاملے میں مسلمان حکمرانوں نے جس فراخدلی اور رواداری کا مظاہرہ کیا، اس کا اعتراف غیر مسلم مفکرین کو بھی ہے۔ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس سلسلے میں "ٹریٹن " کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ:

مسلمان حکمرانوں کا سلوک مجموعی طور پر ان قوانین سے بہتر تھا جنہیں ذمیوں پر لاگو کرنے کے وہ پابند تھے۔ عرب علاقوں میں نئے گرجوں اور معابد کی تعمیر اس کا واضح ترین ثبوت ہے۔ سرکاری محکموں نے یہود و نصاری کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ

---

[1] - دیکھیے: حوالہ سابق، ص:۲۶۳-۲۶۴؛ نیز صمصام الدولہ، مآثر الامراء (اردو ترجمہ)، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ۲/۷۷ومابعد

[2] - احکام الذمیین والمستامنین، ص:۷۰

[3] -حوالہ مذکور، ص:۷۰-۷۱

کی بلکہ یہ لوگ بعض اوقات اعلی اور اہم ترین مناصب پر فائز ہوئے اور انہوں نے بہت زیادہ مال و دولت جمع کیا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں مسیحی تہواروں میں شرکت کا رواج عام ہو چکا تھا۔[1]

اسی طرح مسٹر ڈینیل سی ڈینٹ جونیر (Daniel C. Dennett Junior) نے "سواد عراق" کی زمینوں کے بندوبست اور خراج وغیرہ کی تفصیل سے قبل لکھا ہے:

یہ حقیقت سب پر واضح ہے کہ ساسانی سلطنت جزواً جزواً عربوں کے قبضے میں آئی اور عربوں نے چند ترمیمات کے ساتھ وہ انتظامی ڈھانچہ قائم رکھا جو سلطنت میں مدت سے رائج چلا آرہا تھا۔ صرف ڈھانچا ہی قائم نہ رکھا بلکہ جس زبان میں دفتری کارروائی ہو رہی تھی، وہ بھی مستعمل رہی۔ جو کارکن ساسانیوں کے ماتحت انتظامات کے ذمہ دار تھے، جس حد تک ممکن تھا، وہ عربوں کے ماتحت بھی بر سر کار رہے۔[2]

مشہور مستشرق "A. S. Tritton" نے زیر تحقیق موضوع سے متعلق اپنی معروف کتاب "The Caliphs and their Non-Muslim Subject" میں دوسرا باب مختلف خلفاء اسلام کے عہد حکومت میں غیر مسلم رعایا کو دی جانے والی سرکاری ملازمتوں اور عہدوں کی تفصیل سے مختص کیا ہے۔ کوئی انیس صفحات پر مشتمل اس باب میں مسٹر ٹریٹن نے غیر مسلموں کو دی جانے والی سرکاری ملازمتوں اور عہدوں کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ اس نے اس معاملے میں مسلمانوں کی بے تعصبی اور وسعت ظرفی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

When the Arabs consolidated their conquests they took over the administrative system they found

---

1 - غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص:۸۱.

2 - جزیہ اور اسلام (اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر) شیخ غلام اینڈ سنز لاہور، طبع اول ۱۹۶۲ء، ص:۳۴؛ نیز دیکھیے جر جی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ۱/ ۹۹

there and those officials who had not flied.[1]

جب عربوں / مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول حاصل کر لیا تو انہوں نے وہاں پر موجود ملکی نظم و نسق (نظام حکومت) اور ان تمام سرکاری عہدہ داروں کو برقرار رکھا جو وہاں سے بھاگ نہیں گئے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مستشرقین مرتبین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مفتوحہ غیر مسلم آبادیوں / علاقوں میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کے تعاون سے ہی نظام حکومت چلایا۔ اور غیر مسلموں کو اسلامی حکومتوں خصوصاً فاطمی عہد حکومت میں بڑے بڑے انتظامی عہدے دیے گئے۔[2] اسی طرح بلاذری کے حوالہ سے ٹریٹن موصوف لکھتا ہے:

As told by Baladhuri, the story shows that the active head of the finance department was a Syrian in Syria and in Persia a Persian.[3]

بلاذری کی بیان کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شام میں محکمہ خزانہ کا سربراہ (وزیر خزانہ) سابقہ ایک شامی تھا اور فارس میں ایک سابقہ فارسی تھا۔

ٹریٹن کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اگرچہ بعض خلفاء اسلام مثلاً عمر ثانی (عمر بن عبد العزیز) اور متوکل عباسی کی پالیسی زیر بحث معاملے میں سخت رہی اور انہوں نے]

It is clear that the relations of christians with authority were some time very easy. Bukam, a rich man from Bura, in Egypt, came to Mamun and asked to be made headman of his town. The caliph said: Turn Muslim, become my client, and I will

---

[1] - The Caliphs and their non-Muslims subject, Oxford University Press, London, 1930, P:18

[2] - The Encyclopaedia of Islam (New ed.) Leiden E.J.Brill, 1986, V:2, P:228-229

[3] -The Caliphs and their Non-Muslims Subject, P:19

make you headman. Bukam replied, you have ten thousand Muslim clients and no one Christian. Mamun laughed and made him headman of Bura and district.[1]

یہ بات بالکل واضح ہے کہ بعض اوقات مسلمان حکمرانوں کے ساتھ عیسائیوں کے تعلقات بڑے آسان/نرم رہے۔ چنانچہ مصر میں "بوکم" نامی ایک امیر اور غیر مسلم آدمی مامون کے پاس آیا اور اس سے درخواست کی کہ اسے اس کے ٹاؤن (علاقہ) کا سربراہ بنا دیا جائے خلیفہ نے کہا: مسلمان ہو جاؤ میں تمہیں اپنے علاقے کا سربراہ بنا دوں گا۔ بوکم نے جواب دیا: آپ دس ہزار مسلمان مخالفین کو برداشت کر رہے ہیں اور ایک عیسائی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس بات پر مامون ہنس پڑا اور اسے اپنے علاقہ بُورا اور پورے ضلع کا "ہیڈ مین" (سربراہ) بنا دیا۔

ٹریٹن ہی نے لکھا ہے کہ اموی خلیفہ سلیمان نے رملہ (فلسطین) میں ایک عیسائی سیکرٹری کو تعمیرات، نہروں، کنووں حتی کہ مساجد کی تعمیر کا بھی اور سیر (overseer) مقرر کیا تھا۔ اسی طرح مصر میں احمد بن طولون نے ایک عیسائی کو آرکیٹکٹ (Architect) مقرر کیا جو مساجد کے لئے ستونوں (Pillars) کا انتظام کرتا۔ علی ہذا القیاس مسلمان خلفاء جب عیسائی حکومتوں کی طرف سفیر بھیجتے تو یہ سفیر عموماً عیسائیوں میں سے منتخب کیے جاتے تھے۔[2]

---

[1] – Ibid. P:23

[2] – Ibid, P: 22-24, 34-35

پانچویں فصل

انتخابات میں حصہ لینے کا حق

آج کل پاکستان سمیت متعدد اسلامی ملکوں میں جمہوری طرز حکومت رائج ہے۔ عام انتخابات یا ووٹ اور بیلٹ پیپر کے ذریعے عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے اور اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں۔ پھر یہ نمائندے اپنے میں سے وزیر اعظم اور صدر مملکت کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض اوقات صدر کا براہ راست انتخاب بھی ہوتا ہے۔ آیا ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم ان انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ شرعی اعتبار سے اس کے جواز عدم جواز کا اندازہ موجودہ انتخابات کے مقصود سے لگایا جا سکتا ہے۔ انتخابات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام میں سے ان افراد کی رائے معلوم کی جائے جو ووٹ دینے یا رائے دینے کا حق رکھتے ہیں یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس شخص کو پارلیمنٹ کا ممبر یا صدر مملکت بننے کا اہل سمجھتے ہیں۔ اب اس میں دو صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم اپنے آپ کو صدر مملکت یا رکن پارلیمنٹ کے امیدوار کے طور پر پیش کرے اور دوسری صورت کسی غیر مسلم شہری کا صدر مملکت یا رکن پارلیمنٹ کے انتخاب میں اپنا ووٹ دینا یا رائے کا اظہار کرنا ہے۔

جہاں تک اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم شہری کا اپنے آپ کو بطور صدارتی امیدوار پیش کرنے کا تعلق ہے تو یہ شرعاً بالکل ناجائز ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ بننے کے لیے جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزرا، کسی آدمی کا محض شہری ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لیے مخصوص شرائط ہیں۔ ان شرائط میں سے اولین شرط صدر مملکت یا خلیفہ کا مسلمان ہونا ہے۔ اس لیے کہ فرائض خلافت (جن کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج اور طوالت کا باعث ہوگی) کو سچے مسلمان کے سوا کوئی دوسرا آدمی سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔[1] علاوہ

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: قاضی ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ، ص:۱۱؛ ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ)، ص:۲۸-۲۹

ازیں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔[1]

اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر غلبے کا راستہ ہر گز نہیں بنائے گا۔

آیت اطاعت اولی الامر (یایها الذین أمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ سورۃ النساء) میں اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے "منکم" کی قید لگائی گئی ہے جس کے صریح معنیٰ یہ ہیں کہ اطاعت امیر کے لئے اس کا اہل ایمان / مسلمانوں میں سے ہونا شرط ہے۔ چنانچہ علماء کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر خلیفہ مرتد ہو جائے تو اس کا معزول کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔[2] اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ / صدر مملکت کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ اسلامی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ خود اہل الذمہ کو بھی اسی بات کا ادراک تھا کہ وہ کسی اسلامی ریاست میں خلیفہ / صدر مملکت کے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ نہ تو کسی ذمی نے کبھی اپنے آپ کو بطور امیدوار خلافت پیش کیا اور نہ کبھی اہل الذمہ نے خلیفۃ المسلمین کے انتخاب میں حصہ لیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ بننے یا خلیفہ کے انتخاب کا حق اہل اسلام کے ساتھ مختص تھا۔ رئیس مملکت کے منصب میں غیر مسلم کے منتخب نہ کیے جاسکنے کے بارے مولانا مودودی نے بھی درج بالا قسم کی رائے ظاہر کی ہے۔[3]

سوال یہ ہے کہ کیا آج غیر مسلم مسلمان صدر مملکت کے انتخاب میں اپنا ووٹ یا رائے دے سکتے ہیں؟ تو اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد الکریم زیدان جواز کی طرف گئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ آج کل کی اسلامی جمہوری ریاستوں میں قرون اولیٰ کی اسلامی ریاستوں کی طرح دین کا رنگ غالب نہیں۔ یہ ریاستیں دنیوی قسم کی ریاستیں ہیں۔ شرعی خلافت کی تعریف کے زمرے میں نہیں آتیں۔ لہذا انہیں رئیس مملکت کے انتخاب

---

[1] - النساء، ۴: ۱۴۱

[2] - دیکھیے: ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ)، ص: ۳۱-۳۲

[3] - دیکھیے: اسلامی ریاست، ص: ۵۹۸

میں حصہ لینے کے اندر کوئی شرعی مانع نہیں۔ اسی طرح عام انتخابات میں اپنی رائے کے اظہار کرنے یا انتخاب میں ممبر پارلیمنٹ کے امیدوار کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرنے میں بھی کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ کیونکہ پارلیمنٹ میں ان کی رائے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔[1] پھر موصوف نے لکھا ہے کہ موجودہ دور میں کئی اسلامی ممالک مثلاً متحدہ عرب امارات اور عراق وغیرہ میں غیر مسلم شہری باقاعدہ انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور اس معاملے میں مسلم و غیر مسلم کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔[2]

بطور ممبر پارلیمنٹ - شرعی نقطۂ نظر

عوامی نمائندوں کو فقہاء اسلام بالعموم "اہل الحل والعقد" کہتے ہیں یعنی ذمہ داران قوم اور نمائندگان قوم جو لوگوں کے معتمد اور مرجع ہوں، امام رازی فرماتے ہیں:

المراد بقوله "واولی الامر" اهل الحل والعقد من الامة۔[3]

اولوالامر سے مراد امت مسلمہ کے اہل حل و عقد ہیں (یعنی فیصلے کرنے والے لوگ)۔

مولانا گوہر رحمن نے "اولوالامر" کی مراد واضح کرنے کے لیے شیخ محمد عبدہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> اولوالامر جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے، ان سے مراد وہ ذی رائے اور صاحب بصیرت لوگ ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں اہل شوریٰ اور اہل حل و عقد کہا جاتا ہے یہ وہ ذمہ داران ریاست ہوتے ہیں جن کو دوسری قومیں "نواب الامہ" یعنی قومی نمائندے کہتی ہیں۔ ضروری ہے کہ تمام قانونی، انتظامی اور سیاسی امور انہی کے سپرد کیے جائیں۔[1]

---

[1] - ملاحظہ: احکام الذمیین والمستأمنین، ص: ۷۲

[2] - حوالہ مذکور

[3] - تفسیر کبیر (سورۃ النساء: ۵۹)، مکتبہ علوم اسلامیہ، لاہور، ۴/ ۱۱۲ (الجزء العاشر من التفسیر الکبیر)

[1] - اسلامی سیاست، ص: ۲۹۸

ارکان پارلیمنٹ کے لیے فقہاء کی اصلاح "اہل الحل والعقد" کے الفاظ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شرعی اعتبار سے یہ ارکان کوئی عام اور ایرے غیرے قسم کے شہری نہیں ہوتے بلکہ ایسی فراست و بصیرت، حکمت ودانش کے حامل ہوتے ہیں جو نظام مملکت کی گتھیاں سلجھانے اور اندرونی و بیرونی مسائل حل کرنے کے لیے کسی آدمی میں ضروری ہوتی ہیں۔ مجلس شوری یا قومی اسمبلی کے ارکان کی صفات بیان کرتے ہوئے مولانا گوہر رحمٰن لکھتے ہیں:

> مشورہ ایک امانت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "المستشار مؤتمن" یعنی جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ معتمد ہوتا ہے اور ارشاد خداوندی ہے: ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الا منت الیٰ اھلھا یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اور ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کرو جو اہل ہوں۔ مجلس شوریٰ کی رکنیت کوئی حق نہیں ہے تاکہ مساوات فی الحقوق کا قاعدہ جاری کیا جائے اور بغیر کسی شرط کے ہر شہری کو رکن شوریٰ بننے اور اس کے لیے بطور امیدوار کھڑا ہونے کا حق دیا جائے بلکہ یہ تو ایک فرض ہے جسے ارکان شوریٰ امت کے وکیلوں کی حیثیت میں انجام دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرض اور امانت ہر ایک کے سپرد نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے لیے اہلیت کا کوئی معیار ہوتا ہے۔ ایمان واسلام اہلیت اور معیار نمائندگی کی بنیادی شرائط میں داخل ہے۔ اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ کا کام سربراہ ریاست اور وزراء کا تقرر بھی ہے، اسلامی قوانین کی تشریح و تعبیر بھی ہے۔ نئے مسائل میں اجتہاد کرنا بھی ہے اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے لیے تدابیر سوچنا بھی اس کا کام ہے تو جو شخص سرے سے اسلام پر عقیدہ ہی نہ رکھتا ہو، اسے یہ اہم ترین ذمہ داری کیسے دی جاسکتی ہے۔ ہر نظریاتی ریاست کے ذمہ داروں کے لیے ریاست کے بنیادی نظریے پر یقین رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے امت مسلمہ کے نمائندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ توحید و

رسالت، ختم نبوت اور قرآن و سنت کے قطعی احکام پر غیر متزلزل اعتقاد رکھتا ہو۔ البتہ غیر مسلم اقلیتیں جداگانہ انتخاب کے ذریعے اپنے نمائندے ریاست کی مجلس شوریٰ میں بھیج سکتی ہیں۔[1]

زیر بحث مسئلے میں مولانا مودودی نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اس کے بعد ہمارے سامنے مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کا مسئلہ آتا ہے۔ جہاں تک ٹھیٹھ اسلامی نظریہ کا تعلق ہے، اس کی رو سے تو مجلس شوریٰ میں بھی غیر مسلموں کی نمائندگی صحیح نہیں ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے حالات میں اس کے لیے گنجائش نکالی جاسکتی ہے بشرطیکہ ملک کے دستور میں اس بات کی واضح اور صریح ضمانت موجود ہو کہ

(أ) پارلیمنٹ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی کرنے کی مجازنہ ہو گی اور ہر فیصلہ جو اس حد سے متجاوز ہو قانونی سند حاصل کرنے سے محروم رہے گا۔

(ب) ملک کے قانون کا اولین ماخذ قرآن و سنت ہوں گے۔

(ج) قوانین کی آخری توثیق کا اختیار جس شخص کو حاصل ہو گا وہ لازماً مسلمان ہو گا۔[2]

مولانا اسحاق سندیلوی نے مجلس تشریعی (قانون ساز اسمبلی) کی شرائط رکنیت بیان کرتے ہوئے "الزامی انداز" میں لکھا ہے:

رواداری کا وعظ کہنے والے ذرا سطحیت کو چھوڑ کر حقیقت پر نظر کریں تو انہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کی سب قومیں یہی کر رہی ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کو وضع قانون کا منصب واقعہ

---

[1] - اسلامی سیاست، ص:۲۹۹-۳۰۰

[2] - اسلامی ریاست، ص:۵۹۸-۵۹۹

کے لحاظ سے کہاں نصیب ہوتا ہے؟ نگاہ حقیقت میں تو ہر جگہ "دیو استبداد" کو جمہوری "قبا" میں "پائے کوب" دیکھ رہی ہے اور دنیا کو "آزادی کی نیلم پری" کا فریب دینا جمہوریت کا بین الاقوامی مزاج بن چکا ہے۔ طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم نام بنام ایک ایک ملک کی جمہوریتوں کی نقاب فریب چاک کر کے ان کی اصلی شکل دکھا دیتے اور یہ مکروہ واقعہ نظر آجاتا کہ ان میں مغلوب قوموں کے نمائندے صرف اسی لئے مجالس قانون ساز میں بازیاب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کو ذبح کرنے میں آلہ کار بن سکیں یا کسی غالب پارٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور دنیا کے سامنے حکومت کی رواداری (بے تعصبی) کے گیت گاتے رہیں۔ اسلام اس فریب کاری کو سخت ناپسند کرتا ہے وہ غیر مسلموں یا مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کو اس مجلس کی رکنیت سے محروم کرتا ہے لیکن اس کی لاثانی رواداری اور اس کا بے نظیر کرم دیکھو کہ وہ اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ ان مسائل کے متعلق جو مندرجہ بالا زیر بحث قسم کے گروہوں سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں اور ان کا کوئی اثر اسلامی احکام پر نہیں پڑتا ہے۔ وہ خود وضع قانون کر سکتے ہیں، خصوصاً ان کا قانون شخصی (Personal Law) اس آزادی سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گا یہ فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ دلائل نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔[1]

علیحدہ پارلیمنٹ

یہ بات چنداں محتاج دلائل نہیں کہ اھل الذمہ / غیر مسلم شہریوں کے مسائل کو ان سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے۔ پھر یقیناً ان کے اندر ہر علم و فن کے ماہرین بھی ہوں گے۔ قرآن مجید میں ایک عمومی ہدایت فرمائی گئی ہے:

---

[1] - اسلام کا سیاسی نظام، ص: ۲۰۰-۲۰۱

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ [1]

اگر تم کوئی چیز نہیں جانتے تو اس کے بارے اس کے متعلقہ ماہرین علم سے پوچھ لیا کرو۔

"اھل الذکر" میں مسلمان ہونے کی قید نہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

الکلمة الحکمة ضالة الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بھا۔ [2]

دانائی کی بات حکیم کی گمشدہ میراث ہے۔ وہ اسے جہاں بھی پائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کئی غیر مسلم اقوام نے ذمی بن کر اسلامی ریاست کے زیر نگیں رہنا قبول کیا۔ ان کے معاملات و مسائل حضرت عمرؓ انہی کے مشورہ سے حل فرمایا کرتے تھے چنانچہ اہل الذمہ سے مشورہ لینے کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی نے حضرت عمر فاروق کے متعلق لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ ہمیشہ ان انتظامات میں جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا تھا، ذمیوں کے مشورے اور استصواب کے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ عراق کا بندوبست جب پیش آیا تو عجمی رئیسوں کو مدینہ میں بلا کر مال گزاری کے حالات دریافت کیے مصر میں جو انتظام کیا اس میں مقوقس سے اکثر رائے لی۔[3] اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے "ہرمزان" سے مشورہ لینے کی روایت بخاری شریف میں موجود ہے جسے تستر کی لڑائی میں قیدی بنایا گیا تھا اور جو ایرانی جرنیلوں میں سے تجربہ کار جرنیل تھا۔[1]

کسی غیر مسلم کے ممبر پارلیمنٹ ہونے کے مسئلے میں مولانا مودودی نے کہا ہے کہ:

---

[1] ۔ النحل، ۱۶: ۴۳

[2] ۔ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح (کتاب العلم ۔ الفصل الثانی) ص: ۳۴، رقم: ۲۱۶؛ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد باب الحکمۃ، رقم: ۴۱۶۹؛ جامع ترمذی، کتاب العلم باب فضل الفقہ علی العبادہ، رقم: ۲۶۸۷

[3] ۔ الفاروق، میزان، لاہور، ۲/ ۲۶۳

[1] ۔ مولانا گوہر رحمن، اسلامی سیاست، ص: ۳۱۵

ایک شکل یہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ غیر مسلموں کو ملک کی پارلیمنٹ میں شامل کرنے کے بجائے ان کے لیے ایک الگ نمائندہ مجلس یا اسمبلی بنادی جائے تا کہ وہ اپنی اجتماعی ضروریات بھی اس کے ذریعہ سے پوری کریں اور ملکی انتظام کے معاملہ میں بھی اپنا نقطہء نظر پیش کر سکیں۔ اس مجلس کی رکنیت اور رائے دہی غیر مسلموں کے لیے مخصوص ہو-اور اس میں ان کو اظہار رائے کی پوری آزادی دی جائے۔اس مجلس کے ذریعہ سے:

۱۔ وہ اپنے شخصی معاملات کی حد تک قوانین تجویز کرنے اور سابق قوانین میں اصلاح وترمیم کرنے کے مجاز ہوں گے،اور اس طرح کی تمام تجاویز رئیس حکومت کی منظوری سے قانون بن سکیں گی۔

۲۔ وہ حکومت کے نظم و نسق اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے متعلق اپنی شکایات، اعتراضات، مشورے اور تجاویز پوری آزادی کے ساتھ پیش کر سکیں گے اور حکومت انصاف کے ساتھ ان پر غور کرے گی۔

۳۔ وہ اپنے گروہ کے معاملات اور عام ملکی معاملات کے متعلق سوالات بھی کر سکیں گے،اور حکومت کا ایک نمائندہ ان کے جوابات دینے کے لیے موجود رہے گا۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بلدیات اور مقامی مجالس(Local Bodies) کا تعلق ہے، ان میں غیر مسلموں کو نمائندگی اور رائے دہی کے پورے حقوق دیے جاسکتے ہیں۔[1]

جبکہ اسلامی ریاست کے اندر قانون سازی کے عمل میں غیر مسلموں کی شرکت کے مسئلہ کی

[1] ۔اسلامی ریاست، ص:۵۹۹

وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

مطلق قانون سازی کا حق ہر شخص کو معلوم ہے، اسلامی ریاست کے اندر کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتا، نہ کسی مسلم کو نہ غیر مسلم کو۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکام موجود ہوں گے، اسلامی حکومت ان معاملات میں ان کو بلا کم وکاست جاری کرے گی۔ جن معاملات میں کوئی صریح قانون موجود نہ ہو گا، ان کے بارہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت میں درک رکھنے والوں اور حالات اور مصالح پر اسلامی نظر سے غور کرنے والوں کا یہ کام ہو گا کہ وہ بتائیں کہ ان میں اسلامی شریعت کے مزاج سے کیا بات قریب تر ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں غیر مسلم نہ کوئی مدد دے سکتے ہیں اور نہ انہیں اس کام میں شریک کرنے کے کوئی معنی ہیں۔ البتہ جن امور کا تعلق عام مصلحت یا عام انتظامی معاملات سے ہے، ان میں غیر مسلموں کے مشوروں سے بھی حکومت اسی طرح فائدہ اٹھائے گی جس طرح مسلمانوں کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گی، بلکہ ایسے امور سے متعلق قانون سازی کے معاملات میں انہیں شریک بھی کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کو اس بات کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ایک ایسی اسمبلی بنا لیں جو ان کے پرسنل لاء کے دائرہ کے اندر قانون سازی کے لیے سفارشات بھی مرتب کرے۔[1]

[1] - اسلامی ریاست، ص:۲۲۶

چھٹی فصل

غیر مسلم رعایا کے ساتھ خلفاء اسلام کی رواداری تاریخی نظائر اور مستشرقین کا اعتراف

ایک اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کے تمام انسانی اور بنیادی حقوق کی ادائیگی اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کس طرح پابند ہے؟ اسلام نے اس معاملے میں اسلامی حکومت اور مسلمان حکمرانوں کو کیا ہدایات دی ہیں؟ قرآن و سنت کی کیا تعلیمات ہیں؟ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اس معاملے میں کیا اسوہ حسنہ چھوڑا ہے؟ خلفاء راشدین نے غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ فقہاء و مفکرین اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ غیر مسلموں کے ساتھ سماجی تعلقات کے کیا احکام و حدود ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، یہ تمام تفصیلات بقدر ضرورت گزشتہ ابواب و فصول میں گزر چکی ہیں۔ غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے اسلام کی ان تعلیمات پر بعد کے خلفاء اسلام اور اسلامی حکومتوں نے کس حد تک عمل کیا، اس کی بھی اکا دکا مثالیں سابقہ ابواب میں درج ہو چکی ہیں۔ تاہم مزید وضاحت کے لیے یہاں تاریخ اسلام سے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کی کمال رواداری، وسعت ظرفی اور عدل و انصاف کے چند مزید نظائر پیش کرنا بے جا نہ ہو گا۔ مسلمان خلفاء کی غیر مسلموں سے رواداری کی تمام مثالیں جمع کی جائیں تو یقیناً ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ خلفاء اسلام مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں اپنی سیاسی کشمکشوں، اقتدار کی خاطر باہمی لڑائیوں، خونریزیوں اور کئی انتظامی و اخلاقی خامیوں کے باوجود اپنی غیر مسلم رعایا سے جس انصاف، ہمدردی، خیر خواہی، وسعت ظرفی، بے تعصبی، بردباری، برداشت اور رواداری سے پیش آتے رہے، اس کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اور قوم پیش نہیں کر سکتی۔ دنیا کے دوسرے غیر مسلم حکمرانوں کے مقابلے میں خلفاء اسلام کی یہ وہ خوبی ہے جس کا اعتراف خود انصاف پسند اور حقیقت شناس غیر مسلم

مفکرین اور مستشرقین نے بھی کیا ہے۔

زیر بحث معاملے میں خلفاء اسلام کے سامنے یقیناً اسلام کی یہ بنیادی تعلیم مد نظر رہی کہ اسلام کا رب صرف "رب المسلمین" ہی نہیں بلکہ "رب العالمین" ہے۔ اسی طرح اس کا رسول ﷺ بھی "رحمۃ للمسلمین" کی بجائے "رحمۃ للعالمین" ہے۔ اگر کسی مسلمان حکمران نے کسی موقعہ پر اسلام کی اس بنیادی تعلیم کے برعکس کوئی قدم اٹھایا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل، مذہبی تعصب یا کوئی سیاسی ضرورت ہو سکتی ہے، اسلام کی تعلیم ہرگز نہیں۔ مسلمان خلفاء نے اپنی ہزار کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اپنی غیر مسلم / ذمی رعایا سے جو رواداری برتی اور جس حسن سلوک اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا، اس کے بدلے میں "الانسان عبدالاحسان" (انسان احسان کا غلام ہے) کے مشہور مقولہ نے اپنا اثر دکھایا اور اہل الذمہ مسلمانوں کے بڑے وفادار اور معاون و مددگار بن گئے۔ اور انہوں نے کبھی مسلمانوں کے خلاف بغاوت نہ کی۔ امام ابو یوسفؒ نے اس تاریخی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

> فلما رأى اهل الذمة وفاء المسلمين لهم وحسن السيرة فيهم صاروا اشداء على عدوالمسلمين وعوناً لهم للمسلمين على اعدائهم۔[1]
>
> اہل الذمہ نے جب مسلمانوں کی عہد کی پابندی اور اپنے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ دیکھا تو وہ مسلمانوں کے دشمنوں کے سخت دشمن اور ان دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔

جبکہ عصر حاضر کے نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس تاریخی حقیقت کی یوں وضاحت کی ہے:

> غرض مسلمانوں کا طرز عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی نظیر ہمیں تاریخ عالم میں کم ملتی ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا اس کی طرف اشارہ کر کے میں

---

[1] - کتاب الخراج، ص: ۸۰

اسے (خطبہ / موضوع) کو ختم کرتا ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اس فریق نہ اُس فریق کا ساتھ دیتے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال انہیں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قیصر روم نے پیام بھیجے اور وہاں کے اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے کہ تم بغاوت کرو۔ میں بھی اس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا اور ان سے ہم نجات پائیں گے۔ اس ابتدائی زمانہ سے لے کر کروسیڈز (صلیبی جنگوں) تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کیے تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی و خود مختاری دیتے تھے حتی کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے، یہ خوش خبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہمارے Convents کی مدد کرتی ہے۔[1]

---

[1] ۔ خطبات بہاولپور (خطبہ: تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ)، ص: ۳۱۳

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری اور وسعت ظرفی کو دیکھتے ہوئے غیر مسلم رعایا کے ان کے وفادار بن جانے اور خوش آمدید کہنے کی ایک مثال سر تھامس آرنلڈ نے یہ لکھی ہے کہ جب قیصر ہرقل نے اپنے بعض اقدامات اور مذہبی پابندیوں کے باعث اپنی عیسائی رعایا کو ناراض کر لیا تو سلطنت روما کی آرتھوڈوکس رعایا کا بڑا حصہ جو قیصر کے مفتوحہ صوبہ جات میں آباد تھا، عربوں کا دوست بن گیا۔ قیصر کو بے دین سمجھ کر رعایا نے دشمنی کی نظر سے اپنے بادشاہ کو دیکھا اور یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں اپنے مونوتھیلتک عقائد کو زبردستی جاری کرنے میں ہم پر ظلم نہ کرنے لگے۔ پس عیسائی رعایا نے بلا تامل بلکہ شوق سے اپنے نئے حاکموں کا خیر مقدم کیا جنہوں نے ان کے دین کے سلامت رکھنے کا وعدہ کیا اور راضی ہو گئے کہ عیسائیوں کے مذہبی مراتب اور قومی آزادی میں مناسب انداز قائم کر دیں گے بشرطیکہ موجودہ خطرے سے وہ اپنے تئیں بچا لیں۔ چنانچہ جب ہرقل کی فوج حمص کے شہر کے قریب آئی تو شہر والوں نے فصیل کے دروازے بند کر لیے اور مسلمانوں سے کہا تمہاری حکومت اور تمہارے انصاف کو یونانیوں کی بے انصافی اور ظلم کے مقابلے میں بہتر جانتے ہیں۔[1]

علامہ شبلی نعمانی نے عہد فاروقی میں اہل الذمہ کے ساتھ حضرت عمرؓ کی نرمی اور درگزر کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ذمیوں کے ساتھ جو لطف و مراعات کی گئی تھی اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ذمیوں نے ہر موقع پر خود اپنے ہم مذہب سلطنتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا، ذمی ہی تھے جو مسلمانوں کے لیے رسد بہم پہنچاتے تھے۔ لشکر گاہ میں مینا بازار لگاتے تھے، اپنے اہتمام اور صرف سے سڑک اور پل تیار کراتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاسوسی اور خبر رسانی کرتے تھے یعنی دشمنوں کے ہر قسم کے راز مسلمانوں سے آکر کہتے تھے حالانکہ یہ دشمن انہی کے ہم مذہب عیسائی یا پارسی تھے۔ ذمیوں کو مسلمانوں

---

[1] - دعوت اسلام (اردو ترجمہ۔ باب سوم)، ص:۷۶

کے حسن سلوک کی وجہ سے جو اخلاص پیدا ہو گیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جنگ یرموک کے پیش آنے کے وقت جب مسلمان شہر حمص سے نکلے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے۔ عیسائیوں نے نہایت حسرت سے کہا: خدا کی قسم تم رومیوں کی نسبت کہیں بڑھ کر ہم کو محبوب ہو۔[1]

اسی طرح ڈاکٹر گستاؤلی بان خلفاء راشدین کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ رواداری اور نرمی و رعایت کی پالیسی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خلفائے راشدین نے سمجھ لیا کہ مذہب اور نظامات بزور شمشیر جاری نہیں ہو سکتے اور ہم نے دیکھا ہے کہ وہ جہاں کہیں گئے شام میں، مصر میں، اندلس میں، انہوں نے مفتوحہ اقوام سے نہایت ملائمت کا سلوک کیا اور ان کو قانون اور نظامات اور مذہب کی آزادی دی اور اس امن و امان کے بدلے جس کی انہوں نے ذمہ داری لی ان سے ایک خفیف سا محصول لیا جو مقدار میں اس سے بہت کم تھا جو وہ پہلے دیتے تھے۔ دنیا میں کبھی ایسے متحمل اور روادار ملک گیر نہیں ہوئے اور نہ ایسا نرم اور مہربان کوئی مذہب ہوا۔ یہ رواداری یہ ملائمت جس کو مورخین اس قدر غلط سمجھتے ہیں، بہت بڑا سبب عربوں کی فتوحات کے پھیل جانے اور ان کے مذہب اور نظامات اور زبان کے ہر جگہ بآسانی مقبول ہو جانے کا تھا۔[2]

غرض آئندہ سطور میں ہم زمانی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر خلفاء اسلام کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ مثالی مذہبی رواداری حد درجہ وسعت ظرفی اور کمال حسن سلوک کے چند تاریخی نظائر اور مستشرقین کے

[1] - الفاروق، المیزان، لاہور، ۲/ ۲۶۸

[2] - تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، (فصل عربوں کی ترقی کے اسباب)، ص: ۵۱۸

اعترافات درج کریں گے تاکہ اس معاملے میں خلفاء اسلام کی عظمت و برتری واضح ہو سکے کیونکہ "الفضل ماشهدت به الاعداء" اصل فضیلت و عظمت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں۔ ساتھ ہی اس کے مقابلے میں غیر مسلم خصوصاً عیسائی حکومتیں اپنے پیغمبر علیہ السلام کی تعلیم کے برعکس اپنی مسلمان رعایا سے جس ظلم اور مذہبی تعصب و تشدد سے پیش آتی رہیں، اس پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

قاہرہ (مصر) کی جامعہ عین شمس میں تاریخ اسلام کے استاذ ڈاکٹر علی حسن الخربوطلی نے زیر بحث موضوع پر اپنی مستند کتاب "الاسلام واھل الذمۃ" میں زمانی و تاریخی ترتیب کے حساب سے خلفاء راشدین کے عہد حکومت، پھر عہد بنی امیہ، عہد بنی عباس اور عثمانی عہد حکومت کے علاوہ مصر اور بلاد اندلس وغیرہ کی اسلامی حکومتوں میں اہل الذمہ کے ساتھ جس تسامح، رواداری، عدل و انصاف اور حسن سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔ اس کی پوری تفصیل اور متعدد نظائر بیان کیے ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ ان میں سے خلفاء راشدین اور خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے اپنی ذمی رعایا کے ساتھ برتاؤ اور مذہبی رواداری کے حوالے سے بعض نظائر و امثال گزشتہ ابواب میں گزر چکی ہیں۔ زیر نظر فصل میں ہم اس سلسلے کی چند مزید نظائر پیش کریں گے، جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام نے غیر مسلموں / اہل الذمہ کے حقوق اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے حوالے سے جو تعلیمات اور ہدایات دی ہیں وہ محض کتاب دستور کی زینت نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں نے عموماً ان تعلیمات پر پورا پورا عمل کیا ہے۔ زیر بحث معاملے کے حوالے سے رئیس احمد جعفری کا یہ تبصرہ و تجزیہ قابل ملاحظہ ہے کہ

> کوئی انسان بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ لغزشوں سے اس کا دامن پاک ہے۔ مسلمانوں سے بھی تاریخ کے ہر دور میں کچھ نہ کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، ملاطفت، وسعت قلب اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کچھ اس طرح مسلمانوں کی فطرت میں رچ گیا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کو مسلمان ہو جانے پر مجبور نہیں کیا۔ نہ غیر مسلم ہونے کے سبب انہیں عام انسانی حقوق سے محروم

کیا۔ مسلمان فرمانرواؤں نے خود مسلمانوں کو بہت ستایا، پریشان کیا، آپس کی جنگ میں خون کی ندیاں بہادیں، لیکن غیر مسلموں کو ہدف ستم نہیں بنایا۔ یہ کردار نتیجہ ہے ان واضح قرآنی ہدایات کا جنہیں مسلمانوں نے اپنے اندر جذب کر لیا اوراس طرح جذب کیا کہ یہ چیز ان کی طبیعت کا جزو بن گئی اور اس خصوصیت کا اعتراف خود غیر مسلموں نے بڑی صفائی اور بے باکی سے کیا۔ "الفضل ما شهدت به الاعداء" (سب سے بڑی بڑائی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کرنے پر مجبور ہو جائے)۔[1]

خلیفہ مامون عباسی کی رواداری

علامہ شبلی نعمانی نے خلیفہ مامون عباسی کی اپنی غیر مسلم رعایا سے کمال بے تعصبی، رواداری، حد درجہ برداشت اور وسعت ظرفی کا ایک حیران کن واقعہ درج کیا ہے۔ ایسا توہین آمیز واقعہ جو ایک عام مسلمان آدمی کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا مگر خلیفہ نے سارے اختیارات واقتدار کا مالک اور ایسے جرم پر کڑی سے کڑی سزا دینے کی قدرت واختیار رکھنے کے باوجود جس رواداری اور برداشت کا مظاہرہ کیا، مذاہب کی تاریخ میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں:

> عبدالمسیح بن اسحاق کندی جو ایک عیسائی عالم اور معزز ملکی عہدے پر فائز تھا، مامون کے ایک عزیز کا دلی دوست تھا۔ اس ہاشمی نے عبدالمسیح کو نہایت نرم لفظوں میں ایک دوستانہ خط لکھا کہ "اگر آپ مذہب اسلام قبول کر لیں تو خوب ہو۔ مجھ کو افسوس ہے کہ ایک ایسے سچے مذہب کی طرف جیسا اسلام ہے، اب تک آپ مائل نہیں ہوئے ہیں"۔ اس خط کے جواب میں عبدالمسیح نے جو کچھ لکھا، کوئی شخص جب تک خود دیکھ نہ لے اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس نے برگزیدہ رہنمائے خلق یعنی محمد مصطفی ﷺ اور قرآن مجید و صحابہؓ کی نسبت وہ الفاظ لکھے کہ سن کر دل کانپ جاتا ہے یہ پورا خط جو

---

[1] - اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص: ۸۹

ایک رسالہ کی شکل میں ہے، بمقام لندن مطبع گلبرٹ اور رونگٹن، تھوڑے دن ہوئے چھاپا گیا ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا اور ناظرین کو یقین دلاتا ہوں کہ دیکھنے کے وقت ایک ایک حرف پر میرا دل لرز جاتا تھا۔ اگر آج عبدالمسیح زندہ ہوتا تو تعزیرات ہند کے اثر سے کبھی نہ بچ سکتا۔ مامون کے سامنے یہ خط پیش ہوا تو اس نے پڑھ کر صرف اتنا کہا کہ "جو مذہب دنیا کے کام کا ہے وہ زرتشت کا مذہب ہے اور جو محض آخرت کے لیے مفید ہے وہ عیسائی مذہب ہے لیکن دین و دنیا کے لیے جو مذہب موزوں ہے وہ اسلام ہے"۔[1]

عباسی خلیفہ مقتفی لامر اللہ کی رواداری

عباسی خلیفہ مقتفی لامر اللہ کے عہد حکومت (۵۳۰ تا ۵۵۵ھ) میں نسطوری عیسائیوں کے چیئرپارک عبدشیوع سوم نے عیسائیوں کی طرف سے خلیفہ کو ایک درخواست دی تھی جس میں امیر المؤمنین کی حکومت کی برکت اور غیر مسلموں کے ساتھ عدل پروری اور تحفظ حقوق کا اعتراف کیا گیا تھا۔ اس درخواست کے جواب میں امیر المؤمنین نے درج ذیل سرکاری فرمان کے ذریعے عبدشیوع کو جو عزت اور اختیارات دیے، عیسائی رعایا کے لیے جن مراعات کا اعلان کیا اور ان کے جان و مال اور تمام حقوق کے تحفظ کی جس طرح یقین دہانی کرائی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان خلفاء غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس قدر رواداری اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ سید صباح الدین نے سید سلیمان ندوی کے ایک مضمون کے حوالے سے یہ فرمان یوں درج کیا ہے۔

"تجھ کو اس تحریر کے ذریعے سے تمام نسطوری عیسائیوں کا "جاثلیق" مقرر کیا جاتا ہے جو دارالاسلام (بغداد) اور دیگر بلاد اسلام میں آباد ہیں، تجھ کو ان کا سردار بھی بنایا جاتا ہے اور نیز یونانی، یعقوبی اور ملکیہ فرقوں کا بھی، خواہ ان کی نمائندگی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو اور جو ان نسطوریوں کے ساتھ کسی دوسرے

---

[1] - المامون، دارالاشاعت کراچی، ۴/۱۱۸

ملک میں مخالفت رکھتے ہیں، تیرے تمام اہل مذہب میں صرف تجھ کو گرجاؤں اور مذہبی جلسہ گاہوں میں کیتھولیک کے نشانات پہننے کا اختیار ہے، کسی ارچ، بشپ یا ڈیکن کو ان کے پہننے کا یا ان میں شرکت کرنے کا استحقاق نہ ہوگا کیونکہ یہ اس بات کی نشانیاں ہیں کہ وہ اس عالی منصب اور عزت کے ماتحت ہیں جو تجھے بخشی گئیں، اگر ان عہدیداروں میں کوئی تیرے ساتھ مخاصمت یا اختلاف کرے گا یا تیرے احکام سے بغاوت کرے گا اور تیرے فیصلوں کو نہ مانے گا اس پر مقدمہ چلا کر سزا دی جائے گی۔ تاآنکہ وہ باز آجائے اور اس کی ضد ہٹ جائے تاکہ دوسروں کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو، تمہارے قوانین کے احکام کلیۃً محفوظ ہیں، امیر المؤمنین اپنے پیشروائمہ سے مستند طریق عمل کے اتباع میں جو انہوں نے تیرے پیشرو جاثلیقوں کے ساتھ برتے تھے، قانونی حق تیرے پیروؤں کو عطا کیا ہے کہ تیری جان، تیرے مال اور تیری قوم کی حفاظت کی جائے گی، تمہاری بہبود کی ترقی میں کوشش کی جائے گی، تمہارے طریق دفن وکفن کا احترام کیا جائے گا، تمہارے گرجاؤں اور خانقاہوں کی حفاظت کی جائے گی، اس معاہدہ کی شرائط کی تعبیر میں ہم اس طریق عمل کے پابند ہیں جو اپنے اصول کے سخت پابند (ارتھوڈکس) خلفا کا تھا، جس کی اتباع ہمارے ائمہ اسلاف رضی اللہ عنہم کرتے رہے، یہ کہ ہم تم سے راضی رہیں گے، بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے رہو جو تمہارے عاقل بالغ اور ذی مقدور مردوں سے لیا جائے گا، نابالغ مرد اور عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، یہ ٹیکس شرع کے رحیمانہ اصول کے تحت پابندی ساتھ سال میں ایک مرتبہ وصول کیا جائے گا۔ امیر المومنین نے اپنی مہربانی سے عیسائیوں کے مختلف فرقوں کی نزاعات میں حکم بننا منظور کر لیا ہے تاکہ زبردست سے زبردست کا انصاف حاصل کیا جائے اور گمراہوں کو راہ پر لایا جائے اور ان کی مذہبی ضروریات کے لحاظ سے ان کی خبر گیری کی جائے اور وہ اپنے مذہب پر صاف اور سیدھی راہ سے عمل کر سکیں ان انعامات کا جو تجھ کو عطا کیے گئے ہیں مستحق ہیں جو تیری روح کی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں، امیر المومنین کے لیے شکر گزاری، احسان مندی اور دنیاداری کے ثبوت میں دعا اور طلب رحمت کیا کرو۔"[1]

---

[1] اسلام میں مذہبی رواداری، ص: ۱۶۸-۱۶۹

عباسی خلیفہ کے اس فرمان پر ایک عیسائی مصنف ڈاکٹر منگانا کا تبصرہ اور مسلمان خلفاء کی رواداری کا اعتراف قابل ملاحظہ ہے:

یہ ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی ہے کہ ایک مستند بیان اس کے متعلق پیش کیا جائے کہ جس زمانہ میں اسلام کے ہاتھ میں لاکھوں عیسائیوں کی موت وحیات کا فیصلہ تھا۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان سرکاری روابط کس قسم کے تھے۔ انفرادی حیثیت سے ممکن ہے کہ عیسائیوں کو مسلمانوں کے ہاتھ سے ایذائیں پہنچی ہوں، ایسی مثالیں تاریخ میں بھی کہیں کہیں ملیں گی کہ کسی صوبہ کے گورنر یا قاضی کے مذہبی جنون میں یا کسی نیم دیوانہ شیخ اور ملانے اپنے کسی مجنونانہ تخیل کی بنا پر عیسائیوں پر ظلم کیے ہیں۔ خلفاء میں سے بھی ایک دو نے مثلاً متوکل نے ضرور عیسائیوں کے خلاف بعض تکلیف دہ احکام نافذ کیے تھے۔ لیکن ان واقعات کو اگرچہ ان کی تعداد کس قدر زیادہ ہو اصول مذہب اور قانون کے خلاف سمجھنا چاہیے اور وہ لوگ جن کی وجہ سے یہ واقعات سرزد ہوئے ہیں۔ اسی طرح قانون کی خلاف ورزی کے مجرم تھے جس طرح ہر مجرم ہوتا ہے۔ اسلام کا اس بارے میں جو عمل رہا ہے وہ اس چارٹر (سند فرمان) میں صاف الفاظ میں درج ہے جو شک وشبہ کے بغیر اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ باوجودیکہ اسلام کا نظام سلطنت بعض تمدنی امور میں نامکمل رہا لیکن اس کا دامن نارواداری سے پاک تھا۔ یہ فرمان ایک عباسی خلیفہ کے ایوان حکومت سے جاری ہوا لیکن کیا کوئی انگریز بادشاہ، ڈنمارک کی ملکہ یا فرانس کا صدر اس بیسویں صدی میں اس سے زیادہ روادارانہ فرمان اپنی بے شمار مسلمان رعایا کے حق میں لکھ سکتا ہے۔[1]

---

[1] ۔سید صباح الدین، اسلام میں مذہبی رواداری، ص: ۱۷۰

محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے حسن سلوک

بنی امیہ کے عہد میں نوخیز سپہ سالار محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو اس کے تمام باشندوں کو امان اور پوری مذہبی آزادی دے دی اور برہمنوں اور دوسرے اکابر و اعیان کے مذہبی حقوق و مراتب برقرار رکھے۔ شاہ معین الدین ندوی نے چچ نامہ کے حوالے سے لکھا ہے:

پس اکابر و مقدمان و براہمہ رافرمود کہ معبود خودرا عمارت کنند و بامسلمانان خرید و فروخت کنند و ایمن باشند و درصلاح خود کوشند و فقراء و برہمنان را تیمار دارند واعیاد و مراسم خود بشرائط آباء واجداد قیام نمایند۔[1]

پس محمد بن قاسم نے مذہبی اکابر، پیشواؤں اور برہمنوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کریں۔ مسلمانوں سے خرید و فروخت کریں، ہماری طرف سے مطمئن رہیں، اپنی ترقی کی کوشش کریں، فقراء اور برہمنوں کی تیمارداری کریں اور اپنے تہواروں اور مذہبی مراسم کو اپنے آباؤ اجداد کی شرائط کے مطابق بجالائیں۔ اس حسن سلوک سے سندھ کے باشندے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ جب محمد بن قاسم پر سلیمان بن عبد الملک کا عتاب نازل ہوا اور وہ جیل میں مر گیا تو اہل ہند نے بڑا غم منایا اور اس کی یادگار میں کیرج میں اس کی مورتی بنائی۔ بلاذری نے لکھا ہے:

فبکی اهل الهند و سندھ علی محمد و صوره بالکیرج۔[2]

پس اہل ہند اور سندھ محمد بن قاسم کی موت پر بڑے روئے اور کیرج میں اس کی مورتی بنا کر رکھی۔

محمد بن قاسم کی اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کمال رواداری کی گواہی رئیس احمد جعفری ندوی نے ایک ہندو مؤرخ مسٹر چونی لال انند کے الفاظ میں یوں نقل کی ہے:

دوسرے مقامات کی طرح ہندوستان میں بھی عربی حکومت کے ماتحت اقوام پر کوئی

---

[1] ۔شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص: ۲۵۹-۲۶۰

[2] ۔فتوح البلدان، ص:۴۴۶؛ بحوالہ شاہ معین الدین ندوی، دین رحمت، ص: ۲۶۱

مذہبی جبر و تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی رسوم و اعتقادات کی عزت کرتا تھا۔ ہندوؤں کو قانون کی ویسی ہی پناہ حاصل تھی جیسی کہ مسلمانوں کو تھی۔ ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی انسٹی ٹیوشنوں میں کوئی مداخلت نہ کی جاتی تھی۔ وہ اپنے بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے ایماء پر ان کے ذات پات کے قواعد کو قانون کا درجہ دیا گیا تھا۔ توسیع سلطنت کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے لیے تمام سرکاری دفاتر کھول دیے گئے تھے۔ برہمنوں کو مال گزاری اور کلکٹری کے کاموں پر متعین کیا گیا تھا۔ اور قاسم نے وزارت کا اعلیٰ ترین عہدہ اپنے وقت کے ایک مشہور فلاسفر مسمی کاکہ کو عطا کیا تھا۔ عربوں کے ماتحت سندھ مذہبی آزادی کی سرزمین تھی۔[1]

رضیہ سلطانہ کی رواداری

ہندوستان کی معروف خاتون حاکمہ رضیہ سلطانہ کی اپنی غیر مسلم رعایا سے برداشت کا درج ذیل واقعہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ تاریخ ملت کے فاضل مصنفین لکھتے ہیں:

جمنا پر ہندوانی تہواروں پر اشنان ہوتے رہتے تھے اور کنارے پر جو مندر تھے ان میں ناقوس اور گھنٹے بڑے زور شور سے تہوار والے دن بجائے جاتے۔ لوگوں نے رضیہ سلطانہ سے شکایت کی اور کہا حضور کے والد نے مہاکال کا مندر منہدم کرا دیا۔ آپ بھی جمنا کنارے کے شوالے مسمار کرا دیجئے اور ثواب کمائیے۔ رضیہ سنتی رہی اور اس نے ارادہ کیا کہ ایسا ہی کیا جائے۔ قاضی سعد الدین کردی کو علم ہوا، اس نے سلطانہ سے کہا: آپ یہ کیا کرتی ہیں؟ آپ کے والد نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ میں نہ تھا جو مشورہ دیتا، سلطانہ!

---

[1] اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲/ ۴۵۴-۴۵۵

محمد بن قاسم کی اہل سندھ سے کمال رواداری کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، تاریخ ملت، ۳/ ۳۸۶-۳۸۸؛ شوکت علی فہمی مفتی، ہندوستان پر اسلامی حکومت، ص: ۴۱-۴۲

شاکیوں سے معلوم کرو یہ سلسلہ اشنان کب سے ہے؟ چنانچہ وہ لوگ بلائے گئے، پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا۔ یہاں رضیہ سے پہلے بھی اسلامی حکومت تھی۔ پہلے بادشاہ کیوں مزاحم نہ ہوئے؟ انہوں نے اس رسم کو کیوں نہ بند کیا؟ رضیہ بولی ان کو توفیق نہیں ہوئی۔ قاضی کردی نے کہا۔ قدیم الایام سے جو رسوم قوموں میں رائج ہیں ان کے موقوف کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ التمش نے مہاکال کا مندر ڈہایا۔ وہ مندر زناکاری کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پجاری نوجوان عورتوں کو جو پوجا کرنے آتیں ان کے ساتھ افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے۔ وہاں کے براہم نے بادشاہ سے کہہ کر مندر کو مسمار کرایا۔ اے رضیہ سلطانہ! صحابہ کرام نے ایران فتح کیا وہاں مذہب زرتشتی تھا جگہ جگہ آتش کدے روشن تھے۔ انہوں نے باوجود صاحب اقتدار ہونے کے آتشکدوں کو نہیں ڈھایا اور نہ زرتشتیوں کو ان کے حق سے محروم کیا جو ان کو اپنے ملک میں حاصل تھے۔ حتیٰ کہ ان کو یہ کہہ کر اہل کتاب کے مساوی سمجھا گیا کہ وہ شبیہ اہل کتاب ہیں یعنی اہل کتاب کے ساتھ ہیں۔ یہی سلوک محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان فتح کر کے ان باشندگان کے ساتھ کیا جو تمام تر ہندو تھے۔ ان کے مندر باقی رہے، ان کے رسم و رواج جاری رہے۔ تم کیا ان سے بڑھ کر ہو جو نیا قدم اٹھا رہی ہو۔ رضیہ سلطانہ نے قاضی کردی کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اپنے احکامات واپس لئے، اشنان اور پوجا پاٹ میں حکم دیا کوئی مزاحم نہ ہو۔[1]

اندلس میں مسلمان خلفاء کی رواداری

اندلس / ہسپانیہ میں مسلمانوں نے کوئی آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ مسلمان خلفاء نے اندلس میں تہذیب و تمدن، معاشرت و سیاست، علم و ادب، تعمیر و ترقی اور اخلاق و شائستگی کے اعتبار سے جو مثالی نمونہ چھوڑا اور علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اندلس کو جس بام عروج تک پہنچایا، اس کی تفصیل میں جانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ زیر بحث موضوع کے حوالے سے یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اندلس میں حکمران قوم مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم عیسائی اور یہودی بھی ان کے ساتھ شانہ بشانہ

1۔ مفتی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی انتظام اللہ شہابی، تاریخ ملت، ۳/ ۴۷۸-۴۷۹

زندگی بسر کر رہے تھے، انہیں اپنے عقائد و نظریات کے مطابق دینی، ثقافتی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی اعتبار سے پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ اندلس میں مسلمان حکمرانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ جس کمال رواداری فیاضی اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اپنی معروف کتاب "یورپ پر اسلام کے احسان" میں مشہور مستشرق موسیو لیبان کے حوالے سے لکھا ہے:

عربوں نے چند صدیوں میں اندلس کو مالی اور علمی لحاظ سے یورپ کا سرتاج بنادیا۔ یہ انقلاب صرف علمی و اقتصادی نہ تھا، اخلاقی بھی تھا۔ انہوں نے نصاری کو انسانی خصائل سکھائے۔ ان کا سلوک یہود و نصاری کے ساتھ وہی تھا جو مسلمانوں کے ساتھ۔ انہیں سلطنت کا ہر عہدہ مل سکتا تھا۔۔۔ مذہبی مجالس کی کھلی اجازت تھی۔۔۔ ان کے زمانے میں لاتعداد گرجوں کی تعمیر اس امر کی مزید شہادت ہے جب ۱۱۹۳ء میں والیٔ قرطبہ (ابو یوسف یعقوب بن المنصور از موحدین افریقہ ۱۱۸۴ء – ۱۱۹۹ء) نے طلیطلہ کا محاصرہ کیا، جو اس وقت ایک عیسائی شہزادی بیرن ژیر کے قبضے میں تھا۔ تو شہزادی نے ابو یوسف کو پیغام بھیجا کہ عورتوں پہ حملہ کرنا بہادروں کا شیوہ نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ شہزادی پہ میرا اسلام ہو اور فوراً محاصرہ اٹھالیا۔[1]

اسی طرح رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔ کہ سپین کے عربوں اور عیسائیوں کے تعلقات اس قدر گہرے تھے کہ جب عبدالرحمان اول (۷۵۶ء – ۷۸۸ء) کے زمانے میں شارلیمان (۷۶۸ء – ۸۱۴ء) نے سپین پہ حملہ کیا۔ تو اس کا مقابلہ نصاری و مسلم نے مل کر کیا۔[2]

اندلس میں مسلمانوں پر مظالم

اندلس میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمانوں حکمرانوں کی روادارانہ پالیسی اور حسن سلوک کے برعکس جب مسلمانوں پر زوال آیا اور وہاں عیسائیوں کی حکومت قائم ہوئی تو عیسائی حکومت مسلمانوں کے

---

[1] - تمدن عرب، ص: ۲۵۷ – ۲۵۸

[2] - یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص: ۱۳۰ – ۱۳۱

ساتھ کس شدت، ظلم اور مذہبی تعصب سے پیش آئی۔ اس کی ایک جھلک بھی ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے الفاظ میں ہی ملاحظہ ہو۔ڈاکٹر برق لکھتے ہیں:

تاریخ کا قطعی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان سپین اور سسلی میں نہ جاتے تو یورپ بربریت، فلاکت اور انتہائی بداخلاقی کی دلدلوں سے کبھی نہ نکل سکتا۔ مسلمانوں نے یورپ کو ایک تابدار تمدن، عظیم الشان تہذیب، بے شمار درس گاہیں اور ہر قسم کے علوم دیئے۔ انہیں کپڑے پہننا، نہانا، کھانا اور انسانوں کی طرح رہنا سہنا سکھایا، اخلاق و آداب کا درس دیا، ان سے آٹھ سو برس تک نہایت عادلانہ وفیاضانہ سلوک کیا۔ اپنے درباروں میں بڑے بڑے منصب دیئے، سب کچھ کیا، لیکن جونہی انہیں زوال آیا عیسائیوں نے ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ گرانے شروع کر دیئے۔ ۱۴۹۲ء میں اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہوا تھا۔ صرف آٹھ برس ہی گزرے تھے کہ فردینان نے مسلمانوں سے اسلام چھڑانے کی مہم شروع کر دی۔ وہ اس طرح کہ تمام سرکردہ مسلمانوں کو جن کی تعداد ساڑھے تین لاکھ تھی۔ پکڑ کر مذہبی عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ ان میں سے اٹھائیس ہزار پانسو چالیس کو موت کی سزا ملی اور بارہ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کی سینکڑوں لائبریریاں جن میں لاکھوں کتابیں تھیں سپرد آتش کر دی گئیں۔۱۵۵۶ء میں فلپ دوم نے سارے حمام بند کر دیئے۔ ۱۶۱۰ء میں تمام مسلمانوں کو ترک ملک کا حکم مل گیا۔ ڈیڑھ لاکھ عربوں کا ایک قافلہ بندر گاہ کی طرف جا رہا تھا کہ بلیڈا نامی ایک پادری نے غنڈوں کو ساتھ ملا کر اس قافلے پر حملہ کر دیا اور ایک لاکھ نفوس قتل کر ڈالے۔ اس کے بعد مسلمانوں پر گھروں، گلیوں اور بازاروں میں قاتلانہ حملے شروع ہو گئے اور ۱۶۳۰ء میں ایک بھی مسلمان سپین میں باقی نہ رہا۔

اس ہجرت کا اثر یہ ہوا کہ وہ اندلس جو سارے یورپ کو علم و تہذیب کا درس دے رہا تھا، دفعتہً جہالت میں ڈوب گیا۔ مدارس بند ہو گئے، اساتذہ بھاگ گئے، صنعت و حرفت ختم ہو گئی اور شہر اجڑ گئے۔ اسلامی عہد میں طلیطلہ (ٹولیڈو) کی آبادی دو لاکھ تھی اور آج صرف بیس ہزار ہے۔ غرناطہ کی آبادی بیس

لاکھ تھی اور اب پچاس ہزار ہے۔[1]

سسلی (صقلیہ) میں مسلمانوں پہ مظالم

اسی طرح ڈاکٹر غلام جیلانی برق سسلی میں مسلمانوں پر مظالم اور مذہبی تعصب و تشدد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایس۔ پی سکاٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

سسلی کے عیسائی مذہبی و قومی تعصب کے باوجود مسلمانوں کی عادلانہ حکومت کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً قسطنطنیہ کے ذلیل و جابر حکومت کے مقابلے میں۔۔۔۔ جب بازنطینی رعایا اپنی حالت کا موازنہ مسلمانوں کی عیسائی رعایا سے کرتے۔ تو ان پر رشک کرتے۔ لیکن جب عیسائیوں کی باری آئی تو راجر اول نے تبلیغ اسلام کو حکماً روک دیا اور پھر یہ قدم اٹھائے۔

1) تمام مسلمانوں کو ملازمتوں سے نکال دیا۔

2) ان سے زمینیں اور دکانیں چھین کر عیسائیوں میں بانٹ دیں۔

3) مسلم امراء سے دولت چھین لی۔

4) عیسائی غنڈوں کو اکسایا کہ وہ مسلمانوں کے گھر جلائیں اور ان پر قاتلانہ حملے کریں۔

5) حضور پر نور ﷺ کو ہر جگہ اور ہر محفل میں گالیاں دیں۔

6) اذان اور نماز جمعہ بند کر دی۔

7) فریڈرک دوم (۱۲۱۲ء – ۱۲۵۰ء) نے اندازاً اسی ہزار مسلمان سسلی سے نکال کر اٹلی کے جنوب میں جا بسائے۔ جنہیں چارلس دوم (۱۲۸۵) نے جبراً عیسائی بنالیا۔

جب سپین کا ایک عالم ابن جبیر ۱۱۸۵ء میں سسلی پہنچا۔ تو وہاں ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ یہ لوگ سسلی کی ایک بندرگاہ پر جہاز کا انتظار کر رہے تھے کہ ان کے پاس سسلی کا ایک مسلم اپنی جوان لڑکی کے ساتھ آیا اور کہنے لگا کہ میری اس لڑکی سے یا تو خود نکاح کر لو اور یا اسے ساتھ لے جاؤ۔ یہاں رہی تو عیسائی

---

[1] ۔ حوالہ مذکور، ص: ۸۷-۸۸

غنڈوں سے اس کی آبرو محفوظ نہیں رہے گی۔ زوال سسلی کے بعد ولیم اول (۱۱۵۱ - ۱۱۶۶ء) کے زمانے میں اس کے ایک امیر البحر نے بونہ (سسلی کا شہر) پر حملہ کیا۔ وہاں چند ایک مسلم علما و مشائخ بھی موجود تھے۔ امیر البحر نے ان کا احترام کیا اور انہیں کوئی دکھ نہ دیا جب یہ خبر پوپ تک پہنچی تو اس نے امیر البحر کو اس جرم میں، کہ اس نے ان علماء کو زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا۔ آگ میں پھینک دیا۔[1]

سلاطین دولت عثمانیہ کی رواداری

اسلامی خلافت عثمانیہ کے سلاطین اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ جس حسن سلوک اور رواداری کے ساتھ پیش آتے رہے۔ اس کا اقرار جہاں مسلمان مؤرخین نے کیا ہے وہاں غیر مسلم مؤرخین اور مستشرقین کو بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں۔ مشہور مستشرق و مؤرخ سر تھامس آرنلڈ نے اپنی معروف کتاب The Preaching of Islam کے چھٹے باب میں یورپ کی عیسائی اقوام میں ترکوں کے ذریعے اشاعت اسلام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد میں انتظام یہ کیا کہ یونانی کلیسا کا سرپرست اور حامی بنا تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں۔ عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق کو اور اس کے جانشینوں اور ماتحت سقفوں کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے، دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے مستثنیٰ تھے، ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے۔ گناد وس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا، اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامان جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے۔ ترکوں نے

---

[1] ۔حوالہ سابق، ص:۸۸-۸۹

جزیرہ سسلی میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم اور مذہبی تشدد کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مفتی زین العابدین میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، تاریخ ملت، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۳/۳۳۴-۳۳۵

صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہان روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے۔ بطریق قسطنطنیہ کی عدالت ایسے کل مقدمات کو جن میں فریقین مسیحی المذہب ہوں، فیصلہ کرتی تھی۔ جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے علیحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا اختیار بھی اس کو حاصل تھا۔ وزرائے سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں۔[1]

اسی طرح پاکستان کے مشہور محقق اور فاضل مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے سلاطین ترکی کی کمال رواداری اور وسعت ظرفی کے متعلق پروفیسر جے ایل پورٹر کے ایک لیکچر جو انہوں نے بمقام گلاسگو ماہ دسمبر ۱۸۷۶ء میں دیا تھا، کے حوالے سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ

تاریخ ثابت کرتی ہے نیز سلاطین ترکی اور تاریخ ہسپانیہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ فقہ اسلامی کی مذہبی بنیاد قیاساً خواہ کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو لیکن عملاً وہ کبھی تمام مذاہب میں کامل مسالمت کے راستہ میں حائل نہیں ہوئی۔ جو لوگ ان کے قومی مذہب سے اختلاف رکھتے ہیں، انہیں صرف ایک قسم کا ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ باقی تمام معاملات میں وہ آزاد ہیں۔ یہ مشہور بات ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مختلف عیسائی اقوام مثلاً ارمنی، یونانی، شامی، ترکی میں ابتدائے سلطنت سے اب تک کامل آزادی کے ساتھ رہتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہر قوم کو سلطان نے اپنے اپنے دیوان اور مذہبی معاملات کے انتظام کرنے کا حق دے رکھا ہے۔ شہر اور مضافات کی کونسلوں میں بھی ہر فرقہ کا مذہبی وکیل بیٹھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ملکی وکیل بھی رہتا ہے۔ کیا اب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں مذہبی آزادی نہیں؟

---

[1] ۔دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص: ۱۳۲

نوٹ: آرنلڈ نے یہاں بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو حاصل مزید اختیارات کی بھی تفصیل دی ہے۔ جس کا اندراج بلا ضرورت طوالت کا باعث ہو گا۔

ترکی کی تاریخ کا یورپ کی عیسائی اقوام کی تاریخ سے مقابلہ کیجیے۔ترکی نے کبھی تحقیقات مذہب کی عدالتیں قائم کر کے قاعدہ اور ضابطہ نہیں بنایا،نہ شرمناک ظلم وستم اور جبر وتعدی کی،اس کا دامن اس دھبہ سے پاک رہا ہے۔ترکی نے کبھی ظالمانہ طور سے ان لوگوں کو جو اس کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے جلا وطن نہیں کیا۔ان غریب بے خانماں یہودیوں کو جنہیں جرمنی، انگلینڈ، فرانس، اسپین نے پے درپے طرح طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائیں،ترکی ہی نے پناہ دی۔[1]

خلفائے بنو فاطمہ کی حد درجہ رواداری

محقق مذکور جناب رئیس احمد جعفری ندوی نے مصر میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ خلفائے بنو فاطمہ کی کمال رواداری اور وسعت ظرفی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں غیر مسلموں کو عبادت خانے بنانے کی عام اجازت دے دی، انہیں اعلیٰ مناصب پر سرفراز کیا، ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فیاضانہ، فراخدلانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا۔ جس پر علامہ ابن تیمیہ وغیرہ نے اپنی شدت پسندانہ طبیعت کے باعث ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا۔رئیس احمد جعفری بنو فاطمہ کے غیر مسلموں کے ساتھ اس حسن برتاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بہر حال بنو فاطمہ جب تک مصر پر حکمران رہے۔ اپنی اس روش پر قائم رہے۔ان پر چاہے جتنے کفر کے فتوے دیے جائیں۔ لیکن ان کے لیے یہ فخر کافی ہے کہ لاکھوں غیر مسلموں کے قلوب پر انہوں نے اسلام کی بے تعصبی، رواداری اور عالی حوصلگی کا نقش بٹھا دیا۔ انہوں نے خود اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے کفر اور زندقہ اور منافقت کا الزام گوارا کر لیا۔ لیکن اسلام پر اور اسلام کی ہیئت حاکمہ پر یہ الزام نہیں لگنے دیا کہ محکوم غیر مسلم اسلام کے حدود میں عزت نفس، خودداری اور مساوات کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ مان لیا کہ یہ عبیدی (بنو فاطمہ) کافر تھے لیکن کافر بھی کتنے اچھے تھے جنہوں نے اسلام کی تعلیمات رواداری پر عمل کر کے غیر مسلموں کو اسلام سے قریب تر کر دیا۔

---

[1] - اسلام اور رواداری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱/ ۳۰۳-۳۰۴

اسلام کا مداح اور معترف کر دیا۔"[1]

مسلمان خلفاء کی رواداری اور مستشرقین کا اعتراف

غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمان خلفاء کی رواداری کا اعتراف متعدد انصاف پسند مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ احاطہ یہاں مقصود نہیں۔ ہم "مشتے از خزوارے" کے طور پر صرف چند گواہیوں پر اکتفا کریں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے "عربوں کی ملک گیری کی خصوصیات" کے بیان میں لکھا ہے:

خلفائے راشدین جس ملکی خوش تدبیری کو کام میں لائے وہ مافوق ان کی سپاہ گری اور اس فن حرب کے تھی، جسے انہوں نے آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ شروع ہی سے انہیں ایسی اقوام سے کام پڑا جن پر سالہا سال سے مختلف حکومتوں نے نہایت بے رحمی سے ظلم کر رکھا تھا اور اس مظلوم رعایا نے نہایت خوشی کے ساتھ ان نئے ملک گیروں کو قبول کر لیا۔ جن کی حکومت میں انہیں بہت زیادہ آسائش تھی۔ مفتوح اقوام کے ساتھ طریقہ عمل کیا ہونا چاہیے، نہایت صاف اور صریح طور پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور خلفائے اسلام نے ملکی اغراض کے مقابلے میں ہرگز بزور شمشیر دین کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بعوض اس کے کہ وہ بہ جبر اپنے دین کی اشاعت کرتے جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے، وہ صاف طور پر ظاہر کر دیتے تھے کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب و رسوم و اوضاع کی پوری طرح سے حرمت کی جائے گی اور اس آزادی کے معاوضہ میں وہ ان سے ایک بہت خفیف سا خراج لیتے تھے جو ان مطلوبات کے مقابل میں جو ان اقوام کے پرانے حکام ان سے وصول کیا کرتے تھے، نہایت کم تھا۔[2]

ڈاکٹر موصوف نے مصر کی فتح کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ:

جو کچھ انتظام عمرو بن العاص نے اس مفتوحہ ملک میں کیا اس سے اس کی خوش تدبیری معلوم ہوتی

---

[1] - حوالہ مذکور، ۱/۳۰۹

[2] - تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، مقبول اکیڈمی لاہور، ت۔ن، ص: ۱۸۰

ہے۔ مزارعین کے ساتھ وہ منصفانہ برتاؤ کیا گیا جس سے وہ سال ہائے دراز سے واقف نہ تھے۔ اس نے باقاعدہ اور مستقل عدالتیں مقرر کیں اور مرافعہ کے محکمے قرار دیے لیکن ان عدالتوں کو مسلمانوں ہی کے مقدمات کا اختیار تھا۔ اگر کوئی فریق بھی مصری ہوتا تو مقدمہ قبطی عدالتوں میں جاتا۔ اس نے ملک کے قانون و رسوم و رواج اور مذہب کو قائم رکھا۔ صرف ایک رسم کو البتہ اس نے موقوف کیا اور وہ یہ تھی کہ ہر سال ایک جوان اور خوبصورت باکرہ لڑکی اپنے والدین سے بہ جبر لی جاتی تھی اور دریائے نیل میں اس غرض سے پھینک دی جاتی تھی کہ سیلاب کے وقت پانی کافی بلندی تک پہنچے۔[1] اس جوان لڑکی کی جگہ پر ایک مٹی کی

[1] ۔اس خلاف شریعت اور ظالمانہ رسم کے خاتمہ کے حوالے سے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کی اس کرامت یا توہم پرستی کی بجائے اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت اور تصرف پر یقین کامل کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ فتح مصر کے بعد اہل مصر نے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ سے کہا کہ ہمارے دریائے نیل کا یہ معمول ہے کہ سال کے ایک مخصوص دن میں جب تک ایک باکرہ لڑکی اس کی نذر نہ کی جائے یہ جاری نہیں ہوتا۔ حضرت عمرو نے کہا اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔ کئی ماہ تک جب نیل میں پانی نہ آیا تو لوگوں نے وہاں سے جلا وطنی کا ارادہ کر لیا۔ اس صورت حال سے گورنر مصر نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا: جو کچھ تم نے کیا، ٹھیک کیا۔ اس جوابی خط میں ایک رُقعہ بھیج رہا ہوں۔ اسے دریائے نیل میں ڈال دینا۔ عمرو بن العاص نے خط کے ساتھ دریائے نیل کے نام رقعہ پڑھا تو اس میں لکھا تھا: "من عبداللہ عمر امیر المؤمنین الی نیل اهل امصر اما بعد فان کنت انما تجری من قبلک ومن امرک فلا تجر فلا حاجة لنا فیک. وان کنت انما تجری بامر اللہ الواحد القهار وهوالذی یجریک فنسأل اللہ تعالیٰ ان یجریک" (اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے اہل مصر کے دریائے نیل کے نام۔ امابعد اگر تو اپنی طرف سے اور اپنے حکم سے چلتا ہے تو ہرگز نہ جاری ہونا۔ ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں اور اگر تو اللہ، واحد و قہار کے حکم سے چلتا ہے اور وہی تمہیں جاری کرے گا تو ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تمہیں جارے کر دے۔) راوی کہتا ہے جب یہ رقعہ دریائے نیل میں ڈالا گیا تو صرف ایک رات میں سولہ گز تک پانی بلندی پر آگیا اور اللہ نے ہمیشہ کے لیے اس ظالمانہ رسم کو ختم

مورتی قائم کی گئی جس کا نام عروس رکھا گیا اور یہ آج تک روز معین پر دریا میں پھینکی جاتی ہے۔ اس قدیم رسم سے جو غالباً ساٹھ صدی سے چلی آرہی تھی، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا قربانی کرنا، مصر کے قدیم مذہب کا ایک جزء تھا۔

جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس میں کیا تھا ویسا ہی عمرو بن العاصؓ نے بھی عیسائیوں کے ساتھ بہت مہربانیوں کا سلوک کیا۔ جس وقت قوم قبطی نے ایک نئے بطریق کی جو عہدہ ان سے ہمیشہ سے چلتا آتا تھا۔ درخواست کی تو عمرو نے فوراً وہ درخواست منظور کر لی۔ اس نے مذہب عیسوی کی ہمدردی کو اس درجہ جائز رکھا کہ مسلمانوں کے شہر میں کلیسہ تعمیر ہونے کی اجازت دے دی۔[1]

مسٹر گبن کا اعتراف

مشہور متجدد سر سید احمد خان نے معروف مستشرق سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" میں اسلام پر ولیم میور کے اس اعتراض بلکہ الزام کہ "اسلام میں مذہبی آزادی یعنی یہ بات کہ لوگ جو نسا مذہب چاہیں اختیار کریں اور اس کے لوازم مذہبی آزادی سے ادا کریں بالکل روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے۔ تحمل کا تو نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا۔" کا بڑی تفصیل سے اور مدلل انداز میں جواب دیا ہے۔ اس مفصل جواب میں اسلام کے اندر جس صورت میں تلوار اٹھانے کی اجازت ہے، اس صورت کی وضاحت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:....

اس بیان سے ان مصنفوں کی بھی سخت غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ "اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے۔ ہاں ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا۔

فرمایا۔ دیکھیے: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷/۱۰۷-۱۰۸؛ ملا علی قاری، مرقاۃ المصابیح (باب مناقب عمر) مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۱/۳۱۱؛ سیوطی، تاریخ الخلفاء (اردو ترجمہ از شمس بریلوی) پروگریسو بکس لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۲۹۴

[1] - تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص: ۲۴۱-۲۴۲

مگر مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے بلکہ ہم کو یہ بات تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں اور اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل بر خلاف تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان فتحمند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے۔ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلحاظ قوم مذہب کے ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے۔ تواریخ سے ہم کو بے شمار مثالیں مسلمان فتحمندوں کی دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنے کی ملتی ہیں اور ہم اس مقام پر چند رایوں کو نقل کرتے ہیں جو اس باب میں عیسائی مصنفوں نے لکھی ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنا اسلام کی خاصیت میں سے ہے۔[1]

اس کے بعد سر سید نے متعدد مستشرقین اور عیسائی مصنفین کی گواہیاں اپنے استدلال میں درج کی ہیں۔ ان میں مشہور مستشرق مسٹر گبن کے متعلق لکھتے ہیں:

مشہور و معروف مؤرخ مسٹر گبن جو زمانہ حال کے مؤرخوں میں سب سے بڑا مؤرخ ہے اور جس کی سند نہایت معتبر گنی جاتی ہے، اس امر کی نسبت اپنی کتاب میں یہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی لڑائیوں کو ان کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آنحضرت نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں ان سے خلیفاؤں نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی جس سے اسلام کے غیر معتقدوں کی مخالفت رفع ہو جائے۔ ملک عرب حضرت محمد ﷺ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، مگر وہ دنیا کی قوموں کو محبت سے اور بہت کم رشک سے دیکھتا تھا۔ بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والے اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے۔ شرعاً نیست و نابود کئے جاسکتے تھے۔ مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدابیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتحمندوں نے بعض کام دوسرے مذہب کی آزادی کے بر خلاف کرنے کے بعد اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور

---

[1] - الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ص: ۲۲۷

حضرت عیسیٰ کے معتقدوں سے بہ متانت یہ استدعا کی گئی ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے الہام کو جو زیادہ تر کامل ہے قبول کریں، لیکن اگر انہوں نے نہ مانا اور ایک معتدل خراج یعنی جزیہ دینا قبول کر لیا وہ اپنے عقیدہ میں اور مذہبی پرستش میں آزادی کے مستحق تھے۔[1]

بعد ازیں سرسید نے "ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار" میں شائع ہونے والے ایک انگریز مصنف کے مضمون کا اقتباس درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

پھر اسی مصنف نے اسی آرٹیکل میں دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی۔ کسی کو ایذا نہیں پہنچائی کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجز تبدیل کرنے کا قصہ نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتحمندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے اور مفتوح سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتحمند نے ابتدائے دنیا سے حضرت محمد ﷺ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں۔

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے۔ جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔ اسلام کی تاریخ کے ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اس کو وسعت ہوئی دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے ان واقعات کا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ بارہ سو برس بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔ اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعنہ کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔ اب دیکھو کہ یہ رائیں بہت سی بے طرف دار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد

---

[1] - حوالہ مذکور، ص: ۲۳۰-۲۳۱

رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔ کیسی بر خلاف ہیں۔[1]

ایک بڑے پادری کا اعتراف

دنیا میں کسی بھی انسان یا قوم کی اصل اور حقیقی خوبی اور کمال وہ ہوتا ہے جس کا اعتراف اس کے مخالفین کریں ورنہ اپنے تو رطب اللسان ہوتے ہی ہیں۔اس حقیقت کی وضاحت کے لیے عربی زبان کی مشہور ضرب المثل ہے: "الفضل ما شهدت به الاعداء" (اصل فضیلت و عظمت وہ ہے جس کی گواہی دشمن لوگ دیں)۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری اور بے تعصبی کی خوبی، فضیلت و عظمت کی مذکورہ کسوٹی پر بھی پوری اترتی ہے۔ چنانچہ اے ایس ٹریٹن نے غیر مسلموں کے ساتھ اہل اسلام کے عمومی رویہ اور حسن سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بڑے عیسائی پادری کی گواہی یوں نقل کی ہے:

> There is some christian evidence to support this view. Ishoyahbh, who was patriarch from A.D 647 to 657, writes, The Arabs, To whom God gave the domination over the world behave to us as you know. They are not hostile to Christianity, but praise or religion honour the priests and saints and help the churches and monasteries.[2]

غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمانوں کی مذکورہ نرمی اور رواداری کے نظریہ پر بعض عیسائیوں کی گواہی بھی موجود ہے۔ چنانچہ اسحاق جو ۶۴۷ء سے ۶۵۷ء تک بڑے پادری کے عہدے پر فائز رہا، لکھتا ہے: عرب لوگ جنہیں خدا نے دنیا پر حکومت و سلطنت عنایت فرمائی ہے، ہمارے ساتھ جیسا کہ تم جانتے ہو، اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وہ عیسائیت کے مخالف نہیں بلکہ ہمارے مذہب کی تعریف کرتے

---

[1] - حوالہ سابق، ص: ۲۳۲

[2] - The Caliphs and their Non-Muslim Subjects, (Chapter No. 10 Social Condition) P:138

ہیں۔ ہمارے پادریوں اور بزرگوں کی عزت کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں یعنی عبادتگاہوں کی مدد کرتے ہیں۔

مشہور مؤرخ سید امیر علی نے بھی الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ عیسائی بطریرک کے اس اعتراف اور گواہی کو نقل کیا ہے۔[1]

[1] ۔روح اسلام (اردو ترجمہ) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:۴۲۶

باب ہشتم

غیر مسلموں کے حقوق۔ اعتراضات و شبہات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

پہلی فصل

جزیہ۔اعتراضات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں سے لیے جانے والے معروف ٹیکس "جزیہ" (Tribute) کے بارے میں مستشرقین کے خیال میں مسلمان ابتدائی دور میں آمدنی کے ذرائع کا خیال رکھے بغیر ذمیوں پر اجتماعی طور پر جزیے (Tribute) کی ایک مقدار عائد کر دیتے تھے۔ جس سے ذمی رعایا کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔[1] علامہ شبلی نعمانی نے غیر مذہب والوں کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ جزیہ کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لئے اسلام کا قبول کر لینا بھی گوارا کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا۔[2] اسی طرح غیر مسلم یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جزیہ صرف غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے مسلمانوں سے وصول نہیں کیا جاتا۔ ایک مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے دونوں کے ساتھ مساوی سلوک ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک جزیہ تذلیل و تحقیر پر مبنی اور غیر مسلموں کے اسلام قبول نہ کرنے کی سزا کے طور پر نافذ کیا گیا تھا۔[3]

اگرچہ عصر حاضر میں اسلامی ممالک میں جزیہ (Tribute) کے نام سے غیر مسلم اقلیتوں پر کوئی ٹیکس نافذ ہے نہ شرعاً اسکا نفاذ فرض ہے۔[4] تاہم اسلام کی ابتدائی صدیوں میں غیر مسلم رعایا پر چونکہ یہ

---

1 - اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء، ۷/۴۴۹

2 - مقالات شبلی (مذہبی)، دارالمصنفین اعظم گڑھ انڈیا، ۱۳۴۹ھ، ۱/۲۲۷

3 - یوسف القرضاوی، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی (الفصل الخامس) مکتبہ وھبۃ القاہرہ، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء، ص: ۶۱

4 - جزیہ کے شرعاً فرض نہ ہونے کی ایک دلیل تو حضور اکرم ﷺ کا اہل مقناہ اور اہل جنبہ وغیرہ سے جزیہ کی معافی ہے (ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ از ابو یحیٰ امام خان نوشہروی) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء، ص ۵۸ وثیقہ

ٹیکس لاگو رہا جس کی بنیاد پر درج بالا شکوک و شبہات پیدا ہوئے، اس لیے ان شبہات کا ازالہ اور تجزیہ ضروری ہے۔

جزیہ کا موضوع بڑا وسیع ہے۔ علماء نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مفسرین نے آیت جزیہ (سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹) کی تفسیر میں اور فقہاء نے اپنی کتب فقہ میں اس کی بڑی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مثلاً جزیہ کا لغوی معنی واشتقاق، اصطلاحی معنی، جزیہ کے لیے دیگر اصطلاحات، جزیہ کی تاریخ، جزیہ کی مشروعیت کی حکمت، جزیہ کی قسمیں، جزیہ کی مقدار و شرح، جزیہ کن غیر مسلموں سے قبول کیا جائے گا، جزیہ کن افراد پر واجب ہوگا، کن طبقات و افراد سے معاف ہوگا۔ سقوط جزیہ کے اسباب، جزیہ کی وصولی کس طرح ہوگی اور ادائے جزیہ کی کیفیت وغیرہ۔[1]

نمبر ۳۴) دوسرے نصاریٰ بنی تغلب نے جب جزیہ کے نام سے ٹیکس دینا پسند نہ کیا تو حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کی بجائے دوگنا صدقہ (زکوٰۃ) عائد کر دیا۔ دیکھیے: ابو عبید، کتاب الاموال (اردو ترجمہ) ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۷۹۴ پیرہ نمبر ۱۶۹۳؛ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۲۶۸-۲۶۹؛ ابو یوسف، کتاب الخراج، دارالمعرفۃ بیروت، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۰-۱۲۱

[1] - ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابو یوسف، کتاب الخراج، طبع مذکور، ص ۱۲۲ تا ۱۲۶؛ شافعی، الام (کتاب الجزیۃ)، دارالفکر بیروت، ۴/ ۱۸۱، ۱۹۰؛ جصاص، ابو بکر احمد الرازی، احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ت۔ن، ۳/ ۱۵۰-۱۳۴؛ ابن العربی، ابو بکر محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، داراحیاء الکتب العربیہ، ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء، القسم الثانی، ص ۹۰۶ تا ۹۱۳؛ حصکفی، علاؤ الدین، الدرالمختار شرح تنویر الابصار، المطبعۃ العامرۃ الملیجیۃ بمصر، ت۔ن، ۲/ ۱۰۶-۱۰۸؛ ماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب البصری، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ) قانونی کتب خانہ لاہور، ت۔ن، ص: ۲۳۵ تا ۲۵۴ (باب نمبر ۱۳)؛ قاضی ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ، مصطفی حلبی مصر، ۱۳۵۷ھ، ص: ۱۳۷ تا ۱۴۱؛ وھبۃ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دارالفکر، دمشق، ۱۴۰۹ھ / ۱۹۸۹ء، ۶/ ۴۴۵-۴۵۰؛ الموسوعۃ الفقہیۃ (کویت)، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵ء، الطبعۃ الاولی، ۱۵/ ۱۴۹-۲۰۷ (جزیہ پر تفصیلی اور مدلل بحث ہے)؛ ابن قیم الجوزیہ، احکام اہل الذمہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء، ۱/ ۱۸-۹۰؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیہ)،

جزیہ کے کئی پہلو اور مسائل و احکام ہیں مگر ان مختلف پہلوؤں اور مسائل و احکام کی تفصیل میں جانا بلاضرورت موضوع کو طول دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف مذکورہ اعتراضات اور شکوک وشبہات کے ازالہ اور تجزیہ پر ہی اکتفا کریں گے چنانچہ اس سلسلے میں اصولی اور بڑی عام فہم سی بات جس پر دنیا کی ہر حکومت عمل پیرا ہے، یہ ہے کہ جب ریاست ہر شہری کے جان ومال اور عزت و آبرو کی حفاظت و دفاع اور دیگر حقوق کی ادائیگی کا اہتمام وانتظام کرتی ہے، جس پر اخراجات اٹھتے ہیں تو ہر شہری کا بھی فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن وآئین کے پابند ہوں اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف میں تعاون کریں جو انہیں پرامن زندگی گزارنے کا موقع دیتی اور ہر ظلم وتعدی سے محفوظ رکھتی ہے۔ چنانچہ لغوی اشتقاق کی تشریح میں جائے بغیر آسان لفظوں میں جزیہ کی تعریف یہ ہے کہ ذمی رعایا اپنی ہر طرح کی حفاظت کے عوض جو متعین اور معمولی سا ٹیکس بیت المال میں جمع کراتی ہے، اس کا اصطلاحی نام جزیہ ہے اور مسلمانوں سے جو بڑا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، جس میں عبادت کا پہلو بھی ہے، اس کا نام زکوٰۃ ہے۔

آیت جزیہ (سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹) کی رو سے وجوب جزیہ کی تین شرائط نکلتی ہیں۔ اگر ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی فقدان ہو گا تو جزیہ لینا جائز نہ ہو گا۔

1. یہ کہ مسلمان جنگ کے ذریعے انہیں قوت سے مغلوب کر لیں۔ اس لیے جنہیں قوت سے مغلوب نہ کیا گیا ہو یا وہ قتال کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں جیسے بچے بوڑھے عورتیں وغیرہ تو ان پر جزیہ عائد نہ ہو گا۔

مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص: ۵۷۷-۵۸۴؛ ابن رشد، بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۴۹۸-۴۸۹/۳؛ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مذہبی)، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۲۷-۲۳۸/؛ علاوہ ازیں تمام فقہی مسالک کی امہات کتب فقہ میں جزیہ پر بحث موجود ہے۔

2. وہ اسلامی حکومت کے مطیع و محکوم ہونے پر راضی ہو کر معاہدہ طے کر لیں۔

3. ذمی کو حفاظت کی نعمت (بلکہ ضمانت) حاصل ہو۔ لہٰذا اگر اس کی جان و مال کی حفاظت نہ ہو تو اسلامی ریاست کو جزیہ کی وصولی کا حق نہ ہو گا۔ (اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے)[1]

فقہ حنفی کی رو سے جزیہ کی مقدار غریب (مزدور۔ محنت کش) آدمی کے لیے بارہ درہم، متوسط کے لیے ۲۴ درہم اور سرمایہ دار کے لیے ۴۸ درہم سالانہ اور ماہانہ بالترتیب ایک درہم، دو درہم اور چار درہم مقرر ہے۔ (ایک درہم تقریباً ساڑھے ماشہ چاندی کا ہوتا ہے)[2] اب اگر ایک ذمی کروڑ روپے کا مالک ہو جب بھی اسے وہی ۴۸ درہم دینا ہوں گے جبکہ مسلمان کروڑ کا مالک ہو تو اس سے بطور زکوٰۃ چالیسواں حصہ، اڑھائی لاکھ درہم وصول کیے جائیں گے۔ غور فرمائیے اس صورتحال میں ٹیکس کے معاملے میں آسانی ذمیوں کے لیے ہے یا مسلمانوں کے لیے؟[3]

جزیے کی حکمت اور غرض و غایت

جزیے کی حکمت اور غرض و غایت صرف یہ ہے کہ ایک طرف ذمی لوگ کفر پر مصر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنی جان و مال کی حفاظت بھی چاہتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر دارالاسلام کے دفاع میں اور دارالحرب کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے سامنے ایک آسان اور متبادل صورت رکھی گئی ہے اور وہ یہ کہ شہری حقوق کے بدلے ذمی لوگ مالی ذمے داری قبول کریں۔ چنانچہ ایک شہری کے طور پر جزیے کی مناسب مقدار انہیں ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس میں

---

[1] ۔ سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا، الفیصل لاہور، ۱/ ۶۷۸

[2] ۔ دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۲۳؛ السرخسی، المبسوط، دارالمعرفہ، بیروت، ۱۰/ ۷۸؛ جصاص، احکام القرآن، ۳/ ۱۴۳-۱۴۴؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیۃ)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص: ۵۷۸؛ نسفی، کنزالدقائق (باب العشر والخراج والجزیۃ)، ص:۱۸۵

[3] ۔ پھلواری، جعفر شاہ، اسلام ۔ دین آسان، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص:۲۲۶

ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ چونکہ دارالاسلام کے باشندے اس کی حفاظت و دفاع کے لیے اپنی رغبت سے جان و مال کی قربانی دیتے ہیں اور غیر مسلم سے یہ توقع نہیں کہ دارالاسلام سے اسے قلبی وابستگی یا دلی لگاؤ ہو گا اور ظاہر ہے کہ قدرتاً اس کا اندرونی میلان دارالحرب ہی کی طرف ہوتا ہے اس لیے اس سے سچی قربانی اور کامل امداد کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔[1]

اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ وہ ریاست کے دفاع کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کفار سے لڑیں۔ محققین کے نزدیک یہ ٹیکس صرف فوجی خدمات کے عوض لیا جاتا ہے اور صرف ان آزاد اور بالغ اھل الذمہ سے لیا جاتا ہے جو لڑائی کے قابل ہوتے ہیں۔ خواتین، بچوں، معذوروں، بیماروں، راہبوں اور غلاموں وغیرہ کو اسی وجہ سے جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں جو ذمی جنگ کرنے کے قابل نہیں ان پر کوئی جزیہ نہ ہو گا۔[2] اس سلسلے میں فقہاء اسلام کی درج ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

چنانچہ علامہ جصاص رازیؒ آیت جزیہ کے لفظ "قاتلوا" (باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ) کے صرفی اقتضاء کی وضاحت اور اس سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واذا کان کذالک ثبت ان الجزیة ماخوذة ممن کان من اهل القتال

---

[1] - سید قاسم محمود، شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ۱/۶۷۷

[2] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: امام ابو یوسف، کتاب الخراج، (فصل فیمن تجب علیه الجزیة)، ص: ۱۲۲؛ شافعی، الام، دار الفکر، بیروت، ۴/۱۸۵؛ ابن قیم، احکام اہل الذمہ، (فصل من لا تجب علیهم الجزیة) ۱/۴۸-۴۹؛ ابن عابدین، ردالمحتار حاشیہ علی الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ت۔ن، ۴/۱۹۸-۱۹۹؛ شیخ زادہ عبدالرحمن، مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، مکتبہ عثمانیہ، ۱۳۲۷ھ، ۱/۶۷۹؛ السرخسی، المبسوط، ۱۰/۷۹؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیة)، ص: ۵۸۰-۵۷۹؛ ابن رشد، بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، ۳/۴۹۰؛ نسفی، کنز الدقائق (باب مذکور)، ص: ۱۸۵؛ خربوطلی، الاسلام واہل الذمہ، القاہرہ، ص: ۲۱۰؛ سر تھامس آرنلڈ، دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، مسعود پبلشنگ ہاؤس کراچی، ص: ۷۲

ومن يمكنه ادائه من المحترفين ولذالک قال اصحابنا ان من لم
يکن من اهل القتال فلا جزية عليه فقالوا من کان اعمی اوزمناً او
مفلوجا او شيخاً اکبيرا فانيا وهو موسر فلا جزية عليه۔[1]

اور صرفی قاعدہ کی رو سے جب بات یوں ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ جزیہ صرف اس آدمی (غیر مسلم شہری) سے لیا جائے گا جو جنگ کے قابل اور ان کمائی کرنے والے لوگوں میں سے ہو جن کے لیے جزیہ کی ادائیگی ممکن ہو۔ اسی لیے ہمارے اصحاب (فقہائے احناف) نے کہا ہے کہ جو آدمی اھل قتال میں سے نہ ہو اس پر جزیہ نہ ہے۔ نیز انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو آدمی اندھا، ہاتھ پاؤں سے معذور، فالج زدہ اور قریب المرگ بوڑھا ہو چاہے وہ امیر ہی کیوں نہ ہو، اس پر جزیہ عائد نہیں ہو گا۔

اسی طرح علامہ السرخسی اہل الذمہ پر وضع جزیہ وخراج کی شرعی دلیل اور ان کے فقہی مسائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم يأخذ المسلمون الجزية منه خلفاً عن النصرة التى فاتت
باصراره على الكفر لان من هو من اهل دار الاسلام فعليه القيام
بنصرة الدار وابدانهم لاتصلح لهذه النصرة لانهم يميلون الى اهل
الدار المعادية فيشوهون علينا اهل الحرب فيؤخذ منهم المال
ليصرف الى الغزاة الذين يقومون بنصرة الدار ولهذا يختلف
باختلاف حاله فى الغنى والفقر فانه معتبر باصل النصرة۔[2]

پھر مسلمان اس (ذمی) سے جزیہ وصول کریں گے اس مدد کے بدلے میں جو اس کے کفر پر اصرار کے باعث فوت (مفقود) ہو گئی ہے کیونکہ جو آدمی دارالاسلام کے اندر

---

[1] -احکام القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، (باب من تؤخذ منہ الجزیۃ)، ۳/ ۱۴۲

[2] -المبسوط (کتاب السیر باب فی توظیف الخراج) دارالمعرفۃ بیروت، ۱۴۰۹ھ / ۱۹۸۹ء، ۱۰/ ۷۸

رہنے والا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ دارالاسلام (ملک) کی نصرت کرے مگر ان (اہل الذمہ) کے ابدان / اجسام اس لازمی نصرت کے قابل نہیں کیونکہ وہ (ذہنی و فکری طور پر) دشمن ملک کے باشندوں کی طرف مائل ہوں گے اور یوں اہل حرب کو ہمارے خلاف مزید دلیر کریں گے لہٰذا ان سے ایک متعین مال (جزیہ) لے کر ان مجاہدین پر خرچ کیا جائے گا جو ملک کی عملی طور پر نصرت / حفاظت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذمی کی معاشی و اقتصادی حالت (غنی و فقر) مختلف ہونے کے باعث اس کی مقدار بھی مختلف یعنی کم یا زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ بنیادی طور پر ملکی نصرت کا دارومدار مالی حیثیت پر ہے۔

علیٰ ہذا القیاس صاحب ہدایہ فقہ حنفی میں امیر اور غریب پر جزیہ کی مقدار میں اختلاف کی عقلی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولانه وجب نصرة للمقاتلة فتجب على التفاوت بمنزلة خراج الارض. وهذا لانه وجب بدلاً عن النصرة بالنفس والمال وذالک يتفاوت بكثرة الوفر وقلته فكذا ماهو بدله۔[1]

اور اس لیے بھی کہ جزیہ مجاہدین کی نصرت کے لیے واجب کیا گیا ہے لہٰذا زمینی خراج کی طرح جزیہ بھی متفاوت ہو کر واجب ہو گا نیز اس لیے بھی کہ جزیہ جان و مال کی نصرت کے بدلے واجب ہوا ہے اور یہ چیز مال کی کمی اور زیادتی سے متفاوت ہوتی ہے لہٰذا اس کا بدل بھی متفاوت ہو گا۔

جبکہ علامہ کاسانی کا اس ضمن میں یہ کہنا ہے:

لان الله سبحانه و تعالىٰ اوجب الجزية علىٰ من هو من اهل القتال لقوله تعالىٰ قاتلوا الذين لايؤمنون بالله ولا باليوم الآخر الآية

---

[1] ۔ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیۃ)، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ص: ۵۷۸

والمقاتلة مفاعلة من القتال فتستدعی اهلیة القتال من الجانبين فلا تجب علیٰ من ليس من اهل القتال۔[1]

اسلیے کہ اللہ تعالیٰ نے جزیہ صرف ان لوگوں پر لازم کیا ہے جو اھل قتال (جنگ کے قابل لوگوں) میں سے ہیں۔ جیسا کہ آیت جزیہ قاتلوا الذین الخ میں لفظ قاتلوا سے معلوم ہوتا ہے۔ مقاتلہ لفظ قتال سے باب مفاعلہ ہے۔ جو جانبین سے قتال (جنگ) کی اہلیت کا تقاضا کرتا ہے پس جو اہل ذمہ اھل قتال (جنگ کی اہلیت رکھنے والے) نہیں ہوں گے ان پر جزیہ واجب نہیں ہوگا۔

فقیہ مفسر علامہ قرطبی نے بھی آیت جزیہ کی تفسیر میں مالکی علماء کی یہی رائے نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں:

والذی دل علیه القرآن ان الجزیة تؤخذ من الرجال المقاتلین لانه تعالیٰ قال "قاتلوا الذین" الیٰ قوله حتی یعطوا الجزیة. فیقتضی ذالک وجوبها علیٰ من یقاتل ــــ وهذا اجماع من العلماء علیٰ ان الجزیة انما توضع علی جماجم الرجال الاحرار البالغین وهم الذین یقاتلون دون النساء والذریة والعبید والمجانین المغلوبین علی عقولهم والشیخ الفانی۔[2]

جس چیز پر قرآن کے الفاظ دلالت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جزیہ صرف جنگ کرنے کے قابل مردوں سے وصول کیا جائے گا کیونکہ فرمان باری تعالیٰ (آیت جزیہ) کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ صرف اس آدمی پر واجب ہو جو جنگ کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جزیہ ان بڑے، آزاد اور بالغ

---

[1] - بدائع الصنائع، ۷/۱۱۱؛ نیز دیکھیے: امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۲۲؛ شافعی، الام (مع مختصر المزنی)، ۴/۱۸۵؛ ابن قیم، احکام اھل الذمہ (فصل من لا تجب علیہم الجزیۃ)، ۱/۴۸-۴۹

[2] - قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، المکتبہ العربیہ قاہرہ، ۷/۱۱۲

مردوں پر لگایا جائے گا جو جنگ کر سکتے ہیں نہ کہ عورتوں، بچوں، مغلوبوں، پاگلوں، فاتر العقول اور شیخ فانی (بوڑھے) پر۔

ابن العربیؒ نے بھی ملتے جلتے مختصر الفاظ میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔[1]

جزیہ کے محض "معاوضہ حفاظت" یا "بدل حفاظت" ہونے پر علامہ شبلی نعمانی نے تفصیلی بحث کی ہے۔ پھر عہد نبوی اور عہد خلفاء راشدینؓ کے متعدد معاہدے اس دعویٰ پر بطور استدلال پیش کیے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں تمہید کے طور پر لکھتے ہیں:

> اسلام نے جو انتظام قائم کیا اس کی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جاسکتا تھا۔ لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا نہ وہ لوگ ایسی پر خطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں۔ اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا جسے فارسی لغت سے معرّب کیا گیا تھا لیکن اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کر دیے گئے۔[2]

جزیہ کے معاوضہ حفاظت ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ یا خلفاء راشدینؓ کے زمانہ حکومت میں اہل الذمہ سے جو معاہدے کیے گئے ان میں عموماً صریح الفاظ کے اندر یہ وضاحت موجود تھی کہ یہ جزیہ حفاظت کے بدلے میں ہے۔ اگر اسلامی حکومت ان کی حفاظت نہیں کر سکے گی تو جزیہ کی حقدار بھی نہیں ہو گی۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ ہارون رشید کے اسلامی ممالک میں گرجوں کے گرائے نہ جانے کے ایک اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں:

---

[1] ۔دیکھیے: احکام القرآن، دار احیاء الکتب العربیہ، ۲/ ۹۱۰

[2] ۔مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/ ۲۳۱ - ۲۳۲

فانما کان الصلح جزی بین المسلمین واھل الذمة فی اداء الجزیة وفتحت المدن علی ان لاتھدم بیعھم ولا کنائسھم داخل المدینة ولا خارجھا وعلی ان یحقنو الھم دماءھم وعلی ان یقاتلوا من ناواھم من عدوھم ویذبوا عنھم فادوا الجزیة الیھم علی ھذا الشرط فافتحت الشام کلھا والحیرة الا اقلھا علیٰ ھذا فلذالک ترکت البیع والکنائس ولم تھدم۔[1]

بے شک مسلمانوں اور اہل الذمہ کے درمیان جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی تھی اور تمام شہر اس شرط پر فتح کیے گئے تھے کہ ان (اہل الذمہ) کے معابد اور گرجے نہیں گرائے جائیں گے۔ شہروں کے اندر اور باہر بھی اور اس شرط پر کہ ان کی جانوں کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے مقابل دشمن سے جنگ کی جائے گی اور ان کا دفاع کیا جائے گا۔ وہ اسی شرط پر مسلمانوں کو جزیہ ادا کریں گے۔ چنانچہ اسی شرط پر سارا شام اور حیرہ کا اکثر علاقہ فتح ہوا۔ اس لیے تمام معابد اور گرجے حسب سابق باقی رہنے دیے گئے اور انہیں نہ گرایا گیا۔

اسی طرح عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ (عراق) کے ساتھ جو تحریری معاہدہ کیا اور جن شرائط پر یہ معاہدہ صلح ہوا اس میں یہ وضاحت بھی تھی کہ

وان ھم حفظوا ذالک وزعوہ وادوہ الی المسلمین فلھم ماللمعاہد وعلینا المنع لھم۔[2]

اگر ان لوگوں (اہل حیرہ) نے اس عہد کی حفاظت اور پاسداری کی اور حسب معاہدہ مسلمانوں کو

---

[1] ۔کتاب الخراج (فصل فی الکنائس والبیع والصلبان) ص ۱۳۸

[2] ۔حوالہ مذکور، ص: ۱۴۴؛ نیز ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص: ۲۳۱ (وثیقہ نمبر ۲۹۰)

جزیہ ادا کیا تو ان کے لیے وہ تمام حقوق ہیں جو ایک معاہد کے ہوتے ہیں اور ہمارے اوپر ان کی حفاظت لازم ہے۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت خالد بن ولیدؓ نے صلوبا بن نسطونا (صاحب موضع قس الناطف) اور اس کی قوم کے ساتھ جو معاہدہ کیا اس میں بھی یہ لکھ دیا کہ

انی عاهدتكم على الجزية والمنعة ـــ فان منعناكم فلنا الجزية والا فلا حتى نمنعكم۔[1]

میں نے (تمہاری طرف سے) جزیہ اور (اپنی طرف سے) حفاظت کے وعدہ پر معاہدہ کیا۔۔ پس اگر ہم نے تمہاری حفاظت کی تو ہمارے لیے جزیہ لینا روا ہے ورنہ نہیں یہاں تک کہ ہم آپ کی حفاظت کریں۔

الغرض یہ جزیہ اہل الذمہ کی حفاظت کے بدلے میں تھا۔ اگر کسی وقت مسلمان اہل الذمہ کی حفاظت سے قاصر رہے ہیں تو انہوں نے جزیہ لینا تو درکنار وصول شدہ جزیہ بھی واپس کر دیا۔ جیسا کہ حمص (شام) میں حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ نے واپس کر دیا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حمص کی فتح اور ان سے معاہدہ کے مطابق جب ان سے جزیہ کی وصولی شروع ہو گئی۔ مگر دوسری طرف عسکری صورت حال ایسی ہو گئی کہ اہل حمص کا تحفظ غیر یقینی ہو گیا اور جنگی مصلحت کے تحت حضرت ابوعبیدہؓ کو شہر حمص خالی کرنا پڑا تو آپ نے جتنا جزیہ وصول کیا تھا۔ حسبِ معاہدہ ایک ایک فرد کو واپس کر دیا۔ اس کمال انصاف کو دیکھ کر اہل حمص کی زبانوں پر بے ساختہ یہ دعاء اور اعتراف جاری ہوا کہ

ردكم الله علينا ونصركم عليهم فلو كانوا هم لم يردوا علينا شيئا

[1] - طبری، تاریخ، (خبر مابعد الحیرۃ) مؤسسۃ الاعلمی بیروت، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۸ء، ۳/۲۰۱-۲۰۲ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/ ۲۳۳؛ ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات، ص: ۲۳۵ (وثیقہ ۲۹۳)

واخذوا کل شئی بقی لنا حتیٰ لا یدعوالنا شیئا۔ [1]

اللہ تمہیں دوبارہ ہمارے پاس لوٹا کر لائے اور ان (رومیوں) کے مقابلے تمہاری مدد کرے۔ اگر وہ لوگ (رومی حکمران) ہوتے تو ہمیں کوئی ایک چیز بھی واپس نہ کرتے بلکہ جو کچھ ہمارے پاس ہوتا وہ بھی لے جاتے اور ہمارے لیے کوئی چیز نہ چھوڑتے۔

بلاذری نے اس موقعہ پر اہل حمص کے قلبی تاثرات و جذبات اور مسلمانوں کے عدل کا اعتراف یوں قلمبند کیا ہے:

"اس واپسی پر اہل حمص نے کہا: ہمیں تمہاری حکومت اور تمہارا عدل اس ظلم پر جور سے بہت زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمہارے آنے سے قبل مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج کی مدافعت کریں گے اور تمہارے عامل کے ساتھ مل کر شہر کی حفاظت کریں گے۔ سنگدل یہودیوں نے بھی کہا: "توراۃ کی قسم! ہرقل کا عامل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمیں مغلوب نہ کرے اور ہماری تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے اور اس کی حفاظت کی۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے جن دوسرے شہروں سے اہل اسلام کی صلح ہو گئی تھی، انہوں نے بھی اسی طرح کیا۔ [2]

جبکہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اس موقعہ کی منظر کشی یوں کی ہے:

"وہ سماں دیکھنے کے قابل تھا کہ مسلمان رخت سفر باندھ رہے ہیں اور عیسائی زار زار رو رہے ہیں۔ ان کے بشپ نے ہاتھ میں انجیل لے کر کہا: "اس مقدس کتاب کی قسم! اگر کبھی ہمیں اپنا حاکم خود منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو ہم عربوں کو ہی منتخب کریں گے۔" [3]

اسی طرح فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ نے جزیہ وغیرہ کے معاملے میں مصر کے قبطیوں (غیر

---

1 - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۳۹؛ نیز بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ)، نفیس اکیڈمی، کراچی، ص: ۲۰۶

2 - بلاذری، فتوح البلدان (فصل: یوم الیرموک)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص: ۱۴۳

3 - یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص: ۱۲۸

مسلموں) سے جو حسن سلوک کیا تو وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ رومی حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں کے معاون بن گئے (وصاروا معه عوناً للمسلمین علی الروم) حتیٰ کہ اللہ نے رومیوں کو شکست دی اور انہیں مصر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔[1]

گزشتہ تفصیل اور تصریحات کے مطابق یہ جزیہ چونکہ غیر مسلم شہریوں کی دشمن سے حفاظت یا دوسرے لفظوں میں ان کی فوجی خدمت کے معاوضے میں لگایا جاتا تھا۔ اس لیے اگر کبھی ایسی نوبت آئی یا ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ غیر مسلم مسلمان فوجیوں کے ساتھ جہاد / دفاعی جنگ میں شریک ہوئے تو ان سے جزیہ کی ادائیگی ساقط کر دی گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

> یہ بات بالکل واضح ہے کہ لشکر اسلام میں خدمات سرانجام دینے والا ہر عیسائی (ذمی) جزیے کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھا۔ انطاکیہ کے قریب کی ایک مسیحی آبادی جراجمہ کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ وہاں کے باشندوں نے مسلمانوں کے ساتھ صلح کی اور وعدہ کیا کہ اگر ان سے جزیہ نہ لیا جائے اور مال غنیمت سے صلہ دیا جائے تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے اور جنگوں میں ان کے شانہ بشانہ لڑیں گے۔[2]

پھر ڈاکٹر موصوف نے طبری کے حوالہ سے لکھا ہے:

> اور جب ۲۲ھ میں اسلامی فتوحات کا رخ تیزی سے شمالی ایران کی طرف ہوا تو اسی طرح کے ایک معاہدے کی توثیق ان علاقوں کی حدود میں آباد لوگوں سے بھی کی گئی اور انہیں فوجی خدمت کے عوض جزیہ کی ادائیگی سے بری کر دیا گیا۔[3]

---

[1] - ملاحظہ ہو: مقریزی، الخطط المقریزیۃ، دار صادر بیروت، ۲/ ۴۹۲

[2] - غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی (الفصل الخامس)، ص:۶۳؛ نیز سر تھامس آرنلڈ، دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص:۴۳

[3] - حوالہ مذکور، نیز دیکھیے: شیخ محمد خضری بک، الدولۃ العباسیۃ، مؤسسۃ المختار قاہرہ، ص ۱۴۴؛ زکریا الندواف، الاخلاق السیاسیۃ، دار القلم، دمشق، ص:۴۱۲-۴۱۳

یوسف القرضاوی نے اس مقام پر فوجی خدمات کے عوض اھل الذمہ سے جزیہ کی منسوخی کی چند اور مثالیں بھی تاریخ اسلام سے پیش کی ہیں۔ جن کا اندراج بلاضرورت طوالت کا باعث ہو گا۔ پھر شریعت اسلامیہ میں صرف اسی رعایت پر اکتفا نہیں کہ اہل الذمہ کی ملکی دفاع میں شرکت پر ان کا جزیہ ساقط ہو جائے گا بلکہ انہیں مال غنیمت میں مسلمان مجاہدین کی طرح مقررہ حصہ بھی دیا جائے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں:

ورأى بعض اهل العلم ان يسهم لهم اذا شهدوا القتال مع المسلمين ويروى عن الزہری ان النبیﷺ اسهم لقوم من اليهود قاتلوا معه۔[1]

اور بعض اہل علم (فقہاء) کی رائے ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہوں تو انہیں مال غنیمت میں سے مقررہ حصہ بھی دیا جائے چنانچہ امام زہری سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان یہودیوں کو مال غنیمت میں سے حصہ دیا تھا جو آپ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔

گزشتہ تصریحات سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو گئی ہے کہ جزیہ غیر مسلموں کے قانونی طور پر فوجی اور دفاعی خدمات سے مستثنیٰ ہونے کا عوض و بدل ہے۔ تاہم یہاں عصر حاضر کے ایک اور نامور محقق ڈاکٹر حمید اللہ اور نو مسلم مفکر اسلام محمد اسد کی مزید تحقیق اور گواہی کا اندراج بے سود نہ ہو گا۔ چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں:

مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت، ریاست اور

---

[1] ۔ترمذی، جامع (ابواب السیر، باب ماجاء فی اھل الذمۃ یغزون مع المسلمین ھل یسہم لہم) مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱/۷۱۴، رقم الحدیث: ۱۵۵۸

اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و امان سے متمتع ہوتی ہے جبکہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سر کٹاتے ہیں۔ لہذا فوجی ضروریات کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عائد کیا جاتا ہے جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں۔ اسلام سے پہلے ایران و روم میں بھی جو لوگ فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے، ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت خفیف ٹیکس دے کر جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا، اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوئے دولت کماتے۔[1]

اسی طرح دوسرے اسلامی مفکر محمد اسد (لیوپولڈ وائس) زیر بحث مسئلہ کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

اگر اسلامی مملکت کے ارباب اختیار جہاد کے قرآنی تصور کی پیروی کریں جس کے مطابق صرف دفاعی جنگ جائز ہے۔ تو مملکت کے دفاع کا فرض، جو غیر مسلموں کے لیے حفاظت کا سامان مہیا کرتی ہے، غیر مسلم شہریوں پر بھی واجب ہے۔ زیادہ تر اس لیے کہ اسلام جہاں ان کی مادی بہبود کی حفاظت کا ذمہ اٹھاتا ہے وہاں انہیں روحانی آزادی کی بھی اجازت دیتا ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ (صلعم) نے کبھی ان غیر مسلموں پر اصرار نہ کیا جو زیر حفاظت رہتے تھے یعنی اہل الذمہ تھے کہ وہ ان مہموں میں حصہ لیں جو اسلام کے دفاع میں پیش آئیں۔ ساتھ ہی حضور ﷺ نے غیر مسلموں کو حسب دلخواہ مسلمانوں کے دوش بدوش لڑنے سے کبھی نہ روکا۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان فرق صرف اس حد تک ہے کہ مسلمان کے لیے مذہبی احکام کے مطابق

---

[1] خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۴۰۱ھ، ص ۳۱۲، (خطبہ نمبر ۱۲)

جہاد میں حسب ضرورت جان تک دے دینے کی پابندی ہے۔ غیر مسلم شہری سے تمام حالات میں اس طرز عمل کی پیروی نہیں کرائی جا سکتی۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم شہریوں کی بہت بڑی تعداد نہ صرف آمادہ ہو گی بلکہ دل سے خواہاں ہو گی کہ جو مملکت ان کی آزادی کی محافظ اور ان کے شہری حقوق کی ضامن ہے، اس کے دفاع میں پورا حصہ لے۔ تاہم سمجھا جا سکتا ہے کہ بعض غیر مسلم خصوصاً مسیحی سمجھ رہے ہوں کہ ہتھیار اٹھانا ان کے مذہبی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لہذا فوجی خدمت میں شامل کیے جانے پر معترض ہوں۔ ایسے ہی معترضین کے لیے یہ اصول استعمال ہو گا کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ وہ ایک خاص ٹیکس ادا کر کے جسے جزیہ کہتے ہیں، فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہو جانے کے حقدار ہیں۔ (جزیہ کے لفظی معنی بھی یہ ہیں کہ فوجی خدمت کے بدلے میں محصول ادا کر دینا)۔[1]

جزیہ جبراً مسلمان بنانے کا ذریعہ نہیں تھا

جہاں تک اس اعتراض یا شبہ کا تعلق ہے کہ جزیہ اہل الذمہ کو جبراً مسلمان بنانے کا ایک ذریعہ تھا تو اس کے جواب کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اگر یہ بات ہوتی تو اتنی معمولی مقدار میں اور برائے نام ٹیکس نہ لیا جاتا۔ یعنی کاروباری حضرات اور سرمایہ داروں سے ۴۸ دراھم (سالانہ) متوسط طبقہ سے ۲۴ دراہم (سالانہ) اور محنت کش طبقہ سے ۱۲ دراہم (یعنی ماہانہ صرف ایک درہم)[2] پھر وہ بھی جیسا کہ ابھی اوپر گزرا،

---

[1] - اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول (اردو ترجمہ از مولانا غلام رسول مہر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص:۱۲۴-۱۲۵

[2] - دیکھیے: ابو یوسف کتاب الخراج، ص:۱۲۳-۱۲۴؛ جصاص، احکام القرآن، ۳/۱۴۳-۱۴۴؛ ابن عربی، احکام القرآن، ۲/۹۰۸؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/۵۰۱؛ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۸/۱۱۱؛ موسوعۃ الفقہیۃ (کویت)، ۱۵/۱۸۳

صرف جنگ کے قابل اور کمائی کرنے والے مرد حضرات پر۔ بچے عورتیں، بیمار، معذور، محتاج، بوڑھے، مفلوج وغیرہ قسم کے سب اہل الذمہ جزیہ سے بری الذمہ۔

جزیہ کی صورت میں اتنے معمولی ٹیکس جس کی وصولی میں مقدور بھر نرمی اور رعایت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور کئی صورتوں میں بالکل معاف بھی کر دیا جاتا ہے۔ (جس کی تفصیل یہاں طوالت کا سبب بنے گی) کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ جبراً مسلمان بنانے کا ایک ذریعہ تھا، انصاف اور عقل کے خلاف ہی نہیں "مذہبی نفسیات" کے بھی خلاف ہے۔ شاید اسی مذہبی نفسیات کے پیش نظر علامہ شبلی نعمانی نے زیر بحث شبہ کے جواب میں "الزامی انداز" میں کہا ہے:

> اب ہم پوچھتے ہیں ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اسقدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی جس کی بنیاد نوشیروان عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے، جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہو گا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہو گا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔[1]

زیر بحث اعتراض کے غلط ہونے کے حوالے سے مشہور مستشرق سر تھامس آرنلڈ کی یہ وضاحت ان کی مشہور کتاب "The Preaching of Islam" میں قابل ملاحظہ ہے:

> بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عیسائیوں پر جزیہ ان کے قبول اسلام سے انکار کے باعث لگایا جاتا تھا۔ مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ جزیہ کی ادائیگی میں وہ لوگ بھی دیگر ذمیوں کے ساتھ شریک تھے جو اپنے مذہب کی وجہ سے فوجی خدمت سرانجام دینے سے قاصر تھے۔ اور جن کی حفاظت کی ذمہ داری جزیہ کے عوض مسلمان حکام پر عائد

---

[1] ۔ مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/ ۲۳۷

ہوتی تھی۔ چنانچہ حیرہ کے باشندوں نے جزیہ ادا کرتے ہوئے اس بات کی خاص طور پر وضاحت کر دی کہ مسلمان اور ان کا حاکم ہمیں ظلم سے بچائے گا۔ خواہ ظالم مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔[1]

جزیہ۔کفر پر قائم رہنے کی سزا(Penalty)نہیں

ہمارے بعض فقہاء نے لفظ جزیہ کو "جزاء" سے مشتق قرار دیتے ہوئے اسے "معاوضہ حفاظت" کے برعکس کفر پر قائم رہنے کا "بدلہ" یا "عقوبت"(Penalty) بھی قرار دیا ہے۔ مثلاً علامہ حصکفی تنویر الابصار کی شرح میں فرماتے ہیں:

(وھی) ای الجزیہ لیست رضا منا بکفرھم کما طعن الملحد بل انما ھی (عقوبة) لھم علی اقامتھم (علی الکفر)۔[2]

اور وہ یعنی جزیہ ہماری طرف سے ان (اہل الذمہ) کے کفر پر رضامندی نہیں جیسا کہ ملحد لوگ طعنہ دیتے ہیں بلکہ وہ ان کے کفر پر قائم رہنے کی بنا پر ان کے لیے ایک قسم کی "عقوبت" (سزا) ہے۔

صاحب ہدایہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جزیہ کا وجوب اہل الذمہ کے کفر پر اصرار کی عقوبت(سزا) کے طور پر ہے۔[3]

اسی طرح فقیہ مفسر ابن عربی وجوب جزیہ کی علت میں مختلف اقوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فقال علماء المالکیة وجبت بدلا عن القتل بسبب الکفر۔[4]

مالکی علماء کہتے ہیں کہ یہ (جزیہ) کفر کے سبب ان کے قتل کے عوض کے طور پر واجب ہوا ہے۔

---

[1] ۔دعوت اسلام (اردو ترجمہ از محمد عنایت اللہ دہلوی)، مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص: ۷۲

[2] ۔الدر المختار شرح تنویر الابصار، ۲/ ۱۰۷

[3] ۔مرغینانی، الہدایہ مع الدرایہ، (کتاب السیر باب الجزیة)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲/ ۵۸۱

[4] ۔احکام القرآن، ۲/ ۹۱۱

ابن العربی نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ:

واستدل علماء نا علی انها عقوبة بانهاوجبت بسبب الكفر وهو جناية فوجب ان يكون مسببها عقوبة۔[1]

ہمارے علماء نے اس کے عقوبت ہونے پر اس چیز سے استدلال کیا ہے کہ یہ کفر کے بسبب واجب ہوا ہے جو ایک بہت بڑا جرم ہے تو ضروری ہے کہ اس کا سبب عقوبت ہو۔

علیٰ ہذا القیاس مفسر قرطبی نے بھی علماء مالکیہ کے حوالے سے یہی کہا ہے کہ "یہ کفر کے قتل کے عوض کے طور پر واجب ہوا ہے۔[2] علامہ ابن قدامہ حنبلی نے بھی جزیہ کو "صغار" (ذلت) اور "عقوبت" قرار دیا ہے۔[3]

مگر ان فقہاء و مفسرین کی یہ رائے محل نظر ہے۔ کیونکہ جزیہ کی علت، مذکورہ صراحت کے مطابق جہاں بعض فقہاء نے قتل کا عوض یا عقوبت بیان کی ہے وہیں بعض فقہاء نے اسے "جہاد و نصرت کا بدل" اور "بدل عن الحمایہ" (حفاظت کا بدل ہے) بھی قرار دیا ہے۔[4] دوسرے اسی زیر تحریر مقالہ میں گزر چکا ہے کہ صحابہ کرام نے اھل الذمہ کے ساتھ جو معاہدے کیے، ان میں بھی جزیہ حفاظت کے عوض کے طور پر لاگو ہوا اور جن اھل الذمہ کی حفاظت نہ کی جا سکی انہیں وصول شدہ جزیہ بھی واپس لوٹا دیا گیا۔ تیسرے اگر یہ جزیہ کفر کے سبب قتل کے عوض کفر کی عقوبت (سزا) کے طور پر واجب ہوتا تو بلا تفریق تمام اھل الذمہ پر واجب ہوتا۔ اس میں بچوں، خواتین، بوڑھوں اور معذوروں وغیرہ کا استثنیٰ نہ ہوتا۔ جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

---

[1] - حوالہ مذکور، ۲/ ۹۱۲

[2] - الجامع لاحکام القرآن، ۸/ ۱۱۳

[3] - المغنی، ۸/ ۵۰۳

[4] - دیکھیے: قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۸/ ۱۱۳؛ ابن العربی، احکام القرآن، ۲/ ۱۱۴

ذلت آمیز طریقہ سے جزیہ وصولی سے متعلق اقوالِ فقہاء۔ تحقیقی جائزہ

آیت جزیہ کے جملہ "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون"۔ میں لفظ "ید" اور "صاغرون" کو ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اھل الذمہ سے جزیہ وصول کیا جائے تو ذلت آمیز طریقے (Way of Humiliation) سے وصول کیا جائے۔ مثلاً جصاص رازیؒ نے "وھم صاغرون" کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ یمشون بھا ملببین۔ (پیدل چلتے ہوئے جزیہ لے آئیں اس حال میں کہ ان کا گریبان پکڑا ہوا ہو۔)

حضرت عکرمہ کی طرف منسوب یہ قول نقل کیا ہے کہ الصغار اعطاء الجزیۃ قائما والآخذ جالس۔[1] (صغار یہ ہے کہ ذمی کھڑے ہو کر جزیہ کی رقم پیش کرے اور وصول کرنے والا بیٹھا ہو۔)

معروف مفسر ابن العربی اور قرطبی نے بھی مذکورہ الفاظ کی تفسیر میں یہ اقوال نقل کیے ہیں۔[2]

جبکہ علامہ حصکفی نے شرح تنویر الابصار میں اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز طریقہ پر جزیہ کی وصولی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

(ولا تقبل من الذمی لو بعثھا علی ید نائبہ فی الاصح (بل یکلف ان یأتی بنفسہ فیعطیھا قائما والقابض منہ قاعد) ھدایہ ویقول اعط یا عدو اللہ ویصفعہ فی عنقہ۔[3]

---

[1] - احکام القرآن، ۳/۱۳۶

[2] - دیکھیے: احکام القرآن، ۲/۹۱۰-۹۱۱؛ الجامع لاحکام القرآن، ۸/۱۱۵؛

نوٹ: دیگر مفسرین مثلاً امام ابن کثیر نے تفسیر القرآن العظیم، امام سیوطی نے الدر المنثور اور کئی دوسرے مفسرین نے بھی سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۲۹ کی تفسیر میں اس قسم کے توہین آمیز اقوال درج کیے ہیں۔

[3] - الدر المختار شرح تنویر الابصار (مع حاشیہ رد المحتار)، ۴/۲۰۱-۲۰۲؛ نیز مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیۃ)، ۲/۵۸۱

ذمی اگر جزیہ اپنے کسی قائم مقام کے ہاتھ بھیجے تو صحیح ترین قول یہی ہے کہ اس سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ بذات خود جزیہ لے کر آئے اور کھڑے کھڑے اسے ادا کرے جبکہ اس سے جزیہ لینے والا اہلکار بیٹھا ہو اور اسے کہے: اے اللہ کے دشمن جزیہ ادا کرو اور ساتھ ہی اس کی گردن پر تھپڑ بھی رسید کرے۔

اسی طرح امام ابو یوسف، ابن قیم، السرخسی اور ابو عبید قاسم وغیرہ نے بھی اس قسم کے اقوال نقل کیے ہیں۔[1]

فقہائے اسلام کے یہ اقوال اگرچہ کاغذی، کتابی اور اجتہادی حد تک ہیں اور خلفائے اسلام نے ان اجتہادات یا اقوال کو کبھی عملی جامہ پہنانا درخور اعتناء سمجھا تاہم اس سے انکار نہیں کہ یہ اقوال جیسا کہ اوپر گزرا، ہماری تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور یقیناً اسی بنیاد پر مزید "مرچ مصالحہ" لگاتے ہوئے مصری نژاد سوئٹزرلینڈ کی مصنفہ و فاضلہ محترمہ Bat Ye'or نے The Manner of Collecting the Jizya (جزیہ وصولی کا طریقہ کار) کا عنوان قائم کرتے ہوئے لکھا:

> On the day of payment they shall be assembled in a public place like the suq. They should be standing there waiting in the lowest and dirtiest place. The acting officials representing the Law shall be placed above them and shall adopt a threatening attitude so that it seems to them, as well as to the others, that our object is to degrade them by pretending to take their possessions. They will realize that we are doing them a favor (again) in accepting from them the jizya and letting them (thus) go free. Then they shall be dragged one by

[1] دیکھیے: کتاب الاموال (اردو ترجمہ)، ص ۸۰؛ ابن قیم، احکام اہل الذمہ، ۱/۱۳؛ السرخسی، المبسوط، ۱/۸۱؛ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۲۲؛ ابن ابی شیبہ، مصنف (کتاب الجہاد)، ۷/۲۳۶

one (to the official responsible) for the exacting of payment. When paying, the dhimmi will receive a blow and will the thrust aside so that he will think that he has escaped the sword through this (insult).[1]

جزیہ کی ادائیگی کے دن انہیں بازار جیسی کسی عوامی جگہ میں جمع کیا جائے گا۔ وہاں انہیں کسی پست اور گندی جگہ پر انتظار کے لیے کھڑا کر دیا جائے گا۔ جزیہ وصول کرنے والے سرکاری اہلکار ان کے بالمقابل بلند جگہ پر بیٹھ کر ان سے ایک دھمکی آمیز رویہ اختیار کریں گے جس کا مقصد انہیں اور دوسرے لوگوں کو یہ دکھانا ہو گا کہ ہمارا مقصد ان کے مال (جزیہ) کی وصولی کے بہانے ان کی بے عزتی کرنا ہے۔ وہ اس بات کو محسوس کریں گے کہ ہم ان سے جزیہ قبول کر کے گویا انہیں آزاد کر کے دوبارہ ان پر احسان کر رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد انہیں ایک ایک کر کے جزیہ کی جبری وصولی کے لیے سرکاری اہلکاروں کی طرف گھسیٹا جائے گا۔ ادائیگی کے وقت ذمی کو ایک دھکا دیا جائے گا اور اس کے پہلو میں کوئی نوکدار ہتھیار بھی چبھویا جائے گا تاکہ وہ اس بات کو سمجھے کہ اس طریقہ تذلیل کے ذریعے اس نے تلوار سے اپنے لیے نجات پالی ہے۔

قرآنی الفاظ "ید" اور "صاغرون" کی مذکورہ تفسیر اور اقوال فقہاء چونکہ قرآن و سنت کی عمومی تعلیمات اور نصوص سے متعارض اور شریعت کے مزاج کے خلاف ہیں۔ اس لیے ان تفاسیر اور اقوال کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ ضروری ہے۔ [illegible]

جزیہ کی وصولی میں نرمی اور سہولت کی تعلیم

زیر بحث مسئلے میں درج بالا اقوال کے حوالے سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ یہ فقہاء کے [illegible]

---

1 - The Dhimmi, Jews and Christians under Islam, Fairleigh Dickinson University Press, London, 1985, P:201

اقوال اور اجتہادات و آراء ہیں۔ قرآن و حدیث کی نصوص نہیں۔ جن میں غلطی یا تبدیلی کا امکان نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اہل الذمہ سے جزیہ و خراج کی وصولی میں اسلام کی بنیادی و اصولی تعلیم یہ ہے کہ اس معاملے میں ان کے ساتھ مقدور بھر نرمی کی جائے، سہولت اور آسانی پیدا کی جائے اور بے جا سختی و جسمانی تشدد سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ "کتاب الخراج" کی "فصل فیمن تجب علیہ الجزیۃ" کے اندر جزیہ سے متعلقہ مسائل مثلاً کن اہل الذمہ پر جزیہ واجب ہوتا ہے؟ کن سے ساقط ہوتا ہے؟ جزیہ میں کیا چیزیں وصول کی جائیں گی؟ کس طرح وصول کی جائیں گی؟ جزیہ کی مقدار کتنی ہو گی؟ اور کس طرح جزیہ کی وصولی ہو گی وغیرہ وغیرہ، کی تفصیلات کے ضمن میں جزیہ کی وصولی کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ولا یضرب احد من اھل الذمۃ فی استیدائھم الجزیۃ، ولا یقاموا فی الشمس ولا غیرھا ولا یجعل علیھم فی ابدانھم شئی من المکارہ ولکن یرفق بھم۔[1]

اھل الذمہ سے جزیہ کی وصولی میں کسی کو مارا نہیں جائے گا۔ انہیں سورج وغیرہ کی گرمی، دھوپ میں کھڑا نہیں کیا جائے گا اور نہ ان پر کوئی جسمانی تشدد کیا جائے گا بلکہ ان کے ساتھ جزیہ کی وصولی میں نرمی کی جائے گی۔

پھر امام ابو یوسفؒ نے جزیہ کی وصولی میں شریعت کے اس اصول کی تائید و تاکید کے لئے چند احادیث نبوی کے علاوہ حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے سے بتایا ہے کہ شام کے سفر سے واپسی پر انہوں نے کچھ اہل الذمہ کو دیکھا کہ انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر تیل انڈیلا جا رہا ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ جزیہ کی عدم ادائیگی کے باعث انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے۔ آپ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی عدم ادائیگی کی وجہ ناداری ہے تو فرمایا "فدعوھم لاتکلفوھم مالا یطیقون" پس انہیں چھوڑ دو اور

---

[1] - کتاب الخراج (ضمن موسوعۃ الخراج)، ص: ۱۲۳

انہیں ایسی چیز کا مکلف نہ ٹھہراؤ جس کی یہ طاقت نہیں رکھتے۔

اسی طرح آپ نے ایک بوڑھے ذمی کو تنگدستی کے باعث جزیہ کی ادائیگی کے لیے بھیک مانگتے دیکھا تو آیت صدقات "انما الصدقات للفقراء والمساکین" سے استدلال کرتے ہوئے اس طرح کے تمام مسکین ذمیوں سے جزیہ معاف کر دیا۔[1]

علی ہذا القیاس مشہور صحابی حکیم بن حزامؓ نے حمص میں دیکھا کہ ایک عامل عیاض بن غنم نے جزیہ کی وصولی کے لیے چند اہل الذمہ کو دھوپ میں کھڑا کیا ہوا ہے تو آپؓ نے فرمایا۔ اے عیاض! یہ کیا حرکت کر رہے ہو؟ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جو لوگ بلا جواز دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں وہ آخرت میں عذاب کے اندر مبتلا کیے جائیں گے۔[2]

زیر بحث مسئلے میں نامور اسلامی ماہر معاشیات علامہ ابو عبید قاسمؒ نے "اجتباء الجزیة والخراج، وما یؤمر به من الرفق باهلها وینهی عنه من العنف علیهم فیها" (جزیہ و خراج کی وصولی اور اس سلسلے میں اہل جزیہ سے جس نرمی کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی وصولی میں ان پر جس قسم کی سختی سے منع کیا گیا ہے، کا بیان) کے عنوان سے مستقل باب قائم کرتے ہوئے اس موضوع سے متعلق متعدد روایات درج کی ہیں، جن کا احاطہ یہاں مشکل ہے۔ ان روایات میں ابو عبیدؒ نے یہ روایت بھی درج کی ہے کہ:

> ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس جزیہ کا بہت سا مال آیا تو فرمایا: میرا خیال ہے کہ (اتنا کثیر مال حاصل کرنے میں) تم نے لوگوں (اہل الذمہ) پر بے جا دباؤ ڈال کر انہیں تباہ

---

1 - دیکھیے: حوالہ مذکور، ص: ۱۲۵-۱۲۶

2 - حوالہ مذکور، ص: ۱۲۵؛ نیز مسلم، الصحیح (کتاب البر والصلة والادب باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق)، ۲/۳۲۷، رقم الحدیث: ۶۶۶۰؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیة، باب النہی عن التشدید فی جبایة الجزیة)، ۱۴/۵۱، رقم ۱۹۲۳۷

کر دیا ہو گا۔ اس پر مال لانے والوں نے بتایا: نہیں اللہ کی قسم! ہم نے ان کی خوشی اور خوش دلی کے ساتھ یہ کچھ ان سے وصول کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے (مزید اطمینان کے لیے) دریافت کیا: بغیر کوڑے مارے اور بغیر لٹکائے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا۔ اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اور میرے دور حکومت کو رعایا پر مظالم و تشدد سے محفوظ رکھا۔[1]

اسی طرح ابو عبید نے زیر بحث معاملے میں حضرت علی المرتضیٰؓ کی اپنے عامل کو ہدایت نقل کی ہے:

دیکھو خراج وصول کرنے کے لیے نہ تو ان اہل الذمہ کی غذا فروخت کرنا اور نہ گائے بیل نہ ان کی گرمی کی پوشاک بیچنا نہ سردی کے کپڑے، ان سے نرمی برتنا اور حتی الامکان ان کے ساتھ نرمی کرنا اور ان کے ساتھ (مراعات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا) یہ رعایت بھی کرنا یہ رعایت بھی کرنا۔[2]

جبکہ محدث بیہقی نے حضرت علی المرتضیٰؓ کی اپنے عامل کے نام ہدایت یوں درج کی ہے:

جزیہ کی رقم (درہم) کی وصولی میں کسی آدمی (ذمی) کو کوڑا نہ مارنا نہ اس مقصد کے لیے ان کی خوراک فروخت کرنا نہ سردی کے کپڑے نہ گرمی کے کپڑے نہ ایسا چوپایہ جس کے ذریعے وہ محنت مزدوری کرتے ہوں نہ جزیہ کی وصولی کے لیے کسی آدمی کو کھڑا کرنا۔ عامل کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: امیر المومنین! تب میں جس طرح خالی ہاتھ آپ کے پاس سے جا رہا ہوں اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹ آؤں گا۔ آپ نے فرمایا: تم اس حکم پر عمل کرو چاہے خالی ہاتھ ہی لوٹ آؤ۔ تمہاری ہلاکت ہو۔ بے شک ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم جزیہ میں ان سے صرف فالتو (ضرورت سے زائد) مال لیں۔[3]

---

1 - دیکھیے: کتاب الاموال (عربی)، مؤسسۃ ناصر الثقافہ، بیروت، ص: ۲۶

2 - حوالہ مذکور۔ نیز دیکھیے: نہج البلاغہ (اردو ترجمہ از مفتی جعفر حسین)، امامیہ کتب خانہ، لاہور، ص: ۷۴۲ (مکتوب نمبر ۵۱)

3 - بیہقی، السنن الکبریٰ، (کتاب الجزیۃ باب النہی عن التشدید فی جبایۃ الجزیۃ)، ۱۴/ ۵۱، رقم ۱۹۲۴۸

اسلام کی انہی تعلیمات اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے فقہا نے کہا ہے:

انه ينبغي للعامل على الجزية أن يكون رفيقا بأهل الذمة عند استيفائه للجزية، بأن يأخذ منهم بتلطف دون تعذيب او ضرب وأن يؤخرهم إلى غلاتهم وأن يقسطها عليهم وأن يقبل منهم القيمة بدلا من العين، والصغار في قوله تعالى (وهم صاغرون) معناه عند أكثرهم التزامهم أحكام الإسلام [illegible]

جزیہ وصول کرنے والے کے لیے مناسب ہے کہ جزیہ کی وصولی کے وقت اہل الذمہ کے ساتھ نرم رویہ رکھے بایں طور کہ ان سے پیار کے ساتھ وصول کرے نہ کہ سختی میں مبتلا کر کے یا مار پیٹ کر، ان کے غلہ / فصل پکنے تک انہیں مہلت دے یا قسطوں میں وصولی کی اجازت دے اور عین (پیداوار) کے بدلے قیمت قبول کر لے اور اللہ تعالیٰ کے قول (وهم صاغرون) کا معنی یہ ہے کہ وہ اسلام کے احکام و قوانین پر عملدرآمد کو قبول کر لیں [illegible]

جزیہ کے معاملے میں نرمی اور سہولت کے انداز میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مقدار جزیہ کا تعین صاحب جزیہ کی مالی حیثیت کو دیکھ کر کیا جائے گا، اسی لیے احناف نے فیصلہ کیا کہ اونچے درجے کے مالدار، متوسط اور غریب آدمی کے جزیہ کی مقدار میں فرق کیا جائے، اس کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ابن عیینہ نے ابن ابی نجیح سے روایت کی ہے کہ میں نے مشہور تابعی حضرت مجاہد سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ اہل شام پر چار دینار اور اہل یمن پر صرف ایک دینار (سالانہ) جزیہ مقرر کیا گیا؟ تو انہوں نے جواب دیا [illegible]

1۔ موسوعۃ الفقہیۃ (کویت) 15/193 [illegible]

(نوٹ: جزیہ کی وصولی کے لیے ان شکلوں یا آسانیوں کی مزید تفصیل بھی موسوعہ ہذا میں درج ہے، دیکھیے ج 15 ص 192 تا 196 [illegible] 156 [illegible]

"جعل ذالک من قبل الیسار" (اہل شام کی خوشحالی کے باعث ان پر چار دینار جزیہ عائد کیا گیا)[1] دوسرے گھر کے اکیلے سربراہ کی طرف سے جزیہ کی مقررہ ادائیگی اس کے زیر کفالت تمام اہل خانہ کی طرف سے شمار ہوتی تھی۔[2]

امام ابو عبیدؒ اور ابن قیمؒ وغیرہ نے اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اپنے بصرہ کے عامل عدی بن ارطاۃ کے نام ایک خط نقل کیا ہے جس میں عامل مذکور کو جزیہ کے معاملے میں اہل الذمہ سے اتنی نرمی اور رعایت کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس خط کی عبارت یہ تھی:

> امابعد، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جزیہ لینے کا جو حکم دیا ہے وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اسلام قبول کرنے سے گریز کر کے سرکشی اور کھلے خسارہ کو منظور کرتے ہوئے کفر اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا تم ان میں سے جو جزیہ کا بار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس پر جزیہ لگا دو۔۔۔۔ اور دیکھو تمہارے علاقہ میں جو عمر رسیدہ، کمزور اور کمائی سے لاچار ذمی ہوں، ان کا بیت المال سے مناسب و حسب ضرورت وظیفہ مقرر کر دو۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ مجھے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ ایک ایسے بوڑھے ذمی کے پاس سے گزرے جو دربدر لوگوں سے بھیک مانگ رہا تھا تو انہوں نے کہا: "ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ تیری جوانی میں تو ہم تجھ سے جزیہ وصول کرتے رہے پھر بڑھاپے میں تجھے اس طرح در در کا بھکاری بنا کر چھوڑ دیا"
> چنانچہ انہوں نے بیت المال سے اس کے لیے اس کی ضرورت کے مطابق وظیفہ جاری کر دیا۔[3]

---

[1] ۔بخاری، الصحیح (ابواب الجزیہ والموادعۃ، باب الجزیۃ والموادعۃ مع اہل الذمۃ والحرب)، ۱/۴۴۷

[2] ۔خربوطلی، الاسلام واھل الذمہ، ص:۷۰

[3] ۔کتاب الاموال طبع مذکور، ص:۷۲؛ ابن قیم، احکام اھل الذمۃ، ۱/۴۵

قبول اسلام سے جزیہ معاف

جزیہ کی وصولی میں حد درجہ نرمی کی وضاحت کے لیے ایک اور چیز کی صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی ذمی (جس پر جزیہ واجب ہے) سالانہ جزیہ کی ادائیگی کی مقررہ تاریخ سے صرف ایک دو دن قبل بھی اسلام قبول کرلے تو اس سے پورے سال کا جزیہ معاف ہو جائے گا۔[1] کیونکہ اسلام قبول کرنے کے باعث وہ ملک کی دفاعی نصرت کرنے کا اہل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اصل (اہلیت دفاع) کے پائے جانے کے بعد اس کے قائم مقام (جزیہ) کی گنجائش نہیں۔[2]

بعض فقہاء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر اس کے ذمہ دو سال کا جزیہ تھا۔ اب اگر اللہ اسے اسلام کی توفیق دے دیتا اور وہ اسلام قبول کرلیتا ہے تو دو سال کا واجب الادا جزیہ بھی ساقط ہو جائے گا۔[3] اسی طرح اگر وہ ادائیگی سے قبل انتقال کر جائے تو بھی اس کے ذمہ واجب الاداء جزیہ کا مطالبہ اس کے ورثاء سے نہ کیا جائے گا۔[4]

کسی مسلمان سے جزیہ وصول نہ کرنے کے مذکورہ شرعی اصول کے پیش نظر اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک عامل عبدالحمید بن عبدالرحمٰن نے جب حیرہ کے ان یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں سے جزیہ وصول کرنا چاہا جو اسلام لے آئے تھے، یہ گمان کرتے ہوئے کہ یہ جزیہ سے بچنے کے لیے اسلام قبول کر رہے ہیں تو خلیفۃ المسلمین نے اسے ایسا کرنے سے روکتے ہوئے ایک تاریخی جملہ لکھا۔ فرمایا:

---

[1] - دیکھیے: ابو یوسف، کتاب الخراج (فصل: فیمن تجب علیہ الجزیۃ)، ص: ۱۲۲-۱۲۳

[2] - السرخسی، المبسوط، ۱۰/۸۱؛ مرغینانی، ہدایہ اولین، (کتاب السیر باب الجزیۃ)، ۲/۵۸۰

[3] - ابن قیم، احکام اہل الذمہ، (فصل اذا اسلم الکافر)، ۱/۶۰؛

نوٹ ابن قیم نے یہاں قبول اسلام کے بعد جزیہ واجب نہ ہونے کے مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

[4] - ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۲۳؛ نیز السرخسی، المبسوط، ۱۰/۸۱؛ مرغینانی، ہدایہ اولین (کتاب السیر باب الجزیۃ)، ص: ۵۸۱

ان الله جل ثناءه بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم داعیاً الی الاسلام ولم یبعثه جابیاً فمن اسلم من اهل تلک الملل فعلیه فی ماله الصدقة ولا جزیة علیه۔[1]

بے شک اللہ جل شانہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعیِ اسلام بنا کر مبعوث فرمایا تھا نہ کہ محصل بنا کر۔ پس ان اہل ملت میں سے جو آدمی اسلام لے آئے تو اس پر اس کے مال میں صدقہ (زکوٰۃ) ہے اور اس پر کوئی جزیہ نہیں۔

اسی طرح ایک دوسرے عامل نے نو مسلم اہل الذمہ پر جزیہ لگانے کی اجازت چاہی تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مذکورہ مقصد بتاتے ہوئے یہ جواب دیا کہ ہم کو زہد ہی لکھوا بھیجئے۔[2]

علامہ شبلی نعمانی کے مقالات شبلی (مذہبی) میں ایک مقالہ "الاسلام" کے عنوان سے ہے۔ اس مقالہ کا تعارف کراتے ہوئے بالکل ابتداء میں علامہ نے لکھا ہے: "یہ ایک کتاب کا نام ہے جو فرانس کے نامور فاضل کاؤنٹ ہنری دی کاستری نے فرنچ زبان میں لکھی ہے اور جس کا ترجمہ احمد فتحی بک زغلول مصر کے ایک مصنف نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا ہے" گویا یہ مقالہ فرانسیسی کے ایک فاضل کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں فاضل موصوف نے جزیہ میں خود ریختہ نومسلموں اور اسلام قبول کرنے والے ذمیوں سے جزیہ نہ لینے کے حوالے سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے مذکورہ واقعے کو نقل کیا ہے تفصیل یہ لکھتے ہیں:

دولت بنو امیہ کے زمانے میں نہایت کثرت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود خلفاء نے اس ترقی کو اس لحاظ سے پسند نہیں کیا کہ بیت المال کی آمدنی کو نقصان پہنچتا تھا۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کے زمانے میں مصر میں جزیہ کی آمدنی حضرت عثمانؓ کے زمانے کی نسبت سے آدھی رہ گئی تھی۔ اسی بناء پر خلفاء نے قبول

1۔ حوالہ مذکور، ص: ۳۱ و نیز جصاص، احکام القرآن، ۴/۲۸

2۔ جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، ۲/۳۳

اسلام کی بجائے جزیہ کی وصولی کو اس طریقے سے تنگ کر دینا چاہا کہ نو مسلم بھی جزیہ سے معاف نہ کیے جائیں۔ چنانچہ حیان نے عمر بن عبد العزیزؒ کو خط لکھا کہ اگر یہی حالت رہی تو اس ملک کے تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خزانہ شاہی کو سخت نقصان پہنچے گا لیکن عمر بن عبد العزیزؒ نے خط پڑھ کر ایک شخص کو حکم دیا کہ حیان کے پاس جا کر کہو کہ تم کو دُرّے لگائے جائیں اور اس سے کہہ کہ اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہوگی کہ تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں۔ خدا نے نبی محمد ﷺ کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کریں، نہ اس لیے کہ خراج اور جزیہ وصول کریں۔[1] [illegible]

سلطانی "عن یدٍ وھم صاغرون" کا معنی [illegible]

جہاں تک جزیہ کی وصولی میں تذلیل و اہانت کی درج بالا رائے یا فقہی اقوال کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ واضح رہے کہ خود آیت جزیہ میں قتال کے انتہا (جنگ بندی) کی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ مقاتلین جزیہ دینے کی شرط کو "وھم صاغرون" کی حیثیت قبول کر لیں۔ صاغرون کا لفظ عربی مادہ "صغر" سے ماخوذ ہے جس کا ایک معنی ذلیل ہونا بھی ہے لہٰذا اسی معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ کی تفسیر و تشریح میں مذکورہ اسلوب کا اظہار کیا گیا ہے۔[2] مگر آیت کا سیاق و سباق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں جیسا کہ آگے بھی اوپر گزرا "صغر" سے مراد "ماتحتی کی حالت" ہے جو کہ ظاہری ذلالت اور دوسرے محکومی یعنی اسلامی حکومت کی اطاعت و فرماں برداری قبول کر لینا اور اس کے ماتحت ہو جانا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قیمؒ نے "وھم صاغرون" کی تفسیر میں مذکورہ بالا قسم کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: [illegible]

وھذا کله مما لا دلیل علیه ولا ھو مقتضی الآیة ولا نقل عن رسول الله ﷺ ولا عن الصحابة انھم فعلوا ذالک۔ والصواب فی الآیة ان

---

[1] مقالات شبلی (مذہبی)، ۱/۱۵۰

[2] ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ)، ص: ۲۳۶

الصغار هو التزام لجریان احکام الملة علیهم واعطاء الجزیة فأن التزام ذالک هو الصغار۔[1]

یہ سب وہ اقوال ہیں جن پر کوئی دلیل نہیں اور نہ یہ آیت کا مقتضیٰ ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ اور نہ ہی صحابہؓ سے کوئی ایسی چیز منقول ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا کیا ہو۔ آیت ہذا کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی سیاسی برتری تسلیم کرتے ہوئے اپنے اوپر اسلامی حکومت کے احکام کا التزام کرنے کا عہد کریں اور جزیہ دیں پس ان کا یہی التزام یا اسلامی حکومت کی برتری تسلیم کر لینا ہی صغار ہے۔

اسی طرح علامہ آلوسی نے ان اقوال پر تأسف کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان اقوال کا آج ہم کہیں اثر نہیں دیکھتے کیونکہ اہل الذمہ مسلمانوں سے زیادہ ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔[2]

قرآن وسنت کی نصوص کی تعبیر و تشریح اگر اسوہ رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کے طرز عمل سے ہٹ کر کی جائے گی تو اس سے بہت سی غلط فہمیاں جنم لیں گی۔ اس اصول کی بنا پر پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ آیت جزیہ کی رو سے ذمیوں سے ذلت آمیز طریقہ پر اور ان کی عزت نفس کو مجروح کر کے جزیہ وصول کرنے کی رائے اسلام کی بنیادی واخلاقی تعلیمات اور اسوہ رسول و صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر اس رائے کو قبول کر لیا جائے تو اھل الذمہ کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک، نرمی، انصاف اور ان پر ظلم و زیادتی نہ کرنے کی تعلیمات نبوی جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کو کہاں رکھیں گے؟ اسی لیے علامہ شامی نے صاحب درمختار کے بیان کردہ جزیہ کی وصولی کے مذکورہ ذلت آمیز طریقہ کی شرح بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ولهذا رد بعض المحققين من الشافعية ذالک بأنه لااصل له فی السنة ولا فعله احد من الخلفاء الراشدين۔[3]

---

[1] ۔احکام اھل الذمہ، ۱/ ۳۵

[2] ۔روح المعانی، ۱۰/ ۷۸ (تحت تفسیر سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹)

[3] ۔حاشیہ رد المحتار، ۴/ ۲۰۲

اور اسی لیے شوافع کے بعض محققین نے اس طریق کار کو رد کیا ہے۔ اس لیے کہ سنت میں اس کی کوئی اصل نہیں اور نہ خلفاء راشدینؓ میں سے کسی نے کبھی ایسا کیا ہے۔

آیت جزیہ میں "عن ید" کا لفظ اس مضمون کی تشریح کرتا ہے کہ ید سے مراد یہاں حسی ہاتھ نہیں بلکہ دراصل یہ کنایہ ہے اطاعت و انقیاد سے۔ چنانچہ کہتے ہیں: اعطی فلان بیدہ اذا اسلم وانقاد۔[1] (جب کوئی آدمی کسی دوسرے کی اطاعت و تابعداری قبول کرلے تو کہتے ہیں کہ فلاں نے اپنے ہاتھ سے دیا) لہٰذا "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید" کے معنی یہ ہیں کہ وہ اطاعت پر آمادگی کے ساتھ جزیہ دینا قبول کرلیں۔ اسی طرح "وھم صاغرون" سے مراد جیسا کہ اوپر گزرا اسلامی حکومت کی سیاسی برتری کو تسلیم اور اسکی ماتحتی قبول کرلینا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر جنگ کے مقصد (حتی لاتکون فتنۃ) سے بھی "صاغرون" کا یہی معنی متعین ہوتا ہے کہ کفار کا اپنے باطل اور ظالمانہ قوانین کی تنفیذ سے فتنہ وفساد برپا نہ کرسکنا اور قانون الٰہی کے ماتحت ان کا اسلامی نظام عدل کا پابند رہنا ہی ان کا "صغار" ہے۔ اور آیت جزیہ میں "وھم صاغرون" سے یہی صغار مراد ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے بھی "وھم صاغرون" کی تفسیر "اذلاء" سے کی ہے۔[2] امام شافعیؒ فرماتے ہیں: وسمعت عدداً من اھل العلم یقولون الصغار ان یجری علیھم حکم الاسلام۔[3] (اور میں نے متعدد اہل علم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ صغار یہ ہے کہ ان (غیر مسلموں) پر اسلام کا حکم / قانون جاری ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اہل الظواہر کے مشہور فقیہ ابن حزم "صغار" کا مفہوم یا مراد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ومن الصغار ان لا یؤذوا مسلماً ولا یستخدموہ ولا یتولی احد منھم شیئاً من امور

---

[1] - بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۸۷۳ء، ص:۱۰۱۷

[2] - الجامع الصحیح (کتاب الجہاد، باب الجزیۃ والموادعۃ مع اھل الذمۃ والحرب الخ)، ۱/۴۴۷

[3] - شافعی، ابو عبداللہ محمد بن ادریس، الام (مع مختصر المزنی)، دارالفکر بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء، ۴/۱۸۶، ۲۲۲

السلطان يجري لهم فيه امر على مسلم" صغار سے مراد یہ ہے کہ وہ (غیر مسلم) کسی مسلمان کو تکلیف نہ پہنچائیں نہ اس سے خدمت لیں اور نہ ان میں سے کوئی آدمی بھی ایسے حکومتی عہدے پر فائز ہو جس سے وہ اہل اسلام پر اپنا حکم چلائے۔ موصوف ابن حزم نے "الصغار" کی ایک تفسیر یہ بھی بیان کی ہے کہ: "الصغار هو ان يجري حكم الاسلام عليهم وان لا يظهروا شيئا من كفرهم ولا مما يحرم في دين الاسلام" صغار یہ ہے کہ ان پر اسلام کا حکم (حکومت) لاگو ہو جائے اور وہ اپنے کفر اور اسلام کے اندر حرام چیزوں میں سے کسی کو ظاہر نہ کریں۔[1]

علامہ ماوردی نے بھی "وهم صاغرون" سے مراد "ان تجري عليهم احكام الاسلام" (کہ ان پر احکام اسلام لاگو ہو جائیں) لی ہے۔[2]

جہاں تک وصولی جزیہ کے وقت اہل الذمہ کی گردنوں میں مہر لگانے کا تعلق ہے (تو یہ چیز بھی ان کی تذلیل یا تحقیر کے لیے نہ تھی بلکہ ایک وقتی اور انتظامی ضرورت تھی اور محض یہ معلوم کرنے کے لیے تھی کہ کون آدمی جزیہ ادا کر چکا ہے اور کس کے ذمہ ابھی باقی ہے اور ادائیگی کے بعد یہ مہر توڑ دی جاتی تھی۔ یہ ایسی چیز نہ تھی جسے صرف مسلمان حکمرانوں نے اپنایا بلکہ ان سے پہلے بازنطینی (رومی) حکمران بھی اسی طرح کرتے تھے۔[3]

جزیہ میں نرمی۔ مستشرقین کا اعتراف

مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلم رعایا سے جزیہ کے معاملے میں جس حد درجہ نرمی، بھلائی، آسانی اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، اس کا مظاہرہ غیر مسلموں نے اپنے حکمرانوں سے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کا اعتراف انصاف پسند مستشرقین کو بھی ہے مثلاً مشہور مستشرق گستاؤلی بان نے عہد فاروقی کے فاتح حضرت

---

1 - المحلی (کتاب الجہاد)، دار الجیل بیروت، ۷/۳۴۶-۳۴۷ (مسئلہ نمبر ۹۵۸)

2 - الاحکام السلطانیہ (عربی)، ص: ۱۴۸

3 - خربوطلی، الاسلام واهل الذمہ (الفصل الرابع)، المجلس الاعلی للشئون الاسلامیہ، قاہرہ، ص: ۷۱-۷۲

مصر عمرو بن العاصؓ کے بارے میں لکھا ہے:

عمرو بن العاصؓ نے باشندگان مصر (یعنی فتح کے بعد) وعدہ کیا کہ انہیں مذہب کی مکمل آزادی، پورا انصاف بلا رعایت اور جائیداد کی ملکیت کے پورے حقوق دیے جائیں گے۔ اور ان مطالبات اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں جو شاہنشاہان یونانی ان سے وصول کیا کرتے تھے، صرف ایک سالانہ جزیہ لیا جائے گا۔ جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپے تھی۔ ان قلیل مطالبات سے اہل مصر نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہو گئے اور جزیہ کی رقم انہوں نے پیشگی ادا کر دی۔ عمال اسلام اپنے عہد پر بدرجہ مستحکم رہے اور انہوں نے اس رعایا کے ساتھ جو ہر روز شہنشاہ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھوں سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتی تھی، اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے بہ کشادہ پیشانی دین اسلام اور زبان عربی کو قبول کر لیا۔ میں بار بار کہوں گا کہ یہ وہ نتیجہ ہے جو ہرگز بزور شمشیر ممکن حاصل نہ ہو سکتا اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے مصر پر حکومت کی وہ ہرگز ایسی کامیابی حاصل نہ کر سکی تھیں۔[1]

اسی طرح ڈاکٹر موصوف اندلس میں عربوں (مسلمانوں) کے تسلط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو انہوں نے شام و مصر میں کیا تھا۔ ان کا مال، ان کے کنیسے، ان کے قوانین انہیں دیے اور اپنے ہم قوم حکام کے زیر انصاف رہنے کے حقوق انہیں عطا کیے گئے۔ ایک سالانہ جزیہ بہ چند شرائط ان پر لگایا گیا جو امراء کے لیے ایک دینار سرخ اور عامہ خلائق کے لیے نصف دینار تھا۔ یہ شرائط اس قدر نرم تھیں کہ رعایا نے بلا تکرار انہیں قبول کر لیا اور عربوں کو بجز بڑے

[1] تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ت۔ن، ص:۱۸۱

بڑے جاگیرداروں کے کسی کے مقابلہ کی ضرورت نہ رہی۔[1]

اسی طرح مشہور مستشرق سر تھامس واکر آرنلڈ نے اپنی کتاب The Preaching of Islam میں جہاں جزیہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہاں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کے حوالے سے جزیہ کی شرح کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

یہ محصول یعنی جزیہ اگر خواہش کی جاتی تھی تو جنس میں بھی ادا ہو سکتا تھا۔ مویشی، تجارت کا مال، گھر کا اسباب یہاں تک کہ سوئیاں بھی روپیہ کے عوض میں قبول ہو سکتی تھیں۔ لیکن سور، شراب اور مردہ جانور نہیں لیے جاتے تھے۔ جزیہ فقط صحیح الجثہ مردوں پر جاری تھا نہ کہ عورتوں اور بچوں پر۔ ایسے تنگ دست جن کی روزی خیرات پر تھی اور ایسے مفلس جو زیادہ عمر کے ہوتے اور کام نہ کر سکتے، خاص طور پر جزیہ سے مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح اندھے لنگڑے لولے، لاعلاج مریض اور دیوانے اگر وہ دولتمند نہ ہوتے تو وہ بھی اس محصول سے بری رہتے۔ یہی شرط قسیسوں اور عیسائی عالموں کے ساتھ تھی کہ اگر امیروں کی خیرات پر ان کا گزر ہوتا تو جزیہ سے مستثنیٰ رہتے لیکن اگر مقدور والے ہوتے تو ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ عمال جو جزیہ وصول کرتے تھے، ان کو خاص ہدایت تھی کہ رعایت کریں اور وصول نہ ہونے کی حالت میں سختی یا جسمانی سزا سے بالکل پرہیز کریں۔[2]

علیٰ ہذا القیاس سید سلیمان ندوی نے ایک ہندو مصنف منشی لال چند کی ایک قلمی کتاب "نگار نامہ" جو جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں موجود تھی، کے حوالے سے مشہور مغل حکمران اورنگ

---

[1] ۔حوالہ مذکور، ص:۲۷۶

[2] ۔دعوت اسلام (اردو ترجمہ)، ص: ۷۲

ریب عالمگیر کے زمانے کا ایک سرکاری طویل فرمان "سند معافی جزیہ" نقل کیا ہے۔ جس میں ہندوستان کے غیر مسلم غریب اور معمول، رعایا جو زراعت پیشہ ہیں، سے جزیہ نہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید موصوف لکھتے ہیں:

> ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں غیر مسلمان ذمی رعایا سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس وصول ہوتا تھا، اس کی نسبت انگریز مؤرخوں نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندو مصنفوں نے جو بے سروپا باتیں پھیلائی ہیں ان کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے۔ اب ہم کو ایک نئی دستاویز ہاتھ آئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسا ٹیکس نہ تھا جو ظلم سے لگایا جاتا تھا اور کبھی معاف نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایسے لوگوں سے جو غریب ہوتے تھے، عموماً معاف کر دیا جاتا تھا بلکہ ہندوستان کے عام کاشتکاروں سے جو زیادہ تر غریب طبقہ ہے۔ اکثر معاف کر دیا جاتا تھا۔[1]

[1] ۔ دیکھیے: صباح الدین عبد الرحمن، مقالات سلیمان ندوی (تاریخی)، دار المصنفین اعظم گڑھ، ت۔ن، ۱/۳۷۷-۳۷۹ (بحوالہ معارف اکتوبر ۱۹۳۷ء)

دوسری فصل

ذمیوں پر مخصوص ہیئت ولباس وغیرہ کی پابندی۔ تنقیدی جائزہ

اس امر میں کوئی شبہ اور انکار کی گنجائش موجود نہیں کہ بعض فقہاء اسلام نے اھل الذمہ / غیر مسلم شہریوں کی ظاہری ہیئت، شکل وشباہت، لباس، بالوں اور سواری وغیرہ کے حوالے سے بعض ایسی پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو بظاہر بڑی سختی، انسانی تحقیر وتذلیل، جبر واکراہ اور تنگ دلی پر مبنی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی وضع قطع، ہیئت اور لباس میں مسلمانوں کی مشابہت اختیار نہ کریں، کمر میں زنار باندھیں، لمبی ٹوپیاں پہنیں، گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، ہتھیار نہ لگائیں، گھوڑوں پر کاٹھیاں نہ ڈالیں، ان کے گھروں پر ایسی علامت ہو جس سے دور سے پتہ چل جائے کہ یہ غیر مسلم کا گھر ہے، وہ سور اور شراب نہ بیچیں، نئی عبادت گاہیں نہ بنائیں، ان کی گردنوں پر مہر لگائی جائے، جوتوں میں اون کے تسمہ ڈالیں، مسلمانوں کے برابر نہ چلیں، ان کی عورتیں بھی راستوں اور حماموں میں مسلمان عورتوں سے الگ رہیں، ان کی کنیت مسلمانوں جیسی نہ ہو، ان کی پیشانی سے بال کاٹ دیے جائیں۔ اپنے بالوں کی مانگ نہ نکالیں، ان پر راستہ تنگ کیا جائے، وہ اہل علم وزہد کے ساتھ مختص لباس نہ پہنیں، اپنی عمارتیں مسلمانوں سے زیادہ بلند نہ کریں وغیرہ وغیرہ[1]

1 - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: امام ابو یوسف، کتاب الخراج (فصل فی لباس اہل الذمۃ و زیہم) ص: ۱۲۸-۱۲۷ ؛ شافعی، محمد بن ادریس، امام، الام (مع مختصر المزنی) دار الفکر بیروت ۴/ ۲۰۹ ؛ مرغینانی، ہدایہ (مع اردو ترجمہ بنام عین الہدایہ) قانونی کتب خانہ لاہور، ۲/ ۵۸۰ ؛ حصکفی، الدر المختار (مع حاشیہ رد المحتار)، ۴/ ۲۰۶ ؛ کاسانی، بدائع الصنائع، ۷/ ۱۱۳ ؛ ابن قدامہ، المغنی ۸/ ۵۳۳ ؛ ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ) ص ۳۳۹ ؛ ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ ص ۱۴۳ ؛ ابو عبید، کتاب الاموال (عربی) ص ۳۰ ۳ (پیرہ نمبر ۱۳۴ تا ۱۴۰)= بیہقی، السنن الکبریٰ (کتاب الجزیۃ)، دار الفکر بیروت ۱۴/ ۴۴ ؛ القلقشندی، صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳/ ۳۶۳

امام ابو یوسف ؒ نے ہیئت ولباس کی مذکورہ بالا پابندیوں میں سے بعض کا ذکر کرتے ہوئے انہیں حضرت عمر فاروقؓ کی طرف منسوب کیا اور لکھا ہے:

ھکذا کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ امر عمالہ ان یاخذوا اھل الذمۃ بھذا الزی و قال حتی یعرف زیھم من زی المسلمین[1]

اسی طرح حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے عمال کو حکم دیا تھا کہ اھل الذمہ / غیر مسلم شہری اس ہیئت ولباس کی پابندی کریں تاکہ ان کی ہیئت و شکل مسلمانوں کی ہیئت سے ممتاز ہو۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عمال کو اھل الذمہ کی گردنوں پر مہر لگانے کی بھی ہدایت کی تھی[2]

اسی طرح ابو عبید ؒ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ "حضرت عمرؓ نے ذمیوں کے متعلق یہ حکم دیا کہ ان کی پیشانیوں کے بال کاٹ دیے جائیں اور جب وہ سوار ہوں تو نمدوں پر بیٹھیں اور سواری پر عرضا (ایک طرف دونوں پاؤں کر کے) بیٹھیں اور مسلمانوں کی طرح سواری پر نہ بیٹھیں۔ اور یہ کہ وہ اپنی پیٹیاں کس لیا کریں۔"لیعرف زیھم من زی المسلمین" تاکہ ان کی ہیئت مسلمانوں کی ہیئت سے علیحدہ ہو اور وہ دور سے پہچانے جائیں۔[3]

ابو عبید ؒ نے خلیفہ بن قیس سے مروی یہ روایت بھی درج کی ہے کہ

"حضرت عمرؓ نے کہا: اے یرفا! ملک کے تمام بڑے شہروں کے اھل کتاب باشندوں کے متعلق یہ ہدایت نامہ جاری کر دو کہ ان کی پیشانیوں کے بال کاٹ دیے جائیں نیز یہ کہ وہ اپنی کمر میں پیٹیاں (زنار) باندھیں تاکہ مسلمانوں کے طرز لباس سے ان کا طرز لباس جداگانہ حیثیت رکھے اور وہ پہچانے جاسکیں

---

[1] - کتاب الخراج (فصل فی لباس اہل الذمۃ وزیھم) ص ۱۲۷ = کتاب الاموال ص ۳۰ پیرہ نمبر ۱۳۷

[2] - حوالہ مذکورہ ص ۱۲۸ نیز ابو عبید کتاب الاموال ص ۳۰ (پیرہ نمبر ۱۳۶)

[3] - کتاب الاموال (عربی) ص ۳۰ (پیرہ نمبر ۱۳۷)

(لیعرف زیھم من زی اھل الاسلام)[1] (تاکہ ان کی ھیئت اہل اسلام کی ھیئت سے ممتاز ہو)

الغرض یہ وہ پابندیاں ہیں جن پر غیر مسلم تو اعتراض کرتے ہی ہیں، ایک مسلمان کو بھی یہ ناروا قسم کی پابندیاں کھٹکتی اور ناگوار گزرتی ہیں۔ اس لیے آئندہ سطور میں ان پابندیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

مخصوص ھیئت ولباس کی پابندی کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف محل نظر ہے

لباس وھیئت کے معالمے میں اہل الذمہ پر ان پابندیوں کے حوالے سے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ کی طرف ان کا انتساب ہی محل نظر ہے۔ چنانچہ مشہور مستشرق A. S. TRITTON کہتا ہے کہ امام ابویوسف (م ۱۸۲ھ) نے اھل الذمہ کے ساتھ حضرت عمر فاروق ؓ کے جن معاہدوں کا ذکر کیا ہے، جن میں ان پر لباس وھیئت کے معالمے میں مذکورہ پابندیاں لگائی گئیں مگر بلاذری اور طبری جیسے مستند مورخین نے ان معاہدوں میں اس قسم کی پابندیوں کا ذکر نہیں کیا۔ وہ لکھتا ہے:

> The treaties given by Tabri and Baladhuri do not mention dress. If, as is argued by Caetani in the case of Jerusalem, these treaties are later fabirications, the absence of any mention of dress makes one suspect even more strongly that Umar did not issue the commands.[2]

وہ معاہدے جن کا اندراج مورخ طبری اور بلاذری نے کیا ہے۔ ان میں اھل الذمہ کے مخصوص لباس کا ذکر نہیں۔ کاتانی نے یروشلم کے معالمے میں جو دلائل دیے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ پابندیاں بعد کی ملاوٹ ہیں۔ ان معاہدوں کے اندر لباس کے معالمے میں کسی قسم کا ذکر نہ ہونے سے اس امر کا قوی احتمال موجود ہے کہ حضرت عمر نے یہ ہدایات نہیں دی تھیں۔

---

[1] - حوالہ مذکور (پیرہ نمبر ۱۳۸)

[2] - The Caliphs and Their Non-Muslim subject (Chapter VIII - Dress) P. 115

حضرت عمر فاروقؓ کے حوالے سے اہل الذمہ پر اس قسم کی زیادہ تر پابندیوں اور شرائط کا تذکرہ اس معاہدہ میں ہے جو شام کے عیسائیوں نے وہاں کے عامل عیاض بن غنم کی وساطت سے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے کیا تھا۔ اس معاہدہ کے مطابق یہ شرائط عیسائیوں نے خود اپنے اوپر عائد کی تھیں۔ جنہیں امیر المومنین نے قبول کر لیا۔ لمبی چوڑی ذلت آمیز اور حد درجہ کمزوری لاچاری کی حامل شرائط پر یہ معاہدہ کئی فقہاء و محدثین نے نقل کیا ہے،[1] مگر یہ معاہدہ بعض شواہد اور درایت کی بنیاد پر محل نظر اور مشکوک ہے۔ مثلاً

۱۔ نبی رحمت ﷺ نے سینٹ کیتھرائن کے راہبوں کو جو عہد نامہ عنایت فرمایا تھا (جس کی تفصیل باب ششم میں گزر چکی ہے) اس میں آں جناب ﷺ نے راہبوں کو زیر بحث معاہدے میں درج قسم کی شرائط کا پابند کرنے کی بجائے انہیں متعدد مراعات دیں اور جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی۔

۲۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد حکومت میں اہل ایلیاء (فلسطین) سمیت متعدد غیر مسلموں / اہل الذمہ سے معاہدے فرمائے جن میں سے بعض کی تفصیل گذشتہ ابواب میں گزر چکی ہے، ان میں کسی بھی معاہدے کے اندر اس قسم کی شرائط موجود نہیں۔

۳۔ زیر بحث معاہدہ کی بعض شرائط بھی اس معاہدہ کو مشکوک ٹھہراتی ہیں مثلاً اس میں ہے کہ عیسائیوں نے کہا: "و لا نعلم اولادنا القرآن" ہم اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم نہیں دیں گے۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ "و لا نتکلم بکلامھم" ہم ان کی زبان (عربی) نہیں بولیں گے۔ تو ان دونوں شرطوں کا جواز سمجھ نہیں آتا۔ قرآن کا تو خود مطالبہ ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اس میں غور و فکر کیا جائے۔ (اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔[2]

---

[1] - دیکھئے: شافعی، الام (مع مختصر المزنی) دار الفکر بیروت ۴/۲۰۹؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ)، دار الفکر بیروت ۱۴/۴۴؛ ابن قدامہ، المغنی، ۸/۵۳۲؛ قلقشندی، صبح الاعشی، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳/۳۶۳

[2] - محمد، ۴۷:۲۴

اور اسی طرح ارشاد الٰہی ہے: وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ[1]

ترجمہ: "اور اگر کوئی مشرک آدمی آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیجئے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام (قرآن) سن سکے پھر اسے اپنے وطن پہنچا دیجئے۔"

تو ان آیات کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ ان پر تعلیم قرآن حاصل نہ کرنے کی پابندی لگا دیں۔ اسی طرح عربی زبان سیکھنے پر پابندی لگانے کا شرعی اعتبار سے کوئی جواز نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس اسلامی تاریخ میں اہل الذمہ پر اس قسم کی ناروا اور شریعت کے عمومی مزاج اور پالیسی کے خلاف کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ درج بالا شواہد اور وجوہات کی بنا پر زیر بحث معاہدہ کی صحت اور حضرت عمرؓ کی طرف نسبت مشکوک اور محل نظر ہے۔

مخصوص لباس صرف امتیاز کے لئے تھا نہ کہ تحقیر کے لئے

علی سبیل التنزل امام ابو یوسفؒ اور دوسرے فقہاء و علماء سیاست اور مورخین کی صراحت کے مطابق اگر اہل الذمہ کیلئے لباس و ہیئت کے معاملے میں ان پابندیوں کو درست اور حضرت عمرؓ کی طرف ان کا انتساب صحیح بھی مان لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ درج بالا ہیئت و لباس وغیرہ کی پابندیاں بنیادی طور پر (جیسا کہ بعض مذکورہ تصریحات سے بھی مترشح ہوتا ہے) محض امتیاز اور پہچان کے نقطہ نظر سے لگائی گئی تھیں نہ کہ ان کی تذلیل و تحقیر کی نیت سے۔ اگر کسی فقیہ نے ان پابندیوں سے مقصود ان کی اہانت و حقارت سمجھا ہے تو یہ اس کا ایک اجتہاد ہے۔ قرآن و حدیث کی کوئی نص نہیں۔ اہل الذمہ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات میں کوئی ایسی چیز ہے نہ آپ کے اسوہ سے ثابت ہے۔ نہ تاریخ اسلام میں اس بات کی کوئی شہادت نظر آتی ہے کہ خلفاء اسلام نے پکڑ پکڑ کر اہل الذمہ کی پیشانیوں کے

---

[1] - التوبہ، ۹:۶

بال کاٹے ہوں۔ اس قسم کے احکام صرف انتظامی، وقتی، عارضی اور مطلق پہچان کے لئے تھے۔ جس کی بعض مواقع پر ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ علامہ ابن قیمؒ نے زیر بحث مسئلہ میں لکھا ہے:

"جہاں تک ان کی امتیازی حیثیت ولباس کا تعلق ہے تو عہد نبوی میں ان پر اس طرح کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کی بنیاد حضرت عمرؓ کا ایک حکم ہے جس کا پس منظر یا اجرائے حکم کا سبب یہ ہے کہ امیر کوفہ خالد بن عرفطہ کے پاس ایک نصرانی عورت آئی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اس کے عیسائیت چھوڑنے کے باعث اس پر تشدد کر رہا ہے اور اس دعوی (الزام) پر اس نے گواہی بھی پیش کر دی۔ جس پر خالد نے اس کے خاوند کو بلا کر پٹائی کے ساتھ اس کا سر بھی سزا کے طور پر منڈا دیا اور دونوں میاں بیوی کے درمیان تفریق بھی کر دی۔ اس نصرانی نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو اس بات کی شکایت کی تو آپ نے خالد سے اس معاملے کی تحقیق اور باز پرس کی۔ اصل صورت حال معلوم ہونے پر آپ نے فرمایا: "الحکم ما حکمت به" اس جرم کا فیصلہ وہی ہے جو تو نے کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے تمام شہروں کے حکام کی طرف لکھ بھیجا کہ یہ اہل الذمہ آئندہ اپنی پیشانیوں کے بال کٹوا کر رکھیں اور مسلمانوں جیسا لباس نہ پہنیں تاکہ لوگوں کے درمیان پتہ چل سکے کہ مسلمان کون ہے اور غیر مسلم کون"[1]

اسی طرح مدائن کے عامل حضرت حذیفہ نے ابووائل نامی ذمی کے خراج ادا نہ کرنے پر بطور سزا اس کا سر مونڈا دیا جس سے مقصود محض تنبیہ تھا کیونکہ سر منڈانا ان کے نزدیک بڑا اہم معاملہ یا مثلہ کے مترادف تھا۔[2] جبکہ علامہ کاسانی نے ان پابندیوں کا بنیادی سبب یہ روایت قرار دیا ہے کہ "حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا گزر کچھ ایسے گھڑ سواروں پر ہوا جو اپنی ظاہری حیثیت سے معززین لگتے تھے۔ آپ نے انہیں مسلمان گمان کرتے ہوئے سلام کہا۔ اس پر آپ کے ساتھیوں میں سے ایک آدمی نے کہا: اللہ آپ کی اصلاح فرمائے کیا آپ جانتے ہیں یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ بنو تغلب

---

[1] - احکام اہل الذمہ، ۱/ ۱۸۳

[2] - ابو عبید، کتاب الاموال (عربی) ص ۳۰ (پیرہ نمبر ۱۳۵)

سے تعلق رکھنے والے عیسائی ہیں۔ جب آپ اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے تو ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں اس بات کا اعلان کر دے کہ آئندہ ہر نصرانی اپنی پیشانی کے بال باندھ کر رکھے اور گدھے کے پالان پر سوار ہو۔ ان کے اس حکم پر کسی عالم نے اعتراض نہیں کیا تو یہ حکم بمنزلہ اجماع ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سلام شعائر اسلام میں سے ہے اور مسلمان باہمی ملاقات کے وقت اس شعار کے اظہار کے پابند ہیں۔ اور یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اہل الذمہ کسی مخصوص پہچان کے ذریعے ممتاز نہ ہو جائیں"[1]

کاسانی کی اس روایت سے یہ بات بھی اخذ کی جاسکتی ہے کہ کم از کم حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ حکومت (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) تک مسلمانوں اور ذمیوں کے لباس اور ظاہری ہیئت میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا ورنہ خلیفہ کو ان کے پہچاننے میں کوئی مغالطہ نہ لگتا، دوسرے ان پابندیوں کے عائد کرنے کا حکم حضرت عمر فاروقؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے دیا تھا، جسے علامہ کاسانی کے بقول "بمنزلہ اجماع" قرار دیا گیا۔

علامہ ابن عابدینؒ نے ہیئت ولباس کی مذکورہ پابندی کی یہ وجہ وحکمت بتائی ہے کہ "جب اہل الذمہ اہل اسلام کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی کوئی امتیازی علامت ہو تاکہ ان کے ساتھ عزت و بزرگی کے اعتبار سے مسلمان کا معاملہ نہ کیا جائے اور یہ چیز شرعی لحاظ سے جائز نہیں اور بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی اچانک راستے میں حادثاتی طور پر مر جاتا ہے اور جب اس کی پہچان نہیں ہو پاتی تو اس پر نماز جنازہ پڑھ دی جاتی ہے۔ (جو مسلمان کے ساتھ خاص ہے)"[2]

علامہ مرغینانیؒ نے بھی اہل الذمہ کیلئے لباس وہیئت میں امتیاز کی پابندی کی بڑی وجہ یہی بتائی ہے کہ "اگر انکی کوئی امتیازی علامت نہ ہو گی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے اور یہ

---

[1] - بدائع الصنائع ۷/۱۱۳

[2] - رد المحتار (مع الدر المختار) ۴/۲۰۶ (مطلب فی تمییز اہل الذمۃ فی الملبس)

چیز شرعاً جائز نہیں"[1]

المختصر یہ پابندیاں ان کی پہچان کیلئے اور وقتی تقاضوں کے پیش نظر تھیں۔ حضرت عمرؓ کے حوالے سے امام ابویوسفؒ اور ابوعبیدؒ کی بیان کردہ مذکورہ ہدایات (حتی یعرف زیهم من زی المسلمین) سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ اسی لیے علامہ کاسانیؒ ان پابندیوں کی تفصیل سے قبل ان کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان اهل الذمة یوخذون باظهار علامات یعرفون بها و لا یترکون یتشبهون بالمسلمین فی لباسهم و مرکبهم و هیئتهم"[2]

بیشک اھل الذمہ کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ ایسی علامات اختیار کریں جن سے وہ دور سے پہچانے جائیں۔ انہیں اپنے لباس اپنی سواری اور اپنی ظاہری حیثیت میں مسلمانوں کیساتھ مشابہت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ علامہ قرطبی نے بھی ان پابندیوں کی یہی غرض وغایت بتائی ہے۔[3]

مستشرق اے۔ ایس ٹریٹن نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے اھل الذمہ پر لباس وحیئت کی پابندی انکی تحقیر کیلئے نہیں بلکہ محض پہچان کی خاطر تھی۔ وہ ذمی رعایا پر لباس کی پابندی بارے لکھتا ہے:

The object of the rules about dress was to distinguish the Christians from the Arab; this is definitely stated by both Abu Yusuf and Ibn Abd ul Hakeem, Two of the earliest writers whose works have come down to us. At the time of conquest there was no need to command the Christians to dress differently from the Arabs, they did so. It was only later, as the Arabs grow

---

[1] - الہدایہ مع الدرایہ (کتاب السیر) ۲/ ۵۸۲

[2] - بدائع الصنائع ۷/ ۱۱۳

[3] - دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن ۸/ ۱۱۳

civilized, that there was any temptation for their subjects to imitate their costume."[1]

لباس کے حوالے سے ان قوانین کا مقصد صرف عیسائیوں کو عربوں سے ممتاز کرنا تھا۔ یہ بات دو قدیم ترین مصنفین ابو یوسف اور ابن عبد الحکیم جن کا علمی کام ہم تک پہنچا ہے، نے پورے وثوق و یقین سے بیان کی ہے۔ فتح کے وقت اس چیز کی ضرورت نہ تھی کہ عیسائیوں کو یہ ہدایت دی جاتی کہ وہ عربوں سے مختلف لباس پہنیں۔ اور اس لیے انہوں نے ایسا کیا۔ اس امتیازی لباس کی ضرورت بعد میں پیش آئی۔ جب عرب تہذیب یافتہ ہو گئے تو ان کی غیر مسلم رعایا کیلئے اس بات کی ترغیب ہو سکتی تھی کہ وہ ان کے لباس کی نقل اتارے۔

ظاہری ہیئت و لباس کے حوالے سے اھل الذمہ پر لگائی گئی حضرات عمرین (حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ) کی ان پابندیوں کی حیثیت محض انتظامی ہونے اور ان کی کوئی شرعی و قانونی حیثیت نہ ہونے پر یہ بات دلیل ہے کہ فقہاء اسلام نے (جیسا کہ باب سوم میں گزرا) انہیں غیر ضروری شرائط میں شمار کیا ہے جن کی خلاف ورزی پر عقد ذمہ کے بعد معاہدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ علامہ ماوردی فرماتے ہیں: اھل الذمہ پر عقد ذمہ کے بعد جزیہ کے ساتھ ساتھ دو شرطیں اور بھی عائد ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ضروری ہے جبکہ دوسری غیر ضروری۔ ضروری شرط میں چھ امور داخل ہیں۔

(۱) کتاب اللہ پر طعن یا اس کی تحریف کے مرتکب نہ ہوں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب و توہین نہ کریں۔

(۳) اسلام کی مذمت اور اس پر اعتراض نہ کریں۔

(۴) مسلمان عورت سے زنا کے مرتکب ہوں نہ اس سے نکاح کا نام لیں۔

(۵) کسی مسلمان کو مذھب سے ورغلائیں نہ اس کے مذھب و مال سے کوئی تعرض کریں۔

---

[1] - The Caliphs and Their non-Muslim Subjects, (Chapter VIII) P.115

(۶) اہل حرب کی اعانت کریں نہ ان کے دولتمندوں سے رابطہ رکھیں۔

یہ چھ امور بلاشرط کے بھی واجب العمل ہیں۔ شرط محض اطلاع اور عہد کی تاکید اور تغلیظ کیلئے کی جاتی ہے۔ شرط کے بعد اگر ان میں سے کسی کی پابندی نہ کی گئی تو عہد ٹوٹ جائے گا۔ جبکہ غیر ضروری شرط میں بھی چھ امور داخل ہیں:۔

(۱) خاکی لباس اور زنار پہن کر اپنی حیثیت ممتاز رکھیں۔

(۲) اپنی عمارتیں مسلمانوں سے بلند نہ کریں زیادہ سے زیادہ ان کے مساوی رکھیں۔

(۳) اپنے ناقوس اور اپنی کتابوں کی آواز مسلمانوں کو نہ سنائیں نہ ان کو مسیح و عزیر علیہما السلام کی بابت اپنے خیالات بتائیں۔

(۴) علی الاعلان شراب نوشی کریں نہ صلیب اور خنزیر کا اظہار کریں۔

(۵) اپنے مردوں کو خاموشی سے دفن کریں شور اور نوحہ نہ کریں۔

(۶) عمدہ اور اصیل گھوڑوں پر سوار نہ ہوں۔ خچروں اور گدھوں پر سوار ہونے کی ممانعت نہیں ہے۔

یہ چھ امور داخل معاہدہ نہیں۔ شرط کرنے سے لازم ہوتے ہیں۔ شرط کے بعد ان کے ارتکاب سے نقض عہد لازم نہ آئے گا مگر تادیبا مواخذہ و گرفت ضرور کی جائے اور شرط نہ کی گئی ہو تو مواخذہ بھی نہ کیا جائے۔"[1]

قاضی ابو یعلی نے بھی الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ ان شرائط کے بارے یہی بات لکھی ہے۔[2]

جبکہ علامہ قرافی نے بھی یہی لکھا ہے کہ لباس وغیرہ کے حوالے سے پابندیوں کی خلاف ورزی پر معاہدہ نہیں ٹوٹتا۔[3]

---

[1] ۔ الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ از ڈاکٹر عبد المالک عرفانی) ص ۲۴۹

[2] ۔ دیکھئے الاحکام السلطانیہ (عربی) ص ۱۴۳-۱۴۴

[3] ۔ الفروق ۳/۲۴

یہی وجہ ہے کہ بعض غیر مسلم بڑا قیمتی اور فاخرانہ بلکہ شاہانہ لباس پہن کر صرف مسلمان معاشرے میں ہی نہیں گھومتے تھے، خلفاء اسلام کے درباروں میں بھی اسی شاہانہ کروفر سے جاتے تھے اور ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مشہور مستشرق اے۔ ایس۔ ٹریٹن غیر مسلم رعایا کے "Dress"(لباس) کی بحث میں لکھتا ہے:

The historians do not often speak of the dress of the dhimmis, but a few details are given. The Christians poet al Akhtal wore silk, with a gold cross round his neck, and rode to the gate of a mosque on a horse, and in this guise he came into the presence of the caliph.[1]

مورخین ذمیوں کے لباس کے بارے میں اکثر کوئی ذکر نہیں کرتے تاہم چند تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ عیسائی شاعر اخطل گلے میں سنہری صلیب لٹکا کر اور سلکی لباس میں ملبوس گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد کے دروازے پر جاتا اور اسی شاہانہ ہیئت و لباس میں خلیفہ کی موجودگی میں دربار کے اندر جاتا۔

غیر مسلم رعایا پر لباس و ہیئت کے معاملے میں یہ پابندی چونکہ ایک انتظامی ضرورت تھی نہ کہ کوئی شرعی مسئلہ اس لیے عموماً اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ٹریٹن اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ

The general laws were never repealed, but were usually disregarded unless the zeal of some ruler, or an outburst of popular feeling, caused them to be put in force again.[2]

اهل ذمہ کے لباس کے معاملے میں یہ قوانین اگرچہ کبھی بالکل منسوخ تو نہیں کیے گئے تاہم عموماً ان کا چنداں خیال نہیں رکھا گیا۔ الا یہ کہ کسی حکمران کے مذہبی جوش یا لوگوں کے دباؤ نے حکمرانوں کو ان قوانین کے دوبارہ اجراء پر مجبور کر دیا ہو۔

[1]- The Caliphs and Their non-Muslim Subjects P. 115-116

[2]- Abid P. 121

اسی طرح The Encyclopaedia of Islam کے مستشرق مرتبین نے ان پابندیوں کے غیر ضروری ہونے کے بارے میں لکھا ہے!

"In fact it would appear that these regulations, often variable in their detail, had never been respected for any length of time......and it is even doubtfull whether there was any real desire to apply them outside Baghdad and great islamic centres.[1]

غیر مسلم شہریوں پر لباس و ہیئت کے حوالے سے پیدا ہونے والے اعتراض کا جواب علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق، سیرۃ النعمان اور مقالات شبلی (مذہبی) میں تفصیل سے دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بلاشبہ یہ حضرت عمرؓ کے احکام ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ احکام ذمیوں کی تحقیر کی وجہ سے صادر ہوئے تھے، سخت غلطی ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب اکثر متاخرین فقہاء نے کیا ہے۔ بے شبہ حضرت عمرؓ کا ایک طبعی مذاق تھا کہ وہ قومی امتیاز کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اہل فوج کو اکثر فرمانوں میں لکھا ہے کہ "وہ جاڑوں میں دھوپ کھانا چھوڑیں، گھوڑوں پر رکاب کے سہارے سوار نہ ہوں، موٹے کپڑے استعمال کریں" جس سے مقصد یہ تھا کہ اہل عرب اپنے ملک اور وطن کی خصوصیتوں کو محفوظ رکھیں۔ اسی بنا پر انہوں نے اہل عجم کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، تاکید کی وہ اپنی قومی خصوصیتوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اہل عجم زمانہ اسلام سے پہلے زنار باندھتے تھے، لمبی لمبی ٹوپیاں اوڑھتے تھے۔ ان کے زین آج کل کے انگریزی زینوں کے مشابہ ہوتے تھے ان کی عورتیں اونٹوں پر سوار نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ انہی رسوم و عادات کی نسبت حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اہل ذمہ اس کی پابندی کریں۔ یہی احکام امام ابو حنیفہ اور قاضی ابو یوسف نے قائم رکھے جن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دونوں قومیں اپنی اپنی خصوصیات قائم رکھیں۔"[2]

---

[1]- The Encyclopaedia of islam (New Edition) leiden Ej.Brukk 1986, V.II P .228

[2]- سیرۃ النعمان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲/۲۱۵-۱۴

علامہ شبلی نعمانی نے "زنار" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

زنار جس کا ذکر حضرت عمرؓ کے فرمان میں ہے، اس کی نسبت ہمارے فقہاء نے اکثر غلطیاں کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ انگلی برابر موٹا ایک قسم کا جنیو ہوتا تھا اور اس سے ذمیوں کی تحقیر مقصود تھی۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ زنار کے معنی پیٹی کے ہیں اور عرب میں یہ لفظ آج بھی اس معنی میں مستعمل ہے۔[1]

علامہ موصوف نے اس ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور نے اپنے دربار کیلئے جو لباس تجویز کیا وہ قریب یہی لباس تھا۔ اگر یہ لباس تحقیر کیلئے ہوتا تو خلیفہ منصور اس کو اپنا اور اپنے درباریوں کا لباس کیونکر قرار دے سکتا تھا۔[2]

مولانا سید مودودی نے بھی اھل الذمہ پر لباس کی پابندیوں کی وضاحت میں شبلی نعمانی سے ملتا جلتا موقف اپنایا ہے۔[3] البتہ اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ

"علاوہ بریں اس میں قانونی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے لئے شراب پینا، رکھنا اور بیچنا فوجداری جرم ہے اور ذمیوں کیلئے یہ جرم نہیں ہے۔ اب اگر ایک مسلمان ذمیوں کے مشابہ لباس پہنے تو وہ پولیس کے مواخذہ سے بچ سکتا ہے اور اگر ایک ذمی مسلمانوں کے مشابہ بن کر رہے تو وہ پولیس کی گرفت میں آسکتا ہے۔[4]

مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: شبلی نعمانی، الفاروق ۲/ ۲۷۰-۲۶۸؛ مقالات شبلی (مذہبی) ۲/ ۲۰۸-۱۱۲

[1] - الفاروق ۲/ ۲۶۹

[2] - حوالہ مذکور ۲/ ۲۷۰

[3] - دیکھئے: اسلامی ریاست ص ۴۸۵

[4] - حوالہ مذکور ص ۴۸۶

مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک اھل الذمہ پر صرف فوجی لباس نہ پہننے کی پابندی تھی نہ کہ لباس اور مخصوص ھیئت کے معاملے میں کوئی دوسری پابندی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"دوسری بات یہ ہے کہ ذمیوں کو منع کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس استعمال کریں۔ اس حکم کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ذمی عام طور پر فوجی لباس پہننے لگ گئے تھے۔ جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں اور مزید غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس وجہ سے انتظامی طور پر ان کو اس سے روکا گیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے ذمیوں سے جو شرط کی تھی، اس کے الفاظ یہ ہیں: " ولهم كل ما لبسوا من الزي الا زي الحرب "[1] (یہ لوگ فوجی لباس کے سوا ہر لباس اختیار کر سکتے ہیں)

ظاہر بات ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنے فوجیوں کی وردی کے عام استعمال کی اجازت لوگوں کو نہیں دیا کرتی۔ اس وجہ سے اگر اسلامی حکومت نے بھی اس قسم کا کوئی حکم دیا تو اس نے دنیا کے معروف اور مسلم طریقوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔"[2]

مخصوص لباس شناختی کارڈ اور گردن پر مہر ادائیگی جزیہ کی رسید تھی

اھل الذمہ کے مخصوص لباس اور ہیئت کے معاملے میں مصری فقیہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی درج ذیل وضاحت عقل کو اپیل کرتی ہے:

"اس زمانے مذھب کی بنیاد پر لوگوں کے مابین یہ فرق بہت ضروری تھا اور خود ان مذاھب کے پیروکاروں کی خواہش بھی یہی تھی۔ لباس کے علاوہ لوگوں میں تمیز کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ چونکہ شناختی کارڈ جس میں فرد کا نام لقب اور دین و مذھب لکھا جاتا ہے، ان لوگوں کے ہاں موجود نہیں تھا لہذا لوگوں میں تمیز کرنے کی ضرورت کے باعث ہی مسلم حکام اس طرح کی ہدایات جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس لیے ہمیں اپنے زمانے میں کوئی ایسا مسلمان فقیہ نظر نہیں آتا جو لباس کی تفریق کو متقدمین کی طرح واجب سمجھتا ہو

---

1 - ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۷۵

2 - مولانا اصلاحی، اسلامی ریاست ص ۲۱۸-۲۱۷

کیونکہ آج کل اس کی ضرورت نہیں۔[1]

اس قاعدے کے محرکات کے بارے میں ڈاکٹر خربوطلی کی پیش کردہ توجیہہ یہاں نقل کرنا مفید ہو گا۔ "ہماری رائے یہ ہے کہ اگر ہم مباحثے کی خاطر یہ فرض کر بھی لیں کہ دونوں خلفاء (حضرت عمر فاروقؓ اور عمر بن عبد العزیزؒ) کی جانب سے اس نوعیت کی کوئی ہدایات جاری کی بھی گئیں تو اس میں کوئی اشکال نہیں کہ لباس کا یہ تعین معاشرتی زندگی کے سیاق میں کیا گیا جس کا واحد مقصد مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں تمیز کرنا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم تاریخ کے اس ابتدائی دور کی بات کر رہے ہیں جب شناختی کارڈ موجود نہیں تھے۔ لہذا لباس ہی ایک ایسی چیز تھی جس کے ذریعے لوگوں کا دین ظاہر ہوتا تھا۔ مسلمان عربوں کا اسی طرح مخصوص لباس تھا جس طرح کہ نصاری و یہود اور مجوسیوں کے ہاں تھا۔ اگر مستشرقین لباس کے رنگ یا شکل کے تعین کو تشدد کا مظہر سمجھتے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں تشدد کے شکار مسلمان اور ذمی مساوی طور پر ہوئے کیونکہ جب خلفاء نے مسلمانوں کو دوسروں کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا تو منطقی طور پر غیر عرب اور غیر مسلم افراد کو عربوں اور مسلمانوں کی مشابہت سے روکا گیا"[2]

جہاں تک اھل الذمہ کی گردنوں میں مہر لگانے کا تعلق ہے تو یہ چیز بھی ان کی تذلیل یا تحقیر کیلئے نہ تھی بلکہ ایک وقتی اور انتظامی ضرورت تھی اور محض یہ معلوم کرنے کے لئے تھی کہ کون آدمی جزیہ ادا کر چکا ہے اور کس کے ذمہ ادائیگی ابھی باقی ہے اور ادائیگی کے بعد توڑ دی جاتی تھی یہ ایسی چیز نہ تھی جسے صرف مسلمان حکمرانوں نے اپنایا ہو بلکہ ان سے پہلے روم کے بازنطینی حکمران بھی اسی طرح کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر علی حسنی خربوطلی لکھتے ہیں:

"جزیہ کی ادائیگی کے وقت بازنطینی رومیوں کی پیروی میں گردنوں پر مہر کا طریقہ جو مسلمانوں نے اختیار کیا، تشدد یا تذلیل کی علامت نہیں بلکہ یہ جاننے کا ایک ذریعہ تھا کہ ٹیکس کس نے ادا کر دیا اور کس نے نہیں۔

---

[1] ۔ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی ص ۶۷

[2] ۔ الاسلام و اھل الذمۃ (ملابس اھل الذمۃ) المجلس الاعلی للشؤن الاسلامیہ، قاہرہ، ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء، ص: ۸۶

چونکہ اس وقت طباعت نہ تھی اس لیے جزیہ کی ادائیگی ثابت کرنے والی اور جعلسازی کے امکانات سے مبرا رسیدیں بنانا اس وقت ممکن نہ تھا۔ اسی لیے بعض ایشیائی اور افریقی ممالک بیسویں صدی میں بھی انتخابات کے اندر یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ووٹ دہندگان کے ہاتھوں پر ایک طرح کی مہر لگادی جاتی ہے تاکہ کوئی شخص ایک سے زیادہ مرتبہ ووٹ نہ ڈال سکے اور یہ مہر دو تین دن سے پہلے ہاتھوں سے زائل نہیں ہوتی۔"[1]

یہ پابندی حضرت عمرؓ کا اجتہادی و انتظامی فیصلہ تھا نہ کہ شرعی حکم

ہم زیر بحث مسئلے کا اصول فقہ کے پہلو سے بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ اہل الذمہ پر ہیئت و لباس کی مذکورہ پابندیوں کا فیصلہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی اور انتظامی فیصلہ تھا۔ یہ قرآن وسنت کا کوئی منصوص فیصلہ نہیں۔ اور اہل علم سے مخفی نہیں کہ اجتہادی احکام کا تعلق خاص حالات، واقعات، عرف وعادت، رسم ورواج اور کسی عہد کے مخصوص ضرورتوں سے ہوتا ہے جن کے تبدیل ہونے سے وہ اجتہادی احکام جو ان مخصوص احوال و ظروف اور ضرورتوں سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، اصولیین نے اس صورت حال کو مشہور فقہی ضابطے "لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان" کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ علامہ ابن عابدین اپنے مشہور رسالہ "نشر العرف" میں فرماتے ہیں:

> "بہت سے احکام جنہیں مجتہد اپنے دور کے حالات کے پیش نظر بیان کرتا ہے، زمانے کے تغیر، لوگوں کے عرف کی تبدیلی، نئی ضرورت کے پیدا ہو جانے یا ان لوگوں میں فساد در آنے کے باعث تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان تبدیلیوں کے باوجود اگر وہی پہلا حکم باقی رہے تو لوگوں کو مشقت اور ضرر کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ان قواعد شرعیہ کی مخالفت لازم آئے گی جن کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے لئے تخفیف وتیسیر پیدا کی جائے اور ضرر وفساد دور کیا جائے تاکہ قانونی نظام عمدہ قوانین واحکام پر مبنی رہے۔ اسی وجہ

---

[1] - الاسلام واھل الذمہ ص ۷۲ (الفصل الرابع۔ طریقۃ جمع الجزیۃ وموعدھا)

سے ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء مذاہب بہت سے مواقع پر اپنے امام مجتہد کی اس رائے کے خلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں جو مجتہد نے اپنے دور میں قائم کی تھی۔ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر امام مجتہد آج کے دور میں ہوتے تو اپنے مذہبی قواعد کی بنا پر یہی رائے اختیار کرتے"[1]

مصالح، حالات اور ضرورت کے تبدیل ہو جانے سے تو منصوص احکام کی تبدیلی کی مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً قربانی کے گوشت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

نهيتكم من اجل الدافة التي دفت فكلوا وادخروا وتصدقوا۔[2]

میں نے تمہیں عمومی تنگدستی کی وجہ سے قربانی کا گوشت (تین دن سے زیادہ) ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا مگر اب تمہیں اجازت ہے کہ کھاؤ، ذخیرہ کرو یا بانٹ دو۔

غیر مسلموں کی ہیئت ولباس پر پابندیوں کے مذکورہ بالا احکام اور فقہی آراء اس زمانے کی ہیں جب عالم اسلام کو سیاسی اعتبار سے ساری دنیا پر غلبہ حاصل تھا۔ بڑی بڑی طاقتیں ممالک اور اقوام مسلمانوں کے زیر نگیں تھے۔ اب حالات بالکل اس صورت حال کے برعکس ہیں۔ سارے مسلمان ممالک بظاہر آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود سیاسی مغلوبیت بلکہ محکومیت کی جس انتہاء کو پہنچ ہوئے ہیں اور اسلامی ممالک کی حکومتوں کی تشکیل میں غیر مسلم طاقتوں کی مداخلت اور عراق، افغانستان وغیرہ میں کھلم کھلا جارحیت حتی کہ "جامہ تلاشی" تک کی نوبت محتاج وضاحت نہیں۔ ایسے حالات میں مذکورہ فقہی آراء کے جواز کا کوئی عالم بھی قائل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] - ابن عابدین، مجموعہ رسائل ابن عابدین، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء، ۲-۱۲۵/۱۲۶؛ نیز دیکھیے کتاب ہذا (رسالہ عقود رسم المفتی)، ۱/۴۵

[2] - مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الاضاحی باب بیان ما کان من النہی عن اکل لحوم الاضاحی)، ۲/۱۵۸، رقم: ۵۱۰۳

تیسری فصل

مذھبی تبلیغ واجتماع پرپابندی-غلط فہمی کا تجزیہ وازالہ

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / اھل الذمہ کے ساتھ اسلامی حکومت کے طرز عمل سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی یا پیدا کی جاتی ہیں، ان میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اظہار رائے وخیال اور دینی ومذھبی تبلیغ واجتماع کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس غلط فہمی کے ازالہ کیلئے اصولی بات یہ ہے کہ جب اسلام نے غیر مسلم شہریوں / اھل الذمہ کو عقیدہ ومذھب کے معاملے میں آزادی اور اپنی مذھبی عبادات ومراسم ادا کرنیکی اجازت دی ہے (جیسا کہ باب ششم میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔) تو وہ انہیں اپنے عقیدہ ومذھب کے حوالے سے اپنی رائے کے اظہار اور قانونی دائرے اور متعین ضوابط کی حدود میں اپنی مذھبی تبلیغ واجتماع پر جو مذھبی آزادی کا ایک لازمی حصہ ہے، کیوں کر پابندی لگائے گا؟ قرآن وسنت کی کوئی ایسی نص نظر نہیں آتی اور نہ کوئی ایسی شرعی ہدایت دکھائی دیتی ہے جس میں اھل الذمہ پر رائے کے اظہار اور مذھبی وغیر مذھبی اجتماع پر پابندی عائد کی گئی ہو۔ اسلام ہر شخص کو اپنے عقیدہ کے مطابق تبلیغ، اشاعت اور پروپیگنڈہ کی اجازت دیتا ہے۔ خواہ تقریر کے ذریعے یا تحریر کے ذریعے۔ لیکن چونکہ اسلام ایک بااخلاق اور چند اخلاقی ضابطوں کا پابند نظام حیات ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں وہ اپنے تمام مسلم وغیر مسلم شہریوں پر کچھ اخلاقی اور قانونی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے اور یہ پابندیاں بھی دوسروں کے جذبات واحساسات عزت نفس اور جان ومال کے تحفظ کیلئے عائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تقریر یا تحریر کے ذریعے کسی کے جذبات کو مجروح نہ کیا جائے۔ اپنے عقیدہ کی تبلیغ وترویج کیلئے دوسروں کے مذھبی پیشواؤں یا ان کے نزدیک مقدس ہستیوں کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ اس نے مشرکوں کے بتوں کو بھی جنہیں وہ معبودان باطل سمجھتا ہے، برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ اہل اسلام کو ہدایت فرمائی گئی:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔[1]

اور نہ گالی دو ان بتوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی جہالت کے باعث دشمنی میں اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مذہبی تبلیغ میں اسلام پر طعن و تشنیع کی اجازت نہیں

تبلیغ مذھب اور تقریر و تحریر اور اظہار رائے کی آزادی میں یہی ضابطہ اھل الذمہ پر بھی عائد ہو گا ۔ انہیں اجازت ہے کہ وہ اپنے مسائل و معاملات میں جن امور کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اپنی رائے کا انفرادی یا اجتماعی طور پر اظہار کریں اور اپنی آواز یا مطالبات حکومت تک پہنچائیں۔ اپنے عقیدہ و مسلک کی خوبیاں اجاگر کریں تاہم اظہار رائے کے معاملے میں انہیں یہ احتیاط بہر کیف کرنا ہو گی کہ وہ اسلامی معتقدات و دینی شعائر کے بارے میں زبان درازنہ کریں۔ کیونکہ اسلامی ریاست کے ساتھ ان کا معاہدہ ہے۔ اور معاہدین کے حوالے سے قرآن کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۔[2]

اور اگر یہ لوگ اپنی قسموں کو اپنے عہد کے بعد توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم جنگ کرو (ان) پیشوایان کفر سے کہ (اس صورت میں) انکی قسمیں باقی نہیں رہیں تا کہ یہ لوگ باز آجائیں۔

طعن کے لغوی معنی نیزہ مارنے اور چبھانے کے ہیں۔[3] طعن کا اطلاق سنجیدہ، علمی، عقلی اختلاف

---

[1] ۔ سورۃ الانعام ٦: ١٠٨

[2] ۔ سورۃ التوبۃ ٩: ١٢

[3] ۔ بلیاوی، مصباح اللغات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ص ٥١١ (مادہ طعن)

رائے و عقیدہ پر نہیں ہوتا۔ طعن کہتے ہیں ایسی بات کو جو دل کو چھید دے اور زخمی کر دے۔ دین میں طعن سے مقصود عموماً تحقیق نہیں ہوتی بلکہ دین کی توہین اور اہل دین کی دل آزاری ہوتی ہے۔ اپنے مذہب کی تبلیغ اور چیز ہے اور دوسرے دین کی توہین اور اہل دین کی دل آزاری دوسری چیز ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک ذمی جس وقت دین اسلام پر زبان طعن دراز کرتا ہے تو اس کا عقد ذمہ ٹوٹ جاتا اور اس کا قتل جائز ہو جاتا ہے۔[1]

عام حنفی فقہاء اگرچہ طعن فی الدین (ذات باری تعالیٰ، قرآن مجید، رسول خدا اور دیگر شعائر اسلام کی توہین و تنقیص اور سب و شتم) کو عقد ذمہ ٹوٹنے کا سبب تسلیم نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ "طعن فی الدین" کی حیثیت کفر پر کفر کی زیادتی کی ہے۔ جب عقد ذمہ میں ہم نے ان کے اصل کفر کو قبول کرتے ہوئے ان سے معاہدہ کر لیا تو کفر کی زیادتی سے بھی معاہدہ نہیں ٹوٹے گا[2] تاہم بعض احناف بھی اس جرم کے مرتکب کے قتل کے قائل ہیں[3] جبکہ دیگر ائمہ مجتہدین کے نزدیک "طعن فی الدین" سے گریز معاہدہ عقد ذمہ کی وہ بنیادی اور لازمی شرط ہے کہ عقد ذمہ میں اس شرط کا تذکرہ نہ ہو تب بھی اس کی پابندی لازم ہے۔[4] "طعن فی الدین" کی ممانعت جس طرح غیر مسلموں کیلئے ہے اسی طرح مسلمانوں کیلئے بھی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص کی اجازت مسلمانوں کو ہے نہ غیر مسلموں کو۔ امام شافعی نے عقد ذمہ کے وقت اہل الذمہ پر عائد کی جانے والی شرائط کی لمبی چوڑی فہرست میں سر فہرست یہ شرط رکھی ہے کہ

اھل الذمہ میں سے کسی کو اس بات کی اجازت نہ ہو گی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اللہ

---

[1] - دیکھیے: شافعی، الام (مع مختصر المزنی) ۴/۲۰۸-۲۱۰: بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ)، ۱۴/۳۹-۴۲

[2] - دیکھئے: کاسانی، بدائع الصنائع ۷/۱۱۳: حصکفی، الدر المختار (مع رد المحتار) ۴/۲۱۲: شیخ زادہ، مجمع الانھر ۱/۶۸۴

[3] - دیکھئے: ابن عابدین شامی، حاشیہ رد المحتار (مع الدر المختار) ۴/۲۱۴

[4] - ملاحظہ ہو: ابن قدامہ، المغنی ۲/۵۲۵ ابن قیم، احکام اہل الذمہ ۲۱۵-۲۰۵ (بڑی تفصیلی اور مدلل بحث) ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ) ص۲۳۸ قاضی ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ ص ۱۴۳

کے رسول) یا اللہ کی کتاب (قرآن مجید) یا اس کے دین کا نامناسب (گستاخانہ) انداز میں ذکر کرے۔ اگر کسی ذمی نے ایسا کیا تو اس سے اللہ تعالیٰ، امیر المومنین اور تمام مسلمان بری الذمہ ہوں گے اور اسے جو امان کا عہد دیا گیا تھا وہ ٹوٹ جائے گا اور امیر المومنین کے لیے اس کا خون اور مال اسی طرح حلال ہو جائیں گے جس طرح اهل الحرب کے خون اور اموال حلال ہیں۔"[1]

اس قید کے سوا دین کی تبلیغ میں کسی مذہب وملت کے لوگوں پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اسلام نے مسلمانوں یا غیر مسلموں میں سے کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ان بنیادی اصولوں کی مخالفت یا تحقیر کریں جن پر اسلامی ریاست قائم ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی اجازت اس آسمان کے نیچے نہ کسی حکومت نے آج تک کسی کو دی ہے اور نہ کوئی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی زیر بحث مسئلے میں لکھتے ہیں:

"انگلستان کی حکومت اپنی رواداری اور مذہبی غیر جانبداری کے لیے ضرب المثل بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے ملک کے اندر کسی شخص کو بھی یہ حق یا یہ اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہے کہ وہ تاج برطانیہ کی حاکمیت چیلنج یا اس کی مخالفت یا تحقیر کرے، کیونکہ اس چیز پر انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو اس کو غدر کبیر (HIGH TREASON) کی سزا دی جائے گی۔ روس اور امریکہ میں ایسے جرم کے مرتکب کا حشر اس سے بھی بدتر ہو گا۔ اپنی حفاظت خود اختیاری کے اسی حق کے تحت اسلامی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی شخص کو (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خدا کی حاکمیت کے خلاف آواز اٹھائے یا اس کی تردید یا تحقیر کی کوشش کرے کیونکہ یہ چیز براہ راست حاکم سلطنت کی ہستی پر حملہ ہے، اور

[1] - کتاب الام (مع مختصر المزنی) دارالفکر بیروت ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء، ۴/ ۲۰۹، نیز بیہقی، السنن الکبری، دارالفکر۔ بیروت ۱۴/ ۳۹

اس کی قانونی حیثیت بعینہ وہی ہے جو انگریزی راج کے دوران میں تعزیرات ہند کے تحت " بادشاہ کے خلاف جنگ (WAR AGAINST THE KING) "ریاست کی ہستی پر حملہ (DERPEDATION AGAINST THE STATE) کے جرائم کی تھی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی آج تک دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی روشن خیالی اور زیادہ سے زیادہ شہری آزادی (CIVIL LIBERTIES) کی دعویدار حکومت اسلام کی برابری نہیں کر سکتی۔ اس زمین کی سطح پر کبھی کوئی ریاست (بجز صحیح اور سچی اسلامی ریاستوں کے) ایسی نہیں گزری اور نہ اس وقت موجود ہے جس نے اپنے حدود واقتدار کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لیے پنپنے کی تو در کنار، زندہ رہنے کی بھی گنجائش رکھی ہو۔ ہمارے پڑوس کے ملک میں کوئی شخص "دو قومی نظریہ" پر ایمان رکھ کر سانس نہیں لے سکتا۔ روس میں کمیونزم کے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین اور مخالفین کو نہ صرف یہ کہ اپنے دائرہ اقتدار میں پناہ اور وہ سارے حقوق دیتی ہے جن کا ابھی اوپر ذکر گزرا ہے بلکہ انہیں اس بات کا بھی پورا حق دیتی ہے کہ جو عقائد و نظریات وہ رکھتے ہیں ان پر قائم رہیں، ان کو اپنے اخلاف میں بطور ورثہ منتقل کریں، اپنے دائرہ کے اندر ان کی حفاظت و ترقی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بے روک ٹوک کریں۔ البتہ ریاست ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ ان نظریات کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے برپا اور ان کو اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں پر بالفعل غالب کرنے کی کوشش کریں۔ غور کیجیے تو اس بات میں غیر مسلموں کو اسلام نے مسلمانوں سے بھی زیادہ آزادی عطا کی ہے کیونکہ غیر مسلم تو اسلامی حکومت کے اندر اپنی پسند کے ہر دین و مذہب اور ہر نظریہ و خیال کو اختیار کرنے کیلئے کاملاً آزاد ہیں مگر

مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلام کے سوا کسی اور نظریہ وخیال کو اعتقادا بھی اختیار کریں"[1]

جبکہ مولانا مودودی کا اہل الذمہ کی تبلیغی آزادی کے حوالے سے کہنا ہے:

"قانون کی حدود کے اندر غیر مسلموں کو مذہبی بحث ومباحثہ کی ویسی ہی آزادی ہوگی جیسی مسلمانوں کو ہے۔ وہ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے میں بھی پوری طرح آزاد ہوں گے اور اگر ایک غیر اسلامی مذہب کا پیرو کسی دوسرے غیر اسلامی مذہب کو قبول کرلے تو حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ کوئی مسلمان اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہوئے اپنا دین بدلنے کا مجاز نہ ہوگا۔ لیکن ارتداد کی صورت میں مواخذہ جو کچھ بھی ہوگا خود مرتد سے ہوگا نہ کہ اس غیر مسلم سے جس کا اثر قبول کر کے وہ مرتد ہوا"[2]

مذہبی تبلیغ کی طرح اسلامی قانون کے دائرے میں ان کے مذہبی، سیاسی اور سماجی اور مشاورتی قسم کے اجتماع پر بھی کوئی پابندی شرعا جائز نہیں۔ اسی طرح وہ اپنی کمیونٹی تک اپنے مذہب کی تعلیم وتدریس کے معاملے میں بھی آزاد ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے علیحدہ مدارس قائم کرسکتے ہیں۔ اہل الذمہ کی مذہبی تعلیم وتدریس کے جواز پر یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ فتح خیبر کے بعد مسلمان مجاہدین نے جب مال غنیمت جمع کیا تو اس مال میں یہود کی آسمانی کتاب تورات کا ایک نسخہ بھی موجود تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے وہ نسخہ یہود کو واپس لوٹا دینے کا حکم دیا۔[3]

البتہ انہیں اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ "مشنری انداز" میں مفت

---

[1] - اسلامی ریاست ص ۲۱۵-۲۱۴

[2] - اسلامی ریاست ص ۶۰۰

[3] - عبدالکریم زیدان۔ احکام الذمیین والمستامنین ص ۶۸ = ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد ص ۳۹۰

تعلیم اور سکولوں کی آڑ میں مسلمان بچوں کو اسلام سے بدظن کرنے اور مرتد بنانے کی کوشش شروع کریں کیونکہ ارتداد اسلام میں ایسا جرم ہے جس کے بارے میں کوئی نرمی کی گنجائش نہیں۔ جہاں تک اپنے دین کے محاسن بیان کرنے اور دوسروں کے ساتھ مجادلہ حُسنیٰ" (اچھے انداز میں بحث مباحثہ) کا تعلق ہے تو اس کا ان کے لیے جواز ہو گا کیونکہ اسلام نے ان کے انبیاء کا تذکرہ خیر کے ساتھ اور ان کے شرائع کے محاسن کا ذکر کیا ہے اور غیر مسلموں کے ساتھ "مجادلۃ بالحسنیٰ" کی تاکید کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

ولا تجادلوا اہل الکتاب الا بالتی ھی احسن۔[1]

"اور تم اہل کتاب سے بحث مباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو انتہائی مہذب ہو۔"

اب صرفی قاعدہ اور باب مفاعلہ کی رُو سے "مجادلہ" چونکہ طرفین کے درمیان ہوتا ہے اس لیے اہل کتاب کے لیے بھی "مجادلہ بالحسنیٰ" کا جواز ہو گا۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حق تبلیغ کے بارے ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودی نے لکھا ہے:

"تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آئندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے، اس کا حق تمام ذمی گروہوں کو حاصل ہو گا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے، اس کی اجازت بھی ذمیوں کو ہو گی۔ مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا مآل یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی

[1] ۔ العنکبوت ۲۹:۴۶

اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔"[1]

اپنے مذہب کی تبلیغ کی آڑ میں انہیں دین اسلام، شعائر اسلام، قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی ذات پر کیچڑ اچھالنے اور تنقیص و توہین کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ در مختار میں ہے:

و یؤدب الذمی و یعاقب علی سبه دین الاسلام او القرآن او النبی صلی الله علیه وسلم۔[2]

اگر کوئی ذمی دین اسلام یا قرآن یا نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اس پر اس کی تادیب اور گرفت کی جائے گی۔ اس کے حاشیہ میں ابن عابدین شامی نے لکھا ہے کہ اس جرم کی تادیب میں اسے قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔[3]

ابن قدامہ فرماتے ہیں:

عقد ذمہ کے بعد اہل الذمہ کے لیے لازم ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو مسلمانوں کے لیے ذلت کا باعث ہو اور وہ ہے ان کے رب یا ان کی کتاب (قرآن مجید)، ان کے دین یا ان کے رسول ﷺ کا برائی کے ساتھ ذکر[4] اسی طرح امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ عرفہ بن الحارث الکندی کے پاس سے ایک نصرانی گزرا تو انہوں نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ مگر اس نے جواب میں نبی اکرم ﷺ کی شان میں بدزبانی کی۔ جس پر انہوں نے اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا جس سے اس کی

---

[1] - اسلامی ریاست ص ۵۳۱-۵۳۰

[2] - در مختار مع حاشیہ رد المختار، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی ۴/ ۲۱۴

[3] - حوالہ مذکور

[4] - المغنی ۴/ ۵۳۱

ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ معاملہ حضرت عمرو بن العاص کے پاس آیا تو انہوں نے کہا: ہم نے ان لوگوں کو عہد دے رکھا ہے۔ تو حضرت عرفہ نے کہا: اس بات سے خدا کی پناہ کہ ہم انہیں اس لیے عہد (عقد ذمہ) دیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کو گالیاں دیتے رہیں۔ ہم نے ان کی حفاظت کا ذمہ اس لیے اٹھایا ہے کہ ہم ان کی عبادات میں حائل نہیں ہوں گے۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالیں گے۔ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ آور ہو گا تو ان کا دفاع کریں گے۔ تو حضرت عمروؓ نے کہا: "صدقت" (آپ نے سچ کہا)[1]

---

[1] - السنن الکبریٰ دار الفکر بیروت ۱۴/ ۳۹۰، رقم ۱۹۲۲۲

چوتھی فصل

حکم نبوی پر یہودی سرداروں کا قتل- تحقیقی جائزہ

حدیث، تاریخ اور سیرت طیبہ کی مستند اور متعدد کتابوں میں یہ تفصیلی روایت موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک خفیہ کارروائی کے ذریعے یہود کے مشہور سردار کعب بن اشرف کو قتل کرا دیا تھا۔[1] اسی طرح ایک دوسرے یہودی سردار ابو رافع کو پیغمبر اسلام ﷺ کا قتل کرا دینا بھی حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے ثابت ہے۔[2] جس پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اسلام جیسا کہ پچھلے

---

[1] - دیکھئے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الرھن فی الحضر، باب رھن السلاح)، رقم: ۲۵۱۰ بخاری، الجامع الصحیح (کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف) ۲/ ۵۷۶، رقم: ۴۰۳۷ قدیمی کتب خانہ کراچی = بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجہاد باب الکذب فی الحرب و باب الفتک فی الحرب ۱/ ۴۲۵، رقم: ۳۰۳۱- ۳۰۳۲ (مختصرا)= مسلم، الجامع الصحیح (کتاب الجہاد والسیر باب قتل کعب بن الاشرف طاغوت الیہود) ۲/ ۱۱۰، رقم: ۴۶۶۴؛ ابو داود، السنن (کتاب الجہاد باب فی العدو یُوتی علی غرۃ و یتشبہ بہم) ۲/ ۳۴۔ رقم ۲۷۶۸؛ عینی، بدر الدین، عمدۃ القاری شرح البخاری، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ ۱۷۶- ۱۷/ ۱۷۹؛ واقدی، کتاب المغازی، جامعہ آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، ۱/ ۱۸۴؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، دار المعرفۃ بیروت، ۱۰- ۳/ ۹؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایۃ، مقتل کعب بن الاشرف یہودی (سنۃ ۳ھ) المکتبۃ الحقانیہ پشاور ۴/ ۳۷۹؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (مقتل کعب بن الاشرف) دار احیاء التراث العربی بیروت۔ لبنان ۱۹۹۵ء، ۳/ ۵۷- ۳۶؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (سریۃ کعب بن الاشرف) دار صادر بیروت ۱/ ۲۶۵؛ ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون ۲/ ۴۱۹- ۴۱۸؛ ابن قیم، احکام اہل الذمہ ۲/ ۲۵۲- ۲۴۹؛ عسقلانی، فتح الباری شرح بخاری، قدیمی کتب خانہ کراچی ۷/ ۴۲۷- ۱۳۴؛ سمہودی، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱/ ۲۸۰؛ الاصبہانی، کتاب الاغانی، ۱۹/ ۱۰۲

[2] - ملاحظہ ہو، بخاری، الجامع الصحیح (کتاب المغازی باب قتل ابی رافع عبد اللہ بن ابی الحقیق) ۲/ ۵۷۷، رقم: ۴۰۳۸ تا ۴۰۴۰؛ بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الجہاد باب قتل المشرک النائم) رقم ۳۰۲۲ ابن حجر، فتح الباری ۲/ ۴۳۸- ۴۳۲؛ عینی، عمدۃ القاری ۷/ ۱۸۵- ۱۷۹؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱/ ۳۹۱- ۳۹۳؛

ابواب میں تفصیل سے گزرا، اہل الذمہ کے جان ومال کے تحفظ کا دعویٰ کرتا ہے، دوسری طرف اپنے مخالف ذمیوں کو جان سے مروادینے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ مستشرقین (Orientalists) نے اسی چیز کو بنیاد بناتے ہوئے کہا ہے کہ مخالفین کو خفیہ طریقے سے قتل کروادینا پیغمبر اسلام (محمد ﷺ) کے نزدیک معمولی بات تھی۔ منٹگمری واٹ کعب بن اشرف کو خفیہ کارروائی کے ذریعے قتل کرادینے کے واقعے کے متعلق لکھتا ہے کہ مردانگی کے اعتبار سے اس کم مردانہ صفت دور میں بھی اس طرح کے طرز عمل کو خصوصاً ایک مذہبی لیڈر کے بارے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

(But in Muhammad's age and country it was quite normal

مگر محمد کے عہد اور ان کے ملک میں یہ ایک معمول کی بات تھی[1]

جبکہ ولیم میور لکھتا ہے کہ محمد ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو یہودیوں کو خفیہ طریقے سے قتل کر دینے کی عام اجازت دے رکھی تھی۔

"Muhammad accorded a general Permission to his followers to slay them (jews) wherever met.[2]

ترجمہ: "محمد (ﷺ) نے اپنے پیروکاروں کو اس بات کی عام اجازت دے رکھی تھی کہ یہودی انہیں جہاں ملیں قتل کر ڈالیں۔"

اسی طرح منٹگمری واٹ نے کعب کے قتل کو سیاسی اور دھوکے کا قتل (Political assassination) اور خود کعب کو مظلوم (Victim) قرار دیا ہے۔[3]

---

[1] – Muhammad Prophet and statesman, oxford University Press 1961, P. 129

نیز مولوی عبدالعلیم احراری، سیرۃ نبوی اور مستشرقین (اردو ترجمہ مقالہ "محمڈنزم" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) ص ۶۷:

[2] – Life of Mohamet, (John grant Edinburgh, 1923 P 249

[3] – Muhammad Prophet and statesman, oxford University Press 1961, P. 128

علامہ ابن قیم کعب بن اشرف کے قتل پر بعض لوگوں کو پیش آنے والا شبہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال شیخنا: و قد عرض بعض السفهاء شبهة في قتل ابن الاشرف فظن ان دم مثل هذا معصوم بذمة او بظاهر الامان۔[1]

ہمارے شیخ (ابن تیمیہ) کہتے ہیں: کعب بن اشرف کے قتل پر بعض بے وقوف لوگوں کو شبہ پیدا ہوا ہے اور انہوں نے گمان کیا ہے کہ اس قسم کا خون عقد ذمہ اور امان کی بنیاد پر معصوم (جس کی حفاظت شرعاً ضروری ہو) ہوتا ہے۔

ابن قیم نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ امیر معاویہؓ کے پاس کعب بن اشرف کے قتل کا تذکرہ ہوا تو پاس بیٹھے بنیامین (یہودی) نے کہا: اس کا قتل عہد شکنی اور دھوکا تھا جبکہ دوسری روایت کے مطابق گورنر مدینہ مروان بن الحکم نے پوچھا کہ کعب بن اشرف کا قتل کیسے ہوا۔ تو ابن یامین فوراً بولا: وہ عہد شکنی اور دھوکا تھا۔ اتفاق سے کعب کو ٹھکانے لگانے والے صحابی محمد بن مسلمہ بھی پاس بیٹھے تھے۔ اس وقت وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے یہ بات سن کر کہا: اے مروان کیا تیرے سامنے کہا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے دھوکا کیا؟ قسم بخدا! ہم نے اسے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر ہی قتل کیا تھا۔ قسم بخدا! آئندہ تو اور میں سوائے مسجد کے کسی ایک چھت کے نیچے جمع نہیں ہو سکتے۔"[2]

اسی طرح منکرین حدیث جو عام طور پر مستشرقین (Orientalists) ہی کے مقلد ہیں، نے بھی فنی و استنادی اعتبار سے ان صحیح روایات کو جن میں مذکورہ یہودی سرداروں کے قتل کے واقعات بیان ہوئے ہیں، موضوع قرار دیا ہے۔ ان کا استدلال ملاحظہ ہو:

"خلفاء بنی امیہ و بنی عباسیہ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ کبھی کبھی وہ اپنے دشمنوں کو مخفی تدبیروں

---

[1] - احکام اہل الذمہ ۲/۲۴۹

[2] - حوالہ مذکور؛ نیز دیکھیے: واقدی، کتاب المغازی (قتل ابن الاشرف)، ۱/۱۹۳

سے قتل کرا دیا کرتے تھے اور اس کو اپنی بساط سیاست کی ایک اچھی چال سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے حامیوں اور حاشیہ نشینوں نے ایسی روایتیں بنائیں کہ اس قسم کے قتل کو رسالت مآب ﷺ کا فعل ثابت کر دیں تاکہ ان سلاطین کو اپنی کارروائیوں کے جواز کی سند مل جائے۔"[1]

پھر ان صحیح احادیث کو رد کرنے کی بڑی وجہ یوں بیان کی ہے:

"ان مکذوب اور مکروہ روایات کی بنا پر رحمۃ للعالمین ﷺ پر خفیہ قتل کرانے کا الزام وہی شخص رکھے گا جو تنقیدی عمل سے عاری ہو اور راویوں کی فتنہ کاری اور مقام نبوت سے قطعاً نا آشنا ہو۔"[2]

کعب بن اشرف کا قتل۔ محرکات و اسباب

مذکورہ یہودی سرداروں کے خلاف پیغمبر اسلام ﷺ کی خفیہ کارروائی پر اعتراض اور اشکال کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حدیث و سیرت کی کتابوں میں جہاں ان کارروائیوں کی تفصیل موجود ہے وہاں عموماً وہ محرکات باغیانہ حرکات اور اسباب و وجوہ درج نہیں ہوتے جن کی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ انتہائی اقدام اٹھانا پڑا تھا۔ اگر یہ بنیادی اسباب و محرکات سامنے ہوں تو پھر اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ کعب بن الاشرف جب رات کو ایک خاموش اور خفیہ کارروائی (جس کا علم کسی کو نہ ہو سکا) میں مارا گیا اور اگلی صبح یہودی یہ اہم معاملہ یا مقدمہ لے کر بارگاہ نبوی میں آئے تو حضور اکرم ﷺ نے جب انہیں اس کی کارستانیوں اور اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ خاموش ہو گئے اور اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہ کی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

فاصبحت يهود مذعورين فأتوا النبي صلى الله عليه وسلم فقالوا قتل سيدنا غيلة فذكرهم النبي صلى الله عليه وسلم صنيعه و ما

---

[1] ۔ماہنامہ طلوع اسلام، دہلی شمارہ فروری ۱۹۴۰ء (ج ۳-ش - ۲) ص ۱۲

[2] ۔حوالہ مذکور

کان یحرض علیه و یوذی المسلمین، زاد ابن سعد فخافوا و لم ینطقوا۔[1]

"یہود اس وقوعہ پر گھبرا کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارا سردار دھوکے سے قتل کر دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ کیا کرتوت کرتا تھا، وہ کس طرح آپ کے خلاف دشمنوں کو بھڑکاتا اور مسلمانوں کو اذیت دیتا تھا۔ ابن سعد نے اس پر یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یہ سُن کر وہ خود بھی خوف زدہ ہو گئے اور مزید کوئی بات نہ کی۔"

بہر کیف آئندہ سطور میں ہم پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام، اہل اسلام اور ریاست مدینہ کے خلاف اس کی سازشوں اور باغیانہ حرکات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جن کے باعث سربراہ ریاست ہونے کے ناطے پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ کارروائی کرنا پڑی۔ اِس وضاحت سے اِس اقدام کا قانونی جواز بھی واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ کعب کو یہ سزائے موت ایک ایسی مملکت نے دی جس کے پاس اس وقت تک نہ اپنی باقاعدہ فوج تھی نہ پولیس، نہ جیل خانہ نہ محکمہ داروگیر۔ کعب بن اشرف کے معاملے میں ایک وقت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسے گرفتار کرنا مشکل تھا کیونکہ اس کا قیام ایک قلعے میں تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے قلعے کا محاصرہ پورے قبیلے کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف تھا اور ایک فرد کے جرم میں قانونی طور پر پورے قبیلے کو سزا نہ دی جا سکتی تھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ اسے جرم بغاوت جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، کی سزا دی جائے دوسری طرف شور و غوغا ہو نہ نقضِ امن کا مسئلہ پیدا ہو۔ لہٰذا ایک خفیہ کارروائی کے ذریعے اسے جرم بغاوت کی سزا (قتل) دے دی گئی۔

---

[1] - ابن حجر، فتح الباری شرح البخاری ۷/ ۳۳۱؛ نیز دیکھیے: عینی، عمدۃ القاری شرح البخاری ۱۷/ ۱۷۹؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱/ ۱۹۲؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۲/ ۲۶۶؛ بیہقی، السنن الکبری دارالفکر بیروت، ۶/ ۱۴ رقم ۱۹۱۴۰؛ الاصبہانی، کتاب الاغانی، ۱۹/ ۱۰۸

نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرما جانے کے بعد مہاجرین، انصار اور یہود مدینہ سے ایک سیاسی اور دفاعی معاہدہ (میثاق مدینہ) فرمایا تھا جس کا مختصر تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ اس معاہدہ کے بعد اصولی اخلاقی اور قانونی طور پر اس کی پابندی فریقین پر لازم تھی مگر کعب بن اشرف نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور ایسی حرکات کا ارتکاب کیا جو ریاستی قانون کے تو خلاف ہی تھیں، مسلمانوں کی حمیت و غیرت کے بھی خلاف تھیں۔ اس لیے نہ وہ معاہد رہا اور نہ ہی "ذمی" ہونے کے ناطے مسلمانوں کے لیے "معصوم الدم" (جس کے خون کی حفاظت کا ذمہ لیا گیا ہو) بلکہ حربی ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے کتاب الجہاد میں جہاں کعب بن الاشرف کے قتل کی روایت مختصراً بیان کی ہے وہاں ایک باب کا ترجمہ الباب "باب الکذب فی الحرب" اور دوسرے باب کے ترجمۃ الباب کا عنوان "باب الفتک فی الحرب" قائم کیا ہے۔[1] اور اگر معاہد بھی ہو تو نبی اکرم ﷺ کو گالی دینے سے معاہد کا قتل جائز ہو جاتا ہے۔[2]

میثاق مدینہ کی اس نے کس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ اس کے متعلق ابن سعد اور ابن کثیر وغیرہ نے لکھا ہے:

> "جب حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ میدان بدر میں قریش مکہ کے مارے جانے کی خبر لے کر مدینہ منورہ آئے اور یہ خبر کعب بن اشرف کو پہنچی تو (ازراہ بغض) کہنے لگا۔ قسم بخدا اگر محمد نے قوم (قریش مکہ) کے ان سورماؤں کو مار ڈالا ہے تو پھر زمین کا پیٹ (موت) اس کے ظاہر (زندگی) سے بہتر ہے۔ بعد ازاں جب اسے اس خبر کا یقین ہو گیا تو مکہ گیا اور مطلب بن ابی وداعہ بن صبیرہ سہمی کے ہاں

---

[1] - بخاری۔ الجامع الصحیح کتاب الجہاد باب الکذب فی الحرب وباب الفتک فی الحرب ۱/۴۲۵، رقم: ۳۰۲۱-۳۰۳۲

[2] - دیکھیے: ابن حجر، فتح الباری ۷/۴۳۱ ابن قیم، احکام اہل الذمہ ۲/۲۱۵-۲۰۵ ابن قدامہ، المغنی ۸/۵۲۵؛ ماوردی، الاحکام السلطانیہ (اردو ترجمہ) ص ۲۳۸؛ قاضی ابو یعلی، الاحکام السلطانیہ ص ۱۴۳

ٹھہرا جس کے پاس عاتکہ بنت ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بھی تھی۔ اس نے اسے مہمان ٹھہرایا اور اس کی آؤ بھگت کی۔ وہ (کعب) لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر ابھارنے لگا اور درد بھرے مرثیے اور اشعار کہہ کر مقتولین بدر پر نوحہ کرنے لگا۔"[1]

جبکہ حافظ ابن حجر نے زیر بحث معاملے میں یہ روایت درج کی ہے کہ

"کعب بن الاشرف (بدر کی شکست کے بعد) قریش مکہ کے پاس آیا اور کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر مسلمانوں کے خلاف ان کے جنگ کرنے کا حلف لیا۔ نیز ابو الاسود کی روایت سے حضرت عروہ سے مروی ہے کہ وہ (کعب) نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو کیا کرتا تھا اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا تھا۔ علاوہ ازیں جب وہ قریش مکہ کے پاس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا: کیا ہمارا دین برحق ہے۔ یا دین محمد؟ تو اس نے کہا: تمہارا دین۔ تو اس کی یہ باغیانہ حرکات دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: کون کعب کا کام تمام کرے گا؟ کیونکہ اب تو اس نے علی الاعلان عداوت شروع کر دی ہے۔"[2]

کعب بن اشرف کے قتل کی روایت کی شرح میں علامہ نووی امام المازری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

انما قتله كذالك لانه نقض عهد النبي صلى الله عليه وسلم و هجاه

[1] - دیکھیے: ابن سعد، الطبقات الکبری ۲/۲۶۵؛ ابن خلدون، تاریخ (قتل کعب بن الاشرف) ۲/۴۱۹-۴۱۸ دار الکتب العلمیہ بیروت۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (مقتل کعب بن الاشرف یہودی) (سنۃ ۳ھ) المکتبۃ الحقانیہ پشاور، ۳۷۹-۴/۳۸۰؛ بیہقی، السنن الکبری ۷/۱۴ رقم ۱۹۱۴۲؛ سمہودی، وفاء الوفاء، ۱/۲۸۰؛ واقدی، کتاب المغازی (قتل ابن الاشرف ۳ھ) ۱/۱۸۵؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳/۱۱

[2] - فتح الباری ۷/۴۲۸ نیز ابن کثیر، البدایہ والنہایہ طبع مذکور ۴/۳۸۰-۳۷۹ المقریزی، امتاع الاسماع ۱/۱۲۵

و سبہ و کان عاہدہ ان لا یعین علیہ احداً ثم جاءہ مع اہل الحرب معینا علیہ۔[1]

"بے شک اس کا قتل اسی طرح (ایک خفیہ کارروائی کے ذریعے) ہوا کیونکہ اس نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کو توڑا تھا۔ علاوہ ازیں وہ آنجناب ﷺ کی ہجو گوئی کیا کرتا اور آپ ﷺ کو گالیاں دیتا تھا۔ حالانکہ اس نے آپ ﷺ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا اس کے باوجود وہ آپ ﷺ کے خلاف اہل الحرب (قریش مکہ) کے ساتھ ہو گیا۔"

کعب بن اشرف کے قتل ہونے کے معاملے میں محمد حسین ہیکل نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ کعب نے مکہ مکرمہ سے واپس آ کر جب با پردہ مسلمان خواتین کی "تشبیب" (بر سر عام ان کے حسن و جمال اور اوصاف کا تذکرہ) شروع کر دی تو مسلمان عربوں نے اپنی طبعی غیرت کی تسکین کے لیے کعب سے اس غیر اخلاقی حرکت کا انتقام لینے کے لیے باہمی مشورہ کیا۔ اس مشورہ میں کعب کے قتل پر سب کا اتفاق ہو گیا اور انہوں نے از خود اسے ٹھکانے لگا دیا۔[2]

زیر بحث معاملے میں ایک مستند ترین روایت سنن ابی داؤد کی ہے۔ چنانچہ:

"حضرت کعب بن مالک راوی ہیں کہ کعب بن الاشرف نبی اکرم ﷺ کی ہجو گوئی کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ کفار قریش کو (حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جنگ کے لیے) بھڑکاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرما ہوئے تو اہل مدینہ کئی

---

[1] - نووی، شرح مسلم (مع صحیح مسلم) ۲/۱۱۰!!

نوٹ: ابن ہشام نے واقعہ ہذا کے ضمن میں کعب کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں جو اس نے قریش کو بھڑکانے کے لیے کہے تھے۔ دیکھئے: ابن ہشام، سیرۃ النبی، دار احیاء التراث العربی ۳/۵۸

[2] - حیاۃ محمد، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۹۶۵ء ص ۲۷۹

گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں مسلمان، بتوں کے پجاری مشرکین اور یہود تھے۔ یہ یہود نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو اذیت پہنچاتے تھے۔ مگر اللہ نے اپنے نبی کو صبر اور درگزر کا حکم دیا۔ انہیں کے بارے میں اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی:و لتسمعُنّ من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم الخ (الآیۃ)جب کعب نے نبی اکرم ﷺ کی اذیت رسانی سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے سعد بن معاذ کو حکم فرمایا کہ وہ کچھ آدمیوں کو بھیج کر اس کا کام تمام کرا دیں۔ چنانچہ انہوں نے محمد بن مسلمہ کو بھیجا جنہوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔[1]

ان باغیانہ اور مخالفانہ سرگرمیوں کے علاوہ حافظ ابن حجر نے "فوائد عبد اللہ بن اسحاق الخراسانی" کے حوالے سے اس کے فوری قتل کا ایک اور سبب بھی لکھا ہے:

"ایک مرتبہ اس نے کھانا تیار کیا اور اس منصوبے میں یہود کی ایک جماعت کو بھی اپنا ہم نوا بناتے ہوئے انہیں کہا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کو کھانے (الولیمہ) کی دعوت دے گا۔ پس جب وہ آ جائیں تو تم انہیں (بے خبری میں) قتل کر دینا۔ پھر حسب پروگرام اس نے آپ ﷺ کو دعوت دی۔ پس آپ چند صحابہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ جب آپ بیٹھ گئے تو حضرت جبریل امین نے اپنے پروں سے آپ کو ڈھانپ لیا۔ یوں بخیر و عافیت آپ یہاں سے تشریف لے گئے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کو اپنے مقام پر نہ پایا تو منتشر ہو گئے۔ اس وقت آپ نے فرمایا: کون کعب بن اشرف کے قتل پر تیار ہے، اور ممکن ہے اس کے قتل کے کئی اسباب جمع ہو گئے ہوں۔"[2]

---

1 - ابو داود، السنن (کتاب الخراج و الفیئ و الامارۃ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ) ۲/ ۷۲، رقم ۳۰۰۰؛ نیز واقدی، کتاب المغازی، ۱/ ۱۸۴

2 - ابن حجر، فتح الباری ۷/ ۳۳۸؛ نیز سمہودی، وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی، ۱/ ۲۸۰

مشہور پاکستانی مفسر محدث اور سیرت نگار مولانا ادریس کاندھلوی نے کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کی تفصیل بیان کرنے کے بعد قتل کے اسباب (یا جرائم) گنواتے ہوئے لکھا ہے:

روایات حدیث سے کعب بن اشرف کے قتل کے جو وجوہ اور اسباب معلوم ہوسکے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

1. نبی اکرم ﷺ کی شان اقدس میں دریدہ دہنی اور سب و شتم اور گستاخانہ کلمات کا زبان سے نکالنا۔
2. آپ ﷺ کی ہجو میں اشعار کہنا۔
3. غزلیات اور عشقیہ اشعار میں مسلمان عورتوں کا بطور تشبیب ذکر کرنا۔
4. غدر اور نقض عہد۔
5. لوگوں کو آپ کے مقابلہ کے لیے ابھارتا اور اکسانا اور ان کو جنگ پر آمادہ کرنا۔
6. دعوت کے بہانہ سے آپ ﷺ کے قتل کی سازش کرنا۔
7. دین اسلام پر طعن کرنا۔

لیکن قتل کا سب سے قوی سبب آپ ﷺ کی شان اقدس میں دریدہ دہنی اور سب و شتم اور آپ کی ہجو میں اشعار کہنا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب "الصارم المسلول علی شاتم الرسول" میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔"[1]

یہ بات گذشتہ صفحات میں تفصیل سے گزر چکی ہے کہ عقد ذمہ کی لازمی شرائط میں یہ شرط بھی داخل ہے کہ معاہد / ذمی پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرے ورنہ اس کا معاہدہ ختم اور وہ واجب القتل ہوگا۔[2]

[1] - سیرۃ المصطفی، الطاف اینڈ سنز کراچی ۱/ ۶۵۴

[2] - دیکھیے: ابن قیم، احکام اہل الذمہ ۲/ ۳۵۴

جبکہ ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن نے کعب کے واقعہ قتل کے ذکر کے بعد اس کے جرائم کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"یہ اس مغرور و سرکش بدکلام اور بدزبان شخص کا انجام ہے جو اپنی آتش بیان سے مخالفین اسلام کے دلوں میں عداوت کی چنگاریاں بھڑکا کر ملک کو شعلہ زار جنگ و جدال بنانا چاہتا تھا اور جس کی سرکش و ناپاک زبان پردہ نشین اور پاک خواتین کی عصمت پر بھی حملے کرنے سے نہ چوکتی تھی۔"[1]

کعب کا باغیانہ کردار اور مستشرقین کا اعتراف

مستشرقین نے بھی کعب بن اشرف کے باغیانہ کردار کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ٹار انڈ رائے (Tor Andrae) اسلام کے ساتھ انتہائی تعصب رکھنے کے باوجود لکھتا ہے:

"This was the poet Ka'b ibn Al-Ashraf, who, after the battle of Bedr, had the audacity to go to Mecca, where he sought to incite the Quraish to revenge by his sarcastic poems."[2]

"یہ شاعر کعب بن اشرف ہی تھا جو جنگ بدر کے بعد جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکہ گیا، جہاں اس نے ہجو پر مبنی اپنے قصیدوں کے ذریعے سے قریش کو انتقام لینے پر برانگیختہ کیا۔"

منٹگمری واٹ (Montgomery watt) جیسا کہ اوپر گزرا ہے، کعب کے قتل کو سیاسی اور دھوکے کا قتل اور خود کعب کو مظلوم قرار دینے کے باوجود لکھتا ہے!

"When he heard the news of Badr, he set out for Mecca, and by his verses helped to rouse the

---

[1] - عرب کا چاند ص ۲۶۷

[2] - Mohammad the Man and his Faith (Translated by Theophi Menzel) Herper and Brothers, New York, 1960, P: 147

Meccans to greif and anger and the desire for revenge."[1]

"جب اس نے میدان بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کی خبر سنی تو وہ مکہ روانہ ہوا، اس نے اپنی شاعری کے ذریعے اہل مکہ کو برانگیختہ کیا اور انتقام پر ابھارا۔"

اسی طرح منٹگمری واٹ نے اپنی دوسری کتاب میں اس کے اِس جرم اور قانون شکنی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"His offence was that after Badr he was so disgusted with Muhammads success that he went to Mecca and composed anti-Muslim verses which had a wide circulation."[2]

منٹگمری واٹ: کعب بن اشرف کے اسلام دشمن طرز عمل کے حوالے سے یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ

A man like Ka'b Ibn-al-Ashraf was a clear enemy of the Islamic community and so there was no obligation to consider him in any way.[3]

کعب بن اشرف جیسا آدمی مسلمان / اسلامی ریاست کا کھلم کھلا دشمن تھا۔ اس لیے کسی بھی اعتبار سے اس کے ساتھ کیے گئے معاہدہ / شرطوں پر غور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) کعب بن اشرف کی فتنہ انگیزیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The defeat of the idolaters at Badr was felt as keenly by the jews as by the Meccans. Immediately after this battle a distinguished member of their race, called Ka'b the son of Ashraf, belonging to the tribe of Nazir, publicly

---

[1] – Muhammad At Medina, oxford university Press London, 1956. P.18

[2] – Muhammad Prophet and statesman, Oxford University Press London 1961, P. 128

[3] – Ibid, P. 129

deploring the ill-success of the idolaters, proceeded towards Mecca. Finding the people there plunged in grief, he spared no exertion to revive their courage. By this satires against the Prophet and his disciples, by his elegies on the Meccans who had fallen at Badr, he succeeded in exciting the Koreish to that frenzy of vengeance which found vent on the plains of Ohad."[1]

"جنگِ بدر میں بت پرستوں کی شکست یہودیوں کو بھی اتنی ہی ناگوار گزری تھی جتنی اہلِ مکہ کو، جنگ کے فوراً بعد یہودی قوم کے ایک معزز فرد کعب بن اشرف نے، جو قبیلہ نضیر سے تھا، بر سرِ عام کفار کی شکست پر اظہارِ افسوس کیا اور عازمِ مکہ ہوا، وہاں اس نے یہ دیکھ کر کہ لوگ غم میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے حوصلے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس نے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کی ہجویں سنا سنا کر اور بدر میں جو اہلِ مکہ قتل ہوئے تھے ان کے مرثیے گا گا کر قریش میں وہ جوشِ انتقام پیدا کیا جو بعد میں میدانِ احد میں ظاہر ہوا۔"

کعب بن اشرف کے جرائم کا تقاضا یہ تھا کہ آپ ﷺ اس کے اور اس کی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ فرماتے، اور باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث تمام افراد کو قرار واقعی سزا دیتے، لیکن آپ ﷺ نے اعلانِ جنگ کرکے میدانِ جنگ میں علی الاعلان اس سے اور اس کی قوم سے لڑائی کرنے کے بجائے حیلے سے اس کو قتل کرا دیا اور اس کی پوری قوم سے تعرض نہیں فرمایا کیونکہ وہ لوگ اس کے تابع تھے اور اصل سرغنہ یہی تھا، اس طرح اس فتنہ گر اور مفسد کا فتنہ و فساد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

---

[1]- The spirit of Islam, Elite Publishers, Karachi, Edition 1988 P: 59-60

مغربی قوانین میں جُرم غداری کی سزا، موت

غداری کے جرم کی سزا "موت" ہونا، مغربی ممالک کے قوانین میں بھی ایک مسلمہ امر ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی اپنے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ میں لکھتے ہیں:

"غداری کے جرم کی سزا، رومی قانون سے لے کر برطانوی قانون تک ہر دور میں موت رہی ہے۔ برطانیہ کے مرڈر ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت موت کی سزا منسوخ کر دی گئی لیکن غداری کے جرم پر سزائے موت میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مختلف ادوار میں غداری کی جو تعریفیں بیان کی گئی ہیں اُن کی رو سے حسب ذیل افعال غداری متصور ہوتے تھے:

۱۔ کسی قوم یا حکمران سے ایسے فعل کے ذریعے دغا کرنا جو اس کی سلامتی کے لیے خطرناک ہو۔

۲۔ کسی آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کرنا یا ترغیب دینا، اپنے فعل، تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنا۔

۳۔ نویں صدی کے قانون کی رُو سے ہر وہ فرد سزائے موت کا مستحق تھا جو بادشاہ (سربراہ) کی جان کے خلاف کسی کارروائی میں ملوث ہو۔

۴۔ انگلینڈ میں ۱۹۸۴ء کے قانون میں بغاوت اور غداری کی جو تعریف کی گئی ہے، اس کی رو سے بادشاہ کے دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو مدد یا سہولت بہم پہنچانا غداری کی تعریف میں آتا ہے۔

۵۔ امریکی قانون کی رو سے ریاست کے خلاف جنگ، دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو کسی قسم کی مدد یا سہولت بہم پہنچانا غداری کی تعریف میں آتا ہے۔

۶، غداری کے لیے نیت بھی ضروری نہیں۔ لاعلمی اور سادگی میں سرزد ہو جانے والے اعمال غداری

کا شمار بھی غداری میں ہی ہوتا ہے۔ دشمنوں کو غذا پہنچانا بھی غداری کی تعریف میں آتا ہے۔[1]

گذشتہ تفصیلات کے مطابق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی بیان کردہ غداری کی تمام تعریفیں کعب بن اشرف پر بدرجہ اتم صادق آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنے کیے کی سزا پائی۔

کعب کے خفیہ قتل کا قانونی جواز

سید مودودی نے کعب بن اشرف کے موجب قتل جرائم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اس کے خلاف خفیہ اور تادیبی کارروائی کا قانونی جواز بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان تمام بیانات سے اس واقعہ کی صداقت مسلم ہو جاتی ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازش قتل نے مکمل کر دیا اور اس کے بعد اس کے کشتنی ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ ایک شخص اپنے قومی معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے سازباز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکاتا ہے اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے۔ ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلان جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا۔ خود اس کی قوم سے بھی یہ امید رکھنی فضول تھی کہ وہ اس کو ان حرکات سے روکے گی کیونکہ ساری قوم کا رویہ اسی کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ دوسرے اعداء اسلام کے ساتھ بھی مل کر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نہیں آیا بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے بیٹھ کر ہی سازشیں کرتا رہا۔ اس لیے اس کے شر کے استیصال کی صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ

1- اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر، بیت الحکمۃ لاہور ۲۰۰۶ء ص ۳۲۸ (بحوالہ Encyclopaedia Britanica; article 'Treason' Vol: 11 P; 197)

نے مجبوراً اسی آخری تدبیر کو اختیار کیا اور محمد بن مسلمہ کو بھیج کر اسے قتل کرا دیا۔"[1]

ماضی قریب کے معروف فاضل ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اسلام کے امور جنگ، جنگی کارروائیوں اور آدابِ جنگ پر گفتگو کرتے ہوئے کعب بن الاشرف کے قتل کے جواز کو یوں بیان کیا ہے:

"ایک چوتھی اور اہم چیز یہ ہے کہ جب حالت جنگ قائم ہو اور دشمن سے کھلا اعلان جنگ ہو تو دشمن کے کسی فرد کے خلاف پولیس ایکشن لیا جا سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ توقع اور اطمینان ہو کہ اس دشمن کے خلاف کارروائی کر کے کسی بڑی جنگ یا بڑے معرکے کو روکا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مدینے سے کوئی چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ایک یہودی قبیلہ آباد تھا جس کا سردار اور پادری کعب بن اشرف، اپنے قبیلے اور پوری برادری کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ وہ اپنی شاعری سے حضور ﷺ کی توہین بھی کرتا اور کفار مکہ کو بھی آمادہ کرتا رہتا کہ مسلمانوں کے خلاف مہم میں اس کا بھرپور ساتھ دیں۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ وہ کسی وقت اپنے وسائل سے کام لے کر مسلمانوں کے خلاف کوئی بڑی فوج کشی کرا دے۔ حضور ﷺ نے چند صحابہ کو بھیجا کہ کعب بن اشرف کی سازشوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ چند صحابہ نے یہ مہم اپنے ذمے لی اور ایک مختصر پر امن کارروائی کے ذریعے اس دشمن اسلام کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا قبیلہ اپنی جگہ ڈر کر بیٹھ گیا اور مسلمانوں کے خلاف اس کی تمام کارروائیاں اور سازشیں ختم ہو گئیں لیکن اس قسم کی پولیس کارروائی کی چند شرائط ہیں: ایک یہ کہ حالت جنگ ہو، دوسرے یہ کہ دشمن باقاعدہ اعلانیہ دشمن ہو اور تیسرے اس بات کا شدید خطرہ موجود ہو کہ وہ مسلمانوں

---

[1] - الجہاد فی الاسلام ص ۳۱۳-۳۱۲

کے خلاف کوئی ایکشن لینے والا ہے، تو ان حالات میں بڑے خطرے کو روکنے کے لیے اس طرح کا ایکشن لیا جاسکتا ہے۔"[1]

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کعب بن الاشرف کے خلاف تادیبی کارروائی کا حکم خود نبی اکرم ﷺ نے دیا تھا اور اس حکم کے پیچھے کعب کی مخالفانہ اور باغیانہ سرگرمیاں تھیں نہ کہ مذہبی تعصب۔ اِس قسم کی باغیانہ حرکات کا کوئی مسلمان مرتکب ہوتا تو یقیناً اس کی بھی یہی سزا ہوتی۔ کعب کے قتل کے قانونی جواز اور اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے حکم دینے کی بنا پر شرعاً یہ بات جائز نہیں کہ کعب کے قتل کو دھوکا کہا جائے۔ امام نووی فرماتے ہیں:

و لا یحل لاحد ان یقول ان قتله کان غدرا و قد قال ذالک انسان فی مجلس علی بن ابی طالب رضی الله عنه فامر به علی رضی الله عنه فضرب عنقه و انما یکون الغدر بعد امان موجود و کان کعب قد نقض عهد النبی صلی الله علیه وسلم۔[2]

"کسی بھی آدمی کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ اس (کعب) کا قتل ایک دھوکہ تھا۔ چنانچہ ایک آدمی نے یہی بات حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی مجلس میں کہہ دی تو آپ کے حکم پر اس کی گردن اڑادی گئی۔ اس لیے کہ دھوکا تو اس امان نامہ کے بعد ہوتا ہے جو موجود ہو جبکہ کعب خود حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ معاہدہ کو توڑ چکا تھا اور یوں اس کا امان نامہ موجود نہیں تھا۔"

اسی طرح ابن یامین النضری نے ایک موقعہ پر کعب کے قتل کو "دھوکا" کہا تو محمد بن مسلمہ نے

---

[1] ۔ اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور۔۲) ص ۳۴۵

[2] ۔ شرح صحیح مسلم (مع صحیح مسلم) ۲/۱۱۰؛ حاشیہ زیر حدیث نمبر ۳۶۶۴

قسم اٹھا کر کہا کہ اگر کبھی میں نے تیرے اوپر قدرت پالی اور میرے ہاتھ میں تلوار ہوئی تو تیری گردن اڑا دوں گا۔[1]

ابو رافع کا قتل۔ وجوہ واسباب

ابو رافع سلام بن ابی الحقیق کا معاملہ بھی کعب بن اشرف سے مختلف نہ تھا، اگرچہ صحیح بخاری کی روایت، جس کا حوالہ گذشتہ سطور میں گزر چکا ہے، میں اس کے جرائم کا بیان بھی موجود ہے (و کان ابو رافع یوذی رسول اللہ و یُعین علیہ) تاہم تاریخ وسیرت کی کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عزائم انتہائی خطرناک تھے، وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلسل سازشوں میں مشغول تھا اور اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے اسلامی ریاست کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ فتح الباری میں ہے:

انہ کان ممن اعان غطفان وغیرھم من مشرکی العرب بالمال الکثیر علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[2]

"یہ ان لوگوں میں سے تھا، جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے خلاف غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی مالِ کثیر سے مدد کی تھی۔"

ابو رافع نے غزوہ احزاب میں قبائل عرب کے جنگی اخراجات پورے کرنے اور لشکر کی تیاری میں بھرپور تعاون کیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ احزاب کا ایک بڑا سبب یہی شخص تھا۔ یہی شخص قریش مکہ کو مسلمانوں پر چڑھا کر لایا اور بہت زیادہ ان کی مالی مدد کی۔ علاوہ ازیں ہمیشہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی عداوت میں روپیہ خرچ کرتا رہتا تھا۔[3] جب اس کی شرانگیزیاں حد سے بڑھنے لگیں تو قبیلہ

---

[1] -مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: واقدی، کتاب المغازی (قتل ابن الاشراف)، ۱/۱۹۳

[2] -ابن حجر، فتح الباری شرح البخاری ۷/۳۴۲؛ نیز واقدی، کتاب المغازی، ۱/۳۹۴

[3] - ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۴/۱۳۷

خزرج کے چند انصار صحابہ کی خواہش پر آپ ﷺ نے عبد اللہ بن عتیک انصاری (م ۱۲ھ) کی زیر قیادت انصاری صحابہ کرامؓ کا ایک دستہ، جس میں ابو قتادہؓ حارث بن ربعی (م ۴۰ھ)، مسعود بن سنانؓ (م ۱۱ھ)، عبد اللہ بن اُنیسؓ (م ۵۴ھ) اور خُزاعی بن اسودؓ شامل تھے، روانہ فرمایا اور ان کو یہ حکم دیا کہ کسی عورت اور بچے کو ہر گز نہ قتل کرنا۔ یہ لوگ شام کے وقت خیبر گئے۔ عبد اللہ بن عتیکؓ یہودیوں کی زبان سے واقف تھے۔ عبد اللہ بن عتیکؓ نے بہانے سے دروازہ کھلوا کر اس کو قتل کر دیا۔[1]

سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) ابو رافع کے باغیانہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"An other jew of the Nazir, Abu Rafe Sallam, son of Abu'I Hukaik, was equally wild and bitter against the muslamans. He inhabited, with the fraction of his tribe, the territories of Khaber, four or five days'journey to the north-west of Madina. Detesting Mohammad and the musalmans, he made use of every endeaivour to excite the neighbouring Arab Tribes, such as the Sulaim and the gatafan against them.[2]

ترجمہ: "بنو نضیر کا ایک اور یہودی ابو رافع سلام بن ابی الحقیق بھی مسلمانوں کا اتنا ہی جانی دشمن تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی ایک شاخ کے ساتھ خیبر کے علاقے میں رہتا تھا جو مدینے کے شمال مغرب کی طرف چار پانچ دن کی مسافت پر واقع تھا۔ اسے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے ہمسایہ عرب قبائل

---

[1] - دیکھیے: بخاری، الجامع الصحیح (کتاب المغازی باب قتل ابی رافع عبد اللہ بن ابی الحقیق) ۲/۵۷۷ رقم: ۴۰۳۹، ۴۰۴۰ ؛ ابن سعد، الطبقات (سریۃ عبد اللہ بن عتیک) ۱/۲۹۵۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (مقتل ابی رافع الیہودی (سنۃ ۵ھ)= ابن حجر، فتح الباری ۷/۴۳۸-۴۳۲؛ عینی، عمدۃ القاری ۱۷/۱۷۹ تا ۱۸۵

[2] The Spirit of Islam P 60

مثلاً سلیم اور غطفان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں ہر طرح کے جتن کیے۔"

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری (م۱۹۹۸ء) ابو رافع کی فتنہ انگیزیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلام بن ابی الحقیق ان لوگوں میں سے تھا جن کی کوششوں اور ترغیب سے مکہ کے قریش اور عرب کے دیگر قبائل نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مدینہ طیبہ پر چڑھائی کی تھی اور مسلسل کئی روز تک مدینہ کا محاصرہ کیے رکھا تھا۔ یہ لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ سلام بن ابی الحقیق نے جنگِ خندق میں لشکر کفار کی عبرت ناک شکست کے بعد بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی معاندانہ کارروائیاں جاری رکھیں اور قبائل عرب کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بھڑکاتا رہا۔ اس کی یہ کارروائیاں ریاستِ مدینہ کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ تھیں اور جو دشمن مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتا ہے، مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ بھی اس کے خلاف جنگ کریں۔ حضور ﷺ نے اس کی پوری قوم پر عام حملہ کرنے کی بجائے چند صحابہ کرامؓ کو بھیج کر اس بدبخت کو قتل کروا دیا، تاکہ زیادہ خون خرابہ نہ ہو۔ سلام بن ابی الحقیق نے خود جو راستہ اپنایا تھا اس کا انجام وہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔ مجرم کو جرم کی سزا ملے تو اس انجام کا ذمہ دار وہ خود ہوتا ہے نہ کہ اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے والے۔"[1]

سیرت، تاریخ اور حدیث کی کتب کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ابو رافع:

۱۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو اذیتیں پہنچاتا تھا۔

[1] ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۴۱۸ھ ۷/۶۰۹

۲۔ مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ اور دیگر قبائل عرب کو برانگیختہ کرتا تھا۔

۳۔ اس نے بنو غطفان اور بنو سلیم کی مسلمانوں کے خلاف مالی امداد کی تاکہ سامانِ رسد کی قلت نہ ہو۔

۴۔ غزوہء احزاب یعنی خندق کی لڑائی کا بڑا سبب یہی شخص تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر نبی ﷺ نے اعلانِ جنگ کر کے میدانِ جنگ میں اس سے اور اس کی قوم سے لڑائی کرنے کی بجائے چند جان نثاروں کو بھیج کر اسے قتل کروادیا اور فتنے کی جڑ کٹ جانے کے بعد آپ ﷺ نے باقی یہودی قوم سے تعرض نہیں فرمایا۔

سردارانِ یہود کے قتل کے جواز پر لین پول کی گواہی

مستشرقین کا سردارانِ یہود کے قتل پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ محمد ﷺ کا عام اصول یہ تھا کہ وہ اپنے مخالفین کو دھوکے سے قتل کروادیا کرتے تھے، اگرچہ گزشتہ سطور میں اس اعتراض پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، تاہم یہاں مشہور مستشرق لین پول (Lane - Poole) کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے، جس میں موصوف نے یہودی سرداروں کے خلاف اسلامی ریاست کی طرف سے کی گئی خفیہ کارروائی کے حق کو نہ صرف بالکل درست تسلیم کیا ہے بلکہ اسے معروضی حالات میں بہترین حکمتِ عملی بھی قرار دیا ہے، چنانچہ لین پول (Lane - Poole) لکھتا ہے:

"The reason is almost too obvious to need explanation. There were no police, or law-courts, or even court martial, at Medina; some of the followers of Muhammad must therefore be the executor of the sentence of death and it was better it should be done quietly, as the executing of a man openly before his clan would have caused a brawl and more bloodshed and retaliation, till the whole city would have become mixed up in quarrel. If secret assasinations is the word for such deeds, secret assasinations was the necessary part

of the internal government of Medina. The men must be killed and best in that way."[1]

"اس کی وجہ اس قدر واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ چونکہ مدینہ میں نہ کوئی پولیس تھی، نہ عام قانونی عدالتیں اور نہ ہی فوجی عدالتیں، اس وجہ سے محمد ﷺ کے کچھ پیروکاروں کو ہی سزائے موت نافذ کرنا پڑتی تھی اور یہی بہتر تھا۔ یہ کام خاموشی سے انجام پانا چاہیے تھا، کیونکہ کسی شخص کو اس کے قبیلے کے سامنے سرعام سزائے موت دینا زیادہ نزاع، خون ریزی اور جوابی کارروائی کا باعث بنتا، حتیٰ کہ پورا شہر اس میں ملوث ہو جاتا۔ اگر اس طرح کی کارروائیوں کو خفیہ قتل کا نام دیا جائے تو خفیہ قتل مدینہ کے اندرونی نظام حکومت کا ایک لازمی حصہ تھا۔ اس طرح یہودی سردار قتل کر دیے گئے اور یہی بہترین راستہ تھا۔"

جسٹس سید امیر علی (م ۱۹۲۸ء) عہد رسالت میں کی گئی اس نوعیت کی خفیہ کارروائیوں کی وجہ جواز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Christian controversialists have stigmatised these executions as "assassinations". And because a Moslem was sent secretly to kill each of the criminals, in their prejudice against the Prophet, they shut their eyes to the justice of the sentence, and the necessity of a swift and secret execution. There existed then no Police court, no judicial tribunal, nor even a court-martial, to take congnisance of individual crimes. In the absence of a State executioner any individual might become the executioner of the law. these men had broken their formal pact. It was impossible to arrest them

[1] - Studies in a Mosque, Khayats Beriut، 1966 P. 69

in public, or execute the sentence in the open before their clans, without causing unnecessary blood-shed, and giving rise to the feud of blood, and everlasting vendetta. The exigencies of the State required that whatever should be done should be done swiftly and noiselessly upon those whom public opinion had arraigned and condemned. [1]

"عیسائی مناظرین نے اسے دغابازانہ قتل سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ اس سزا کی انجام دہی کے لیے مسلمان خفیہ طور پر بھیجے گئے تھے اس لیے وہ آنحضرت ﷺ سے تعصب کی بنا پر اس سزا کے مبنی بر عدل ہونے اور اس کے عاجلانہ اور خفیہ طور پر انجام دیئے جانے کی ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اس وقت انفرادی جرائم کی سزا دینے کے لیے کوئی پولیس، عدالت یا فوجداری عدالت بلکہ فوجی عدالت بھی نہ تھی۔ چونکہ کوئی سرکاری جلاد نہ تھا، اس لیے حکومت کی طرف سے سزا دینے کا اختیار کسی فرد کو ہی دیا جا سکتا تھا۔ چونکہ ان لوگوں نے ایک باضابطہ معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی، انہیں نہ بر سر عام گرفتار کیا جا سکتا تھا، نہ ان کے قبیلوں کے سامنے سزائے قتل دی جا سکتی تھی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو احتمال تھا کہ شدید خون ریزی ہوتی اور ثار یا انتقام خون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مملکت کی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ان لوگوں کے خلاف جنہیں رائے عامہ مستحق سزا قرار دے چکی تھی، جو کچھ بھی کرنا تھا وہ فی الفوز اور خاموشی سے کیا جائے۔"

لین پول (Lane - Poole) اور سید امیر علی کے مذکورہ بالا تجزیہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے معاہدہ شکنوں اور اعلانیہ غداروں کے خلاف معروضی حالات میں اس چارہ جوئی کو سفاکی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بہر حال مستشرقین کے ان اعتراضات کے تجزیاتی جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ

---

[1]- The Spirit of Islam P. 60

اعتراضات بھی دراصل اسی مخالفانہ مہم کی کڑی ہیں جو یہود و نصاریٰ کی طرف سے اسلام اور بانی اسلام کے خلاف ہمیشہ چلائی جاتی رہی ہے۔

پانچویں فصل

یہود کا مدینہ و خیبر سے اخراج۔ تجزیاتی مطالعہ

حدیث و سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ریاست مدینہ کے یہودی شہریوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر ریاست کے دستور کی خلاف ورزی کی تو حضور ﷺ نے ازروئے دستور ایسے افراد کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کی جو دستور کی خلاف ورزی اور بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے اور ان یہودی قبائل کے خلاف بھی کارروائی کرتے ہوئے انہیں مدینہ منورہ سے جلاوطن کر دیا۔ مستشرقین اس قسم کی تمام کارروائیوں کو خلاف انصاف بلکہ ظلم قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان کا جرم فقط اتنا تھا کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو گوئی کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کے لیے جن واقعات کو بنیاد بنایا گیا وہ بالکل معمولی نوعیت کے تھے اور ان واقعات کی بنا پر ان کے خلاف اتنا بڑا سخت اقدام کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ اسی طرح بنو قریظہ کے تمام مردوں کا قتل بھی انتہائی سفاکانہ عمل نظر آتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جن یہودی قبائل کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی ان کا حضور ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ ہی نہ تھا اور جب کوئی معاہدہ ہی نہ تھا تو عہد شکنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مستشرقین نبی رحمت ﷺ پر "خون ریزی" کی تہمت کے ثبوت میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ یہود کا مدینہ سے اخراج اور خصوصاً بنو قریظہ کے خلاف سخت کارروائی کے واقعات ہیں۔ ان واقعات کے محرکات کو مسخ کر کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہود مدینہ بے قصور، معصوم اور پرامن شہری تھے اور ان پر صرف خونریزی کے چسکے میں ظلم توڑے گئے تھے۔[1]

---

[1] ۔ ڈاکٹر عبد القادر جیلانی، اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر ص ۳۲۵

مخالفین بنو نضیر کے اخراج کے واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بنی نضیر کے ساتھ نعوذ باللہ مکر کیا یعنی جب آپ کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد کو توڑ کر انہیں جلا وطن کر دیا۔[1] اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ "محمڈنزم" کے مقالہ نگار مشہور مستشرق ولہاوزن نے اپنے مخصوص مسموم و مذموم اور طعن آمیز انداز تحریر میں غزوہ بدر کی تفصیل بیان کرنے کے بعد یہودی قبیلہ بنو قینقاع کے مدینہ سے اخراج کے واقعہ میں ان کی مظلومیت اور لاچاری دیکھاتے ہوئے لکھا ہے:

"اس لڑائی سے محمد (صلعم) کا اقتدار اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اب مدینہ میں ان کی اعلانیہ مخالفت ناممکن تھی۔ وہ خاندان جو اب تک ان کے حلقہ اثر سے باہر تھے، بعض ان سفاکانہ قتل سے ڈر کر جو محمد (صلعم) کے حکم سے عمل میں آئے تھے، اسلام کے دائرے میں آ گئے۔ اب گویا وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ یہود کا زور توڑنے کی کوشش شروع کر سکیں۔ سب سے پہلے انہوں نے کمزور بنو قینقاع کی طرف توجہ کی اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان کے انکار کے بعد سب سے پہلا موقع ہاتھ آنے پر انہوں نے ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ایک مختصر محاصرے کے بعد ان بیچاروں نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے اور ان کے لیے یہ شکر کا مقام تھا کہ ان کے پرانے حلیف ابن اُبی نے بہ مشکل رسول ﷺ کو اس امر پر راضی کر لیا کہ ان لوگوں کی جان بخش دیں اور انہیں مدینہ سے نکال دینے پر قناعت کریں۔"[2]

---

[1] - سید مودودی، الجہاد فی الاسلام ص ۳۰۲

[2] - مولوی عبد العلیم احراری، سیرۃ نبوی اور مستشرقین (اردو ترجمہ مقالہ محمڈنزم) مکتبۃ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۲۹ء ص ۶۵-۶۶

علیٰ ہذا القیاس مقالہ نگار مذکور بنو قریظہ کی غداری اور اصل جرم پر پردہ ڈالتے ہوئے ان کی قانونی سزا میں رنگ آمیزی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ بد قسمت یہودی اتحادیوں (قریش مکہ اور جنگ احزاب میں ان کے اعتمادی قبائل) کے واپس چلے جانے کی وجہ سے تلوار کے گھاٹ چڑھنے کے لیے بے یار و مددگار رہ گئے تھے چودہ دن کے محاصرے کے بعد انہیں بلا کسی شرط کے اپنے آپ کو حوالے کرنا پڑا۔ قید کر کے اسامہ بن زید کے گھر بھیج دیے گئے۔ جہاں دوسرے دن صبح کو محمد (ﷺ) نے انہیں ایک ایک کر کے مدینہ کے بازار میں بھجوایا اور وہاں قتل کرا دیا۔ یہ سلسلہ رات تک جاری رہا۔"[1]

الغرض یہود مدینہ کے اخراج اور جلاوطنی پر درج بالا قسم کے اعتراضات بلکہ تشکیکات و تلبیسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اس لئے آئندہ سطور میں ہم ان اعتراضات و اشکالات بلکہ الزامات کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کریں گے۔

اشکالات و شبہات کا تحقیقی جائزہ

اس سلسلے میں ایک اصولی اور بنیادی بات جس سے کوئی باشعور آدمی انکار نہیں کر سکتا، یہ ہے کہ ہر معاہدہ میں طرفین پر کچھ ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔ اگر وہ ذمہ داریاں ادا نہ کی جائیں تو معاہدہ کا کوئی معنیٰ اور قدر و قیمت ہی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں معاہدہ یا صلح نامہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ معاہدہ ہو جانے اور امان مل جانے کے بعد مفتوح قوم / معاہدین جو شرارت چاہیں کریں، جس طرح چاہیں فساد و بد امنی پھیلائیں، حکومت کے خلاف سازشیں کریں، دشمنوں سے گٹھ جوڑ کریں اور ان حرکات پر ان سے کوئی باز

[1] ۔ حوالہ مذکور ص ۴۷

پردہ پوشی نہ کی جائے۔ مستشرقین عموماً اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا دامن داغدار کرنے اور اسلام کے خلاف اپنی "ازلی بھڑاس" نکالنے کے لیے "یک طرفہ ٹریفک" چلاتے ہیں۔ انہیں یہ تادیبی کارروائیاں تو نظر آتی ہیں مگر ان کی باغیانہ حرکات، دستور مدینہ کی خلاف ورزی اور ریاست کے خلاف سازشیں اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ سازباز نظر نہیں آتی۔ یہود کی طرف سے عہد شکنی کے متعدد واقعات (جن کی طرف آئندہ سطور میں اشارہ کیا جائے گا) میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہود کے کسی ایک قبیلہ کی عہد شکنی کی خاموش تائید کرنے کے باوجود سب قبائل کے خلاف کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بلکہ جب تک کوئی قبیلہ کھلم کھلا عہد شکنی کا مرتکب نہیں ہوا اس کے خلاف تادیبی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس اجمال کی تفصیل ہم آئندہ سطور میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ اہل کتاب خصوصاً یہود اپنی آسمانی کتابوں میں پیغمبر اسلام کے احوال و اوصاف نشانیوں اور پیشین گوئیوں کی موجودگی کی بنا پر بفحوائے قرآنی آپ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے سگے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔[1] علاوہ ازیں قرآن مجید میں حتی الامکان اہل کتاب کے ساتھ تعاون، مدارات اور حسن معاشرت کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کا اپنا معمول یہ تھا کہ جن معاملات میں اسلام کا باقاعدہ حکم نازل نہ ہوتا ان میں یہود کے طرز عمل کی موافقت فرماتے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔[2] اس سب کچھ کے باوجود یہود نے اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ جو ہمیشہ معاندانہ اور مخالفانہ رویہ اختیار کیے رکھا اور جس طرح کی خفیہ اور کھلم کھلا شرارتوں، شرانگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا ارتکاب کرتے رہے، ان کے

---

[1] - ارشاد الٰہی ہے: الذین آتیناھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم و ان فریقا منھم لیکتمون الحق و ھم یعلمون۔ ترجمہ: "جنہیں ہم نے کتاب دی وہ (آسمانی کتابوں کے حوالے سے) اس (نبی ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بے شک (اس کے باوجود) ان میں سے کچھ لوگ حق (آخری نبی کی شان، نبوت) کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ (اس حق کو) جانتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲: ۱۴۶)

[2] - دیکھئے: شاہ معین الدین ندوی، تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ لاہور ۱/ ۶۴

تذکرہ سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حدیث اور تاریخ کی کتابیں ان کی شرارتوں پر گواہ ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مقام متحمل نہیں ہو سکتا۔[1]

یہود کے اس رویے اور طرز عمل کو دیکھتے ہوئے نبی رحمت ﷺ نے ان کے حسد، عناد اور فتنہ و فساد کے انسداد دوسرے مدینہ کی سماجی سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کے پیش نظر ہجرت کے تھوڑا عرصہ بعد مہاجرین، انصار اور یہود مدینہ کے درمیان ایک تحریری معاہدہ فرمایا۔ اس معاہدہ کا تفصیلی تذکرہ کتاب المغازی للواقدی، سیرۃ النبی لابن ہشام، کتاب الاموال لابی عبید، البدایہ والنہایہ لابن کثیر اور تاریخ طبری وغیرہ میں موجود ہے۔[2] عصر حاضر کے معروف محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بڑی صراحت اور دلائل سے

---

[1] - اہل اسلام کے ساتھ یہود کے باطنی بغض وعداوت کی ایک جھلک سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۸-۱۲۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ابن کثیر نے ان متعدد شر پسند احبار کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دشمنی اور مخالفت کو اپنا مشن بنا رکھا تھا۔ ملاحظہ ہو: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۲/ ۳۴۲-۳۴۴ نیز دیکھیے: مودودی، سیرت سرور عالم، ۱/ ۶۳۸-۶۳۷؛ شاہ معین الدین، تاریخ اسلام ۱/ ۶۴، ۶۵؛ Montgomery Watt, Muhammad at Madina, P:201 ; Stanley Lane – Poole, Studies in Mosques, Khanayats Beirut, 1966, P: 67–68

[2] - تفصیل کے لیے دیکھیے: واقدی، کتاب المغازی، جامعہ آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، ۱/ ۱۷۶؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (کتابہ ﷺ بین المہاجرین والانصار و موادعۃ یہود) دار المعرفۃ بیروت لبنان ت-ن القسم الاول ص ۵۰۴-۵۱۰؛ ابن کثیر، السیرۃ النبیوۃ، دارالمعرفۃ بیروت، ۲/ ۳۲۰-۳۲۳؛ ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، دار المعرفۃ بیروت۔ لبنان ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۲ء ۱/ ۲۳۹؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ (اردو ترجمہ بنام سیاسی وثیقہ جات از ابو یحییٰ امام خان نوشہروی) مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۰ء ص ۲۴-۱۹ وھبۃ الزحیلی، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام (اردو ترجمہ از مولانا حکیم اللہ) شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ ۲۰۱۰ء ص ۲۰۸ تا ۲۲۲ = ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور ص ۱۷۸؛ W. Montgomery Watt, Muhammad at Medina, P:196 and 221 to 225 ; Stanley Lane – Poole, Studies in a Mosque, P: 66

اسے معاہدہ کی بجائے دستور بلکہ دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے۔[1]

اس معاہدہ کی تفصیل اور تمام دفعات کا احاطہ یہاں مقصود نہیں۔ زیر بحث موضوع کے حوالہ سے چند دفعات ملاحظہ ہوں:

بنو عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ہی قوم شمار ہوں گے۔ مگر یہودیوں کا دین اپنا ہو گا اور مسلمانوں کا اپنا۔ اس قومیت میں یہ لوگ خود بھی شامل ہوں گے اور ان کے آزاد کردہ غلام (موالی) بھی۔ ہاں اگر کسی نے ظلم کیا یا کوئی اور خلاف ورزی کی تو اس کا معاملہ دوسرا ہو گا۔ (اس دفعہ کے بعد ۹ دفعات میں ۹ مختلف یہودی قبائل کا نام لے کر درج کیا گیا ہے کہ ان کے لیے بھی یہی بنو عوف کا ضابطہ ہو گا) یہ کہ اس صحیفہ والوں کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو تمام فریق (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے نیز خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کریں گے ان کا شیوہ وفاداری ہو گا نہ کہ عہد شکنی۔ یہ کہ یثرب پر جو بھی حملہ آور ہو گا تو اس کے مقابلے میں یہ سب (یہودی اور مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

اس معاہدہ پر سید صباح الدین کا یہ تبصرہ قابل ملاحظہ ہے:

"یہ معاہدہ رسول اللہ ﷺ کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی کی ایک ایسی مثال ہے جس پر دنیا ناز کر سکتی ہے۔ موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر معاہدہ نہیں کرا سکتیں مگر اس رواداری کے باوجود یہودی نچلے نہیں بیٹھے۔"[2]

---

[1] - دیکھئے عہد نبوی میں نظام حکمرانی، نگارشات پبلشرز، لاہور ۲۰۰۹ء ص ۸۹-۶۷

[2] - اسلام میں مذہبی رواداری ص ۷۱-۷۰

نوٹ: سید صباح الدین نے قرآنی آیات کے حوالے سے یہود مدینہ کی بد کرداری اور پیغمبر اسلام ﷺ و اہل اسلام کے ساتھ ان کے معاندانہ اور شریرانہ رویے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دیکھیے یہی کتاب ص ۷۰/۶۸

جن قبائل سے آپ ﷺ نے یہ معاہدہ فرمایا، ان میں یہودی نسل کے تینوں بڑے بااثر قبیلے بنو قینقاع بنی نضیر اور بنو قریظہ شامل تھے۔[1] یہ تینوں قبائل علیحدہ علیحدہ بستیوں میں مضافات مدینہ میں آباد تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے تمام یہودی قبائل ریاست مدینہ کے شہری تھے اور ان کے لیے قانونی طور پر ضروری تھا کہ وہ ریاست کے قوانین کی پابندی کریں۔ قانونی طور پر ان کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ مدینہ کا شہری ہوتے ہوئے ایسے کام کریں اور ایسی سازشیں کریں جن سے ریاست کا امن بلکہ سلامتی اور وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ مختلف یہودیوں کے خلاف انفرادی یا اجتماعی طور پر جو بھی کارروائی کی گئی اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ لوگ ریاست کے خلاف بغاوت اور سازش کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ جو لوگ آج اپنے آپ کو مہذب سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی ریاست کے غداروں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو حضور ﷺ نے اپنی ریاست کے غداروں کے ساتھ کیا تھا۔ اس معاہدہ کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ:

ان لّا یظاھروا علیہ عدواً۔[2]

"کہ وہ پیغمبر اسلام کے خلاف دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔"

مگر انہوں نے اس شرط کی پاسداری نہیں کی بلکہ ہر موقعہ پر دشمنان اسلام اور قریش مکہ کی مدد کرتے رہے جس کے باعث حضور اکرم ﷺ کو ان کے خلاف کارروائی کرنا پڑی۔ جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے۔ مشہور مؤرخ سید امیر علی یہود کے غیر قانونی و غیر اخلاقی طرز عمل، اسلام دشمن سرگرمیوں، شرارتوں مخالفانہ بلکہ باغیانہ حرکات اور ریاست کے خلاف سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 - دیکھیے: ابن حجر، فتح الباری ۷/۳۱۴؛ نیز: Montgomery Watt, Muhammad at Madina, P: 196

2 - ملاحظہ ہو: امام محمد، السیر الکبیر (مع شرح للسرخسی) دار الکتب العلمیہ بیروت ۵/۳ (باب الموادعۃ)؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱/۱۷۶ اندوی، شاہ معین الدین احمد، تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ لاہور ت-ن ۱/۳۵؛ نیز: Montgomery Watt, Muhammad at Madina, P: 196

"وہ آنحضرت ﷺ کی شان میں نامناسب کلمات استعمال کرتے اور قرآن کے الفاظ، نماز کے کلمات اور مسلمانوں کے عام راہ و رسم کے الفاظ کا تلفظ جان بوجھ کر کچھ اس طرح بگاڑ دیتے کہ وہ مہمل اور مضحکہ خیز یا کلمات کفر بن جاتے۔ یہودی شعراء اور شاعرات جن کی اس وقت بھرمار تھی، تہذیب و شائستگی اور عربوں کے مسلّمہ ضابطہ شرافت و فتوت کو بالائے طاق رکھ کر مسلمان عورتوں کی ہجو میں فحش اشعار لکھتیں۔ لیکن یہ سب تو ان کے لیے خفیف سی بد تمیزیاں تھیں۔ مسلمان عورتوں کی توہین اور آنحضرت ﷺ کی شان میں بدگوئیوں سے ان کی تسلّی نہ ہوئی۔ چنانچہ جس ریاست کی حفاظت میں رہنا انہوں نے باقاعدہ طور پر قبول کیا تھا، اس کے دشمنوں کے پاس انہوں نے ایلچی بھیجے۔ قریش جو آنحضرت ﷺ کے قتل پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، عبداللہ بن ابی اور غدّار اسرائیلیوں کی مخبری کی بدولت مسلمانوں کی کمزور حالت سے پوری طرح واقف تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہودیوں نے محض وقتی مصلحت کی بنا پر آنحضرت ﷺ سے اتحاد کیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے قرب و جوار مدینہ میں منہ دکھاتے ہی یہواہ کے پرستار آنحضرت ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر بُت پرستوں سے جاملیں گے۔"[1]

سید موصوف اسی ضمن میں چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

"ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپ دشمنوں کے طعنوں اور بدزبانیوں کو برداشت کرسکتے تھے لیکن رئیس مملکت کی حیثیت سے اور تقریباً "مسلسل جنگ کے زمانہ میں ایک جرنیل" کی حیثیت سے، جبکہ مدینہ عسکری مدافعت کی حالت میں اور ایک قسم کے

---

[1] روح اسلام (اردو ترجمہ از محمد ہادی حسین) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع دوم ۱۹۸۰ء ص ۱۴۸

فوجی نظم ونسق کے تحت تھا، آپ کے لیے غداری سے چشم پوشی کرنا ناممکن تھا۔ رعایا کی طرف سے آپ پر جو فرض منصبی عائد ہوتا تھا اس کا تقاضا تھا کہ آپ ایک ایسے گروہ کو دبادیں جو حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں شہر کو تاخت وتاراج کرا سکتا تھا اور کرانے کی کوشش سے بھی نہ چوکا۔ مملکت کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ ایسے غداروں کا قلع قمع کر دیا جائے جو یا تو مدینہ کے اندر بغاوت کا بیج بو رہے تھے یا مشترک دشمن کو خبریں دے رہے تھے۔"[1]

بہر کیف ان غداران ریاست کے خلاف تادیبی کارروائیوں اور ان کے وجوہ واسباب کا خلاصہ درج ذیل ہے:

بنو قینقاع کا اِخراج اور اس کی وجہ

مدینہ کے یہودی قبائل میں بنو قینقاع دیگر قبائل کے مقابلے میں تعداد میں زیادہ اور پیشہ کے لحاظ سے زرگر تھے۔ غزوہ بدر کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور ایسی حرکات کیں جو دستور سے کھلی بغاوت اور جنگ کی دعوت کے مترادف تھیں۔ سب سے پہلے اسی قبیلہ نے میثاق مدینہ کی عہد شکنی کی۔[2] غزوہ بدر کے بعد ان کی شرارتوں اور حرکات کو دیکھتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے انہیں ان کے اپنے ہی بازار "سوق بنی قینقاع" میں جمع کیا اور فرمایا:

"اے یہود! اسلام قبول کر لو قبل اس کے کہ تمہارے اوپر بھی وہی افتاد پڑے جو قریش مکہ پر پڑ

---

[1] - حوالہ مذکور ص۱۴۹

[2] - دیکھئے امام محمد، السیر الکبیر (مع شرح السیر للسرخسی) باب الموادعۃ، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۳/۵؛ واقدی، کتاب المغازی (غزوہ قینقاع)، ۱/۱۷۷؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مکتبہ حقانیہ پشاور ۴/۳۷۶؛ المقریزی، امتاع الاسماع ۱/۱۲۲؛ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲/۲۶۴؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، دار احیاء التراث العربی بیروت ۳/۵۴؛

نوٹ: سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۵۸ (و اما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم الخ) انہیں کے بارے نازل ہوئی۔ دیکھیے عربی اردو تفاسیر تحت آیت

چکی ہے۔"[1]

اس پر انہوں نے حضور اکرم ﷺ جو رئیس ریاست بھی تھے، کو جو دھمکی آمیز جواب دیا وہ ہتک آمیز اور بغاوت کے مترادف ہی نہیں بلکہ اعلان جنگ تھا، انہوں نے کہا:

یا محمد لا یغرنک من نفسک انک قتلت نفراً من قریش کانوا غماراً لا یعرفون القتال انک لو قاتلتنا لعرفت انا نحن الناس و انک لم تلق مثلنا۔[2]

"اے محمد! آپ اس دھوکہ میں نہ رہیے کہ آپ نے قریش کے ایسے چند آدمیوں کو قتل کر دیا جو ناتجربہ کار تھے اور لڑنا نہیں جانتے تھے۔ اگر آپ نے ہمارے ساتھ جنگ کی تو آپ جان لیں گے کہ ہم بھی کوئی لوگ ہیں اور آپ نے ہم جیسے لوگوں کے ساتھ کبھی مڈبھیڑ نہیں کی۔"

بنو قینقاع کی طرف سے یہ معاہدہ کی خلاف ورزی اور واضح اعلان جنگ تھا۔ اس کے باوجود آپ خاموشی سے واپس تشریف لائے مگر اس کے بعد انہوں نے ایک ایسی بدتمیزی اور شرم و اخلاق سے عاری حرکت کی جس پر ان کے خلاف کارروائی ناگزیر ہو گئی۔ وہ یہ کہ ایک مسلمان خاتون نقاب پوش ان کے بازار

---

1 - فرمان نبوی کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ بنو قینقاع کی باغیانہ اور معاندانہ حرکتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ قریش مکہ جیسے حشر کے مستحق ہو چکے تھے۔ ورنہ اسلام لانے کے لیے کبھی کسی پر دباؤ نہیں ڈالا گیا، یہ دعوت اسلام بھی یقیناً ان کے بچاؤ اور مفاد کے لیے تھی۔ دیکھیے: امام محمد، السیر الکبیر مذکور ۴/ ۵

2 - ابو داود، السنن (کتاب الخراج والفیٔ والامارۃ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ) ۲/ ۷۲، رقم ۳۰۰۱۔ نیز دیکھیے: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، طبع مذکور ۴/ ۷۷-۳۷۶؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳/ ۵ ابن خلدون، تاریخ (غزوۃ بنی قینقاع) ۲/ ۴۱۹؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی، دار احیاء التراث العربی بیروت ۳/ ۳۵ (امر بنی قینقاع)= المقریزی، امتاع الاسماع، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱/ ۱۲۲؛ بیہقی، السنن الکبری ۹/ ۱۸۱ رقم ۱۹۱۳۱؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱/ ۱۷۶

میں آئیں۔ ایک دوکاندار نے ان کے ساتھ شرارت کی جس پر وہ بے پردہ ہو گئیں۔ اس مظلومہ کی پکار پر ایک غیرت مند مسلمان نے اس یہودی دوکاندار کو مار ڈالا اور یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ منٹگمری واٹ نے بھی ان کی شرارت اور بد تمیزی کا اعتراف کیا ہے۔[2] فضا کشیدہ تھی ہی، مقتول مسلمان کے ورثاء اور ان کے حلیف بگڑے تو پوری یہودی آبادی مسلم آبادی پر ٹوٹ پڑی۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر راشن پانی بند ہونے کی وجہ سے اس پر راضی ہو گئے کہ ان کے بارے میں حضور ﷺ جو فیصلہ کریں گے وہ انہیں منظور ہو گا۔ حضور ﷺ انہیں بغاوت کی سزا میں قتل کرنا چاہتے تھے مگر ان کے حلیف عبد اللہ بن ابی کی پر زور سفارش پر انہیں مدینہ منورہ سے بال بچوں سمیت بحفاظت نکلنے کی اجازت دے دی۔ البتہ ان کے ہتھیار اور اموال ضبط کر لیے گئے۔[3]

اصولی اور قانونی طور پر بنو قینقاع کی یہ سزا ان کی سرکشی، دستور کی خلاف ورزی، بغاوت، ایک مسلمان خاتون کی عزت نفس اور عفت و عصمت پر حملہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔

بنو نضیر کی جلاوطنی اور اس کا سبب

بنو قینقاع کی جلاوطنی کے کوئی سال بعد یہود کا دوسرا قبیلہ بنو نضیر بھی مدینہ منورہ سے شہر بدر

---

1 - واقدی، کتاب المغازی (غزوہ قینقاع) ۱/۱۷۶-۱۷۷؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳/۶

2 - Montgomery wat, Muhammad Prophet and statesman, P. 130

3 - تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ، دار احیاء التراث العربی بیروت ۴/۳؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱۷۸-۱/۱۷۷؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۳/۶-۷؛ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ طبع مذکور ۴/۷۷-۳؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی نگارشات پبلشرز، لاہور ۲۰۰۸ء ص ۲۱۷۔ سید امیر علی، روح اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۰ ص ۱۶۷-۱۶۸؛ المقریزی، متاع الاسماع ۱/۱۲۲؛ ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمد ص ۲۸۰-۲۷۹؛ ابن قیم، زاد المعاد (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی کراچی) ۱۹۹۰ء، ۲/۷۴۸

کیا گیا۔ بنو نضیر نے بھی اعلانیہ اس معاہدے کی خلاف ورزی کی جو ان کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان طے پایا تھا۔ انہوں نے عملاً دو بار نبی اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی ناپاک سازش کی۔ ایک دفعہ یوں کہ کفار مکہ کے اکسانے پر بنو نضیر نے نبی اکرم ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں ہم بھی اپنے احبار کو لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہمیں بھی کوئی عذر نہ ہو گا۔ چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے اس لیے آپ نے پیغام بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپ ﷺ بنو قریظہ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کے لئے کہا تو انہوں نے تعمیل کی۔ یہ دیکھ کر بنو نضیر بھی آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہ علماء اگر آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ آپ ﷺ نے منظور فرما لیا۔ لیکن راستے میں آپ کو مصدقہ ذرائع سے معلوم ہو گیا کہ وہ تو آستینوں میں خنجر چھپا کے بیٹھے ہیں تو آپ ﷺ واپس آ گئے اور یوں ان کی یہ سازش ناکام ہو گئی۔[1]

بنو نضیر نے حضور ﷺ کو شہید کرنے کی دوسری سازش اس وقت کی جب آپ ﷺ حسب معاہدہ ایک خون بہا کی ادائیگی کے سلسلے میں (جس کی تفصیل طوالت کا باعث ہو گی) ان سے بات چیت کرنے کے لیے ان کے پاس بمع چند صحابہ تشریف لے گئے۔ انہوں نے گفتگو تو آپ ﷺ سے بڑی خوش اخلاقی سے کی اور رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ سازش بھی کی کہ مکان کی چھت سے ایک شخص پتھر پھینک کر آپ ﷺ کو شہید کر دے۔ حضور ﷺ کو باعلام الٰہی اس سازش کا علم ہو گیا اور آپ ﷺ

---

[1] - دیکھیے: ابو داود، السنن (کتاب الخراج والفیئی والامارۃ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ۔ ۲/ ۴۷-۴۳، رقم ۳۰۰۴

خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔[1] صحابہ کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی واپس آگئے۔ منٹگمری واٹ اور دوسرے مستشرقین نے بھی بنو نضیر کی اس مجرمانہ اور باغیانہ حرکت اور سازش کا اعتراف کیا ہے[2] اس کے بعد آپ ﷺ نے بنی نضیر کے پاس یہ تحدیدی پیغام بھیجا کہ وہ دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دیں۔ پر امن طور پر مدینہ خالی کرنے کی صورت میں انہیں یہ رعایت بھی دی گئی کہ ان کے باغات پر ان کی ملکیت تسلیم کی جائے گی اور ان کی پیداوار پر ان ہی کا حق ہو گا۔ بنو نضیر نے عبداللہ بن ابی کے اکسانے اور اس کی مدد کے وعدہ پر یہ تحدیدی پیغام رد کرتے ہوئے قلعہ بندی کر لی۔ جو ایک طرح کا اعلان جنگ تھا۔ جس پر نبی اکرم ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔[3]

الغرض بنو نضیر کی ان غداریوں اور عیاریوں کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان پر حملہ کر دیا۔ پندرہ دن تک ان کا محاصرہ فرمایا۔ قلعہ کے ارد گرد جو ان کے درخت تھے انہیں کٹوا دیا۔ بالآخر وہ خائب و خاسر ہو کر امن کے خواستگار ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا دس دن کی مہلت ہے۔ مدینہ خالی کر دو۔ اہل و عیال کو جہاں چاہو لے جاؤ۔ سامان حرب اور باغات کو چھوڑ کر جس قدر ساز و سامان تین آدمی ایک اونٹ پر لے جا سکتے ہو اس کو لے جانے کی اجازت ہے۔ مال کے اتنے حریص تھے کہ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں

---

[1] ۔ اگر حضور اکرم ﷺ یہودیوں پر یہ ظاہر فرما دیتے کہ مجھے تمہاری سازش کا علم ہو گیا ہے تو اس بات کا خدشہ تھا کہ یہودی فوراً کچھ کر گزرتے۔ شاید اسی وجہ سے آپ ﷺ اکیلے وہاں سے تشریف لے گئے اور اپنے واپس آنے کا صحابہ کو بھی نہ بتایا۔ اس سے یہودیوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ آپ ﷺ کسی ضروری کام سے تھوڑی دیر کے لیے اٹھے ہیں اور ابھی واپس آجائیں گے۔ دیکھئے: ابن سعد، الطبقات الکبری ۲/۲۷۸؛ ابن ہشام، سیرۃ النبی داراحیاء التراث العربی بیروت ۳/۲۱۱؛ المقریزی، امتاع الاسماع ۱/۱۸۸؛ ہیکل، حیاۃ محمد ص۳۰۸؛ ابن خلدون، تاریخ (غزوۃ بنی النضیر) ۲/۴۲۶-۴۲۵

[2] – W.Montgomery wat, Muhammad Prophet and statesman,P. 149

[3] ۔ واقدی، کتاب المغازی، ۱/۳۶۷-۳۶۹

تک اکھیڑ کر لے گئے اور شاید جان بچ جانے کی خوشی میں جشن مناتے اور گانے گاتے ہوئے مدینہ منورہ سے جلاوطن ہو گئے۔[1]

اس معاملے میں سید امیر علی کی رائے یہ ہے کہ ان کا مکان گرا کر دروازے اور کھڑکیاں اٹھا کر لے جانا اس نیت (بدنیتی) سے تھا کہ مسلمان ان مکانوں میں رہ نہ سکیں۔[2]

بنو نضیر کی اسلام دشمنی کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہو گا کہ مدینہ منورہ سے اخراج ان کے لیے سبق نہ بن سکا۔ بلکہ ان کی اکثریت نے خیبر میں قیام کیا اور وہاں سے ریاست مدینہ کی تباہی کی سازشیں کیں۔[3] اس سلسلے میں سید مودودی لکھتے ہیں:

"جن دشمنوں کو آپ ﷺ نے قابو میں آجانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپ ﷺ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا۔ اور دو ہی سال بعد ۲۴ ہزار کا لشکر جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اگر آپ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہر گز نہ اٹھتا لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی کہ کسی مغلوب دشمن کی التجائے رحم کو رد کر دیتے آپ کو ان کے جذبہ عناد کا حال خوب معلوم تھا اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین

---

[1] - تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ابو داود، السنن (کتاب الخراج والفیئ والامارۃ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ) ۲/۴۷ رقم ۳۰۰۴؛ سورۃ الحشر کی ابتدائی آیات اور ان کی تفسیر از کتب تفسیر = ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۲/۷۸؛ ہیکل، حیاۃ محمد ص ۳۱۰-۳۰۹؛ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ (امر اجلاء بنی النضیر) ۳/۲۱۴-۲۱۰ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ طبع مذکور ۲/۴۵۵-۴۶۵ المقریزی، امتاع الاسماع (غزوۃ بنی النضیر) ۱/۱۹۰؛ ابن قیم، زاد المعاد (اردو ترجمہ) طبع مذکور، ۲/۷۵۰-۷۴۹ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ) ص ۴۴؛ واقدی، کتاب المغازی، ۱/۳۶۷-۳۶۸

[2] - روح اسلام (اردو ترجمہ) ص ۱۶۹

[3] - حوالہ مذکور ص ۱۷۰ نیز مولوی عبد العلیم، سیرۃ نبوی اور مستشرقین ص ۷۲؛ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور ص ۲۰۴

سے نہ ہٹیں گے۔ مگر اس کے باوجود جب انہوں نے جاں بخشی کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے اُسے قبول کر لیا۔[1]

مشہور ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن بنو نضیر کی جلاوطنی کے جواز اور اس اقدام کے انتہائی کریمانہ اور حسن سلوک پر مبنی ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگرچہ حضور انور یہودیوں سے از خود کبھی ایسا سلوک نہ کرتے اگر وہ ایسا کرنے پر مجبور نہ کیے جاتے۔ مجبور کیے جانے پر بھی آپ نے ایسا کریمانہ اور مشفقانہ سلوک کیا ہے جس کی یاد سے اب بھی انسانی اخلاق میں ایک رفعت و بلندی پیدا ہوتی ہے۔ جنگ میں دشمنوں کو مغلوب کر لینے کے بعد کون غارت گری اور لوٹ مار سے باز رہ سکتا ہے۔ مگر حضور انور نے کسی کی جان و مال سے تعرض نہیں کیا۔ ہتھیار اس لیے رکھ لیے گئے تھے کہ آزاد ہو کر ابھی کوئی اور فتنہ برپا نہ کریں۔ تھوڑا بہت مال جو باقی رہ گیا تھا وہ تاوان جنگ سمجھ لیجئے۔ اس لیے ایسی صورت میں یہ سلوک انتہائی رحم و کرم کا ہے۔ جو عربی تہذیب و تمدن کے لیے اس وقت ایک نئی بات تھی۔"[2]

بنو قریظہ کے خلاف کارروائی کا محرک اور اس کی وجوہات

یہود مدینہ کے تیسرے نامور قبیلہ بنو قریظہ کے خلاف تادیبی کارروائی کا محرک کیا تھا؟ اس کا خلاصہ یوں ہے کہ شوال ۵ھ میں خیبر کے یہودی سرداروں کے ایماء پر قبائل عرب نے غزوہ خندق یا غزوہ احزاب کے موقعہ پر مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا تو میثاق مدینہ کی رو سے بنو قریظہ کا فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کے

---

[1] - دیکھئے: الجهاد فی الاسلام ص ۳۰۶

[2] - عرب کا چاند، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور ت ـن ص ۳۱۳

ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ اور مدینہ منورہ کا دفاع کرتے۔[1] ابتداء میں خندق کی کھدائی کے لیے اوزار کے دیئے انہوں نے تعاون بھی کیا۔[2] لیکن پھر بنو نضیر کے سردار حیی بن اخطب کے کہنے اور معروضی حالات کے پیش نظر انہوں نے یہ سمجھا کہ اب مسلمانوں کے بچ رہنے کا کوئی امکان نہیں تو انہوں نے شہر کے امن میں خلل اندازی شروع کر دی۔ حضور ﷺ نے ان کے پاس آدمی بھیجے اور انہیں معاہدے کی پابندی کا حکم دیا تو انہوں نے کہا:

"محمد کون ہیں؟ ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ ہمارا ان کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہیں۔"[3]

بنو قریظہ کے یہودیوں نے اس قلعے پر حملے کی سازش بھی کی جس میں مسلمانوں نے عورتوں اور بچوں کو حفاظت کے لیے جمع کر رکھا تھا۔[4] لہٰذا مغربی مصنفہ Batye'or کا بنو قریظہ کے متعلق یہ دعویٰ کرنا خلاف واقعہ ہے کہ "Who had been neutral during the siege[5]" جو مدینہ منورہ کے محاصرہ کے دوران غیر جانبدار تھے۔)

اسی طرح منٹگمری واٹ بنو قریظہ پر حضور ﷺ کے حملہ اور ان کے محاصرہ کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ

> The reason, of course, was that, while the outward acts of Clan had been correct, they had been intriguing with Muhammad's enemies and at one

---

1 - دیکھیے ابن سعد، الطبقات الکبری ۲/۲۸۸، ابن کثیر، البدایہ والنہایہ دار المعرفۃ بیروت ۴/۹۹؛ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور ص ۲۰۶

2 - ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ص ۲۲۳

3 - محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ص ۳۳۳۔ قاضی سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین ۱/۱۳۲

4 - محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ص ۳۳۵

5 - The Dhimmi (Historical outline) p.44

point had been on the verge of attacking Muhammad in his rear. They had thus been guilty of treasanable activities against the Medina Community.[1]

اس محاصرہ کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ظاہری حرکات اگرچہ ٹھیک تھیں لیکن وہ دشمنان محمد کے ساتھ خفیہ سازش اور منصوبہ بندی کر رہے تھے اور ایک موقعہ پر تو وہ آپ ﷺ کے پیچھے سے حملہ کرنے پر تیار بھی ہو گئے تھے، یوں وہ ریاست مدینہ کے خلاف مجرمانہ سرگرمیوں کے جرم کے مرتکب ٹھہرے۔

مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔ خارجی دشمن کے مقابلے میں یہ داخلی دشمن زیادہ بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ بہر کیف مسلمانوں کو اپنے لشکر کا، جو پہلے ہی دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھا، ایک حصہ بنو قریظہ کے حملوں کے دفاع کے لیے مقرر کرنا پڑا۔ اللہ نے ان مایوس کن حالات میں اپنے دین اور اس کے مخلص پیروکاروں کی حفاظت فرمائی خدائی مدد طوفان کی شکل میں نازل ہوئی۔ تمام کفار مدینہ کا محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے۔[2]

جب کفار محاصرہ اٹھا کر چلے گئے تو حضور اکرم ﷺ نے بنو قریظہ کو اپنے طرز عمل کی وضاحت کے لیے طلب فرمایا۔ وہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مسلمانوں نے حضرت جبریلؑ کی ہدایت پر ان کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ پچیس دن جاری رہا جب انہیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو انہوں نے پیشکش کی کہ ان کے حلیف قبیلہ بنو اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ ان کے بارے جو فیصلہ کریں انہیں وہ فیصلہ منظور ہو گا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کی درخواست منظور فرمالی۔ حضرت سعد کو طلب کیا گیا۔ انہوں نے بغیر کسی دباؤ کے بنو قریظہ کے جرائم اور توراۃ کے حکم کے مطابق ایسا فیصلہ دیا کہ جس پر حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: لقد اصبت حکم اللہ فیہم (تم ان کے معاملے میں اللہ کے حکم تک پہنچ گئے ہو) بہر کیف انہوں نے

---

[1] Muhammad Prophet and statesman,P. 149

[2] ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ الاحزاب ۳۳: ۲۰-۹، اور ان آیات کی تفسیر نیز کتب سیرۃ میں غزوہ احزاب

کہا:

۱۔ بنو قریظہ کے جنگجو مرد قتل کر دیے جائیں۔

۲۔ عورتیں اور بچے مملوک / غلام بنا لیے جائیں۔

۳۔ ان کے اموال ضبط کر کے تقسیم کر دیے جائیں۔

اس کے بعد اس فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔[1]

بنو قریظہ کی سزا پر مسلم و غیر مسلم مفکرین کا تبصرہ و تجزیہ

اب ہم بنو قریظہ کو دی گئی سزا پر چند مسلم و غیر مسلم مفکرین کی رائے اور تبصرہ پیش کریں گے، چنانچہ یہودی قبائل خصوصاً بنی قریظہ کو دی گئی سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے سید امیر علی کہتے ہیں:

"مختلف یہودی قبائل کو جو سزا دی گئی اس نے میور (Muir) اسپرنگر (Spranger) وائل (Weil) اور اوزبرن (Osborn)، جیسے آنحضرت ﷺ کے سوانح نگاروں کے لیے آپ ﷺ پر حملے کرنے کا ایک موقع مہیا کر دیا ہے۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کو جو سزا دی گئی وہ اس سزا سے بہت ہلکی تھی جس کے وہ مستحق تھے۔ صرف بنی قریظہ کے ساتھ سختی برتی گئی۔ انسانی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی شخص کے افعال چاہے کتنے ہی مجرمانہ ہوں، اگر اس سے ایسا برتاؤ کیا جائے جو ہمیں درشت یا ظالمانہ معلوم ہوتا ہے تو ہماری طبیعت میں قدرتی طور پر اس برتاؤ کے خلاف ایک

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: واقدی، کتاب المغازی (غزوہ بنی قریظہ)، ۲/۴۹۸-۵۱۳ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دار المعرفۃ بیروت ۴/۵۰۸؛ طبری، تاریخ الطبری، روائع التراث العربی بیروت ۲/۵۸۸-۵۸۷؛ المقریزی، امتاع الاسماع، ۱/۲۴۹-۲۴۸؛ ابن سعد، الطبقات الکبری ۲/۲۸۸؛ زیلعی، نصب الرایہ (کتاب السیر)، ۳/۴۰۲-۴۰۱ ابن خلدون، تاریخ (غزوۃ بنی قریظہ) ۲/۴۲۹؛ ابن قیم، زاد المعاد، (اردو ترجمہ ۳/۷۵۳-۷۵۰؛ سمہودی، وفاء الوفاء، باخبار دار المصطفی، ۱/۳۰۵-۳۰۷؛ ہیکل، حیاۃ محمد ص ۳۳۹

جذبۂ بغاوت پیدا ہو جاتا ہے اور رحم انصاف پر غالب آجاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی وہ ہمارے نقطہ نگاہ سے سخت تھی، لیکن اس امر پر چاہے کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ (اگرچہ خود ان کی درخواست پر) ایک غضبناک سپاہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا اور چاہے ہمیں اس امر پر بھی کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ اس شخص کے فیصلے پر فوراً عمل کیا گیا، پھر بھی ہمیں جذباتِ رحم سے متاثر ہو کر جرم اور اس کی منصفانہ سزا کے مسئلہ کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ ہمیں ان لوگوں کے جرائم کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ان کی غدّاری، ان کی کھلم کھلا دشمنی اور ان کا ایک ایسے معاہدہ سے انحراف جس کی پابندی کا انہوں نے حلف اُٹھایا تھا۔"[1]

بنی قریظہ کو دی گئی سزا کے قانونی جواز پر بحث کرتے ہوئے سید موصوف مزید لکھتے ہیں:

"ان لوگوں پر جو کچھ گزری وہ ان کے اپنے کیے کی سزا تھی۔ اگر انہیں سعد بن معاذ ؓ کے فیصلہ کے بغیر بھی قتل کر دیا جاتا تو یہ اس زمانے کے قوانین کے بالکل مطابق ہوتا لیکن انہوں نے خود سعد بن معاذ کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے انتخاب کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سعد کا فیصلہ مسلّمہ قوانین کے منافی نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر فتح ان کی ہوئی ہوتی تو وہ اپنے دشمنوں کو کسی تردّد یا تامل کے بغیر ذبح کر ڈالتے۔"[2]

یہود بنی قریظہ کو یہ فیصلہ اس لیے قبول کرنا پڑا کہ یہ ان کی شریعت موسوی کے مطابق تھا توریت کا

[1] ۔روح اسلام (اردو ترجمہ) ص ۱۷۴

[2] ۔ حوالہ مذکور ص ۱۷۶-۱۷۵!

حکم یہ ہے کہ اگر دشمن صلح نہ کرے تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا ان پر تجھ کو قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیز شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مال غنیمت ہوں گی۔[1]

بنو قریظہ کو دی گئی اس سزا کے قانونی جواز پر بحث کرتے ہوئے مولوی عبد العلیم احراری کا کہنا ہے:

"یہ سزا کوئی غیر معمولی سزا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے زمانہ کو چھوڑ دیجئے ممکن ہے تہذیب و تمدن کے مدعی اسے تاریکی کا زمانہ کہیں۔ یورپ کی جدید تاریخ کو لیجئے کہ یہ تو روشنی کا زمانہ ہے۔ کیا اس تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں نہیں ملتیں کہ باغی سینکڑوں کیا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں قتل کیے گئے ہوں۔ پھر یہ کیا انصاف ہے کہ اپنے لیے تو معیار نقد دوسرا ہو اور ہمارے لیے دوسرا۔ دراصل بنو قینقاع اور بنو نضیر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ رسول خدا ﷺ جیسا رحیم انسان اس کا ذمہ دار ہے، ہاں بنو قریظہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا اور سختی کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر کسی کو اس میں بے جا شدت نظر آتی ہے تو اس کے ذمہ دار رسول نہیں، سعد بن معاذ ہیں جو بنو قریظہ کے دوست تھے اور جنہیں خود انہوں نے نامزد کیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ سعد کا بھی اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہی اس زمانے کا جنگی قانون تھا اور یہی قانون باوجود امتداد زمانہ کے اب تک ہر قوم اور ہر ملک میں جاری ہے۔ لین پول لکھتا ہے: سزا سخت تھی.... لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان لوگوں کا جرم حکومت سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرے کے زمانے میں۔

1۔ کتاب استثناء باب ۲۰ آیت نمبر ۱۰ تا ۱۴ کتاب مقدس (پرانا عہد نامہ۔ تورات)، بائبل سوسائٹی، لاہور، ص: ۱۸۵

جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستہ کا پتہ غداروں اور ڈاکوؤں کی ان لاشوں سے چلتا تھا جو ادھر ادھر درختوں پر لٹکی ہوتی تھیں، انہیں تو کم از کم ایک غدار قبیلہ کے قتل کیے جانے پر متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"[1]

اسی طرح مشہور ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن بنو قریظہ کے متعلق مذکورہ فیصلہ اور سزا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اب طرفین اپنے اقرار کے مطابق اس فیصلہ پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجبور تھے۔ چنانچہ سعد بن معاذ انصاری کی زبان کی ایک معمولی جنبش سے چار سو سے زائد یہودی خاک وخون میں تڑپ کر رہ گئے۔ ممکن ہے کہ موجودہ خیالات کی رُو سے اس فیصلہ میں ظلم وستم اور خونریزی کی ایک جھلک نظر آئے مگر جو کچھ دنیائے جدید میں عملی طور پر وقوع پذیر ہو رہا ہے، اس کے نقطہ نگاہ سے یہ ایک فیصلہ معمولی ہے جس پر کسی کو حرف گیری کی گنجائش نہیں۔ پھر اگر یہودیوں کی فریب کاری اور وعدہ شکنی اشتعال انگیزی اور فتنہ پردازی کو سامنے رکھ لیا جائے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ خس کم جہاں پاک۔ اس بلائے بے درمان کا یہ بہترین درمان تجویز ہوا کہ ایک دشمن صعب سے جو ہر وقت ملک کے امن وامان میں فتنہ وفساد کی چنگاریاں بھڑکانے کے لیے تیار رہتا تھا نجات مل گئی۔"[2]

جبکہ علامہ شبلی نعمانی نے زیر بحث اعتراض کا فیصلہ کن جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"بنو قریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم وبے رحمی کا اعتراض کیا ہے۔ لیکن واقعات

---

[1] - سیرۃ نبوی اور مستشرقین (اردو ترجمہ مقالہ "محمدزم" انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) ص ۷۶-۷۵

[2] - عرب کا چاند، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور ت-ن ص ۳۵۲-۳۵۱

حسب ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آکر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان ومال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا تھا بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔

۳۔ آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کیا۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواج مطہرات قلعہ میں حفاظت کے لیے بھیج دی گئی تھیں ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔ حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔ ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا؟[1]

عام یہود کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کی کمال رواداری اور حسن سلوک

فسادی ذہن کے مالک اور شر پسند یہودیوں کے اخراج کے بعد مدینہ سے بدامنی اور فساد کا قلع قمع ہو گیا۔ یہود اب بھی مدینہ منورہ میں باقی تھے لیکن وہ پر امن شہری تھے جن سے حضور ﷺ کا ہمیشہ لین دین رہا اور جن سے کبھی تعارض نہ کیا گیا۔[2] یہود مدینہ کے خلاف درج بالا جتنی کارروائی کی گئی وہ امن وامان

[1] - سیرۃ النبی ۱/۲۶۲

[2] - یہود مدینہ کے ساتھ حضور ﷺ کے لین دین اور سماجی مراسم وتعلقات کی تفصیل زیر تحقیق مقالہ کے باب چہارم میں دیکھی جا سکتی ہے

کے قیام اور قانون کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تھی۔ اس کے پیچھے کوئی متعین پالیسی یا مذہبی و نسلی دشمنی وغیرہ کے جذبات نہ تھے۔ اس لیے بقیہ یہود کے ساتھ حضور اکرم ﷺ نے ہمیشہ حسن سلوک فرمایا۔ بقیہ یہود مدینہ اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ حضور ﷺ کے کمال حسن سلوک کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں:

"رسول اکرم ﷺ کے ہمسائے میں یہودی رہتے تھے۔ اگر ان کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم ﷺ اس بچے کی عیادت کے لیے اس کے گھر جایا کرتے۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں سے گزرتا اور اتفاق سے رسول اکرم ﷺ وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپ کھڑے ہو جاتے تاکہ ان کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔"[1]

کسی بھی یہودی کی شرارت یا بدتمیزی پر آپ چاہتے تو اسے بڑی سے بڑی سزا دے سکتے تھے۔ کوئی آدمی آپ کا ہاتھ روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود یہود کے معاملے میں آپ کی برداشت، حوصلہ اور کمال حسن سلوک کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

زید بن سعنہ جب یہودی تھے تو ایک بار حضور اکرم ﷺ نے ان سے قرض لیا۔ ابھی قرض کی واپسی کی میعاد بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ (آں جناب ﷺ کے پیغمبرانہ حلم کا امتحان لینے کی خاطر) تقاضے کے لیے آ گئے۔ آپ کی چادر پکڑ کر سخت سست کہا۔ حضرت عمرؓ موجود تھے انہوں نے کہا: او دشمن خدا! رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: عمر! تم سے تو کچھ اور امید

---

[1] خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۴-۱؛ اور ص ۳۱۳ (خطبہ: تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ)

تھی۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں قرض ادا کر دوں۔ اس کی مقررہ مدت میں ابھی تین دن باقی تھے اس کے باوجود حضرت عمرؓ سے فرمایا۔

وامر عمر یقضیه ماله و یزیده عشرین صاعاً لما روّعه۔

ترجمہ: اور آپ ﷺ نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ ایک تو وہ اسے (زید کو) اس کا واجب الاداء مال پورا کر دیں دوسرے انہوں نے جو اسے ڈرایا دھمکایا ہے اس کے بدلے یا کفارہ میں بیس صاع مزید (کھجور) دیں۔

چنانچہ حضور ﷺ کے اس کمال حلم، عفو و درگزر اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ دیکھ کر زید کو آپ ﷺ کے نبی برحق ہونے کا یقین ہو گیا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

اسی طرح یہ بد طینت لوگ بارگاہ نبوی میں آتے تو اپنی زبانوں کو لوچ دیتے ہوئے "السلام علیک" کی بجائے "السام علیک" (آپ پر موت واقع ہو) کہتے۔ آپ اس بد تمیزی اور شرارت بلکہ جسارت پر کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے "وعلیکم" فرما دیتے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے اس بد تمیزی پر ناراضگی کا اظہار کیا تو انہیں بھی یہود کو برا بھلا کہنے سے منع فرما دیا۔[2]

1- قاضی عیاض، ابو الفضل، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، (فصل واما الحلم) المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، ت ن ۱/۱۰۹

2- دیکھیے بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجهاد، باب الدعا علی المشرکین بالهزیمۃ والزلزلۃ، رقم: ۲۹۳۵: کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا رقم: ۶۰۳۰؛ کتاب الدعوات، باب الدعاء علی المشرکین، رقم: ۶۳۹۵: کتاب الدعوات، باب یستجاب لنا فی الیهود، رقم: ۶۴۰۱؛ کتاب الادب باب الرفق فی الامر کله، ۲/۸۹۰، رقم: ۶۰۲۴: کتاب الاستیذان باب کیف یرد علی اهل الذمۃ السلام، رقم ۶۲۵۶: بخاری، الادب المفرد، باب لیس المؤمن بالطعان وباب الرفق، ۱/۲۰۴، ۵۲۹؛ مسلم، الصحیح (کتاب السلام باب النهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام)، ۲/۲۱۳-۲۱۴، رقم ۵۶۵۶؛ ترمذی، الجامع، ابواب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی کراهیۃ التسلیم علی الذمی)، رقم ۲۷۰۱

یہود مدینہ کی اس طرح کی بدزبانیوں اور توہین آمیز حرکات کا ذکر کرتے ہوئے ہندو سیرت نگار سوامی لکشمن اپنے مخصوص ادبی انداز میں لکھتا ہے:

"ان فرزندانِ توحید جن کی مقدس گردنیں اک خدائے وحدہ لاشریک کے آستان عالیہ ہی پر سجدہ ریز ہونا جانتی تھیں اور ان کے رہبر اعظم محبوب رب العالمین سرور عالم حضرت محمد ﷺ کی توہین کو یہودیوں نے ایک تفریح آمیز مشغلہ قرار دے لیا تھا اور سرور عالم کی ہر دلعزیزی اور عزت و وقار پر اپنے زعم میں ضرب کاری لگانے کے لیے آپ کی مجلس میں آکر آپ کے متبعین مخلصین کی موجودگی میں ہتک آمیز اور ناشائستہ کلمات زبان سے نکالاتے تھے۔ انصاف پسندی کا تقاضا حضرت ﷺ کے قوت برداشت اور صحابہ کرام اور دیگر فرزندان اسلام کے جذبہ فرمانبرداری پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آپ ﷺ السلام علیکم کی بجائے السام علیکم (تم پر موت آئے) ایسے نازیبا اور دل آزار کلمات سنتے تھے اور ذرا چیں بہ جبیں نہ ہوتے تھے اور آپ کے متبعین مخلصین بھی آپ کی صبر و برداشت کی تعلیم سن کر آپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ حالانکہ یہ وہی جاں نثار تھے جو آپ ﷺ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعث صد نازش و افتخار سمجھتے تھے اور آپ ﷺ کی شان اقدس میں ذرا سا نازیبا کلمہ سن کر آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔"[1]

منٹگمری واٹ یورپین سکالرز کے اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال سب یہود کو مدینہ سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

---

[1] - عرب کا چاند ص۲۶۹-۲۶۸

"مدینہ میں کچھ نہ کچھ یہودیوں کی ہمیشہ موجودگی بعض یورپین سکالرز کے اس نظریہ کے خلاف ایک دلیل ہے کہ ہجرت کے بعد دوسرے سال محمد (ﷺ) نے یہ پالیسی اختیار کرلی تھی کہ وہ سب یہودیوں کو اس لئے مدینہ سے نکال دیں گے کہ وہ یہودی تھے بنابریں انہوں نے یہود کے خلاف انتہائی بے رحم پالیسی اختیار کی۔ اس قسم کی بے رحمانہ اور ظالمانہ پالیسیاں اپنانا محمد (ﷺ) کا طریقہ نہیں تھا۔ اس کے الفاظ ہیں:

It was not Muhahammad s way to have policies of this kind[1]-

خیبر کے یہود کی جلاوطنی اور اس کے اسباب و محرکات

مدینہ منورہ کے یہودی قبائل تو گذشتہ تفصیل کے مطابق عہد نبوی میں ہی مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دیے گئے۔ مگر خیبر کے یہودی عہد فاروقی میں جلاوطن کیے گئے۔ عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد عہد خلافت میں یہود کے اخراج کو خاص طور پر ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے پیداوار کے نصف حصہ پر معاملہ کر لیا تھا اور مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انہیں جلاوطن کرنے کا کیا حق تھا؟ کیا اس طرح انہوں نے عہد شکنی اور اہل الذمہ کی حق تلفی نہیں کی؟[2]

یہود خیبر کے اِخراج اور جلاوطنی کے حوالے سے یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی اور معقول لگتا ہے مگر جب یہود کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کے کیے گئے معاہدہ کی شرائط اور یہود خیبر کی مجرمانہ حرکات پر نظر ڈالی

---

[1] Muhammad Prophet and statesman, oxford University Prass 1961 P 175

[2] - سید مودودی، الجہاد فی الاسلام ص ۳۱۴

جائے تو اس اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں غزوہ خیبر کی تفصیلات کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے جب خیبر کو بزور شمشیر فتح کر لیا۔ آپ یہود کو وہاں سے نکال دینے کا ارادہ رکھتے تھے مگر یہود کی اس درخواست پر کہ انہیں اس میں رہنے دیا جائے وہ زمینوں پر بدستور کام کریں گے جس کے بدلے میں انہیں نصف پیداوار دے دی جایا کرے۔ پیغمبر رحمت ﷺ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی مگر ساتھ ہی چند دیگر شرائط کے ساتھ یہ وضاحت بھی فرمادی کہ ہم جب تک چاہیں گے آپ یہاں رہنے دیں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

كان رسول الله ﷺ لما ظهر على خيبر اراد اخراج اليهود منها و كانت الارض حين ظهر عليها لله و لرسوله و للمسلمين فاراد اخراج اليهود منها فسألت اليهود رسول الله ليقرهم بها على ان يكفوا عملها و لهم نصف الثمر و قال لهم رسول الله ﷺ نقركم بها على ذالك ماشئنا فقروا بها حتى اجلاهم عمر الى تيماء، اريحاء۔[2]

---

[1] - غزوہ خیبر کا تذکرہ تمام سیرت نگاروں اور مؤرخین کے علاوہ متعدد محدثین نے بھی کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المغازی میں "باب غزوۃ خیبر" کے تحت خاصی تفصیل بیان کی ہے۔ دیکھئے بخاری، الصحیح ۲/۶۰۳-۶۱۰، رقم ۴۱۹۵ تا ۴۲۴۹، طبع قدیمی کتب خانہ کراچی نیز مسلم، الصحیح (کتاب الجہاد والسیر باب غزوۃ خیبر) قدیمی کتب خانہ کراچی ۲/۱۱۲-۱۱۱، رقم: ۴۶۶۵ تا ۴۶۶۹)؛ واقدی، کتاب المغازی، ۲/۶۳۳-۶۹۲

[2] - دیکھیے: بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیة باب لا یسکن ارض الحجاز مشرک) ۶۵/۱۴، رقم ۱۸۵۲۹۔ بخاری، الجامع الصحیح (ابواب الحرث و المزارعة و ما جاء فیه باب اذا قال رب الارض اقرک ما اقرک الله و لم یذکر اجلاً معلوماً فهما علی تراضیهما؛ نیز دیکھئے بلاذری، فتوح البلدان (اردو) تخلیقات، لاہور، ص۴۵؛ زیلعی نصب الرایه (کتاب الجنایات) ۴/۳۷۹ رقم ۸۰۳۲)

ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ جب خیبر پر غالب آ گئے تو آپ ﷺ نے یہود کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرما لیا کیونکہ جب آپ ﷺ نے بزور شمشیر خیبر پر غلبہ پا لیا تو شرعاً خیبر کی زمین اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کی ملکیت میں آ گئی۔ اس لیے آپ نے یہود کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ کیا مگر یہود نے رسول اللہ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ آپ انہیں زمینوں پر اس شرط پر قائم رہنے دیں کہ وہ کھیتی باڑی کریں گے اور اس کے بدلے میں نصف پیداوار ان کی ہو گی۔ (ان کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے) رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ہم تمہیں اس شرط کے مطابق زمین پر اس وقت تک قائم رکھیں گے جب تک کہ ہم چاہیں۔ چنانچہ وہ خیبر کی زمین پر برقرار رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے انہیں تیماء اور اریحاء کے علاقے کی طرف (ملکی حدود کے اندر ہی) جلاوطن کر دیا۔

سنن ابی داؤد کی درج ذیل روایت بھی اس بات پر گواہ ہے کہ معاہدہ کے وقت یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ تمہارا یہ قائم رکھنا یا نہ رکھنا اسلامی ریاست کی مرضی پر منحصر ہو گا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر کے مولیٰ نافع کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہود خیبر کے اخراج کے حوالے سے جب صحابہ کرام کو اعتماد میں لیا تو اس وقت فرمایا:

یایها الناس ان رسول الله ﷺ کان عامل یهود خیبر علی ان نخرجهم اذا شئنا و من کان له مال فلیلحق به فانی مخرج یهود فاخرجهم۔[1]

ترجمہ: "اے لوگو! بیشک رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود سے اس شرط پر (نصف پیداوار کی بنیاد پر) معاملہ فرمایا تھا کہ جب ہم چاہیں گے (مناسب سمجھیں گے) انہیں نکال دیں گے لہٰذا جس آدمی کا کوئی مالی لین دین ہو تو وہ اسے وصول کر لے کیونکہ میں یہود کو یہاں (خیبر) سے نکالنے والا ہوں۔ چنانچہ

---

[1] - ابو داؤد، السنن (کتاب الخراج و الفیء والامارة باب ما جاء فی حکم ارض خیبر) ۲/۷۵ رقم ۳۰۰۷

(حسب ضرورت و مصلحت) آپ نے انہیں نکال دیا (جلاوطن کر دیا۔)"

سنن ابی داؤد کی دوسری روایت جو حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے، اس کے الفاظ بھی مذکورہ روایت سے ملتے جلتے ہیں۔[1]

بلاذری وغیرہ کی تحقیق تو یہ ہے کہ خود یہود خیبر نے حضور ﷺ کے سامنے یہ شرط تسلیم کی تھی کہ ان کے خون معاف کر دیے جائیں ان کے بال بچے قید نہ کیے جائیں وہ زمین سے جلاوطن ہو جائیں گے اور جسموں پر موجود مال کے سوا سب مال و اسباب اور سونا چاندی یہیں چھوڑ جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمیں باغبانی اور آبادکاری کا کام خوب آتا ہے آپ ہمیں یہیں رہنے دیجئے۔ آپ ﷺ نے ان کی درخواست منظور فرمالی اور ان سے پھلوں اور غلہ کی آدھی بٹائی پر معاملہ فرما لیا۔ تاہم یہ صراحت فرمادی کہ "اقرکم ما اقرکم اللہ (میں تمہیں بر قرار رکھوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہاں بر قرار رکھے گا۔)[2]

اگر آپ ﷺ یہود خیبر سے ان کی شریعت (استثناء، ۲۰:۱۰) کے مطابق سلوک فرماتے تو ان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جاتا، ان کے بال بچوں کو غلام بنالیا جاتا اور اموال ضبط کر لیے جاتے مگر رحمت دوعالم نے فراخ دلی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو نہ صرف معاف کیا بلکہ نصف پیداوار کی بٹائی پر انہیں ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا۔[3]

اس معاہدہ میں ان کے لئے کسی مدت کا تعین نہ تھا بلکہ یہ اسلامی ریاست کی صوابدید پر منحصر تھا اور

---

[1] - حوالہ مذکور رقم حدیث ۳۰۰۸ نیز ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۵۰

[2] - بلاذری، فتوح البلدان دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص: ۳۶، دیکھئے: ابن قیم، زاد المعاد (اردو ترجمہ) ۲/۵۹ ۔۷۶۰ نیز ۸۴۲-۸۴۳

[3] - دیکھیے: کتاب مقدس (پرانا عہد نامہ-تورات) بائبل سوسائٹی، لاہور، ص: ۱۸۵، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹/ ۲۰۳

اس معاہدہ کو فریقین نے راضی خوشی قبول کیا تھا جیسا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ روایت کے ترجمۃ الباب کے الفاظ (اذا قال رب الارض اقرک ما اقرک الله و لم یذکر اجلا معلوماً فھما علی تراضیھما) سے واضح ہے۔ جبکہ صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ یہود خیبر سے یہ معاہدہ دائمی نہ تھا بلکہ تا حکم ثانی تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے چشم دید گواہ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

ان رسول اللهﷺ کان عامل یھود خیبر علی اموالھم و قال نقرکم ما اقرکم الله۔[1]

"بیشک رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کے ساتھ ان کے اموال پر معاملہ (معاہدہ) فرمایا تھا مگر ساتھ یہ بھی واضح فرمایا تھا کہ ہم تمہیں اس وقت تک یہاں معاہدہ کے مطابق باقی رکھیں گے جب تک کہ اللہ تمہیں قائم رکھنا پسند فرمائے گا۔"

صحیح بخاری کی اس روایت کے ترجمۃ الباب الفاظ "اذا شئت اخرجتک" (جب میں چاہوں گا تجھے نکال دوں گا) سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ معاہدہ کے وقت انہیں کسی دھوکے یا غلط فہمی میں نہیں رہنے دیا گیا تھا بلکہ صراحت سے بتا دیا گیا تھا کہ اس معاہدہ کی بقاء کا معاملہ اسلامی ریاست کی مرضی پر منحصر ہے۔ مذکورہ حدیث کے الفاظ "نقرکم ما اقرکم الله" (ہم تمہیں اس وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں برقرار رکھے گا) کا مطلب بھی واضح تھا کہ تمہیں مستقل طور پر یہاں نہیں رہنے دیا جائے گا بلکہ جب تک احکام خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمہیں رکھنے کی اجازت دیں

---

[1] ۔ بخاری، الصحیح (کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک) ۱/۳۷۷، رقم: ۲۷۳۰؛ نیز شیبانی، محمد بن حسن (م ۱۸۹ھ) الموطا، قدیمی کتب خانہ کراچی ت۔ن (باب المعاملۃ و المزارعۃ فی النخل والارض) ص ۳۵۷ (الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ)؛ ابوعبید، کتاب الاموال (اردو ترجمہ) ص ۸۳ پیرا نمبر ۱۴۱

گے اس وقت تک تمہیں یہاں رہنے دیا جائے گا اور جب تمہارا طرز عمل نامناسب ہو گا تو ہمیں اختیار ہو گا کہ اس صلح نامہ کی اِس شرط کے مد نظر تمہیں جلاوطن کر دیں۔ حافظ ابن حجر نے مذکورہ شرطیہ جملہ کی تشریح یوں کی ہے:

ان المراد بقوله "ما اقرکم الله" ما قدر الله انا نترککم فیھا فاذا شئنا فاخرجنا کم تبیّن ان اللہ قدّر اخراجکم و اللہ اعلم۔[1]

حضور اکرم ﷺ کے ارشاد "جب تک اللہ تمہیں برقرار رکھے گا" سے مراد یہ تھی کہ جب تک اللہ نے تمہارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تمہیں رہنے دیں گے اور جب ہم تمہیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے تو یہ فعل اس امر کی دلیل ہو گا کہ تمہارے اخراج کے لیے اللہ کی تقدیر پوری ہو چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

یہود خیبر اس معاہدہ کے مطابق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک خیبر کی زمینوں پر کام کرتے رہے۔ حسب معاہدہ پیداوار کی نصف نصف تقسیم میں مسلمان محصلین نے ان کے ساتھ جس کمال عدل و انصاف کا مظاہرہ کیا، اس کا اعتراف خود یہود کو بھی تھا۔ چنانچہ حضرت سلیمان بن یسار سے روایت ہے کہ

"رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو (بٹائی کے موقعہ پر یہود خیبر کے پاس وصولی کے لیے) بھیجا کرتے تھے اور وہ اپنے اور یہود کے درمیان اندازے سے تمام پیداوار کو آدھا آدھا کر لیتے۔[2] ایک دفعہ یہود نے اپنی خواتین کے زیور جمع کیے اور عبداللہ بن رواحہ سے کہا: "یہ زیورات تمہارا نذرانہ ہیں" (ہذالک) البتہ پیداوار کی تقسیم میں ہمارے ساتھ کچھ تخفیف اور درگزر سے کام لیجئے۔ اس پر انہوں نے یہود پر واضح کیا کہ اے گروہ یہود! قسم بخدا تم میرے نزدیک اللہ کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ

---

[1] ۔ عسقلانی، فتح الباری قدیمی کتب خانہ کراچی ۵/۴۱۰

[2] ۔ بلاذری، فتوح البلدان، طبع مذکور، ص: ۳۷؛ ابن شبہ، تاریخ المدینۃ المنورۃ، ۱/۱۷۷

مبغوض (ناپسندیدہ) ہو۔ تاہم یہ بغض و عداوت مجھے اس بات پر قطعاً آمادہ کرنے والا نہیں کہ میں تم پر کسی قسم کا ظلم کروں۔ جہاں تک اس رشوت کا تعلق ہے جو تم نے مجھے پیش کی ہے تو وہ (ہمارے نزدیک) حرام ہے اور ہم (مسلمان) اس حرام چیز کو نہیں کھاتے (لیتے) ہیں۔"

اس پر یہود نے بے ساختہ کہا:

بهٰذا قامت السمٰوات و الارض۔[1]

"اسی عدل و انصاف پر سارے آسمان اور زمین قائم ہیں۔"

خیبر کے یہود کو خیبر سے جلاوطن کرنے اور نجران (یمن) کے عیسائیوں کو نجران سے نکالنے (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی داخلی پالیسی کے تحت تمام مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو مرکز اسلام (جزیرۃ العرب / ارض حجاز) سے نکال دینے کی خواہش کے اظہار کے ساتھ ساتھ وصیت بھی فرمائی تھی۔ جس پر شرعی آئینی قانونی اور سیاسی طور پر عمل درآمد کرنا ضروری تھا۔ مثلاً الفاظ کے قدرے اختلاف کے ساتھ محدثین نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی یہ حدیث نقل کی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:

لئن عشت لاخرجن الیهود و النصاری من جزیرة العرب حتی لا اترک فیها الا مسلماً۔[2]

"اگر میں زندہ رہا تو یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکال دوں گا حتی کہ اس میں مسلمان کے سوا کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔

---

[1] - دیکھیے شیبانی، محمد بن حسن، المؤطا (باب المعاملة و المزارعة فی النخل و الارض) ص ۳۵۷ نیز ابو داؤد، السنن (کتاب البیوع) ۲/ ۶۵۷ (باختلاف الالفاظ)۔ بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱/ ۵۴-۵۳

[2] - مسلم، الصحیح (کتاب الجہاد باب اجلاء الیہود من الحجاز)، ۲/ ۹۴، رقم ۴۵۹۴؛ بیہقی، السنن الکبریٰ (کتاب الجزیة باب لا یسکن ارض الحجاز مشرک) ۱۴/ ۵۷ رقم ۱۹۲۶۰

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے اپنے وصال سے چند دن قبل دیگر نصائح ووصایا کے ساتھ سے یہ بھی فرمایا:

اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب۔[1]

ترجمہ: "مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔"

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی عینی شہادت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا آخری کلام یہ تھا کہ

"حجاز کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔"[2]

ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو جب یہ روایت پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب۔ "جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔"

تو آپ نے اس روایت کی تحقیق کی اور جب آپ کو صحت کا اطمینان اور یقین ہو گیا کہ واقعی آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے تو خیبر اور فدک کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کو جلاوطن کر دیا۔[3]

اسی طرح امام محمد بن حسن شیبانیؒ فرماتے ہیں:

"بے شک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور ان کے اردگرد کا علاقہ (جدہ اور خیبر وغیرہ) جزیرۃ

---

[1] - بخاری، الصحیح (کتاب المغازی باب مرض النبی ﷺ و وفاته نیز کتاب الجهاد باب هل یستشفع الی اهل الذمة و معاملتهم ، رقم:۳۰۵۳؛و باب اخراج الیهود من جزیرة العرب، قم:۳۱۶۷، رقم: ۳۱۶۸؛ السبکی، فتاوی، دارالمعرفة، بیروت، ۳۷۹/۲ مسلم، الصحیح، (کتاب الوصیة باب ترک الوصیة لمن لیس له شی یوصی فیه) بیهقی، السنن الکبری (کتاب الجزیة باب لا یسکن ارض الحجاز مشرک) ۵۶/۱رقم ۱۹۲۵۹

[2] - بیہقی، السنن الکبری (کتاب اور باب مذکور) ۱۴ /۵۷، رقم ۱۹۲۶۱

[3] - دیکھئے: امام مالک، مؤطا کتاب الجامع باب ما جاء فی اجلاء الیهود من المدینة، ص۶۹۸، رقم:۱۶۵۱۔ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیة باب لا یسکن ارض الحجاز مشرک) ۵۷/۱۴ رقم ۱۹۲۶۳

العرب میں سے ہے اور ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا یبقی دینان فی جزیرة العرب" (جزیرۃ العرب میں دو دین اکٹھے باقی نہیں رہ سکتے۔) چنانچہ اسی حدیث کی بنیاد پر حضرت عمر فاروق نے ان تمام لوگوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جو مسلمان نہ تھے۔"[1]

یہود خیبر کو ان کی زمینوں پر باقی رکھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیتے مگر جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں کئی علاقے فتح ہو گئے اور مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور یہود کو باقی رکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہ رہی تو حضرت عمرؓ نے حسب معاہدہ انہیں جلاوطن کر دیا۔ اس معاملے میں ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر فتح فرمایا تو خیبر کی زمین یہود کے پاس رہنے دی کہ وہ کھیتی باڑی کرتے رہیں کیونکہ صحابہ اس وقت کھیتی باڑی سے عاجز تھے اس لیے کہ پھر انہیں وہیں رہنا پڑتا اور اگر صحابہ کی ایک جماعت وہاں قیام کر لیتی تو دین کے کئی ایسے مصالح معطل ہو جاتے جو ان کے بغیر کوئی دوسرا آدمی پورے نہ کر سکتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب کئی علاقے فتح ہو گئے اور مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ یہود سے مستغنی ہو گئے اس لیے انہیں جلاوطن کر دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم تمہیں خیبر میں اس وقت تک باقی رکھیں گے جب تک چاہیں گے۔"[2]

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

لما کثر العیال ای الخدم فی ایدی المسلمین وقووا علی العمل فی الارض

---

[1] - مؤطا، کتاب السیر باب نزول اہل الذمة مکة و المدینة و ما یکرہ من ذالک، مکتبہ رحمانیہ لاہور ص ۳۷۲

[2] - مجموع فتاوی شیخ الاسلام، حکومت سعودی عرب ۲۸/۸۸۔ نیز بلاذری، فتوح البلدان (اردو ترجمہ) تخلیقات، لاہور ص ۵۵

اجلا ہم عمر۔[1]

ترجمہ: ''مسلمانوں کے پاس جب خدام (کام کرنے والے کاشتکاروں) کی کثرت ہوگئی اور وہ خود خیبر کی زمین میں کھیتی باڑی کے قابل ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے یہود کو (ان کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے) جلا وطن کر دیا۔''

یہود خیبر کو جلا وطن کرنے کا فوری محرک ان کا ایک فوجداری جرم بنا۔ چنانچہ امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہود کے ساتھ حضور ﷺ کے مندرجہ بالا معاملہ / معاہدہ کا حوالہ دیتے ہوئے صحابہ کرام کو بتایا کہ

بیشک عبد اللہ بن عمرؓ خیبر میں موجود اپنے مال کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہاں گئے تو رات کو سوتے ہوئے کسی نے انہیں بلندی سے نیچے گرا دیا جس سے ان کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ (فریکچر ہو) گئے اور وہاں یہود کے سوا مسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں۔ وہی ہمارے دشمن ہیں اور انہیں پر ہم باغیانہ حرکت کا الزام لگاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں انہیں (یہود خیبر) جلا وطن کر دوں۔ جب حضرت عمرؓ نے انہیں جلا وطن کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو حقیق نامی یہودی کا ایک بیٹا آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے امیر المؤمنین! کیا آپ ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں جبکہ محمد (ﷺ) نے ہمیں یہاں برقرار فرمایا تھا اور نصف بٹائی کی شرط پر ہمارے ساتھ معاملہ فرما لیا تھا۔ تو حضرت عمر نے فرمایا: کیا میرا گمان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اس بات کو بھول گیا ہوں جو آپ نے تجھ سے فرمائی تھی کہ ''اس وقت تیری کیا کیفیت ہوگی جب تجھے خیبر سے نکال دیا جائے گا اور تیری اونٹنی رات کے بعد رات تجھے لے کر دوڑ رہی ہوگی۔ تو اس نے کہا یہ بات تو ابو القاسم (حضور نبی اکرم ﷺ) نے از راہ مذاح کہی تھی۔ تو آپ نے فرمایا: اے اللہ کے دشمن تو جھوٹ

---

[1] - فتح الباری ۵/۳۱۱۔ نیز ابو عبید، کتاب الاموال (اردو ترجمہ) ص ۸۳ (پیرہ نمبر ۱۴۲) ابن سعد، الطبقات الکبری ۲/۳۰۷

بک رہاہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے انہیں جلاوطن کر دیا اور باغات، اونٹ، سازوسامان، حتیٰ کہ اونٹوں کے کجاوں اور رسیوں تک جتنا بھی ان کا سامان تھا سب کی انہیں قیمت ادا کی۔ [1]

امام ابو یوسف کی روایت کے مطابق یہود خیبر نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے علاوہ ایک انصاری سے بھی زیادتی کی تھی۔ [2]

یہود خیبر کی یہ جلاوطنی اس نوعیت کی نہیں تھی کہ انہیں بالکل اسلامی ریاست کی حدود سے ہی نکال دیا گیا ہو بلکہ ان کی یہ جلاوطنی صرف خیبر سے شام کی طرف تھی۔ [3]

یہود خیبر کے ساتھ معاملے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی اس مذہبی رواداری، احسان اور وسعت ظرفی کا ذکر بھی بے جانہ ہوگا کہ غزوہ خیبر کی فتح کے نتیجے میں مسلمان معاہدین کے ہاتھ میں جو مال غنیمت آیا اس میں چند نسخے تورات کے بھی موجود تھے۔ یہود نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو نبی رحمت ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ انہیں واپس لوٹا دیے جائیں۔ آپ ﷺ نے ان کتب مقدسہ کے سلسلے میں اس مذہبی تعصب اور عدم برداشت کا مظاہرہ نہیں فرمایا جس کا رومیوں نے یروشلم کی فتح کے وقت کیا تھا۔ انہوں نے کتب مقدسہ کو نہ صرف یہ کہ جلا کر توہین کی بلکہ انہیں اپنے پاؤں تلے روند کر بھی ان کی حرمت کو پامال کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اس مذہبی عدم رواداری کا مظاہرہ بھی نہیں کیا جس کا مظاہرہ عیسائیوں نے اندلس میں یہود کے ساتھ جنگ میں کیا تھا جبکہ انہوں نے توراۃ کے پاک صحیفے جلا دیے تھے۔ [4]

---

1 - دیکھئے: بخاری، الصحیح (کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک) ۱/۳۷۷، حدیث: ۲۷۳۰؛ بیہقی، السنن الکبری (کتاب الجزیۃ باب لا یسکن ارض الحجاز مشرک) ۱۴/۵۵ رقم ۱۹۲۵۷؛ ابن شبہ، تاریخ المدینۃ المنورۃ، منشورات دار الفکر، ۱/۱۷۶

2 - دیکھئے: کتاب الخراج ص ۵۱

3 - بلاذری، فتوح البلدان، ص: ۳۹

4 - محمد حسین ہیکل، حیاۃ محمد ص ۳۹۰

نجران کے عیسائیوں کے اخراج کا سبب

اسلامی ریاست کے غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے ایک قابل اعتراض اور طعن و تشنیع کا حامل معاملہ نجران کے عیسائیوں کا اخراج بھی ہے۔ خیبر کے یہودی عنوۃ (بزور شمشیر) فتح ہوئے تھے اور ان سے ابتداءً جلاوطنی ہی کی شرط پر (جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے) صلح ہوئی تھی۔ اس لیے مخالفین کو اس میں اعتراض کی زیادہ گنجائش نہ مل سکی۔ لیکن اہل نجران نے تو بغیر جنگ کے خود بخود اطاعت قبول کی تھی اور جزیہ دے کر آنحضرت ﷺ سے باقاعدہ عہد نامہ لکھوایا تھا۔ اس لیے ان کے اخراج کو مخالفین اسلام صریح عہد شکنی قرار دیتے ہیں۔ ان کا سارا زور اس پر ہے کہ معاہدہ میں غیر مشروط امان دی گئی تھی اور حضرت عمرؓ نے ناجائز طور پر اس امان کو فسخ کیا۔[1]

اہل نجران کے اخراج پر یہ اعتراض بھی سطحی اور اصل معاہدہ پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ معاہدہ کی اصولی شرائط پر نظر کرنے سے یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ اور بلاذری وغیرہ نے جہاں یہ معاہدہ قلمبند کیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ معاہدہ کے آخر میں یہ الفاظ موجود تھے:

و علی ما فی هذا الکتاب جوار الله و ذمة محمد النبی رسول الله ابداً حتی یأتی الله بامره ما نصحوا و اصلحوا ما علیهم غیر متفلتین (و فی روایة غیر مبتلین) بظلم۔[2]

ترجمہ: اس صحیفہ میں جو کچھ ہے اس پر اللہ کی امان اور محمد جو اللہ کے رسول و نبی ہیں، کا ذمہ ہے یہاں تک کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کوئی حکم دے جب تک کہ یہ لوگ (اہل نجران) اسلامی ریاست کی خیر خواہی

---

[1] - سید مودودی، الجہاد فی الاسلام ص ۳۱۹-۳۱۸

[2] - دیکھئے: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دار المعرفۃ بیروت ۵/ ۶۰۔ ابو یوسف کتاب الخراج، دار المعرفۃ بیروت ص ۷۳؛ نیز فتوح البلدان (اردو ترجمہ) ۱/ ۱۰۹

کرتے رہیں اور ان شرائط کی پابندی کرتے رہیں جو ان پر عائد کی گئی ہیں۔ بغیر اس کے کہ ظلم سے انہیں کسی بات پر مجبور کیا جائے۔"

اس معاہدہ میں ان پر یہ شرط بھی عائد تھی کہ وہ سود نہیں کھائیں گے ورنہ اسلامی ریاست ان سے بری الذمہ ہو گی۔[1]

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان سے جو مذکورہ معاہدہ کی تجدید کی تو اس میں بھی یہ صراحت تھی کہ

و علی ما فی هذه الصحیفة جوار الله و ذمة محمد النبی ﷺ ابدا و علیهم النصح و الاصلاح فیما علیهم من الحق۔[2]

اس صحیفہ (عہد نامہ) میں جو کچھ ہے اس پر ہمیشہ کے لیے اللہ کی امان اور محمد نبی ﷺ کا ذمہ ہے اور ان (اہل نجران) پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ (اسلامی ریاست کے ساتھ) خیر خواہی سے کام لیں اور اس معاہدہ کی رُو سے جو حق ان پر واجب ہوتا ہے اسے ٹھیک ادا کرتے رہیں۔

اب اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ اہل نجران نے مذکورہ شرائط معاہدہ کی کہاں تک پابندی کی؟ چنانچہ تاریخ سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ ایک تو انہوں نے سود کھانا (سودی کاروبار) شروع کر دیا۔ دوسرے انہوں نے گھوڑے اور اسلحہ جمع کر کے بغاوت کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ نے انہیں یمن کے نجران سے جلاوطن کر کے عراق کے نجران میں ٹھہرا دیا کیونکہ آپ کو ان سے مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ "**لانه خافهم علی المسلمین و قد**

---

[1] - حوالہ مذکور

[2] - حوالہ مذکور

كانوا اتخذوا الخيل و السلاح في بلادهم [1]

بلاذری نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کی جلاوطنی کا یہ اقدام خود ان کی خواہش پر اٹھایا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"جب اہل نجران کی تعداد چالیس ہزار ہو گئی تو وہ آپس میں حسد کرنے (لڑنے جھگڑنے) لگے اور حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی ہمیں جلاوطن کر دو۔ وہ پہلے ہی ان کی طرف سے مسلمانوں کے لیے خائف ہو رہے تھے انہوں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور انہیں جلاوطن کر دیا بعد میں یہ لوگ پچھتائے اور حضرت عمرؓ سے کہا ہمیں معاف کر دو مگر انہوں نے انکار کر دیا۔"[2]

پھر یہ جلاوطنی صرف اس قدر تھی کہ انہیں یمن کے نجران سے نکال کر باعزت طور پر عراق کے نجران میں منتقل کر دیا گیا۔ انہیں "جوار الله و ذمة محمد النبی ﷺ" (اللہ کی پناہ اور محمد نبی ﷺ کے ذمہ) سے خارج نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسی پناہ اور ذمہ میں ایک نامناسب مقام سے دوسرے مناسب مقام پر ٹھہرا دیا گیا۔ ان کی زمینوں کے بدلے زمین دی گئیں۔ دو سال کا جزیہ معاف کیا گیا۔ یمن سے عراق تک کے سفر کے لیے تمام سہولتیں مہیا کی گئیں اور عمال کو ہدایت کی گئی کہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ان پر کوئی ظلم نہ ہونے پائے، شام اور عراق کے عمال و امراء کے نام حضرت عمر کا یہ ہدایت نامہ آج بھی کتاب الخراج لامام ابی یوسف وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔[3]

سید مودودی اہل نجران کے اخراج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] - کتاب الخراج طبع مذکور ص ۷۲، نیز بلاذری فتوح البلدان (اردو) ص ۱۱۰-۱۰۹؛ السبکی، فتاوی، دار المعرفۃ، بیروت، ۲/۳۷۷

[2] - فتوح البلدان (اردو) ص ۱۱۱

[3] - ملاحظہ ہو، کتاب الخراج ص ۷۳، بلاذری فتوح البلدان (اردو) ص ۱۱۰؛ السبکی، فتاوی السبکی، دار المعرفۃ، بیروت، ۲/۳۷۸

"معترضین نے ان سب باتوں کو بھلا کر صرف اتنا یاد رکھا ہے کہ اہل نجران سے عہد تھا۔ عمر بن الخطابؓ نے اسے توڑا اور انہیں جلا وطن کر دیا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھ کر کوئی بتائے کہ اگر آج اس بیسویں صدی میں بھی کوئی قوم وہ روش اختیار کرے جو اہل نجران نے کی تھی اور اس کی سیاسی و جنگی پوزیشن وہی ہو جو اہل نجران کی تھی تو ایک مہذب حکومت جو اپنی مملکت کے امن کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو، اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟"[1]

---

[1] - الجہاد فی الاسلام ص ۳۲۲-۳۳۱

چھٹی فصل

غیر مسلموں پر راستہ تنگ کرنے کا معاملہ - تجزیاتی مطالعہ

غیر مسلموں / اہل الذمہ کے حقوق کے حوالے سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ عام شاہراہوں پر ذمیوں کو اپنے دوش بدوش چلنے کا موقعہ نہ دیں۔[1] اس غلط فہمی کی بڑی وجہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تبدوھم بالسلام فاذا لقیتموھم فی الطریق فاضطر و ہم الی ضیق الطریق۔[2]

ترجمہ: "انہیں (عیسائیوں / اہل الذمہ) سلام کہنے میں ابتداء (پہل) نہ کرو بلکہ جب تم انہیں راستے میں ملو تو انہیں راستے کے تنگ حصے میں چلنے پر مجبور کر دو۔"

راستہ تنگ کرنے والی روایت کا معنیٰ و محمل

اہل الذمہ پر رستہ تنگ کرنے والی اس روایت پر فنی اعتبار سے تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام عبد الرزاق اور امام ترمذی جیسے محدثین نے اسے نقل کیا ہے اور امام ترمذی نے اس پر "ہذا

[1] - مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست ص ۲۱۹

[2] - دیکھئے: مسلم، الجامع الصحیح (کتاب السلام باب النہی عن ابتداء اہل الکتاب بالسلام و کیف یرد علیہم) ۲/۲۱۳ رقم: ۵۶۶۱۔ ابو داود. السنن (کتاب الادب باب فی السلام علی اہل الذمۃ) ۲/۳۶۶ رقم ۵۲۰۵۔ ترمذی. جامع (ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ التسلیم علی الذمی) ۲/۵۵۷ رقم: ۲۷۰۰۔ عبد الرزاق المصنّف (باب ردّ السلام علی اہل الکتاب) المجلس العلمی بیروت ۱۹۷۲ء/ ۱۰ رقم ۹۸۳۷۔ ابن قیم، احکام اہل الذمۃ، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان ۱۴۲۳ھ ۲۰۰۲ء ۱/ ۱۵۲۔ بیہقی، السنن الکبری ۱۲/ ۷۰۴ رقم ۱۹۲۳۸

حدیث حسن صحیح" کا حکم لگا دیا ہے تو کسی قسم کے نقد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔[1] تاہم یہ روایت بظاہر اسلام کی عمومی اخلاقی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کے "خلق عظیم" کے برعکس نظر آتی ہے کیونکہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایت ہے:

خالق الناس بخلق حسن۔[2] ترجمہ:

"تمام لوگوں سے حُسن اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔"

اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی چشم دید گواہی ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو اس کی آواز سن کر فرمایا: "بئس ابن العشیرۃ" (قبیلے کا کتنا برا آدمی ہے) مگر جب اسے اجازت دی اور وہ اندر آیا تو آپ ﷺ انتہائی نرمی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اس کے ساتھ پیش آئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد حضرت عائشہؓ نے خلاف عادت ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

عائشہ! لوگوں میں وہ آدمی بہت بُرا آدمی ہے جس کی فحش کلامی کے باعث لوگ اس سے ملنا ہی چھوڑ دیں۔[3]

علیٰ ہذا القیاس امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الادب میں ایک باب کا عنوان قائم کیا ہے: "باب الانبساط الی الناس" (تمام لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی اور کھلے دل سے پیش آنے کا بیان) اور اس باب میں فقیہ صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ

خالط الناس و دینک لا تکلمنہ۔[4]

ترجمہ: "تمام لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے میل ملاپ رکھو اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کر کے اپنے

---

[1] - دیکھئے: ترمذی، الجامع (ابواب الاستیذان والادب باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی الذمی) ۲/۵۵۷، رقم: ۲۷۰۰

[2] - کتاب مذکور (ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی معاشرۃ الناس) ۲/۴۶۳، رقم: 1987

[3] - حوالہ مذکور (ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی المداراۃ) ۲/۴۶۳، رقم: ۱۹۹۶؛ نیز ابوداود، السنن (کتاب الادب باب فی حسن العشرۃ) ۲/۳۱۷؛ علی متقی ہندی، کنز العمال (کتاب الاخلاق باب المداراۃ)، ۳/۳۱۵، رقم الحدیث: ۸۷۵۳

[4] - بخاری، الجامع الصحیح (کتاب الادب باب الانبساط الی الناس الخ) ۲/۹۰۵

دین کو عیب دار نہ بناؤ۔

اسی طرح امام بخاری نے "الادب المفرد" میں بھی اسی عنوان (باب الانبساط الی الناس) سے مستقل باب قائم کرتے ہوئے اس مضمون کی متعدد روایات درج کی ہیں اور بتایا ہے کہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت ہے جس کی تائید تورات میں بھی موجود ہے۔[1]

اس لیے اس روایت کی ایسی توجیہ اور ایسا معنیٰ متعین کرنا ضروری ہے جس سے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمین اور صاحبِ خلق عظیم ذات پر کوئی حرف نہ آئے۔ دوسرے زیر بحث روایت اور دیگر اخلاقی تعلیمات اسلام، عملی اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر مسلموں کے ساتھ ہمارے اسلاف کے حسن برتاؤ پر مشتمل روایات کے درمیان ظاہری تعارض و تصادم ختم ہو جائے اور یہ چیز ہمارے دور بین محدثین و فقہاء سے اوجھل نہ تھی۔ چنانچہ مشہور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی نے زیر بحث حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

"اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اہل الذمہ کے اکرام اور احترام میں تنگ راستہ ان کے لیے خالی نہ کر دو.... یہ معنیٰ نہیں کہ جب تم ان سے کسی کھلے اور کشادہ راستے میں ملو تو خواہ مخواہ انہیں ایک طرف چلنے پر مجبور کر دو اور کھلا راستہ ان پر تنگ کر دو کیونکہ یہ ان کے لیے اذیت ہے اور بلا جواز ہمیں ان کی اذیت رسانی سے روکا گیا ہے۔ (لان ذالک اذیً لهم و قد نهینا عن اذاهم بغیر سبب)"[2]

اسی طرح مشہور شارح حدیث علامہ نووی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

"ہمارے اصحاب (شوافع) کہتے ہیں کہ ذمی کو راستے کے درمیان میں نہیں چلنے دیا جائے گا جبکہ اس راستہ پر مسلمان بھی چل رہے ہوں اور اگر راستہ بھیڑ سے خالی ہو تو

---

[1] - الادب المفرد (باب الانبساط الی الناس) دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ص:۳۸

[2] - عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری (کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین) قدیمی کتب خانہ کراچی ت۔ن ۱۱/۴۷ رقم حدیث ۶۲۵۴

اس کے درمیان راستہ چلنے میں بھی کوئی حرج نہیں اور اس پر راستہ تنگ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ دھکیل کر اسے گڑھے میں گرا دیا جائے یا اس طرح اسے پکڑ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے کہ دیوار ہی اس پر گر پڑے۔"[1]

جبکہ سنن ابی داود کے حاشیے میں اس کا معنٰی یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

"اگر راستے کے درمیان میں دیوار ہو جس کے باعث راستہ تنگ ہو رہا ہو تو ذمی راہگیر سے کہا جائے گا کہ راستہ کے درمیان میں چلنے کی بجائے ایک طرف ہو کر چلو یہ گویا صراط مستقیم (اسلام) سے اس کے ہٹ کر چلنے کا بدلہ ہے۔"[2]

اسی طرح جامع ترمذی کے محشی مولانا احمد علی سہارنپوری فرماتے ہیں:

"ذمی راہگیر کو تنگ راستے پر چلنے پر مجبور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تنگ راستے میں اسے درمیان میں نہیں چلنے دیا جائے گا اور اس تنگی کا یہ معنٰی نہیں کہ اسے دھکیل کر کسی گڑھے وغیرہ میں گرا دیا جائے اور اگر راستے میں بھیڑ نہ ہو تو اس کے درمیان راستے پر چلنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔"[3]

علامہ قرافی نے ۱۹ویں فرق میں اہل الذمہ کے ساتھ نیکی اور ان کے ساتھ قلبی محبت و مودت میں فرق بیان کرتے ہوئے زیر بحث معاملے میں بڑی حقیقت پسندانہ اور عمدہ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

وکذالک اذا تلاقینا معهم فی الطریق واخلینا لهم واسعها ورجبها والسهل منها وترکنا انفسنا فی خسیسها وحزنها وضیقها کما جرت العادۃ ان یفعل ذالک المرء مع الرئیس والولد مع الوالد والحقیر مع الشریف فان هذا ممنوع لما فیه من تعظیم

---

1 - نووی، ابوزکریا یحیٰی بن شرف، شرح صحیح مسلم، قدیمی کتب خانہ کراچی ۲/۲۱۴

2 - ابوداؤد، السنن (حاشیہ) ۲/۳۶۶

3 - ترمذی، جامع (حاشیہ) ۲/۵۵۷

شعائر الکفر و تحقیر شعائر اللہ تعالٰی و شعائر دینہ و احتقار اھلہ ۔ [1]

"اور اسی طرح جب ہماری راستے میں ان (اہل الذمہ) سے ملاقات ہو اور ہم ان کے لیے راستے کا وسیع کشادہ اور آسان حصہ خالی کر دیں اور خود راستے کے گندے، سخت اور تنگ حصے میں چلنے لگیں جیسا کہ عادۃً عام آدمی کسی رئیس کے لیے، بیٹا باپ کے لیے اور گھٹیا آدمی کسی شریف آدمی کے ساتھ کیا کرتا ہے تو یہ چیز ممنوع ہے کیونکہ اس طرز عمل میں کفر کے شعائر کی تعظیم اور شعائر اللہ، اس کے دین کے شعائر اور خود اس مسلمان آدمی کی تحقیر کا پہلو پایا جاتا ہے۔"

اسی طرح ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے س مقاصد شریعت کی بحث میں ایک عمدہ بات لکھی ہے۔ جو زیر بحث معاملے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

"اسلام کی دعوت کا سب سے بڑا مفاد جس کی حفاظت ضروری ہے، یہ ہے کہ عام انسانوں کے سامنے نبی کریم رحمۃ للعالمین ﷺ کی تصویر نہ بگڑنے پائے کیونکہ دعوت الی اللہ کی قبولیت کا انحصار بڑی حد تک اس پر ہے کہ لوگ آپ ﷺ کو اعتماد اور انس کے ساتھ دیکھیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ اگر کسی صحیح بلکہ بعض اعتبار سے ضروری اقدام سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہو یا دشمن اسے غلط معنی پہنا سکتا ہو تو اس مفاد کی خاطر اسے نہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ سے مروی دو حدیثیں اس اہم اصل کی تصدیق کرتی ہیں۔" [2]

اس کے بعد موصوف نے مذکورہ اصل کی تائید اور تصدیق میں دو مشہور احادیث نقل کی ہیں، پہلی حدیث وہ ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ذاتی خواہش اور کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے

[1] - الفروق ۳/۳۰

[2] - مقاصد شریعت، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۲۰۰۹ء ص ۳۳-۳۲

باجود بیت اللہ شریف کو ابراہیمی بنیادوں تعمیر کرنے کا ارادہ محض اس لئے ترک فرمادیا کہ یہ نو مسلم قریش مکہ کے انتشار ایمان کا سبب بن سکتا تھا۔ جبکہ دوسری حدیث میں صحابہ کے مشورہ کے باوجود منافقین (عبداللہ بن ابی) کو قتل نہ کرلینے سے متعلق ہے، جن کا اندراج طوالت کا باعث ہوگا۔[1]

بنابریں کہا جاسکتا ہے کہ راستہ تنگ کرنے والی روایت کو اگر ظاہری معنی پر بھی محمول کیا جائے تو درج بالا بڑی شرعی مصلحت کی خاطر اس پر فی زمانہ عمل نہیں کیا جائے گا۔

1۔ دیکھئے: حوالہ مذکور

خلاصہ بحث

زیر تحقیق موضوع کے حوالے سے گزشتہ تمام مباحث اور تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ

- ایک اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد ملک گیری، حدود سلطنت کی توسیع، وسائل پر قبضہ، مفتوح اقوام کا استیصال یا حکمران کے ذاتی اقتدار کا استحکام نہیں بلکہ عدل اجتماعی، انسانی فلاح و بہبود اور ساری دنیا سے بالعموم اور اندرون ملک بالخصوص ہر قسم کے ظلم وزیادتی کا ازالہ اور بلا تمیز و تفریق عدل و انصاف کی فراہمی ہے۔ ایرانی سپہ سالار رستم کے سامنے سفیر اسلام حضرت ربعی بن عامرؓ نے ایران میں اپنی آمد اور ایرانی حکومت کے ساتھ جنگ کی یہی غرض وغایت بتائی تھی۔
- اسلام میں حکومت یا حاکم اور عوام کے تعلق کی نوعیت حاکم اور محکوم کی نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کی ہے۔ اسی لیے اسلامی شریعت نے حاکم کے لیے راعی اور عوام کے لیے رعیت کا لفظ بولا ہے۔ حضور ﷺ کی مشہور حدیث "الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالا میر الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیته" تعلق کی اسی نوعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حکمران اور رعایا کے درمیان تعلق کی یہ نوعیت جس طرح مسلمانوں کے لیے ہے اسی طرح غیر مسلم رعایا کے لیے بھی ہے۔
- اسلام نظام حکومت اور مسلم و غیر مسلم تمام رعایا کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے اسلامی ریاست کو چند اصولوں کا پابند بناتا ہے۔

پہلا اصول: تصور حاکمیت الہیہ

لوگوں کے بنیادی حقوق کی پامالی اور ان کے استحصال کا سب سے بڑا سبب چونکہ حکمران کا اپنے آپ کو الٰہ یعنی مقتدر اعلیٰ اور حاکم اعلیٰ سمجھنا ہے۔ اس لیے اسلام نے سب سے پہلے اس تصور حاکمیت پر کاری ضرب لگائی اور اللہ کو حاکم و مقتدر اعلیٰ قرار دیا ہے۔ اس تصور حاکمیت سے حکمران میں خوف خدا اور

جوابدہی کا تصور پیدا ہوتا ہے جو اسے ہر قسم کے ظلم سے باز رکھتا ہے۔

دوسرا اصول: تکریم انسانیت

اسلام کی نگاہ میں ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب، علاقہ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، قابل تعظیم و تکریم ہے۔ اسلامی حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے انسانیت کی تذلیل و تحقیر ہوتی ہو۔ اس اصول کی رو سے بحیثیت انسان تمام غیر مسلم لوگ بھی قابل تعظیم و تکریم ہیں۔

تیسرا اصول: انسانی مساوات

اسلام کے نزدیک تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے سے برابر ہیں اور وہ رنگ، نسل، حسب و نسب اور علاقہ وزبان وغیرہ کی بنیاد پر کسی سے امتیازی سلوک کا قائل نہیں۔ اس انسانی مساوات کے اصول کے مدنظر حضرت عمر نے گورنر مصر کے بیٹے کو ایک مصری ذمی کے ہاتھ سے بر سر عام کوڑے لگوائے۔

چوتھا اصول: اقامت عدل

اسلامی ریاست کے اندر مقیم ہر فرد خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، چھوٹا ہو یا بڑا، کمزور ہو یا طاقتور، دوست ہو یا دشمن اس کے لیے عدل و انصاف کی فراہمی اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس بنیادی اصول اور فریضہ کے پیش نظر اسلام نے غیر مسلم رعایا کے لیے عدل و انصاف کی ایسی مثالیں قائم کیں جس کی نظر آسمان کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

پانچواں اصول: ہر محتاج و ضرورتمند کی کفالت

اسلامی ریاست کے اندر مقیم ہر محتاج و ضرورتمند خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، کی کفالت اور اس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی حکومت کا بنیادی فرض ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر خلفاء اسلام نے جہاں مسلمان ضرورتمندوں کی کفالت کا اہتمام کیا وہاں اپنی غیر مسلم رعایا کی کفالت کا بھی انتظام کیا۔

چھٹا اصول: ظلم وزیادتی کا ازالہ

اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں میں یہ اصول بھی داخل ہے کہ وہ کسی بھی شہری پر خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ظلم نہیں ہونے دے گی۔ کوئی طاقتور آدمی کسی کمزور پر کسی بھی قسم کی زیادتی کا مرتکب ہو گا تو حکومت اس کا ازالہ کرے گی۔ اسی بنیادی اصول کے تحت خلفاء اسلام نے اپنی غیر مسلم رعایا پر کبھی ظلم نہ ہونے دیا اور اگر کبھی کسی سے زیادتی ہوئی تو اس کا ازالہ کیا۔

سانواں اصول: ایفاء عہد

ایفاء عہد یا معاہدات کی پابندی کرنا بھی اسلامی ریاست کے بنیادی اور لازمی اصولوں میں شامل ہے۔ اس اصول کے تحت اسلامی حکومتوں نے اہل الذمہ سے کیے گئے معاہدوں کی ہمیشہ پابندی کی۔

- دیوانی قانون کے سیاق وسباق میں حق سے مراد وہ استحقاق یا Entitlement ہے جس کا مطالبہ عدالت کے ذریعے یا کسی قانونی ادارے یا حکومت کے ذریعے کیا جاسکتا ہو۔ حق کی جمع حقوق ہے۔ ایک وسیع الاختیار ریاست کے مقابلے میں ایک فرد / شہری کو جو حقوق دیے جاتے ہیں۔ انہیں بنیادی حقوق کہا جاتا ہے۔ اسلام میں بنیادی حقوق سے مراد شریعت کی طرف سے عطا کردہ وہ حقوق ہیں جو ہر انسان کو بحیثیت انسان پیدائشی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ یہ حقوق انسان کی معاشرتی و تمدنی زندگی کے لیے اس کے مدنی الطبع ہونے کی بنا پر ضروری ہیں اور ان کے بغیر انسان کی بقاء اور تعمیر شخصیت ناممکن ہے۔ اسلام یہ حقوق بلا کسی مذہبی و نسلی و علاقائی تفریق کے ہر انسان کو عطا کرتا ہے۔

- اسلام میں انسانی بنیادی حقوق کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان حقوق کا تحفظ اصولیین کے مطابق شریعت اسلامیہ کے پانچ بنیادی مقاصد میں داخل ہے۔ علاوہ ازیں شریعت نے بندوں کے حق کو شریعت کے حق پر مقدم کیا ہے۔

- اسلام کے نزدیک یہ انسانی حقوق قطعی وابدی ہیں کیونکہ یہ انسانوں کے خالق کے عطا کردہ ہیں نہ کہ کسی حکومت کے۔ اس لیے کوئی حکومت انہیں معطل نہیں کر سکتی۔ ہنگامی حالات میں شہریوں

کے حقوق کی معطلی اسلامی نقطہ نظر کے خلاف ہے۔

- اسلام نے ان حقوق کی ادائیگی کے لیے اپنے ماننے والوں کو اولاً تو ذہنی طور پر تیار کیا ہے اور انہیں مطالبہ حق کی بجائے "ایتائے حق" کی تعلیم دی ہے۔ اسی ذہنی تربیت کے لیے حکومت و اقتدار میں امانت و نیابت اور احتساب آخرت کا تصور دیا گیا ہے۔
- انسانی حقوق کی ادائیگی کے لیے اسلام نے صرف اخلاقی تعلیمات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلم و غیر مسلم کی تمیز کے بغیر تمام رعایا کے حقوق کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔ اسلام نے تحفظ حقوق کی سب سے بڑی ذمہ داری حکومت پر ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں حکومتی سطح پر حدود و تعزیرات کے نفاذ کا بھی بڑا مقصد لوگوں کے حقوق اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہے۔
- ایک اسلامی ریاست میں رہائش پذیر غیر مسلم رعایا (اھل الذمہ) کا معاملہ اسلام میں بڑی اہمیت اور انتہائی توجہ کا حامل معاملہ ہے۔ اسی لیے فقہاء و علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں ضمنی مباحث کے علاوہ غیر مسلم شہریوں / ذمیوں کے حقوق و فرائض اور ان سے متعلق دیگر احکام و مسائل پر مستقل کتابیں مرتب کی ہیں۔
- ایک اسلامی ریاست اپنے ظاہری ڈھانچے اور عناصر ترکیبی کے اعتبار سے اگرچہ عام قومی و جمہوری ریاستوں سے چنداں مختلف نہیں ہوتی تاہم اپنے آئین، بنیادی اصولوں، نظام حکومت اور مقاصد و اہداف کے لحاظ سے مذکورہ قسم کی ریاستوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔
- اسلام انسانوں کی تقسیم یا قومیت کی تشکیل دیگر اقوام و مذاہب کی طرح رنگ، نسل، قبیلہ، زبان یا علاقہ وغیرہ جیسے غیر اختیاری عوامل و عناصر (جو عموماً تنگ نظری اور قومی عصبیت کو جنم دیتے ہیں) کی بجائے عقیدہ و نظریہ کے اختیاری عنصر کی بنیاد پر کرتا اور رنگ و نسل یا زبان و علاقہ کی تمیز کے بغیر ہر انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اسلامی عقائد و نظریات اختیار کر کے مسلم قومیت یا

امت مسلمہ میں شامل ہو سکتا اور مسلمانوں کے لیے مختص تمام حقوق کا مستحق ہو سکتا ہے۔

- اسلام کی اس کھلی دعوت کے باوجود جو لوگ اپنے غیر اسلامی عقائد پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو اسلام انہیں ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ تاہم وہ اسلامی قومیت کا جزو نہیں بن سکتے اور نظریاتی اعتبار سے اپنے اور پرائے کا فرق ساری مہذب دنیا اور اقوام میں ایک مسلمہ حقیقت ہے۔
- اسلامی ریاست چونکہ ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہوتی ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ایسی ریاست کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے اساسی دستور پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ اسلام بلاتمیز تمام انسانوں کے سامنے اپنا اصلاحی پروگرام پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کرلے وہ حکمران جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ ذمی (Protected Citizen) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ جس کے جان و مال عزت و آبرو کا تحفظ کیا جائے گا لیکن اسے حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی۔
- جس غیر مسلم گروہ کا عقیدہ و نظریہ اسلامی تعلیمات سے جتنا قریب اور جس کا طرز عمل جتنا دوستانہ اور مصالحانہ ہو گا اس کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلقات اتنے ہی قریبی اور دوستانہ ہوں گے اور جس گروہ یا ملک کا نظریہ و عقیدہ اسلام سے جتنا دور اور اس کا طرز عمل جتنا مخالفانہ اور معاندانہ ہو گا اس سے تعلقات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ اس اصول کی روشنی میں اسلام تمام غیر مسلموں کو محاربین، مستامنین، معاہدین اور اہل الذمہ کی چار اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔ ان میں معاند اور دشمن گروہ (محاربین) کے ساتھ حتیٰ کہ میدان جنگ بھی ان کے ساتھ انصاف اور انسانی ہمدردی و خیر خواہی کا حکم دیتا اور ہر قسم کی زیادتی اور ناانصافی سے منع کرتا ہے۔
- غیر مسلم لوگ جس معاہدہ کے ذریعے اسلامی ریاست کے باقاعدہ شہری قرار پاتے ہیں اصطلاح میں اسے عقد ذمہ اور ان غیر مسلم شہریوں کو اہل الذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ لغوی و اصطلاحی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ شودر اور ملیچھ کا ہم معنی نہیں بلکہ ذمی وہ شخص ہے جس کے حقوق کی ادائیگی

اور ہر طرح سے تحفظ کا ذمہ اسلامی حکومت نے لے رکھا ہو۔

- یہ معاہدہ / عقد ذمہ محض رسمی اور کاغذی کارروائی نہیں ہوتی بلکہ اسے آئینی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ جسے بعد میں آنے والی کوئی حکومت بھی توڑ نہیں سکتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت یہ ذمہ محض اپنی طرف سے یا مسلم باشندوں کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے لیتی ہے۔ اس معاہدہ کے ذریعے اسلامی ریاست اہل الذمہ کے جن حقوق کا ذمہ لیتی ہے ان کی ادائیگی اسی طرح لازم ہے جس طرح اسلام کے دیگر فرائض وواجبات کی ادائیگی لازم ہے۔
- ان عقد ذمہ کی دیگر شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کا ہر طرح دفاع کرے گی۔ اور یہ لوگ اس دفاع کے عوض اسلامی حکومت کو جزیہ کے نام سے ایک برائے نام مالی ٹیکس ادا کریں گے۔ جب کوئی غیر مسلم قوم یا ملک جزیہ دینا قبول کر لیتا ہے تو شرعی اعتبار سے اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی عصمت وحرمت حاصل ہو جاتی ہے جو مسلمانوں کے جان ومال اور عزت وآبرو کو حاصل ہے۔
- غیر مسلموں کے کفر پر قائم رہنے کے باوجود ان سے عقد ذمہ کرنے کی شرعی اجازت میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ جب وہ اسلام کے عقائد وتعلیمات سے آگاہ ہوں گے اور اہل اسلام کے اخلاق، طرز عمل اور نمونہ زندگی کو دیکھیں گے تو شاید اسلام قبول کر لیں۔ گویا یہ عقد ذمہ دعوت اسلام کی ایک شکل ہے اور اسلام کی دعوت وتبلیغ اسلامی ریاست کا سب سے اولین مقصود ہے۔
- انسان طبعی طور پر "مدنی الطبع" ہے اور وہ انسانی سماج ومعاشرہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے غیر مسلموں کو بھی سماجی تعلقات ومراسم قائم کرنے کا اسی طرح حق حاصل ہے۔ جس طرح مسلمانوں کو ہے۔ اور اسلام نے اس معاملے میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے سماجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔
- اسلام تمام غیر مسلموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکتا۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو اجازت دی

ہے کہ جو غیر مسلم ان سے بغض و عداوت کا مظاہرہ نہیں کرتے اور نہ ان سے جنگ و جدال کرتے ہیں تو وہ ان سے نیکی اور انصاف سے پیش آئیں (ان تبروھم وتقسطوا الیھم) پھر اس قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ جس نیکی (برّ) کا حکم دیا گیا، اس میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں تمام معاشرتی نیکیاں آجاتی ہیں۔ اسلام نے غیر مسلموں کا یہ سماجی و تمدنی حق تسلیم کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ باہمی میل جول رکھ سکتے ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں (مساجد) میں بوقت ضرورت داخل ہو سکتے ہیں۔ ملاقات کے وقت سلام دعاء کر سکتے ہیں۔

- شرعی طور پر غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ساتھ سماجی تعلقات و مراسم قائم کرنے کا حق ہے۔ چنانچہ مسلمان ان کی دعوت قبول کر سکتے ہیں۔ انہیں مہمان ٹھہرا سکتے ہیں۔ ان کی عیادت کر سکتے ہیں۔ تجہیز و تکفین میں شرکت کر سکتے ہیں۔ تحائف کا تبادلہ اور لین دین کیا جا سکتا ہے۔ تعزیت کی جا سکتی ہے اور یہ تمام چیزیں اسوہ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے طرز عمل سے ثابت ہیں۔
- قرآن مجید کی کئی آیات میں غیر مسلموں سے قلبی اور رازدارنہ تعلق قائم رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ مفسرین اور فقہاء اسلام کی تصریحات کے مطابق غیر مسلموں سے تعلقات کے مختلف درجات اور ان کا مختلف شرعی حکم ہے۔ ان تصریحات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلموں سے قلبی تعلق میں اصل مانع ان کی عداوت اور بغض ہے نہ کہ مذہبی تعصب۔ یہ ممانعت "من دون المؤمنین" کی حیثیت سے ہے نہ کہ ان کے پڑوسی اور رشتہ دار وغیرہ کی حیثیت سے۔ عقلی طور پر بھی یہ بات درست نہیں کہ آدمی اپنی جماعت کو چھوڑ کر اغیار اور مخالفین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔
- غیر مسلموں یا اہل الذمہ کے حقوق کے حوالے سے اسلام کا عمومی قاعدہ یہ ہے کہ "لھم مالنا وعلیھم ما علینا" اُن کے وہی حقوق ہیں جو ہمارے (مسلمانوں کے) ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہمارے (مسلمانوں کے) اوپر ہیں۔ غیر مسلم شہری جب جزیہ دینا قبول کر لیتے ہیں

تو ان کے مال و جان اور عزت و آبرو کو وہی حرمت و عصمت حاصل ہو جاتی ہے جو مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو حاصل ہے۔

- شرعی لحاظ سے اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کا خون اتنا ہی قیمتی ہے جتنا مسلمانوں کا۔ اگر کوئی مسلمان ناحق اور عمداً کسی ذمی / غیر مسلم کو قتل کر دے گا تو قصاص میں اس مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا۔ ذمی کے بدلے مسلمان قاتل کو قتل کرنے کے کئی تاریخی نظائر موجود ہیں۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر ذمی کے قتل کی صورت میں اس کی دیت (خون بہا) بھی مسلمان کی دیت کے برابر ہو گی۔
- اسلام کے نزدیک غیر مسلموں کے مال کو اسی طرح حرمت حاصل ہے جس طرح مسلمانوں کے مال کو۔ کسی بھی ناجائز طریقے سے اہل الذمہ کا مال کھانا ممنوع ہے۔ اسلام میں غیر مسلموں کے مال و جائیداد کی حرمت کا اس قدر لحاظ رکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کے شراب اور خنزیر کو بھی تلف کر دے گا تو اسے تاوان دینا ہو گا۔ مسلمانوں نے اقتدار کے باوجود کبھی غیر مسلموں کی املاک کو نقصان پہنچایا نہ کبھی ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح اسلام ان کی عزت و آبرو کے تحفظ اور ان کے مذہبی جذبات و احساسات کے پاس کرنے کا حکم دیتا ہے۔
- اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کو ہر قسم کی زیادتی اور ظلم سے بچانے کی شرعی طور پر ذمہ دار ہے۔ صرف داخلی طور پر نہیں بلکہ اگر کوئی خارجی دشمن بھی ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو اس صورت میں بھی ان کا دفاع اسلامی ریاست کا فرض ہے۔ اس معاملے میں پیغمبر اسلامؐ اور خلفاء اسلام نے جو مثالیں چھوڑی ہیں دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اگر کسی خلیفہ نے اپنی طبعی افتاد یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت اہل الذمہ سے زیادتی کی کوشش کی ہے تو فقہاء اسلام نے ان کا دفاع کیا ہے۔
- شرعی اعتبار سے اہل الذمہ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کوئی بھی کاروبار اور پیشہ اختیار کر

سکتے ہیں اس معاملے میں انہیں اتنی احتیاط بہر کیف کرنی ہوگی کہ مسلم آبادیوں میں وہ کھلے عام شراب اور سور کی خرید و فروخت نہ کریں۔ اپنی مخصوص آبادیوں میں ان پر یہ احتیاط بھی لازم نہیں۔ کھلے عام یہ کاروبار کر سکتے ہیں۔

- اسلامی ریاست شرعی اعتبار سے جس طرح اپنے مسلمان شہریوں کی شخصی آزادی اور پرائیویسی کا لحاظ کرنے کی پابند ہے۔ اسی طرح اس کے لیے غیر مسلم شہریوں کی شخصی آزادی اور پرائیویسی کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ غیر قانونی طور پر انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے نہ حبس بے جا میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس پرائیویسی کے حق میں ان کی رہائش گاہوں کی حرمت بھی داخل ہے۔ کسی مسلمان اور اکثریتی فرد کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ بلا اجازت ان کے گھر میں داخل ہو کر اس کی حرمت پامال کرے۔
- اسلامی ریاست میں جس طرح مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست میں جہاں چاہیں قیام کریں، آزادانہ نقل و حرکت کریں۔ اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ملک بھر میں یہ حق حاصل ہے۔ البتہ جزیرۃ العرب کے مخصوص اور محدود علاقہ میں انہیں مستقل رہائش پذیر ہونے کی شرعی طور پر اجازت نہیں۔ یہ پابندی کسی مذہبی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ داخلہ پالیسی کی بنیاد پر ہے۔ جیسا کہ ویٹی کن سٹی میں کسی غیر کیتھولک کو وہاں رہائش پذیر ہونے اور جائیداد خریدنے کی اجازت نہیں۔
- قرآنی نقطۂ نظر سے دنیا میں عقیدہ و مذہب کا اختلاف مشیت الٰہی اور تکوینی و قدرتی امر ہے۔ جسے طاقت کے بل بوتے پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام نے عقیدہ و مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ کو ممنوع ٹھہرایا ہے۔ سیاسی اعتبار سے عروج کے زمانے میں اور دنیا میں سپر طاقت ہونے کے باوجود اسلام نے کبھی مفتوح اقوام کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس کے کئی تاریخی نظائر بھی موجود ہیں۔ خود مستشرقین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ تاہم اسلام میں

مرتد کو قتل کیے جانے کا معاملہ دوسرا ہے۔ "لا اکراہ فی الدین" سے مراد اسلام قبول کرنے میں عدم اکراہ ہے نہ یہ کہ مرضی سے قبول اسلام کے بعد بھی جو چاہے اسلام میں رہے اور جو چاہے اسلام چھوڑ دے۔ اس آیت میں "جبر فطری" کی نفی ہے نہ کہ "جبر قانونی" کی۔

- عقیدہ و مذہب کے معاملے میں اسلام کے درج بالا اصول کے پیش نظر اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں / اہل الذمہ کو بھی عقیدہ و مذہب کے معاملے میں آزادی دی گئی ہے۔ اہل الذمہ کے لیے اس آزادی کے ثبوت کے لیے عہد نبویؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے کے چند معاہدات مثلاً میثاق مدینہ، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ، سینٹ کیتھرائن کے راہبوں کے لیے مذہبی آزادی کا سند نامہ، اور عہد فاروقی میں اہل الذمہ کے ساتھ کیے گئے متعدد معاہدات بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔
- اسلام نے اہل الذمہ کو جیسا کہ اوپر گزرا، جب عقیدہ و مذہب کے معاملے میں پوری پوری آزادی دی ہے تو اس آزادی کا تقاضا ہے کہ انہیں اپنی مذہبی عبادات و رسوم بجالانے کی بھی اجازت ہو۔ چنانچہ اسلامی ریاست انہیں کھلے دل سے مذہبی عبادات و رسوم بجالانے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم اتنی قدغن ضرور لگاتی ہے کہ ان رسوم کی کھلے عام ادائیگی سے اگر نقض امن، خون خرابہ اور فرقہ وارانہ فسادات کا اندیشہ ہو یا اسلامی شعائر کی توہین ہوتی ہو تو پھر انہیں بر سر عام ان رسوم کی ادائیگی میں احتیاط برتنی ہوگی۔ ورنہ اپنی عبادتگاہوں کی چاردیواری کے اندر ان رسوم کی ادائیگی پر کوئی قدغن ہے نہ پابندی۔
- گزشتہ تصریحات کے مطابق اسلام نے اپنے غیر مسلم شہریوں کو جب اپنے عقیدہ و مذہب اور مذہبی عبادات و رسوم کے معاملے میں آزادی دی ہے تو اس آزادی کا عقلی و فطری تقاضا ہے کہ انہیں اپنی عبادتگاہیں تعمیر کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ چنانچہ اسلام نے اہل الذمہ کو اجازت دی ہے کہ وہ "امصار المسلمین" کو چھوڑ کر باقی شہروں اور اپنی آبادیوں میں جہاں چاہیں

اپنی عبادتگاہیں تعمیر کریں اور امصار المسلمین میں بھی تعمیر معابد کی ممانعت کسی مذہبی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ امن وامان کو قائم رکھنے اور مذہبی وفرقہ وارانہ فسادات سے بچنے کی خاطر ہے۔ تاہم غیر مسلم شہریوں کو جس طرح جزیرۃ العرب اور حجاز کے مخصوص علاقے میں شرعی طور پر مستقل رہائش پذیر ہونے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح انہیں وہاں معابد تعمیر کرنے کی بھی اجازت نہیں۔

- اسلام نے اپنے غیر مسلم شہریوں کو جو مذہبی آزادی دی ہے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے شخصی وعائلی معاملات نکاح، طلاق وغیرہ چاہے وہ شرعی نقطہء نظر سے ناجائز اور حرام ہی کیوں نہ ہوں، اپنے مذہبی عقیدہ و قانون کے مطابق سرانجام دے سکتے ہیں۔ اگر کسی خلیفہ نے انہیں ایسا کرنے سے روکنا چاہا ہے تو فقہاء اسلام نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔
- اسلامی ریاست ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہوتی ہے۔ ایسی ریاست کے تمام شہریوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک انسان ہونے کی اور دوسری مسلمان یا غیر مسلم ہونے کی۔ پہلی حیثیت کے حوالے سے مسلم اور غیر مسلم تمام شہریوں میں کامل مساوات ہو گی۔ رنگ، نسل، قبیلہ، علاقہ اور زبان کی غیر اختیاری چیزوں کی بنیاد پر ان کے حقوق میں کوئی امتیاز اور تفریق نہ ہو گی۔ جہاں تک ان کی دوسری حیثیت کا تعلق ہے تو یہ ان کی اپنی اختیار کردہ ہے۔ اسلام نے اہل ایمان کے لیے جو حقوق متعین کیے ہیں وہ دراصل پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ کوئی بھی آدمی اسلام قبول کر کے ان حقوق کا مستحق بن سکتا اور مسلمانوں کے مساوی الحیثیت بن سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم اس سے خود انکاری ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے بعض مختص حقوق سے محروم رہتے ہیں۔
- شرعی نقطہء نظر سے سیاسی یا سرکاری عہدے کسی بھی شہری خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم کا حق نہیں بلکہ ایک امانت ہیں۔ جو صرف اس کے اہل کو دیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے کوئی عہدہ طلب کرنا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں۔

- اسلام کے مطابق تمام سرکاری عہدے ایک امانت ہیں اور یہ صرف ان کے اہل کو دیے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس پر تمام دنیا میں عملدرآمد ہوتا ہے کہ کوئی اہم سرکاری عہدہ صرف اسی آدمی کو دیا جاسکتا ہے جو اس کا اہل ہو اور اس عہدہ کے لیے مطلوبہ شرائط وصفات کا حامل ہو۔ اس اصول کی رو سے اسلامی ریاست کے کئی عہدے مثلاً خلیفہ یا صدر مملکت اور وزیر اعظم وغیرہ ایسے ہیں جو کسی غیر مسلم کو نہیں دیے جاسکتے کیونکہ ان میں عہدیدار کا مسلمان ہونا شرط ہے۔
- اسلامی ریاست میں جہاں تک حکومت کے ان عہدوں اور مناصب کا تعلق ہے جن میں عہدیدار کا مسلمان ہونا شرط نہیں اور وہ انتظامی امور سے متعلق ہیں یا جن کا کام صدر مملکت وزیر اعظم اور حکومت کے احکام پر عملدرآمد یقینی بنانا ہوتا ہے تو وہ تمام عہدے غیر مسلموں کو بشرطیکہ ان کی مطلوبہ اہلیت پر پورا اترتے ہوں، دیے جاسکتے ہیں۔ اس فصل میں فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں اسی اصول کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس اصول کے تحت مختلف اسلامی ادوار میں غیر مسلموں کو بڑے بڑے انتظامی عہدے دیے جاتے رہے ہیں۔
- جہاں تک آج کل کے مروجہ انتخابات میں غیر مسلموں کے حصہ لینے کا تعلق ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم اپنے آپ کو صدر مملکت، وزیر اعظم یا رکن پارلیمنٹ وغیرہ کے امیدوار کے طور پر پیش کرے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم شہری درج بالا امیدواروں کو اپنا ووٹ کاسٹ کرے۔ اس میں پہلی صورت تو شرعاً بالکل ناجائز ہے کیونکہ اسلامی ریاست کا سربراہ بننے کے لیے امیدوار کا صرف شہری ہونا کافی نہیں بلکہ مسلمان ہونا اولین شرط ہے۔ دوسری صورت یعنی غیر مسلموں کا صدر مملک یا وزیر اعظم کے انتخاب میں اپنا ووٹ کاسٹ کرنا تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض جواز اور بعض عدم جواز کے قائل ہیں۔
- اسلامی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ خلفاء اسلام اپنی سیاسی کشمکشوں، اقتدار کی خاطر باہمی

لڑائیوں، خونریزیوں اور کئی انتظامی و اخلاقی خامیوں کے باوجود اپنی غیر مسلم رعایا سے جس رواداری، وسعت ظرفی، بے تعصبی، عدل و انصاف اور بکمال حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے، اس کی نظیر دنیا کی کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ دنیا کے دوسرے غیر مسلم حکمرانوں کے مقابلے میں خلفاء اسلام کی یہ وہ خوبی ہے جس کا اعتراف خود حقیقت شناس اور انصاف پسند غیر مسلم مفکرین اور مستشرقین کو بھی ہے۔

- اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو ریاست کے دفاع پر مجبور نہیں کرتی بلکہ اس دفاع کے بدلے ان کے صرف ان مردوں سے جزیہ لیا جاتا ہے جو جنگ کے قابل اور کمانے والے ہوتے ہیں۔ خواتین بچے، بوڑھے، معذور، راہب وغیرہ سب جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ جبراً مسلمان بنانے کا ذریعہ نہ تھا۔ اگر یہ بات ہوتی تو معمولی مقدار میں جزیہ نہ لیا جاتا نہ اس میں اتنی رعایات دی جاتیں اور نہ کسی غیر مسلم کو مستثنیٰ کیا جاتا۔ جزیہ کی وصولی کے لیے بعض فقہاء نے ذلت آمیز طریقہ سے جزیہ وصول کرنے کی جو رائے دی ہے۔ وہ قرآن وسنت کی عمومی اور اخلاقی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ رائے محل نظر ہے اور آج کے دور میں قابل عمل نہیں۔
- بعض فقہاء اسلام نے اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی ظاہری ہیئت، لباس، بالوں اور سواری وغیرہ کے حوالے سے بعض ایسی پابندیوں کا ذکر کیا ہے جن سے غیر مسلموں کی تحقیر و تذلیل مترشح ہوتی ہے۔ یہ پابندیاں بنیادی طور پر محض امتیاز اور پہچان کے نقطہ نظر سے لگائی گئی تھیں نہ کہ ان کی تذلیل و تحقیر کی نیت سے۔ اگر کسی فقیہ نے ان پابندیوں سے مقصود ان کی اہانت و حقارت سمجھا ہے تو یہ اس کا ذاتی اجتہاد یا ذاتی رائے ہے نہ کہ اسلام کی تعلیم، اس معاملے میں نہ تو قرآن کی کوئی نص موجود ہے، نہ پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور اسوہ حسنہ میں کوئی ایسی چیز موجود ہے اور نہ اس قسم کی کوئی تاریخی شہادت ملتی ہے کہ خلفاء اسلام نے غیر مسلم شہریوں کو پکڑ پکڑ کر ان

کی پیشانیوں کے بال کاٹے ہوں اور مخصوص لباس پہنایا ہو۔

- غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ انہیں اسلامی ریاست کے اندر اپنی رائے کے اظہار، اپنے مذہب وعقیدہ کی تبلیغ اور اجتماع کی اجازت نہیں۔ حالاں کہ شرعی اعتبار سے انہیں قانونی دائرے اور متعین ضوابط کی حدود میں اپنی مذہبی تبلیغ و اجتماع اور اظہار رائے کی اجازت ہے۔ تاہم کسی بھی شہری کو مسلمان ہو یا غیر مسلم تحریر و تقریر کی آزادی کی آڑ میں دوسروں کے جذبات مجروح کرنے کی اجازت نہیں۔ یہی ضابطہ اہل الذمہ پر بھی لاگو ہوگا اور انہیں مذہبی تبلیغ کی آڑ میں شعائر اسلام کی توہین کی اجازت نہیں ہوگی۔
- حدیث وسیرت کی مستند کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے معروف یہودی سرداروں کعب بن اشرف اور ابورافع وغیرہ کو خفیہ کارروائی کے ذریعے قتل کرادیا تھا۔ مخالفین پیغمبر اسلام علیہ السلام کے اس اقدام پر اعتراض تو کرتے ہیں۔ مگر ان وجوہ واسباب اور محرکات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی بنا پر پیغمبر اسلام کو ان کے خلاف یہ کارروائی کرنا پڑی۔ مذکورہ یہودی سرداروں کی ریاست مدنیہ اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں، مسلسل سازشوں، معاہدہ کی خلاف ورزی اور باغیانہ حرکات کو دیکھا جائے تو اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ریاست کے خلاف غداری کے جرم کی سزا مغربی قوانین میں بھی موت ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذکورہ دونوں یہودی سرداروں کی باغیانہ اور غدارانہ سرگرمیوں کا اعتراف خود مستشرقین اور مغربی مفکرین نے بھی کیا ہے۔
- پیغمبر اسلام ﷺ نے مدینہ منورہ کے دو مشہور یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مدینہ منورہ سے اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں کی طرف جلاوطن کر دیا تھا جبکہ تیسرے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کے مردوں کو مقررہ ثالث کے فیصلہ پر قتل کرادیا اور ان کی خواتین اور بچوں کو جنگی قانون کے مطابق غلام بنالیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے عہد حکومت میں خیبر کے یہودیوں کو

خیبر سے دوسرے علاقے کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ تو اس کی وجہ بھی مذہبی تعصب نہیں تھا۔ بلکہ ان کی معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔ تو ان کے خلاف یہ تادیبی کارروائی ان کی باغیانہ حرکات، دستور مدینہ کی خلاف ورزی، ریاست مدینہ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف سازش، عہد شکنی اور دشمنان اسلام سے اسکی سازباز کی وجہ سے کی گئی تھی نہ کہ کسی مذہبی تعصب کی بنا پر۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے عہد حکومت میں نجران کے عیسائیوں کو جو نجران (یمن) سے جلاوطن کر کے عراق منتقل کر دیا تھا تو اس کی وجہ بھی مذہبی تعصب نہیں بلکہ ان کی معاہدہ کی خلاف ورزی تھی۔

- ایک حدیث نبوی کے ظاہری مفہوم کی بنیاد پر یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ عام شاہراؤں پر غیر مسلموں کو اپنے دوش بدوش چلنے کا موقعہ نہ دیں بلکہ ان پر راستہ تنگ کر دیں۔ اس لیے اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات اور عقیدہ و مذہب کی تمیز کے بغیر تمام انسانوں سے حسن برتاؤ کی ہدایات اور مذکورہ اعتراض کی بنیاد بننے والی روایت میں پائے جانے والے تعارض کے درمیان تطبیق اور موافقت پیدا کرتے ہوئے اس حدیث کا صحیح مفہوم واضح کر دیا گیا ہے۔

نتائج بحث

زیر تحقیق موضوع "اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق۔عصری افکار و رجحانات: ایک تجزیاتی جائزہ" کے حوالے سے گزشتہ تمام تفصیلات، مباحث، قرآن و سنت کے دلائل، اسوۂ رسول ﷺ، خلفاء راشدین کے طرز عمل، فقہاء و مفکرین اسلام کے اقوال اور تاریخی نظائر سے یہ امور ثابت ہوتے اور نتائج نکلتے ہیں کہ

- اسلامی ریاست کے قیام کا واحد مقصد محض انسانی فلاح و بہبود کا حصول، عدل اجتماعی کا نفاذ، ظلم و ناانصافی کا خاتمہ اور خدائی سلطنت کا قیام ہے نہ کہ ملک گیری، حدود سلطنت کی توسیع، وسائل پر قبضہ، مفتوح اقوام کا استیصال یا خاندانی اور ذاتی سلطنت کا استحکام۔
- اسلام میں حاکم اور عوام کے تعلق کی نوعیت عام ریاستوں کی طرح حاکم اور محکوم کی نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کی ہے۔ نیز حکمران / خلیفہ اپنی رعایا کی ہر طرح سے حفاظت کا ذمہ دار ہے۔
- لوگوں کے بنیادی حقوق کی پامالی، ان پر ظلم و زیادتی اور حکومت و اختیارات کے بل بوتے پر ان کے استیصال میں سب سے بڑا ہاتھ چونکہ حکمران کا اپنے آپ کو حاکم اعلیٰ اور مقتدر اعلیٰ سمجھنا ہے۔ اس لیے اسلام نے اس تصور کی نفی کر کے حاکمیت الٰہیہ کا تصور دیا ہے۔
- تمام انسانی حقوق کی بنیاد چونکہ انسانی تعظیم و تکریم کے نظریے پر قائم ہے، اس لیے اسلام کے نزدیک ہر انسان عقیدہ و مذہب، خاندان و نسل اور علاقہ و رنگ کی تمیز و تفریق کے بغیر قابل تکریم و تعظیم ہے۔
- اسلام انسانی مساوات کا علمبردار ہے اور وہ رنگ، نسل، حسب و نسب اور علاقہ و زبان جیسے غیر اختیاری عوامل کی بنیاد پر کسی انسان سے امتیازی سلوک کا قائل نہیں۔
- اسلامی ریاست کے ہر شہری کے لیے بلا امتیاز عدل و انصاف کی فراہمی حکومت کا اولین فرض

ہے۔

- عقیدہ و مذہب کی تمیز کے بغیر ہر شہری کی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی دوسرے لفظوں میں کفالت عامہ اسلامی حکومت کا بنیادی فرض ہے۔
- کسی مذہبی و نسلی تمیز کے بغیر اسلامی ریاست میں بسنے والے ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچانا اور مظلوم کا دفاع کرنا اسلامی حکومت کا کوئی احسان نہیں بلکہ فرض ہے۔
- اسلامی ریاست جب کسی قوم سے عقد ذمہ سمیت کوئی معاہدہ کرتی ہے تو قرآن و سنت کی رُو سے اس معاہدہ کی پاسداری یا ایفائے عہد شرعاً اس پر فرض ہو جاتا ہے۔
- تمام انسانی حقوق کا تحفظ شریعت اسلامیہ کے پانچ بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔
- اسلام میں انسانی حقوق خالق کائنات کے عطا کردہ ہیں نہ کہ کسی حکومت یا پارلیمنٹ کے۔ اس لیے انہیں کسی شرعی جواز کے بغیر معطل نہیں کیا جاسکتا۔
- تحفظِ حقوق کے لیے اسلام نے حکمرانوں سمیت تمام لوگوں کی ذہنی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات بھی کیے ہیں۔
- اسلام انسانوں کی تقسیم دیگر اقوام و مذاہب کی طرح رنگ، نسل، زبان یا علاقہ کے غیر اختیاری عوامل و عناصر کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدہ و نظریہ کے اختیاری عنصر کی بنیاد پر کرتا ہے۔
- اسلام تمام غیر مسلموں کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کا قائل نہیں۔ ان میں سے جو لوگ اہل اسلام سے عداوت و مخالفت کا مظاہرہ نہیں کرتے، ان سے نیکی کا حکم دیتا ہے۔
- قرآن مجید کی جن آیات میں غیر مسلموں سے دلی دوستی اور رازدارانہ تعلق کی ممانعت ہے، وہ ان کی عداوت اور مسلمان دشمنی کی بنا پر ہے نہ کہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر۔
- اسلام نے انسانی فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے غیر مسلموں کو اہل اسلام سے سماجی و تمدنی تعلقات و مراسم قائم کرنے کی اجازت دی ہے۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ نے غیر مسلموں سے سماجی تعلقات

قائم کر کے امت مسلمہ کے لیے جواز مہیا کر دیا ہے۔

- اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی حقوق (جان و مال اور عزت و آبرو و غیرہ کا تحفظ) حاصل ہوں گے۔
- اسلام عقیدہ و مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ کا قائل نہیں۔ اس لیے اپنے غیر مسلم شہریوں کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دیتا اور انہیں امن و امان کو مد نظر رکھتے ہوئے تمام مذہبی رسوم بجالانے کی اجازت دیتا ہے۔
- اسلام اپنے غیر مسلم شہریوں کو سیاسی و انتظامی حقوق بھی دیتا ہے اور انہیں چند کلیدی عہدوں جن میں عہدہ دار کا مسلمان ہونا شرط ہے، کے سوا تمام انتظامی عہدے اہلیت کی بنیاد پر دینے کا قائل ہے۔
- مسلمان خلفاء نے ذاتی اعتبار سے کئی خامیوں کے باوجود اپنی غیر مسلم رعایا سے جس رواداری اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا، اقوام و مذاہب کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔
- اسلامی ریاستوں میں غیر مسلم شہریوں سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس لیا جاتا رہا، وہ ان کے دفاع کے عوض تھا نہ کہ کفر پر قائم رہنے کی سزا کے طور پر اور نہ اس سے ان کی تذلیل و تحقیر مقصود تھی۔
- اوائل اسلام میں اسلامی ریاستوں کے غیر مسلم شہریوں پر ہیئت و لباس کے معاملے میں جو بعض پابندیاں لگائی گئیں وہ محض امتیاز اور پہچان کے لیے تھیں۔ ان پابندیوں سے مقصود ان کی تذلیل و تحقیر نہ تھی۔
- عہد نبوی میں بعض یہودی سرداروں کا قتل اور مدینہ منورہ سے یہود کی جلاوطنی اسی طرح عہد فاروقی میں خیبر سے یہود کا اور نجران سے عیسائیوں کا اخراج ان کی بدعہدی اور ریاست کے خلاف باغیانہ حرکات کے باعث تھا نہ کہ کسی قسم کے مذہبی تعصب کی بنا پر۔

سفارشات / تجاویز

- جدید ذرائع ابلاغ پر زیادہ تر اسلام مخالف اور دین بیزار قوتوں اور نام نہاد اسلامی مفکرین کے تسلط کی وجہ سے اسلام کو تشدد، دہشت، وحشت اور بربریت کا مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ اس لیے مفکرین و مخلصین اسلام کا فرض ہے کہ وہ جدید ذرائع ابلاغ سے پورے شرح صدر اور ٹھوس عقلی و نقلی دلائل سے اس تاثر کو زائل کرنے کی سعی کریں۔
- اسلام ساری انسانیت کے لیے سراپا دین رحمت ہے۔ اس لیے کسی بھی حوالے سے اسلام پر مغرب کے جارحانہ حملوں کے جواب میں معذرت خواہانہ اور مدافعانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے مدلل طور پر اور حکمت بھرے اسلوب میں اسلام کی تعلیمات کو عام کیا جانا اور انصاف پسند مغربی دانشوروں اور عوام تک پہنچایا جانا چاہیے۔
- اسلام رنگ و نسل، علاقہ اور عقیدہ و مذہب وغیرہ کی تنگ ظرفی سے بالاتر ہو کر ہر انسان کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لیے موجودہ ماحول میں عملی طور پر اسلام کے اس نقطہء نظر کو واضح کیا جانا چاہیے۔
- اسلام غیر مسلموں سے نیکی اور انصاف کا حکم دیتا ہے (ان تبروھم و تقسطوا الیہم) اس لیے اس حوالے سے غیر مسلموں کی غلط فہمیوں کو دور کیا جانا، اسلامی رواداری سے آگاہ کیا جانا اور ان کے ساتھ کوئی جذباتی یا شدت پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا جانا چاہیے۔
- ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہیں جو مسلمان شہریوں کو

حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے تمام مسلمان ممالک کی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں غیر مسلم شہریوں / اقلیتوں کے ہر قسم کے خدشات دور کریں اور عملی طور پر ان کے حقوق ادا کر کے انہیں اطمینان دلائیں۔

- اسلام غیر مسلم شہریوں کو اچھوت نہیں سمجھتا بلکہ اُن سے سماجی و تمدنی تعلقات و مراسم کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے اہل اسلام کا شرعی و اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ ان تعلقات و مراسم، حسن سلوک اور حسن اخلاق کے ذریعے غیر مسلموں کو دامن اسلام میں لانے کی کوشش کریں۔
- مسلمان ممالک کے مسلمان شہریوں کو اپنی اکثریت اور حکومت و اقتدار کے زعم میں یا جذبات کی رو میں بہہ کر غیر مسلم اقلیتوں سے کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے ان کی دل آزاری یا تذلیل ہو اور اسلام کے خلاف نفرت پیدا ہو۔
- اسلام نے غیر مسلموں پر کسی بھی قسم کے ظلم و زیادتی سے منع کیا ہے اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے بڑی وعیدیں بیان فرمائی ہیں، اس لیے اہل اسلام کا فرض ہے کہ وہ غیر مسلموں پر کسی بھی قسم کی زیادتی اور حق تلفی سے گریز کریں۔
- جن عہدوں میں مسلمان ہونا شرط نہیں، ان عہدوں پر تقرری مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کے بغیر محض اہلیت کی بنیاد پر کی جانی چاہیے اور یہ چیز سرکاری اور پرائیویٹ سطح پر نظر بھی آنی چاہیے اور یہ انصاف ہوتا ہوا نظر آنا چاہیے۔
- غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک، ہمدردی و خیر خواہی اور نیکی و انصاف کی تعلیمات اسلام، اسوہ رسول ﷺ نیز خلفاء اسلام اور بزرگان دین کے طرز عمل اور نقطہء نظر کو اختصار کے ساتھ مغربی زبانوں میں ڈھالا جانا اور غیر مسلموں تک پہنچایا جانا چاہیے تا کہ اس حوالے سے غیر مسلموں کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے۔

مصادر و مراجع

- القرآن الحکیم
- آصف ملک، محمد و تمکین انجم: مسلمانوں کے سیاسی افکار و ادارے، ایمپوریم پبلشرز، لاہور، س۔ن
- آصف ملک، محمد و دیگر: انسانی حقوق (ایک خصوصی مطالعہ) ایمپوریم پبلشرز لاہور، ۲۰۱۰ء
- آلوسی: روح المعانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- آلوسی، محمود بغدادی، شہاب الدین (م ۱۲۷۰ھ): روح المعانی فی تفسیر ال؛قرآن العظیم والسبع المثانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- ابن ابی شیبہ، عبد الرحمن بن محمد (م ۲۳۵ھ)، مصنف ابن ابی شیبہ، مکتبہ امدادیہ ملتان، س۔ن
- ابن الاثیر الجزری، ابوالحسن علی بن ابی المکرم محمد بن محمد بن عبد الکریم (م ۶۳۰ھ): الکامل فی التاریخ، دارالکتاب العربی، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء
- ابن الاثیر، ابوالحسن عزالدین علی بن محمد الجزری (م ۶۳۰ھ): اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان (الطبعۃ الثانیہ)، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء نیز المکتبۃ الاسلامیہ، طہران ۱۳۲۴ھ
- ابن الاثیر، مجد الدین مبارک بن محمد الجزری (م ۶۰۶ھ): النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، مؤسسہ اسماعیلیان، قم ایران، تاریخ انتشار، تابستان، سال ۱۳۲۴ - داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان
- ابن اسحاق بن یسار المطلبی (متوفی ۱۵۱ھ): السیرۃ النبویہ، (تحقیق و تخریج: احمد فرید المزیدی)، دارالنفائس کریم پارک لاہور، ۱۴۳۶ھ / ۲۰۰۵ء
- ابن الطقطقی، محمد بن علی بن طباطبا (م ۷۰۹ھ)، الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، مکتبہ التجاریۃ الکبریٰ، مصر، ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۷ء
- ابن العربی، ابوبکر محمد بن عبداللہ (م ۵۴۳ھ): احکام القرآن، دارالمعرفۃ، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- ابن الفرس، ابو محمد عبد المنعم بن عبد الرحیم الاندلسی (م ۵۹۷ھ): احکام القرآن، دارابن حزم،

بیروت۔لبنان، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء

- ابن الھمام الحنفی، کمال الدین محمد بن عبدالواحد السیواسی ثم السکندری (م ۶۸۱ھ): شرح فتح القدیر (شرح ہدایہ لمرغینانی)، دار عالم الکتب، ریاض، سعودی عرب، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء
- ابن تغری، جمال الدین ابی المحاسن یوسف بن تغری بردی الاتابکی (م ۸۷۴ھ): النجوم الزاھرہ فی ملوک مصر والقاھرہ، وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی الموسسۃ المصریۃ العامۃ، س۔ن
- ابن تیمیہ، تقی الدین احمد بن عبدالحلیم حرانی (م ۷۲۸ھ): السیاسیۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیہ، دارالکتب العربیہ، بیروت۔لبنان، ۱۳۸۶ھ
- ابن تیمیہ: مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حکومۃ مملکۃ السعودیۃ العربیۃ، الطبعۃ الاولی، ۱۳۹۸ھ
- ابن تیمیہ، مختصر الفتاوی المصریۃ، دار ابن قیم دمام، سعودی عرب، ۱۹۸۶ء
- ابن جوزی، عبدالرحمن ابوالفرج (م ۵۹۷ھ): سیرۃ عمر بن الخطاب، مطبعۃ الساعدہ، مصر، ۱۳۶۴ھ
- ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد الظاہری (م ۴۵۶ھ): المحلی (تحقیق و تصحیح شیخ احمد محمد شاکر)، دار الجیل بیروت، س۔ن
- ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن محمد (۸۰۸ھ): تاریخ ابن خلدون، المسمی کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرھم من ذوی السلطان الاکبر، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔لبنان، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء
- ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن محمد (۸۰۸ھ): مقدمہ ابن خلدون، دار الکتاب العربی، بیروت، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء
- ابن خلکان، علامہ شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر (م ۶۸۱ھ)، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۴۸ء
- ابن رجب الحنبلی، ابوالفرج، عبدالرحمن بن احمد (م ۷۹۵ھ): الاستخراج لاحکام الخراج (مشمولہ در موسوعۃ الخراج)، دارالمعرفۃ بیروت۔لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء

- ابن رشد الاندلسی، القاضی ابو الولید محمد بن احمد بن محمد (م۵۹۵ھ): بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء
- ابن سعد محمد بن سعد بن منیع الزہری (م ۲۳۰ھ): الطبقات الکبریٰ، دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء نیز مطبع مذکور طبع ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء
- ابن شبہ، ابوزید عمر بن شبہ النمیری البصری (م ۲۶۲ھ): تاریخ المدینۃ المنورۃ، منشورات دارالفکر قم، ایران، ۱۴۱۰ھ
- ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ)، مجموعہ رسائل، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء
- ابن عابدین، شامی محمد امین (م ۱۲۵۲ھ): حاشیہ ردالمحتار علی الدرالمختار، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، س۔ن
- ابن عساکر ابو القاسم علی بن الحسن ابن ھبۃ اللہ بن عبداللہ الشافعی (م ۵۷۱ھ): تاریخ مدینۃ دمشق، دارالفکر بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء
- ابن عماد الحنبلی ابوالفلاح عبدالحی (م ۱۰۸۹ھ)، شذرات الذھب فی اخبار من ذھب، مکتبۃ القدسی ازھر، مصر، ۱۳۵۰ھ
- ابن قدامہ، ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد (م ۶۲۰ھ)، المغنی، مکتبۃ الریاض الحدیثہ، ریاض، سعودی عرب، س۔ن
- ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر (م ۷۵۱ھ): اعلام الموقعین عن رب العالمین، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان (الطبعۃ الثانیۃ)، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء
- ابن قیم الجوزیہ، شمس الدین ابی عبداللہ محمد بن ابی بکر الزرعی الدمشقی (م ۷۵۱ھ): زادالمعاد فی ھدی خیر العباد، (تحقیق و تخریج: شعیب الارنؤوط۔ عبدالقادر الارنؤوط) مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء (الطبعۃ الثانیۃ)، نیز دارالکتب العلمیہ بیروت

- ابن قیم الجوزیۃ: الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت۔ لبنان، س۔ن : المکتبۃ التجاریۃ، مکۃ المکرمۃ، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء
- ابن قیم، الجوزیہ: احکام اہل الذمۃ، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء
- ابن قیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (اردو ترجمہ از رئیس احمد جعفری)، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۰ء
- ابن کثیر ابو الفداء عماد الدین اسماعیل (م ۷۷۴ھ): السیرۃ النبویۃ، دار لمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء
- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل (م ۷۷۴ھ): تفسیر القرآن العظیم، سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء
- ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل (م ۷۷۴ھ): البدایہ والنہایہ، مطبعۃ السعادۃ، مصر / دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۲ء۔ المکتبۃ الحقانیہ پشاور، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۵ء
- ابن ماجہ، ابو عبداللہ محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ): السنن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن
- ابن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم افریقی (م ۷۱۱ھ) : لسان العرب، دار صادر بیروت۔ لبنان، ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء
- ابن نجیم، زین الدین الحنفی (م ۹۷۰ھ): البحر الرائق شرح کنز الدقائق، دارالمعرفۃ، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الثانیۃ، س۔ن
- ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم (م ۹۷۰ھ): الاشباہ والنظائر (مع شرح حموی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۴ء
- ابن ہشام، عبدالملک، ابو محمد (م ۲۱۳ھ): السیرۃ النبویہ، دارالمعرفۃ، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- ابو بکر بن علی بن محمد الحدید الزبیدی (م ۸۰۰ھ): الجوہرۃ النیرۃ شرح مختصر القدوری، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی عکس مجتبائی دہلی، ۱۳۲۳ھ۔ مکتبہ رحمانیہ لاہور، ت۔ن

- ابو حیان اندلسی الغرناطی، اثیر الدین محمد بن یوسف بن علی (م ۷۵۴ھ): تفسیر البحر المحیط، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء الطبعۃ الاولیٰ
- ابو داؤد، سلیمان بن اشعث (م ۲۷۵ھ): السنن، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ت۔ن / اصح المطابع کراچی، س۔ن
- ابو زہرہ، محمد بن احمد (م ۱۳۰۴ھ / ۱۹۷۴ء): اصول الفقہ، دارالفکر العربی، قاہرہ، ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء
- ابو عبداللہ الحسین بن خسرو البلخی (م ۵۲۲ھ): مسند الامام الاعظم ابی حنیفہ النعمان بن ثابت الکوفی، المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ، الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۳۱ھ / ۲۰۱۰ء
- ابو عبید، قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ): کتاب الاموال (اردو ترجمہ از عبدالرحمن طاہر سورتی)، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء (طبع جدید)
- ابو عبید، قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ): کتاب الاموال (عربی)، مؤسسۃ ناصر للثقافۃ، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۸۱ء
- ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی (م ۳۱۶ھ): مسند ابی عوانہ، دائرۃ المعارف حیدر آباد، ۱۳۶۴ھ / دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء
- ابو یعلی، قاضی محمد بن الحسین الفراء (م ۴۵۸ھ): الاحکام السلطانیہ، مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۸ء
- ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، قاضی (م ۱۸۲ھ): کتاب الخراج (مشمولہ در موسوعۃ الخراج) دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء
- ابو یعلی، الموصلی احمد بن علی (م ۳۰۷ھ): مسند ابی یعلی، مؤسسۃ علوم القرآن، بیروت، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء (الطبعۃ الاولیٰ)

- الاتاسی، محمد خالد، شرح المجلہ، مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ، ۱۴۰۳ھ
- احمد امین بن شیخ ابراہیم (م ۱۳۷۳ھ)، فجر الاسلام، دارالکتاب العربی، بیروت۔ لبنان، (الطبعۃ العاشرہ) ۱۹۶۹ء
- احمد بن حنبل، امام (م ۲۴۱ھ): مسند، دار صادر بیروت، س۔ن
- احمد بن حنبل، امام: مسند، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء
- اختر علی قریشی: آئین پاکستان ۱۹۷۳ء (بمع جدید ترامیم)، ندیم بک ہاؤس، لاہور، س۔ن
- الازھری، پیر محمد کرم شاہ (م ۱۹۹۸ء): تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۰۰ھ
- الازھری، پیر محمد کرم شاہ (م ۱۹۹۸ء): ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۰۰ھ
- الاصبہانی ابو الفرج: کتاب الاغانی، دار صعب، بیروت، س۔ن
- اصبہانی، ابو نعیم احمد بن عبداللہ (م ۴۳۰ھ): حلیۃ الاولیاء، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۳ء
- اصلاحی، امین احسن، مولانا: اسلامی ریاست، دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۶ء
- اصلاحی، امین احسن، مولانا: تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۸۵ء، / ۲۰۰۱ء۔ ۱۴۰۲ھ
- اعجاز احمد، ضرورت امن، ایشیاء بک سنٹر، لاہور، س۔ن
- امیر علی، مولانا: عین الہدایہ (اردو ترجمہ ہدایہ)، قانونی کتب خانہ، لاہور، س۔ن
- الدمیری، کمال الدین محمد بن موسیٰ بن عیسیٰ: حیوۃ الحیوان الکبری، عبد احمدی احمد حنفی، قم۔ ایران، س۔ن
- بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل (م ۲۵۶ھ): الجامع الصحیح، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، س۔ن۔ دار ابن کثیر، دمشق، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۹۰ء / قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن
- بخاری، ابو عبداللہ، محمد بن اسماعیل: الادب المفرد، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- البلاذری، ابو الحسن احمد بن یحیٰ (م ۲۷۹ھ) فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۸ھ

/ ۱۹۷۸ء

- بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر (م۲۷۹ھ): فتوح البلدان (اردو ترجمہ از سید ابوالخیر مودودی)، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۶ء / تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء
- بلیلادی، عبدالحفیظ، مولانا: مصباح اللغات ایچ ایم سعید کمپنی کراچی، ۱۹۷۳ء
- البھترالوی، عبدالرزاق القاضی، المظہر النوری لحل مافی المختصر القدوری (مع متن المختصر القدوری)، ضیاء العلوم پبلی کیشنز، راولپنڈی، س۔ن
- بھترالوی، عبدالرزاق چشتی: کشف الحقائق حاشیہ کنزالدقائق، مکتبہ ضیائیہ راولپنڈی، س۔ن
- بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر بن محمد البیضاوی (م۶۸۵ھ): انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف بتفسیر البیضاوی، دار فراس للنشر والتوزیع، ۱۳۲۹ھ
- بیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین (م۴۶۸ھ): شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۰ھ
- بیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین (م۴۵۸ھ): دلائل النبوۃ و معرفۃ احوال صاحب الشریعہ، مکتبہ اثریہ لاہور (عکس بیروت)، س۔ن
- بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین (م۴۵۸ھ): السنن الکبریٰ، دار الفکر بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء (الطبعۃ الاولیٰ)۔ نیز مکتبہ دار الباز، مکہ مکرمہ سعودی عرب، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۴ء
- پانی پتی، ثناء اللہ، قاضی (م ۱۲۲۵ھ): تفسیر مظہری (اردو ترجمہ از سید عبدالدائم الجلالی)، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۹۸۰ء
- پھلواری، جعفر شاہ، مولانا: اسلام —دین آسان، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء
- ترتیون، آرٹرستانلی: اہل الذمۃ فی الاسلام (ترجمہ: دکتور حسن حبشی)، دار المعارف القاہرہ، الطبعۃ الثانیہ، ۱۹۶۷ء
- ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ (م۲۷۹ھ)۔ الجامع، نور محمد کراچی طبع کلاں، ت۔ن / مکتبہ رحمانیہ،

لاہور، طبع کلاں، س۔ن

- تورات (کتاب مقدس، عہد نامہ عتیق)، بائبل سوسائٹی، لاہور، س۔ن
- ثانی، حافظ محمد، ڈاکٹر: رسول اکرم اور رواداری، فضلی سنز اردو بازار کراچی، ۱۹۹۸ء
- ثانی، حافظ محمد، ڈاکٹر: محسن انسانیت اور انسانی حقوق، درالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۹ء
- جاء حنفی، محمد، عبدالمتجلی: الحریات والحقوق فی الاسلام، رابطۃ العالم الاسلامی، مکۃ المکرمہ، ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء
- جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام (مترجم مولوی محمد حلیم انصاری)، شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۶۴ء
- جزیری، عبدالرحمن (م ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء): کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (اردو ترجمہ از منظور احسن عباسی) علماء اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء
- جصاص، ابو بکر رازی (م ۳۷۰ھ): احکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء / مکتبۃ البہیۃ، مصر، س۔ن
- جلال الدین عمری، مولانا: غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق، پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ، س۔ن
- جواد علی: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۷۶
- حامد الانصاری، مولانا: اسلام کا نظام حکومت، مکتبہ الحسن، لاہور، س۔ن
- حسن ابراہیم حسن، ڈاکٹر: النظم الاسلامیہ (اردو ترجمہ بنام "مسلمانوں کا نظم مملکت" از مولوی علیم اللہ صدیقی)، دارالاشاعت کراچی، س۔ن
- حصکفی، علاؤ الدین، محمد (م ۱۰۸۸ھ): الدرالمختار شرح تنویر الابصار، المطبعۃ العامرۃ الملیجیۃ، مصر، س۔ن

- الحموی، احمد بن محمد المصری (م۱۰۹۸ھ): غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر لابن نجیم، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۴ء
- حنیف ندوی، مولانا محمد، اساسیات اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳ء
- حمید اللہ جمیل، محمد پروفیسر، انسانی حقوق (ایک خصوصی مطالعہ)، عبد اللہ برادرز، لاہور، س۔ن
- حمید اللہ، محمد ڈاکٹر (م۲۰۰۲ء): عہد نبوی میں نظام حکمرانی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء
- حمید اللہ، محمد ڈاکٹر (م۲۰۰۲ء): خطبات بہاولپور، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۱۴۰۱ھ (اشاعت اول)
- خالد علوی، ڈاکٹر (م۲۰۱۰ء): اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل لاہور، ۲۰۰۵ء
- خضری، شیخ محمد الخضری بک، الدولۃ العباسیہ (محاضرات فی تاریخ الامم الاسلامیۃ)، مؤسسۃ المختار، القاہرہ، مصر، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء
- خطابی، ابو سلیمان حمد بن محمد البستی (م۳۸۸ھ): معالم السنن شرح سنن ابی داؤد، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء
- خفاجی، شہاب الدین احمد (م۱۰۶۹ھ): نسیم الریاض شرح الشفاء للقاضی عیاض، مکتبہ الازہریہ، مصر، ۱۳۲۶ھ
- الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الفضل بن بہرام (م۲۵۵ھ): سنن الدارمی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س۔ن
- دریابادی، عبد الماجد، مولانا: تفسیر القرآن (یکجا جلد)، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، س۔ن
- الدکتور علی حسنی الخربوطلی: الاسلام واهل الذمۃ، المجلس الاعلیٰ للشؤن الاسلامیہ، القاہرہ، ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء
- ذاکر نائیک، ڈاکٹر: اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اوران کے جوابات (ترجمہ سید خالد جاوید مشہدی)، بیکن بکس، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء

- ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (م ۷۴۸ھ) سیر اعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۷۸ء
- رئیس احمد جعفری، مولانا: اسلامی جمہوریت، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۸ء
- رازی، فخر الدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن حسین (م ۶۰۶ھ): مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، مطبعۃ البہیہ مصر (الطبعۃ الاولی)، ت۔ن
- راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ): المفردات فی غریب القرآن، نور محمد کراچی، س۔ن
- رشید رضا، محمد (م ۱۹۳۵ء): تفسیر القرآن الحکیم، المشہور بتفسیر المنار، دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء
- زاہد علی، ڈاکٹر: تاریخ فاطمین مصر، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۳ء
- زکریا النداف، محمد: الاخلاق السیاسیۃ للدولۃ الاسلامیۃ فی القرآن والسنۃ، دار القلم دمشق، الطبعۃ الاولی، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء
- زمخشری، جاراللہ محمود بن عمر بن محمد (م ۵۲۸ھ): الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، مرکز اھل السنۃ برکات رضا گجرات، انڈیا، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء – مؤسسۃ الریان بیروت الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۲۴ھ / ۲۰۰۳ء
- الزیلعی، جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الحنفی (۷۶۲ھ): نصب الرایہ تخریج احادیث الھدایہ (مع الھدایہ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاول، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۶ء
- زیلعی، فخر الدین عثمان بن علی الحنفی (م ۷۴۳ھ): تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، مکتبہ امدادیہ، ملتان، س۔ن
- زین العابدین، علی بن الحسین، الامام (م ۹۵ھ)، رسالۃ الحقوق (مترجم محمد علی توحیدی)، البلاغ المبین، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

- السبکی، ابوالحسن تقی الدین علی بن عبدالکافی الشافعی (م۷۵٦ھ): فتاوی السبکی، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، س۔ن
- سحنون بن سعید التنوخی (م۲۴۰ھ) عن الامام عبدالرحمٰن بن قاسم العتقی(۱۹۱ھ): المدونۃ الکبری لامام مالک بن انس الاصبحی (م۱۷۹ھ)، شیخ زاید بن سلطان النہیان الامارات العربیۃ المتحدہ، ۱۴۲۲ھ نیز دارالکتب بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۴ء (الطبعۃ الاولیٰ)
- تھامس واکر، آرنلڈ: The Preaching of Islam (اردو ترجمہ بنام "دعوت اسلام" از محمد عنایت اللہ دہلوی) مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹٦۴ء
- سرخسی، ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل(م۴۸۳ھ): اصول السرخسی، مکتبۃ المعارف، ریاض، س۔ن
- السرخسی، ابوبکر محمد بن احمد، شمس الائمہ (م۴۸۳ھ): المبسوط، دارالمعرفۃ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۰۹ھ / ۱۹۸۹ء / مطبعۃ السعادۃ، مصر ۱۳۳۴ھ / دارالفکر بیروت، ۲۰۰۰ء
- السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سہل (م۴۸۳ھ): شرح السیر الکبیر (للامام محمد بن حسن شیبانی)، دارالکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء - دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدر آباد، ہند، س۔ن
- سعیدی، غلام رسول، علامہ: تبیان القرآن، فرید بک سٹال، لاہور، طبع اول، ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء
- سمہودی، نور الدین علی بن احمد (م۹۱۱ھ): وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ، مطبعۃ السعادۃ بمصر، الطبعۃ الاولی، ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴
- سوامی لکشمن: عرب کا چاند، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، طبع سوم، ت۔ن
- السہیلی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ (م۵۸۱ھ): الروض الانف، مکتبہ الکلیات، الازھریہ، مصر، س۔ن
- سید امیر علی: روح اسلام (اردو ترجمہ از محمد ہادی حسین)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم،

۱۹۸۰ء

- السید سابق: فقہ السنۃ، دارالکتاب العربی، بیروت۔ لبنان، (الطبعۃ الاولی) ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء
- سیف الرحمن، ملک: اسلام اور غیر مسلم رعایا، مکتبہ خدام الاحمدیہ مرکزیہ، ربوہ، س۔ن
- سیوطی، جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر (م ۹۱۱ھ): تاریخ الخلفاء، نور محمد، کراچی، س۔ن
- سیوطی، جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر (م ۹۱۱ھ): تاریخ الخلفاء، (اردو ترجمہ از شمس بریلوی)، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۹۷ء
- سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، مولانا: اسلام کا اقتصادی نظام، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۹ء
- شاطبی، ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ (م ۷۹۰ھ): الموافقات فی اصول الشریعہ، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء
- الشافعی، ابوعبداللہ، محمد بن ادریس، امام (م ۲۰۴ھ)، الام (مع مختصر المزنی)، دارالفکر بیروت، الطبعۃ الثانیہ، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء
- الشافعی، محمد بن ادریس، امام (م ۲۰۴ھ): الرسالہ، (تحقیق و شرح احمد محمد شاکر)، المکتبۃ العلمیہ، بیروت۔ لبنان، س۔ن
- شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ): فتاوی عزیزی، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۴۱ھ
- شاہ معین الدین احمد ندوی: دین رحمت، مطبع معارف اعظم گڑھ، انڈیا، ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۷ء
- شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ): حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ سلفیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء / دارالکتب الحدیثہ بالقاہرۃ، س۔ن
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ): ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، نور محمد کراچی، س۔ن
- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ): البدور البازغہ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۷۰ء
- شاہ ولی اللہ، احمد بن عبدالرحیم محدث دہلوی ۰م ۱۱۷۶ھ): حجۃ اللہ البالغہ، دارالکتب الحدیثہ، بالقاہرہ،

س۔ن

- شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء)، ندوی، سید سلیمان: سیرۃ النبی، الفیصل، لاہور، ۱۹۹۱ء
- شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء): الفاروق، الائیڈ بک کمپنی، جامعہ کراچی، ۱۹۸۶ / اسلامک بک سنٹر لاہور، ۲۰۰۵ء / المیزان لاہور، ۲۰۱۱ء
- شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء): سیرۃ النعمان (امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س۔ن
- شبلی نعمانی، المامون، دارالاشاعت، کراچی، طبع اول، ۱۴۱۲ھ
- شبلی، نعمانی (م ۱۹۱۴ء) مقالات شبلی (مذہبی)، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۳۴۹ھ
- شریف الرضی ابو الحسن محمد بن ابی احمد الحسین (م ۴۰۴ھ): نہج البلاغۃ (اردو ترجمہ از مفتی جعفر حسین)، امامیہ کتب خانہ لاہور، س۔ن
- شعرانی، عبدالوہاب بن احمد بن علی الانصاری الشافعی (م ۹۰۷ھ): المیزان الکبری (اردو ترجمہ بنام میزان شعرانی المعروف بہ مواہب رحمانی، مترجم: مولانا محمد حیات سنبھلی)، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ایڈیشن اول، س۔ن
- شوکت علی فہمی، ہندوستان پر اسلامی حکومت، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۵ء
- شیبانی، محمد بن حسن، امام (م ۱۸۹ھ): کتاب الاصل المعروف بالمبسوط، دارالمعارف النعمانیہ، حیدر آباد، دکن ہند، س۔ن
- شیبانی، محمد بن حسن امام (م ۱۸۹ھ): المؤطا، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن
- شیبانی، محمد بن حسن، امام (م ۱۸۹ھ): السیر الکبیر، (مع شرح السرخسی)، دارالکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷
- شیبانی، ابو عبداللہ محمد بن حسن بن فرقد (م ۱۸۹ھ): کتاب الآثار (اردو ترجمہ علامہ صدیق ہزاروی)،

مکتبہ اعلحضرت دربار مارکیٹ، لاہور، ۱۴۲۵ھ / ۲۰۰۴ء

- شیخ الہند، محمود حسن (م ۱۹۲۰ھ): التقریر للترمذی (مطبوعہ مع جامع ترمذی)، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س۔ن
- شیخ زادہ، عبدالرحمٰن بن شیخ محمد بن سلیمان (م ۱۰۷۸ھ): مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، مکتبہ عثمانیہ مصر، ۱۳۲۷ھ
- شیخ نظام و جماعۃ من علماء الہند، الفتاوی الہندیہ، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء
- صالح بن حسین العاید: حقوق غیر المسلمین فی بلاد الاسلام، داراشبیلا، ریاض، سعودی عرب، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء
- صالحی شامی، محمد بن یوسف (م ۹۴۲ھ)، سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد (المعروف سیرۃ شامی)، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۴ھ / ۱۹۹۳ء
- صباح الدین عبدالرحمٰن، سید: مقالات سلیمان ندوی (تاریخی - حصہ اول)، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انڈیا، س۔ن
- صباح الدین عبدالرحمٰن، سید: اسلام میں مذہبی رواداری، دارالشعور، مزنگ لاہور، ۲۰۱۰ء
- صباح الدین عبدالرحمن، سید: ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۰ء
- صبحی محمصانی، ڈاکٹر: فلسفۃ التشریع فی الاسلام (اردو ترجمہ از مولوی محمد احمد رضوی)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع سوم، ۱۹۶۶ء
- صلاح الدین، محمد: بنیادی حقوق، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۷ء
- صمصام الدولہ، شاہنواز خان: مآثر الامراء (اردو ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری) مرکزی اردو بورڈ لاہور، طبع اول، ۱۹۶۹ء
- الصنعانی ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام الحمیری (م ۲۱۱ھ): المصنف، المجلس العلمی، بیروت، ۱۹۷۰ء
-

- طاہر القادری، محمد ڈاکٹر: تفسیر منہاج القرآن (سورۃ البقرہ)، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء
- طاہر منصوری، محمد ڈاکٹر: اجتماعی اجتہاد۔ تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
- طبری، ابو جعفر محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ): تاریخ الطبری (تاریخ الامم والملوک)، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۲ء – روائع التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ت۔ن، نیز دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء
- طحاوی، ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ الازدی (م ۳۲۱ھ): شرح معانی الآثار، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء
- طحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل (م ۱۲۳۱ھ): حاشیہ الطحطاوی علی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح، قدیمی کتب خانہ کراچی، س۔ن
- طوسی، نظام الملک ابو علی حسن بن علی خواجہ: سیاست نامہ (اردو ترجمہ از محمد منور ایم اے) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۱ء
- ظفر احمد عثمانی (م ۱۳۹۴ھ): اعلاء السنن، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، س۔ن
- عبدالعلیم احراری، مولوی: سیرۃ نبوی اور مستشرقین (اردو ترجمہ مقالہ محمدؐ نوم از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ۱۹۲۹ء
- عبدالقادر جیلانی، ڈاکٹر: اسلام' پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر (مرتب آصف اکبر) بیت الحکمۃ، لاہور، ۲۰۰۶ء
- عبداللطیف الحاتمی، حقوق الانسان فی الاسلام، دارالجیل بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۹۰ء
- عثمانی شبیر احمد، علامہ (م ۱۳۶۹ھ): تفسیر عثمانی، حکومت سعودی عرب، س۔ن

- عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام (م ۶۰۶ھ): قواعد الاحکام فی مصالح الانام، مطبعہ حسینیہ، قاہرہ، ۱۹۳۴ء
- عسقلانی، ابو الفضل احمد بن علی ابن حجر الشافعی (م ۸۵۲ھ): الاصابہ فی تمیز الصحابہ، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۵ھ / ۲۰۰۴ء
- عسقلانی، ابو الفضل احمد بن علی ابن حجر الشافعی (م ۸۵۲ھ): فتح الباری شرح صحیح البخاری، شیش محل روڈ لاہور، ۱۹۸۱ء / نیز قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن
- علال الفاسی: مقاصد الشریعۃ الاسلامیۃ و مکارمھا، مکتبۃ الواحدۃ العربیۃ الدار البیضاء، س۔ن
- علی متقی، ہندی حسام الدین، (م ۹۷۵ھ): کنز العمال، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء نیز حیدرآباد دکن، ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء
- عینی، بدرالدین محمود بن احمد بن موسیٰ الحنفی (م ۸۵۵ھ): عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، داراحیاء التراث العربی، بیروت / محمد امین دمج، بیروت، س۔ن
- العینی، بدرالدین محمود بن احمد بن موسیٰ الحنفی (م ۸۵۵ھ): البنایہ شرح الہدایہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی، ۱۴۲۰ھ / ۲۰۰۰ء
- غازی عنایہ، الدکتور: المالیۃ العامۃ والنظام المالی الاسلامی - دراسۃ مقارنۃ، دارالجیل، بیروت، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۹۰ء (الطبعۃ الاولیٰ)
- غازی، محمود احمد، ڈاکٹر (م ۲۰۱۰ء): محاضرات فقہ، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۵ء
- غلام جیلانی برق، ڈاکٹر: یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، اشاعت اول ۱۹۶۴ء
- غلام سرور قادری، مفتی (م ۲۰۱۰ء): عمدۃ البیان فی ترجمۃ القرآن، عمدۃ البیان پبلشرز، لاہور، ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء
- فتحی عثمانی، محمد الدکتور: حقوق الانسان بین الشریعۃ الاسلامیۃ والفکر القانون العربی، دارالشروق،

بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء

- فلپ کے حتی (Philip K Hitti)، تاریخ شام (History of Syria)، غلام رسول مہر (مترجم)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء
- قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض الیحصبی (م ۵۴۴ھ): الشفاء بتعریف حقوق المصطفی، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، س۔ن
- القدوری، احمد بن محمد بن احمد: المختصر القدوری (مع حاشیہ المظہر النوری)، ضیاء العلوم پبلی کیشنز، راولپنڈی، س۔ن
- قرافی، ابو العباس احمد بن ادریس الصنہاجی (م ۶۸۴ھ): الفروق (انوار البروق فی انواع الفروق، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء (الطبعۃ الاولیٰ)
- القرضاوی، یوسف: الاقلیات الدینیۃ والحل الاسلامی، المکتب الاسلامی، بیروت، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء
- القرضاوی، یوسف: مشکلات الفقر وکیف عالجہا الاسلام (اردو ترجمہ بنام اسلام اور معاشی تحفظ)، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء
- القرضاوی، یوسف، الدکتور: غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، مکتبہ وھبہ القاہرہ، مصر، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۲ء (الطبعۃ الثالثۃ)
- قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد (م ۶۷۱ھ): الجامع لاحکام القرآن والمبین لما تضمن من السنۃ وآی الفرقان، داراحیاء التراث العربی، بیروت۔ لبنان، ت۔ن- دارالکتاب العربیہ قاہرہ، ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء
- قسطلانی، احمد بن محمد (م ۲۹۳ھ): المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ، مکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۱۲ھ / ۱۹۹۱ء

- القلقشندی، احمد بن علی (م۸۲۱ھ): صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء
- الکاسانی، ابوبکر بن مسعود علاؤالدین (م۵۸۷ھ)، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۴۰۰ھ / دارالفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء
- الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (اردو ترجمہ از مختلف مترجمین)، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور (مختلف جلدوں کا مختلف سال طباعت)
- کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا (م۱۳۹۴ھ): احکام القرآن، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۱۸ھ
- کاندھلوی، محمد اشفاق الرحمٰن، مولانا: کشف المغطاعن وجہ الموطا (حاشیہ موطا امام مالک بمع متن موطا)، قدیمی کتب خانہ کراچی، ت۔ن
- الکیاالہراسی، عمادین بن محمد الطبری (م۵۰۴ھ): احکام القرآن، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء
- گستاؤلی بان، ڈاکٹر: تمدن عرب (اردو ترجمہ از سید علی بلگرامی)، مقبول اکیڈمی، لاہور، س۔ن
- گیلانی، مناظر احسن (م۱۳۷۵ھ): مقالات گیلانی، شیخ زاید اسلامک سنٹر جامعہ پنجاب، لاہور، ۲۰۰۴ء
- مالک بن انس بن مالک، امام (م۱۷۹ھ): موطا، قدیمی کتب خانہ کراچی (طبع کلاں)، س۔ن
- الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد حبیب البصری (م۴۵۰ھ): الاحکام السلطانیہ، (اردو ترجمہ از مولوی سید محمد ابراہیم)، قانونی کتب خانہ لاہور، س۔ن
- الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری (م۴۵۰ھ) الاحکام السلطانیہ و ولایات الدینیۃ، مصطفیٰ حلبی، مصر، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۰ء
- الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد حبیب البصری البغدادی (م۴۵۰ھ): الاحکام السلطانیہ والولایات

الدینیۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء (الطبعۃ الاولیٰ)

- مثنیٰ امین نادر: حقوق المواطن غیر المسلم فی الدولۃ الاسلامیۃ دار البلاغۃ طوم، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۹۹ء
- مجتبی موسوی، لاری، السید، تمدن غرب از دید گاہ اسلام، مغربی تمدن کی ایک جھلک، (مترجم مولانا روشن علی) منصبیہ عربک کالج میرٹھ انڈیا، س۔ن
- مجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیۃ، معاملۃ غیر المسلمین فی الاسلام، مؤسسۃ آل البیت اردن، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۸۹ء
- المحلی، جلال الدین محمد بن احمد (م ۸۶۴ھ) والسیوطی جلال الدین بن ابی بکر (م ۹۱۱ھ): تفسیر جلالین، تاج کمپنی کراچی (پاکستان)، ت۔ن
- محمد اسد (لیوپولڈ وائس): اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول (اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۳ء
- محمد حمید اللہ، ڈاکٹر (م ۲۰۰۲ء): سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ "الوثائق السیاسیۃ" از ابو یحیٰ امام خان نوشہروی)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء
- محمد حمید اللہ، ڈاکٹر (م ۲۰۰ء): رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء
- محمد غزالی، حقوق الانسانی بین تعالیم الاسلام واعلان الامم المتحدۃ، دار الدعوۃ الاسکندریۃ، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء
- محمد منیر، جسٹس ریٹائرڈ: شرح اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور، پی ایل ڈی پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء
- مرغینانی، برہان الدین ابی الحسن علی بن ابی بکر (م ۵۹۳ھ): الہدایہ شرح بدایۃ المبتدی (مع شرح علامہ عبدالحی لکھنوی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۱۷ھ / مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ت۔ن (مع الدرایہ وحاشیہ علامہ عبدالحی لکھنوی)
- مسلم بن حجاج القشیری، (م ۲۶۱ھ): الجامع الصحیح (مع شرح نووی)، قدیمی کتب خانہ، کراچی، طبع کلاں،

ت۔ن

- مفتی زین العابدین میرٹھی و مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، تاریخ ملت، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۱ء
- مفتی عبدالحلیم قاسمی، احسن الہدایہ (ترجمہ وشرح اردو ہدایہ)، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن
- مفتی محمد شفیع (م ۱۹۷۶ء): جواہر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۹۹۹ء
- مفتی محمد شفیع (م ۱۹۷۶ء): معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، طبع اول، ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء نیز طبع جدید ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء
- مفتی نذیر احمد خان ایڈووکیٹ: توہین رسالت' اقلیتیں اور قانون تحفظ مذاہب، بیت السلام، کراچی، ۲۰۱۰ء
- المقریزی، تقی الدین ابی العباس احمد بن علی بن عبدالقادر (م ۸۴۵ھ): کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار المعروف بالخطط المقریزیۃ، دار صادر بیروت، ت۔ن
- المقریزی، تقی الدین احمد بن علی بن عبدالقادر بن محمد (م ۸۴۵ھ) : امتاع الاسماع بما للنبیؐ من الاحوال والاموال والحفدۃ المتاع (تحقیق و تعلیق محمد عبدالحمید النمیسی) دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹ء (الطبعۃ الاولی)
- مناوی، محمد عبدالرؤف (م ۱۰۳۱ھ): فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۲ھ / ۲۰۰۱ء
- منصور پوری، قاضی محمد سلیمان (۱۹۳۰م): رحمۃ للعالمین، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ت۔ن
- مودودی، ابوالاعلیٰ، سید (م ۱۹۷۹ء): معاشیات اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
- مودودی، ابوالاعلیٰ، سید (م ۱۹۷۹ء): اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء
- مودودی، ابوالاعلیٰ: حقوق اہل الذمۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ، الدار السعودیۃ للنشر والتوزیع، جدہ،

س۔ن

- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید (م۱۹۷۹ء: تفہیم القرآن، سروسز بک کلب، ۱۹۱۹ء
- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: خلافت وملوکیت، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۵ء
- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: رسائل ومسائل، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: تفہیمات، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع چہارم، ۱۹۹۹ء
- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: سیرت سرور عالم، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، اشاعت اول، ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء
- مودودی، ابو الاعلیٰ، سید: الجہاد فی الاسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۷ء
- نثار احمد، ڈاکٹر، خطبہ حجۃ الوداع۔ حقوق انسانی کا عالمی منشور، بیت الحکمۃ لاہور، ۲۰۰۸ء
- نجات اللہ صدیقی، محمد ڈاکٹر: اسلام کا نظام محاصل (اردو ترجمہ کتاب الخراج لامام ابی یوسف)، مکتبہ چراغ راہ کراچی، ۱۹۶۶ء (طبع اول) سول ایجنٹ اسلامک پبلی کیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور
- نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر: مقاصد شریعت، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء۔
- ندوی، شاہ معین الدین احمد: تاریخ اسلام، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ت۔ن
- ندوی، مجیب اللہ، مولانا (م۲۰۰۸ھ): اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، ۱۹۹۰ء
- نسائی، احمد بن شعیب (م۳۰۲ھ): السنن، مکتبہ رحمانیہ، لاہور ت۔ن / نور محمد کراچی، س۔ن
- نسفی، ابو البرکات عبدالرحمن بن احمد بن محمود (م۷۰۱ھ): کنز الدقائق، مکتبہ ضیائیہ راولپنڈی، س۔ن
- نسفی، ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود (م۷۰۱ھ) تفسیر مدارک التنزیل، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س۔ن

- نعمانی، منظور احمد مولانا: معارف الحدیث، ادارہ اشاعت حدیث، لاہور، ت۔ن
- نووی، یحی بن اشرف، ابوزکریا(م ۶۷۶ھ): ریاض الصالحین، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء / ۱۴۰۰ھ
- الواقدی، ابو عبداللہ محمد بن عمر بن واقد (م ۲۰۷ھ): فتوح الشام، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔لبنان، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء
- الواقدی، محمد بن عمر بن واقد (م ۲۰۷ھ): کتاب المغازی (تحقیق الدکتور مارسدن جونس)، مطبعہ جامعہ آکسفورڈ، ۱۹۶۶ء
- ولی الدین ابی عبداللہ الخطیب التبریزی (م ۷۳۷ھ): مشکوٰۃ المصابیح، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، س۔ن / المکتب الاسلامی بیروت۔لبنان، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء
- وھبۃ الزحیلی: العلاقات الدولیۃ فی الاسلام (مقارنۃ القانون الدولی الحدیث) ارد، ترجمہ از مولانا حکیم اللہ بنام "بین الاقوامی تعلقات — اسلامی اور بین الاقوامی قانون کا تقابلی مطالعہ" شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
- ڈینیل سی ڈینٹ جونیر (Daniel C Donneit jr): جزیہ اور اسلام (اردو ترجمہ از مولانا غلام رسول مہر)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۲ء
- ھمام بن منبہ، ابوعقبہ (م ۱۳۲ھ): الصحیفۃ الصحیحۃ (تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ)، رشید اللہ یعقوب کراچی، ۱۴۱۹ھ / ۱۹۹۸ء
- ہیثمی، نور الدین علی بن ابی بکر بن سلیمان (م ۸۰۷ھ): مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۹۶۷ء
- ہیکل، محمد حسین: حیاۃ محمد، مطبعۃ النہضۃ المصریۃ، القاہرہ، (الطبعۃ التاسعۃ)، ۱۹۶۵ء
- ہیکل، محمد حسین: صدیق اکبر (اردو ترجمہ از محمد اسحاق بھٹی)، الفیصل، لاہور، ۱۹۹۸ء

• ہیکل، محمد حسین: عمر فاروق (اردو ترجمہ از محمد مسعود عبدہ)، الفیصل، لاہور، س۔ن
• یحیٰ بن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ): کتاب الخراج (مشمولہ درموسوعۃ الخراج)، دارالمعرفۃ بیروت۔ لبنان، ۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء

English Books

• A.S. Tritton, The Caliphs and Their Non-Muslim Subjects (A Critical Study of the covenant of Umar), Oxford University Press, London, 1930
• Abdul Hameed Siddiqui, The Life of Muhammad, Islamic Publications, Lahore, 13th Edition, 1997
• Abdul Hakim, Khalifa, Fundamental Human Rights, Institute of Islamic Culture, Lahore, 1980
• Abul A'la Mawdudi, Human Rights in Islam, The Islamic Foundation, Leicester, 1980
• Asbeck, B.F.M.Van, The Universal Declaration of Human Rights and its Predecessors (1679-1948), E.J.Brill, Leiden, 1949
• Bat Ye'or, The Dhimmi (Jews and Christians under Islam) translated from the French by David Maisal, Paul Fenton and David dittman, Fairleigh Dickinson University Press, London, 1985
• Claser, Kurt, Victims of Politics; The State of Human Rights, Columbia University Press, New York, 1979
• Commager, H.S, Majority Rule and Minority Rights, Oxford University Press, London, 1943
• Donnelly, Jack, International Human Rights, Westview Press, Oxford, 1993
• Dr. S.K. Awasthi – R.P. Kataria, Law Relating to Protection of Human Rights, Orient publishing Co. New Delhi, India, 2000

- Garling, Marguerite, The Human Rights Handbook, Macmillan Press, London, 1979
- Graves, Norman, J . and others, Teaching for International Understanding, Peace and Human Rights, Unesco, Paris, 1984
- Hameeed A. K. Rai, Principles of Political Science, Aziz Publishers Lahore, 1982
- Hourani, A.H, Minorities in the Arab world, Oxford University Press, London, 1947
- Human Rights Commission of Pakistan, State of Human Rights in 1995, Human Rights Comission of Pakistan, Lahore, 1995
- Human Rights in the European Union, The Charter of Fundamental Rights, House of commons Library, Research Paper 32, 20 March 2000
- International Congress on the Teaching of Human Rights, Unesco, Paris, 1980
- Joyce, James, Avery, New Politics of Human Rights, Macmillan, London, 1978
- Jami English-Urdu Dictionary, Ministry of Human Resources Development Government of India, New Delhi, India, 1995
- Lanterpacht, H, International Law and Human Rights, Prauger, New York, 1950
- Levine, Andrew, Human Rights & Freedom, The Philosophy of Human Rights & Freedom, The Philosophy of Human Rights, ed. S. Rosenbaum. Aldwych Press, London, N.D
- Martin, Jaques, Human Rights, Allan Wingate, London, 1949
- Mertus, J.A, The United Nations and Human Rights,

Routledge, London, 2005
- Moskowitz, Moses, International Concern with Human Rights, Oceana publications, New York, 1974
- Muhammad Asad, The Principles of State and Government in Islam, University of California Press Berkely, 1961
- Muzaffar-ud-Din Nadvi, Human Rights and Obligations (In the Light of the Quran and Hadith), The Author, Decca, 1966
- Parveen Shakat Ali, Human Rights in Islam, Aziz Publishers, Lahore, 1980
- Philip K. Hitti, History of the Arabs, Macmillan Education Ltd, London
- Reader's Digest Library of Modern Knowledge, vol-2, 25 Berkeley Square, London, 1979
- Robertson, A.H and Merrills, J.G, Human Rights in the world (An introduction to the study of the international protection of human rights) third edition, Manchester University Presss, Manchester and New York, 1994
- Sieghart, Paul, The International Law of Human Rights, Clarendon Press, Oxford, 1983
- Sudhir Kumar Singh, Human Rights, in Pakistan, Pentagun Press, New Delhi, 2007
- Syed Ameer Ali, The Spirit of islam, Elite Publishers Karachi, 1988
- Talwar, Prakash, Human Rights, Isha Books, Dehli, 2006
- The African Charter of Human & Peoples Rights, 1981
- The American Declaration of Rights & Duties of Man, 1948
- The Constitution of Pakistan 1973, Lahore Law Times Publication, Lahore
- The European Convention for the Protection of Human Right, 1950

- The International Covenants on Civil & Political Rights, 1966
- The Vienna Declaration, 1993, UN, NY, 1995
- Time Dunne and Nicholas J. wheeler (Editers), Human Rights in Global Politics, Combridge University Press, U.K, 1999
- United Nations office of public information, United Nations and Human Rights, United Nations, New York, 1978
- United Nations Office of Public Infromation, International Bill of Human Rights Universal Declaration of Human Rights, United Nations, New York, 1978
- United Nations Organization, Yearbook on Human Rights for 1950, 1953
- Universal declaration of Human Rights, UNO, 1948
- W. Mantgomery Watt, Muhammad at Medina, Oxford Clarendan Uiversity Press, 1956
- W. Mantgomery Watt, Muhammad Prophet and Statesman, Oxford University Press, 1961
- World Conference on Human rights, The Vienna Declaration, June 1993, UNO, NY, 1995
- Yearbook on Human Rights for 1961, United Nation, New York, 1963

لغات ومعاجم

- آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری (مرتب ومترجم شان الحق حقی): اوکسفورڈ یونیورسٹی، پریس، ۲۰۰۳ء
- تھانوی، محمد اعلیٰ (م ۱۱۹۱ھ): کشاف اصطلاحات الفنون، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء
- پنجاب یونیورسٹی: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء
- زغلول، ابوہاجر محمد السعید بن بسیونی، موسوعۃ اطراف الحدیث، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔ لبنان، ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۴ء

- سید، قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا (آٹھواں ایڈیشن)، الفیصل لاہور، ۲۰۰۵ء
- فرید وجدی، محمد: دائرۃ معارف القرن الرابع عشر العشرین، ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۷ء
- لویس معلوف الیسوعی، المنجد فی اللغۃ، الکاتولیکیۃ، بیروت، الطبعۃ الجدیدہ، س۔ن
- محمد رواس قلعہ جی وحامد صادق قنیبی: معجم لغۃ الفقہاء (عربی۔انگلیزی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ت۔ن
- وزارۃ الاوقاف والشؤن الاسلامیۃ: الموسوعۃ الفقہیۃ، الکویت، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۵ء (الطبعۃ الاولیٰ)
- Aiyar, Aiyar's Judicial Dictionary, The Law book Co. Allahabad, India, 9th ed. 1984
- Rabia Practical Dictionary, English into English and urdu, Rabia Book House, Lahore, N.D
- Ferozesons Dictionary (English to English and Urdu), Fereozesons, Lahore, N.D
- Henry Gampbell, blacks Law Dictionary 6th Ed. West Publishing Co. USA, 1990
- The Encyclopaedia of Islam (New Edition) Leiden, E .J. Brill, 1986
- The New Shorter Oxford English Dictionary, Clarendon Press Oxford, 1993
- روزنامہ انصاف، لاہور، مؤرخہ ۶ فروری ۲۰۰۶ء
- روزنامہ جنگ، کراچی، ۳۰ دسمبر ۱۹۹۸ء
- روزنامہ جنگ، لاہور، مؤرخہ ۲۴ جنوری ۲۰۰۶ء، - ۲۰ مئی ۲۰۱۰ء
- روزنامہ نوائے وقت لاہور، مؤرخہ ۱۴ جنوری ۲۰۰۶ء - ۸ فروری ۲۰۰۶ء - ۸ فروری ۲۰۱۰ء
- روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۲ مئی ۲۰۱۰ء
- ماہنامہ البرہان، لاہور، شمارہ اگست ۲۰۱۰ء
- ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ ۲۰۰۶ء
- ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، ۱۳:۴ (شمارہ اپریل
- ماہنامہ محدث، لاہور، شمارہ مارچ ۲۰۰۶ء
- مجلہ تحقیقات اسلامی علیگڑھ انڈیا شمارہ جنوری - مارچ ۲۰۱۱ء (مقالہ: اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری۔ذمی: از مولانا یحیی نعمانی)